DUE DATE

Rare
329.954
Cl. No. K8M51 Acc. No. 12865

Late Fine Ordinary books 25 p. per day, Text Book Re 1 per day, Over night book Re 1 per day.

مصنف

ڈاکٹر ایچ۔ بی۔ خان (حافظ بابر خان) ۵ نومبر ۱۹۲۲ء کو پیالہ ، ریاست بھرت پور (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں آپ ہجرت کرکے کراچی آگئے۔ ابتدائی تعلیم پیالہ میں حاصل کی۔ امریکہ میڈیکل اسکول سے ۱۹۴۲ء میں بذریعہ مراسلت ایل۔ ایم۔ پی کیا۔ ۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۹ء مسلم یونیورسٹی ہسپتال علی گڑھ میں بطور میڈیکل اسسٹنٹ خدمات انجام دیں۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ بیرونی طالب علم کی حیثیت سے اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور ۱۹۶۷ء میں آپ نے کراچی یونیورسٹی سے اسلامیات میں ایم۔ اے کیا اور ۱۹۷۵ء میں اسی یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری سے سرافراز ہوئے۔ ۱۹۷۶ء تا ۱۹۷۹ء آپ نے جامعہ کراچی کے شعبۂ تاریخ میں بحیثیت لیکچرار تدریس کے فرائض انجام دئیے اور ۱۹۸۱ء تا ۱۹۸۳ء ہمدرد فاؤنڈیشن سے بطور محقق وابستہ رہے۔

آپ کی تالیفات میں شاہراہ مکہ (کراچی ، ۱۹۷۶ء) خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ فی الوقت آپ زیر نظر کتاب کی دوسری جلد کو آخری شکل دینے میں مشغول ہیں۔

تاریخی سلسلہ (مسلم ہندوستان) : ۳

برصغیر پاک و ہند کی سیاست میں علماء کا کردار

(بیسویں صدی میں ۱۹۴۰ء تک)

برصغیر پاک و ہند کی سیاست میں علماء کا کردار

(بیسویں صدی میں ۱۹۴۰ء تک)

Title Page

ایچ - بی - خان

قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت
پوسٹ بکس نمبر ۱۲۳۰ - اسلام آباد
۱۹۸۵ء

طبع اول : ۱۹۸۵ء

قیمت
۱۲۵٫۰۰ روپے

طابع
مطبع عالیہ
۱۲۰ میکلوڈ روڈ ۔ لاہور

ناشر
قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت
پوسٹ بکس نمبر ۱۲۳۰ ۔ اسلام آباد

فہرست مضامین

باب اول

تاریخ اسلام اور تاریخ برصغیر میں علماء کے مقام کا ایک اجمالی جائزہ

باب دوم

۱۸۵۷ء اور اس کے بعد ملک کے سیاسی حالات اور علماء کی جد و جہد

(ب) ۱۳ - ۱۹۰۶ء برصغیر کی سیاست کا خاکہ

باب چہارم

جنگ عظیم اول ، خلافت عثمانیہ اور مسلمانان برصغیر پر داخلی اور خارجی اثرات (۲۱ - ۱۹۱۴ء)

باب پنجم

جمعیۃ علماء ہند کا قیام اور علماء کی سیاسی سرگرمیاں

باب ششم

۱۹۲۲ء - ۳۵ کے دوران علماء کا کردار

مقدمہ

مقالہ ہذا کو لکھنے کی غرض و غایت اس صدی کے پہلے چالیس سالوں کے دوران علماء کے سیاسی کردار پر روشنی ڈالنا ہے ۔ علماء کے اجتماعی اور انفرادی کردار پر پچھلے پچیس تیس سالوں میں جو کام ہوا ، اس میں یہ کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں :

۱ ۔ شیخ محمد اکرام صاحب کے سلسلہ کوثر میں ، "موج کوثر" ،

۲ ۔ ضیاء الحسن فاروقی صاحب کی کتاب

The Deoband School and the Demand for Pakistan

۳ ۔ مولانا محمد میاں صاحب کی کتابیں ، "علماء ہند کا شاندار ماضی" ، جلد چہارم اور "علماء حق" ، ہردو حصص ۔

۴ ۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی کی حالیہ کتاب ،

Ulema in Politics

علاوہ ازیں بعض دیگر کتب مثلاً مولانا طفیل احمد منگلوری کی کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" میں بھی اس موضوع پر مواد ملتا ہے ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ علماء کے رول پر کوئی مبسوط اور مخصوص کام ابھی تک نہیں ہوا ۔ ڈاکٹر قریشی صاحب کی عالمانہ تصنیف ایک طویل زمانے پر محیط ہے ۔ جس میں موجودہ صدی کی حیثیت ایک باب سے زیادہ نہیں ۔

بیسویں صدی کے پہلے چالیس سال ، برصغیر کی تاریخ میں اور خصوصاً علماء کی تاریخ میں خصوصی اہمیت کے حامل ہیں ۔ اس صدی کے آغاز سے علماء نے سیاست میں اپنی دلچسپی تیز تر کر دی اور جنگ عظیم اول کے ختم ہوتے ہوتے انھوں نے اپنی ایک مرکزی سیاسی تنظیم بھی بنا لی ۔ اس پورے دور میں جتنے اہم مسائل سامنے آئے ، چاہے ان کا تعلق خلافت سے ہو ، یا آئینی اصلاحات سے ، آزادی کی جد و جہد سے ہو یا برصغیر کی آئندہ جغرافیائی تشکیل سے ، ان سب میں علماء نے ایک اہم کردار ادا کیا ۔ جس کو اگر نظرانداز کر دیا جائے تو اس زمانے کی سیاست کی تصویر مکمل نہیں ہوتی اور نہ ہی سیاسی نقشے میں وقتاً فوقتاً جو تبدیلیاں ہوئیں ، ان کی اہمیت پوری طرح واضح ہوتی ہے ۔ اس لیے متعینہ دور میں علماء کے کردار پر یہ خصوصی مقالہ مرتب کیا گیا ہے۔

عہدِ جدید کے ذہنی انقلابات کے نتیجہ میں سیاست اور امارت کی بابت نظریات ہی تبدیل ہوگئے ۔ جا بجا وطن پرستی اور قوم پرستی کے بت خانے تعمیر ہوگئے ۔ جس کی بناء پر طرز زندگی کے خد و خال میں بھی نمایاں تبدیلی رونما ہوئی ۔ ان بدلتے ہوئے حالات میں علماء اسلام نے دنیا کے سامنے دین فطرت کے متعین کردہ نظام عدل و انصاف کو پیش کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ۔ موجودہ کتاب علماء کی ان مساعی کو اجاگر کرنے کی طرف ایک ادنٰی قدم ہے ۔ ہر چندکہ محدود وقت اور وسائل کی کمی کے باعث اس میں صرف معروف علماء کے سیاسی کردار پر ہی روشنی ڈالی جا سکی ہے ۔

محولہ بالا موضوع پر تحقیقی مواد کی جمع آوری کے لیے راقم نے بھارت کے درج ذیل علمی اداروں اور کتب خانوں سے استفادہ کیا ہے ۔

(۱) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (آزاد لائبریری) ۔ (۲) کتابخانہ انجمن ترقی اردو ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۔ (۳) آگرے میں کئی کتب خانے ۔ (۴) انڈین کونسل آف ورلڈ افیرز ۔ (۵) انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز ، دہلی ۔ (۶) انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز، دہلی ۔ (۷) نیشنل آرکائیو آف انڈیا ، دہلی۔ (۸) جامعہ ملیہ ، نئی دہلی ۔ (۹) نہرو میوزیم ، نئی دہلی ۔

ہندوستان میں بہت سے ایسے افراد سے بھی ملا جو بالواسطہ یا بلاواسطہ تحریک آزادی سے وابستہ رہ چکے تھے ۔ ان میں سے حسب ذیل لائق ذکر ہیں :

(الف) ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب صدیقی ، شیخ الجامعہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ۔

(ب) مولانا سید اسعد مدنی صاحب خلف مولانا سید حسین احمد مدنی مرحوم ۔

(ج) مولانا محمد عثمان فارقلیط صاحب ۔

(د) مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب واصف ، خلف مفتی کفایت اللہ مرحوم ۔

مؤخر الذکر نے اپنے ذاتی کتب خانے سے اخبار "مسلم" ، "الجمعیۃ" اور بعض نادر کتب کا ذخیرہ مجھے مطالعے کے لیے پیش کیا ۔ جن سے بہت ہی اہم مواد دستیاب ہوا ۔ مولانا محمد عثمان فارقلیط صاحب جو "الجمعیۃ" کے سابق مدیر اور موجودہ چیف ایڈیٹر ہیں ، سے بھی بڑی اہم اور دلچسپ معلومات حاصل ہوئیں ۔

پاکستان میں دوران تحقیق راقم نے جن حضرات سے علمی اعانت حاصل کی، اُن میں (۱) ڈاکٹر ریاض الاسلام صاحب نے مقالہ کی تکمیل و تدوین میں ابجد تا آخر قدم قدم پر رہنمائی سے نوازا - (۲) ڈاکٹر محمود حسین صاحب مرحوم نے مقالہ کی کتابیات اور ابتدائی خاکہ کی تیاری میں مدد کی - (۳) ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی مرحوم - (۴) مولانا عبدالحامد صاحب بدایونی مرحوم، کراچی - (۵) جناب رئیس امروہوی صاحب - (۶) مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی مرحوم، کراچی - (۷) پروفیسر محمد ایوب صاحب قادری مرحوم، کراچی - (۸) مولانا عبدالحلیم صاحب چشتی - سابق نائب لائبریرین، جامعہ کراچی - (۹) حافظ رشید احمد صاحب، سابق صدر شعبہ عربی، جامعہ کراچی - (۱۰) قاری محمد طیب صاحب، مہتمم دارالعلوم دیوبند، بھارت - (۱۱) مولانا محمد ظفر احمد صاحب انصاری، کراچی - (۱۲) مفتی ولی حسن صاحب ٹونکی، مفتی اعظم دارالعلوم نیو ٹاؤن، کراچی - (۱۳) ہلال احمد صاحب زبیری، سابق ایڈیٹر "الجمعیۃ"، دہلی - (۱۴) پیر حسام الدین صاحب راشدی مرحوم، کراچی - (۱۵) مولانا محمد متین صاحب خطیب، کراچی - (۱۶) سید غلام مصطفیٰ علی صاحب، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی - (۱۷) جناب محمد احمد صاحب، اقبال اکیڈمی، کراچی - (۱۸) جناب سعید الدین فاروقی، لائبریرین، بلدیہ، کراچی - (۱۹) پروفیسر علی محسن صدیقی، شعبہ تاریخ اسلام، جامعہ کراچی - (۲۰) محمد اقبال صاحب اور سرکار احمد صاحب، روزنامہ جنگ، کراچی - (۲۱) ابو سلمان صاحب شاہجہان پوری، کراچی - (۲۲) محمد عبیداللہ صاحب صیفی، نیشنل لیاقت لائبریری، کراچی - (۲۳) عبید اللہ قدسی صاحب، کراچی - (۲۴) فضل اللہ صاحب فاروقی، سابق نائب لائبریرین، جامعہ کراچی - (۲۵) ڈاکٹر عبدالمعید صاحب، سابق لائبریرین، جامعہ کراچی - (۲۶) پیر علی محمد صاحب راشدی، کراچی - (۲۷) ڈاکٹر غلام محمد صاحب، مصنف نقش سلیمان، کراچی -

ان کے علاوہ بھارت کے سفر کے دوران راقم نے مندرجہ ذیل دانشوروں سے تبادلۂ خیال اور علماء سے استفادہ کیا -

(۱) مولانا سید محمد اسعد صاحب مدنی خلف مولانا سید حسین احمد مدنی صاحب مرحوم، (۲) ڈاکٹر انوار الحق صاحب حقی، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ - (۳) ڈاکٹر شان محمد صاحب، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ - (۴) مولانا عبدالشاہد خان صاحب شیروانی، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ - (۵) ایم - ایچ - رضوی صاحب، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ - (۶) محمد فرخ صاحب، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ - (۷) مولانا سعید احمد صاحب

اکبر آبادی ، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ۔ (۸) مفتی محمد رضا صاحب فرنگی محلی ، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ۔ (۹) بیگم ڈاکٹر محمد انس صاحب ، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ۔ (۱۰) ڈاکٹر عشرت انور صاحب، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ۔ (۱۱) جمیل الرحمٰن صاحب قریشی ، لائبریرین ، جامعہ ملیہ دہلی ۔ (۱۲) عابد رضا صاحب بیدار ، انڈین کونسل آف ورلڈ افیرز ، دہلی ۔ (۱۳) خواجہ منیر حسین صاحب ، لائبریرین، آزاد بھون ، دہلی ۔ (۱۴) حکیم عبدالحمید صاحب ، ہمدرد دواخانہ ، دہلی ۔ (۱۵) مولانا محمد میاں صاحب ، جمعیۃ العلماء ہند ، دہلی ۔ (۱۶) مفتی عتیق الرحمان صاحب عثمانی ، دہلی ۔ (۱۷) مولانا سید احمد صاحب ہاشمی ، جمعیۃ العلماء ہند ، دہلی ۔ (۱۸) پروفیسر میناتی ، جامعہ ملیہ ، دہلی ۔ (۱۹) نندا صاحب ، لائبریرین ، جامعہ ملیہ ، دہلی ۔ (۲۰) مسٹر جے ۔ کے ۔ جین ، نہرو میوزیم ، دہلی ۔ (۲۱) جناب ایم ۔ حبیب ، انجمن ترقی اردو ، علیگڑھ ۔ (۲۲) اشتیاق صاحب و گلزار حسین صاحب ، انڈین انسٹیٹوٹ آف اسلامک اسٹڈیز ، دہلی ۔ (۲۳) حاجی محمد صابع صاحب ، جمعیۃ العلماء ہند ، دہلی ۔ (۲۴) سکندر مرزا صاحب و عزیز مرزا صاحب ، دہلی ۔ (۲۵) کوثر صاحب ، کیپر ، نیشنل آرکائوز آف انڈیا ، دہلی ۔

اہم مواد کی کاپیاں فوٹو سٹیٹ کاپیوں کے حصول میں راقم کو ڈاکٹر محمد انس صاحب ، صدر شعبہ جغرافیہ ، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کی عنایت خاص حاصل رہی ۔

باب اول

تاریخ اسلام اور تاریخ برصغیر میں علماء کے مقام کا ایک اجمالی جائزہ

فصل اول

تاریخ عالم کے مطالعہ سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ جب سے انسانوں نے گروہوں میں منظم ہو کر اجتماعی رہن سہن اختیار کیا ، اسی زمانے سے ان میں مذہبی پیشواؤں کا گروہ بھی رفتہ رفتہ تشکیل پاتا گیا ۔ اسلام کی آمد سے بہت پہلے یہ گروہ دنیا کے مختلف علاقوں اور خطوں میں پایا جاتا تھا ۔ نیز یہ گروہ بزعم خود اپنے کو خدا اور انسانوں کے درمیان ایک وسیلہ اور نجات کا ذریعہ سمجھتا تھا ۔ مذہبی اور نیک کاموں کی نگرانی و انجام دہی کو اس گروہ نے اپنی اجارہ داری بنایا ہوا تھا ۔ علاوہ ازیں اس کام کے صلے میں یہ طبقہ عوام سے غیر معمولی اجرت اور حق صلہ بھی وصول کیا کرتا تھا ۔[1]

پروہتوں کے اس گروہ کے متعلق انسائی کلوپیڈیا آف رلی جن اینڈ ایتھکس کی رائے حسب ذیل ہے :

> **"The origin of Priesthood therefore goes back to a very early stage of social evolution : the first indications of a Priest's or Sorcerer's office can be traced back almost to the very origin of religious and magical practices".[2]**

اس طبقے نے مذہبی رسومات میں اپنی اجارہ داری قائم کی ہوئی تھی اور اِس عقیدے کو رواج دیا کہ ہر انسان خدا کے ساتھ براہ راست اپنا تعلق پیدا نہیں کر سکتا ۔ اس کام کی انجام دہی کاہن ، پروہت یا پجاری کر سکتے ہیں ۔[3]

---

1. Dr. Ata Mohy-ud-Din, *The Arabian Prophet : His Message and Achievement*, Karachi, 1955, p. 326.
2. James Hastings (Ed.), *Encyclopedia of Religion and Ethics*, Vol. X, 2nd Impr., New York, 1930, p. 278.
3. Ibid., p. 279.

سنت الٰہی کے مطابق ہر نبی نے توحید کا پرچار کیا اور باطل و گمراہ کن عقائد کی پیروی سے لوگوں کو منع کیا ۔ اس تعلیم کو اکملیت کا جامہ پہنانے کے لیے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ میں قرآنی تعلیم و فلسفہ کے ذریعہ لوگوں کے دلوں سے کاہنوں ، پجاریوں ، پروہتوں وغیرہ کی اجارہ داری کو ختم کیا اور اس سلسلے میں قرآن حکیم کا واضح اعلان سنایا ، یعنی : ''لھا ما کسبت و علیھا مکتسبت'' (ترجمہ) ''اس کا ثواب بھی اسی کو ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے اور اس پر عذاب بھی اسی کا ہوگا جو ارادہ سے کرے ۔''[1] اس آیت کریمہ اور اسی طرح کی دیگر آیات سے خود ساختہ عقائد باطلہ کی نفی ہوتی ہے ۔ چنانچہ اسلام نے فطری اور صحیح العمل اصولوں کی نشان دہی کرکے گمراہ انسانوں کو فلاح و بہبود کے راستے پر گامزن کیا ۔

تدوین حدیث اور تدوین فقہ :

خلفائے کرام اور صحابۂ عظام کی فتوحات سے مسلمانوں کا غلبہ اور اقتدار وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا ۔ مقبوضہ ممالک کے باشندے قومیت ، مذہب اور معاشرت میں باہم دگر بہت مختلف تھے ۔ اس وسیع و عریض مملکت میں نظام مملکت کو شریعت حقہ کے تحت چلانے کے لیے نیز انتظامی امور کو درست و برقرار رکھنے کے لیے ایسے آئین کی تکمیل ضروری تھی جو راعی اور رعایا کو اپنے اپنے حدود اختیارات میں رکھ کر امن و امان کا ضامن ہو ۔ نیز منجملہ دیگر امور کے اسلامی شعائر زندگی کو بھی عملاً قائم و برقرار رکھ سکے ۔[2] لہذا مطلوبہ قانون مرتب کرنے کے لیے محدث ، مجتہد ، مفسر ، مقنن اور فقہاء کی خدمات حاصل کی گئیں ۔

محدثین :

محدثین میں سب سے بڑے محدث خلفاء کبار اور صحابۂ عظام تھے ۔ جن میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ، حضرت انس رضی اللہ عنہ ، حضرت عبدالرحمٰن بن عباس رضی اللہ عنہ ، حضرت جابر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ قابل ذکر تھے ۔[3]

---

۱ ۔ ''القرآن'' ، مولانا اشرف علی تھانوی (مترجم) ، لاہور ، س ن ، پ ۱ ، ر ۔ ۳ ، آیت ۲۸۶ ، سورہ بقرہ ، ص ۷۷

۲ ۔ فرید وجدی، ''اسلام کے عالمگیر اصول'' سید احمد حسین نقوی (مترجم)، لاہور، ۱۹۴۸ء ، ص ۹۵

۳ ۔ مولانا شبلی نعمانی ، ''سیرت النعمان'' ، حصہ اول و دوم ، دہلی، س ن ، ص ۵۷

مجتہدین اور محدثین حضرات کی حیثیتیں جدا جدا ہیں ۔ مجتہد کو صرف ان احادیث سے غرض ہوتی ہے جن سے حکم شرع مستنبط ہو ، مگر محدثین حضرات مواعظ ، قصص ، فضائل ، سیر ، ہر قسم کی روایتوں سے استفادہ کرتے ہیں ۔[1] حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہ کے دور خلافت میں احادیث کی ترویج و اشاعت زیادہ ہوئی ۔ فتوحات کے نتیجے میں مملکت وسیع ہوتی گئی اور نت نئے مسائل روز بروز بڑھتے چلے گئے ۔ ان حالات نے احادیث اور روایات کے سلسلے کو مزید وسعت دی ۔[2] علاوہ ازیں اسی زمانے میں فرضی احادیث بھی وضع ہوئیں ۔ جب فرضی احادیث کے فتنے نے زور پکڑا تو اسناد کی پوچھ گچھ ہوئی ۔ بنوامیہ کے دور میں علم حدیث نے بدرجۂ اتم ترویج پائی ۔ دوسری طرف صحابۂ کرام کی تعداد کم ہوتی گئی ، جس کے نتیجے میں حدیثوں کی قدر و منزلت بڑھتی گئی ۔ بنوامیہ کے آٹھویں خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے امام زہری سے احادیث جمع کرائیں اور اس مجموعہ کی نقول اسلامی ممالک میں بھیجی گئیں ۔[3]

سلطنت میں وسعت اور تمدن میں ترقی کے پیش نظر حامیان اسلام کو وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اسلامی قانون (Islamic Jurisprudence) کے مدون کرنے کی ضرورت پیش آئی ۔[4] فقہ یا اسلامی قانون کسی اعتبار سے بھی متعینہ قرآنی حدود اور احادیث نبوی (صلعم) کے احکامات سے تجاوز نہیں کر سکتا، مگر چونکہ قرآن میں بہت سے مسائل بالتصریح موجود نہیں ہیں ، اس لیے محمد (صلعم) کی وفات کے بعد صحابۂ کرام کو اختلافی مسائل میں استنباط ، تفریع ، حمل النظیر علی النظیر اور قیاس سے بھی کام لینا پڑا ۔ صحابۂ کرام میں جن حضرات نے استنباط اور جہاد سے کام کیا وہ مجتہد کہلائے ۔[5]

اقسام فقہ یا اسلامی قانون کی قسمیں :

فقہ دو قسم کے مسائل پر مشتمل ہے :

(الف) تشریعی : شریعت سے ماخوذ مسائل تشریعی احکام کہے جا سکتے ہیں ۔

(ب) غیر تشریعی : وہ احکام یا مسائل جن کا ذکر شریعت میں موجود تو ہے مگر تشریعی طور پر نہیں ہے اور یہ احکام تمدن یا معاشرے کی ضروریات سے پیدا ہوتے ہیں ۔

---

۱ ۔ ایضاً ، ص ۳۲

۲ ۔ ایضاً ، ص ۸۲

۳ ۔ مولوی محمد عبدالرحمان خان ، ''تاریخ اسلام پر ایک نظر'' ، دہلی ، ۱۹۵۲ء ، ص ۱۲۰ ؛ ''شجرہ بنوامیہ'' و ''سیرۃ النعمان'' ، ص ۱۸

۴ ۔ ''اسلام بیسویں صدی میں'' ، ص ۱۲۹

۵ ۔ ''سیرۃ النعمان'' ، محولہ بالا ، ص ۱۰۵

پہلی قسم کے لحاظ سے فقیہہ کی حیثیت شارح یا مفسر کی ہے اور دوسری قسم کے لحاظ سے فقیہہ ایک مقنن کی حیثیت کا حامل ہے۔[1]

اسلامی قانون کو متشکل کرنے کے لیے مندرجہ ذیل ذرائع مستعمل ہیں :

(اول) قرآن ،

(دوم) سنت نبوی یا احادیث ،

(سوم) اجماع ،

(چہارم) قیاس ،

(پنجم) روایا عرف یا روایات ،

(ششم) امام ابو حنیفہ کے نزدیک استحسان بھی ایک ذریعہ ہے۔

ان میں اول الذکر دو اصول مسلمہ اور ناقابل تردید ہیں۔ جب کہ سوم تا ششم میں فقہاء کو یہ اختیار ہے کہ قرآن و سنت یا حالات اور ضروریات زمانہ کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر ان سے استنباط کریں۔[2]

بنی عباس کا عہد خلافت (۷۵۰ - ۱۲۵۸ء) :

دور بنی عباس ، اسلامی علوم و فنون اور ثقافت کی ترقی و ترویج کے لیے مثالی ہے۔ اسی عہد میں فقہ مذاہب اربع (حنفی ، مالکی ، شافعی اور حنبلی) مرتب ہوا۔ یہ چاروں مذاہب معتبر اور مستند مانے جاتے ہیں۔[3] لیکن اس دور عروج و ترقی میں فقہاء اور علماء کو گونا گوں ابتلاء اور امتحانات سے دوچار ہونا پڑا۔ مثلاً خلیفہ منصور نے امام ابو حنیفہ کو عہدۂ قضا قبول نہ کرنے پر (۱۴۶ھ/۷۶۳ء) میں قید کر دیا۔ بعدۂ موصوف کو زہر دے کر ہلاک کر دیا۔[4]

خلیفہ مامون معتزلی عقائد کا حامل تھا۔ لہذا اس نے بھی علماء حق کو معتزلی عقائد کے خلاف پیروی کرنے پر طرح طرح کی اذیتیں اور تکالیف دیں۔ امام احمد بن حنبل نے ڈھائی برس تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ امام مالک بن انس رضی اللہ عنہ کی سر بازار تشہیر کرائی گئی۔ حافظ ابن عبدالبر کو جلا وطن کیا گیا۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ برسوں جیل خانے میں رہے ، لیکن مصائب و آلام کے باوجود

---

۱ - ایضاً ، ص ۱۱۳

2. Dr. I. H. Qureshi, *Ulema in Politics*, Karachi, 1972, p. 7; M. Mujeeb, *The Indian Muslims*, London, 1967, p. 58.

3. *The Indian Muslims*, p. 57.

۴ - "سیرة النعمان" ، محولہ بالا ، ص ۳۶ - ۳۷؛ مفتی انتظام اللہ شہابی ، "علماء حق اور ان کی مظلومیت کی داستانیں" ، حصہ اول ، دہلی ، س ن ، ص ۲۴ - ۲۵

حق‌گو علماء کے عزائم و ثبات میں لغزش نہ آئی اور صبر و شکر کے ساتھ امتحان و ابتلاء کو برداشت کیا[1] ۔

علماء حق کے علاوہ ایک طبقہ علماء سوء کا (جو ہر دور میں رہا ہے) بھی تھا ۔ جو حب جاہ و مال کی خاطر خلفاء اور حکومت سوقتہ سے ہمہ قسم کا تعاون کرتا رہا ۔

عالم کی تعریف :

مختلف محققین و مورخین نے عالم کی تعریف کی ہے جن میں سے چند کی آراء حسب ذیل ہیں ۔ خلیق احمد نظامی کی رائے یہ ہے کہ :

> "Anybody who had acquired religious knowledge upto a generally accepted and prescribed standard could become an alim".[2]

لیونارڈ بائینڈر نے ایک عالم کی تعریف حسب ذیل کی ہے :

> "Any one who studied law can be an alim".[3]

مندرجہ بالا ہر دو مصنفین کی آراء میں نظامی صاحب کی رائے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے ۔ اصولی طور پر ایک عالم کے لیے ضروری ہے کہ وہ علم تفسیر ، علم حدیث ، علم فقہ و اصول فقہ ، علم تصوف ، علم ادب ، عام صرف و نحو ، علم کلام اور علم منطق کا حامل ہو[4] ۔

علماء کے طبقے یا علماء کی اقسام :

عام طور پر علماء کی دو قسمیں ہیں یعنی علماء حق اور علماء سوء ۔ علماء حق کا سب سے پہلا اور اہم کام "نہی عن المنکر" یعنی بھلائی پھیلانا اور برائی سے روکنا ہے ۔ مگر علماء سوء جائز و ناجائز ، حلال و حرام کا خیال کیے بغیر ابن الوقتی کو اپنا شعار

---

۱ ۔ "برہان" (ماہنامہ) ، دہلی ، مارچ ۱۹۳۹ء ، "نظرات" ، ص ۱۶۲-۱۶۳ ؛ "علماء حق اور ان کی مظلومیت کی داستانیں" ، محولہ بالا ، ص ۳۴-۳۵ اور ۲۸-۲۹ ؛ ایضاً ، حصہ دوم ، ص ۸۳ ۔

2. *Some Aspects of Religion and Politics in India during the 13th Century*, p. 151.
3. Leonard Binder, *Religion and Politics in Pakistan*, California, 1963, p. 25.
4. *Ulema in Politics*, pp. 12-13.

بنا لیتے ہیں[1] - یوں تو احادیث کی کتابوں میں علماء حق کے متعلق بہت سے اقوال اور احادیث موجود ہیں جن میں سے ایک معروف حدیث یہ ہے کہ ''العلماء ورثة الانبیاء'' یعنی علماء انبیاء کے وارث ہوتے ہیں[2] - اسی ضمن کی ایک دوسری حدیث یہ ہے ''افضل الجہاد کلمة الحق عند سلطان جابر'' - یعنی سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ جابر و ظالم سلطان (حکمران) کے سامنے بلا جھجک حق بات کہہ دی جائے[3] -

فصل دوم

اسلامی ہند میں علماء کا مقام اور کردار :

قرون وسطیٰ سے لے کر دور ہم عصر تک علماء حق ، سلاطین و حکمرانوں کے غیر شرعی اعمال و افعال پر، نیز غیر شرعی طرز زندگی پر تعریض و تنقید کرتے تھے - عہد سلاطین دہلی میں بھی علماء حق نے اپنا فرض مذہبی بدرجہ اتم پورا کرنے کی سعی کی ہے اور ان میں سے چند علماء نے تو اپنی جان تک کی پروا نہ کی - مگر کلمۂ حق کی ادائیگی سے سرمو تجاوز نہ کیا - علماء کے ایسے کارنامے تاریخ ہند کے انمٹ اوراق ہیں -

علماء بہ حیثیت عہدیداران حکومت :

اسلامی ہند میں (۶۰۲ھ/۱۸۵۷ء) سلاطین نے کسی نہ کسی شکل میں سلطنت کا نظم و نسق مذہبی عقائد اور شرع کے تحت چلانے کی حتی المقدور کوشش کی - اس نظام کو بروئے کار لانے کے لیے دیوانی شرع یا محکمہ شرعیہ قائم کیا - اس محکمہ کا سربراہ صدر الصدور یا صدر جہان ہوتا تھا[4] - اس عہدہ کے کئی اور نام بھی ہوتے تھے یعنی قاضی القضاۃ ، صدر کل اور قاضی ممالک وغیرہ - قاضی القضاۃ کے ماتحت حسب ذیل امور ہوتے تھے :

---

۱ - خلیق احمد نظامی ، ''سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات'' ، دہلی ، ۱۹۵۸ء (طبع اول) ، ص ۲۰ - ۲۱؛ ''القرآن'' ، سورہ آل عمران ، ر ۱۱ ، آیت ۱۰۳ ، مولانا عبدالماجد دریا بادی ، (مترجم) س ن ، ص ۱۴۸ -

[نوٹ - خلیق احمد نظامی اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحبان نے علماء حق اور علماء سوء کے متعلق احادیث بیان کی ہیں - لیکن بخوف طوالت ہم انھیں نظر انداز کر رہے ہیں] -

۲ - محمد بن عبدالرحمن السخاوی ، ''المقاصدالحسنہ''، مصر ، ۱۳۷۵ھ ، ص ۲۸۶

۳ - عبدالرؤف المناوی ، ''فیض القدیر الجامع الصغیر'' ، مصر ، ۱۹۳۸ء ، ج ۲ ، ص ۳

4. Dr. I. H. Qureshi, *The Administration of the Sultanate of Dehli.*, Karachi, 1958, 4th ed., p. 157.

"(الف) محکمہ قضاء ،

(ب) محکمہ خطابات ،

(ج) تقرر ائمہ ،

(د) احتساب شرعیہ یعنی سرکاری عہدیداران پر شرعی نگرانی ، اور

(ہ) صوبائی قضاۃ ، ضلع ، شہر اور قصبہ جات میں قضاۃ کا تقرر نیز محکمہ تعلیمات اور مفتیان کا تقرر بھی شامل تھا"[1]۔

سرکاری سرپرستی اور اقتدار کے باوجود بہت سے اتقیاء اور زہاد بزرگوں نے عہدہ قضا قبول کرنے سے گریز کیا ۔

علماء کی سیاسی سرگرمیاں :

قطب الدین ایبک کے زمانے سے لےکر علاؤ الدین خلجی کے عہد تک بعض علماء سیاست میں دخیل رہے اور امور مذہبی تو ان کے سپرد ہی تھے ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سلاطین علماء کی غیر معمولی عزت و توقیر کرتے تھے ۔ اس سلسلے میں مولوی حفیظ اللہ نے (بحوالہ تاج الماثر) بیان کیا ہےکہ "علماء دین جو انبیاء علیہم السلام کے جانشین اور علم شریعت کے نگہبان ہیں اور جو اپنے تقرب اور بزرگی کے باعث اختصاص کے مرتبے پر فائز ہیں ، بادشاہ نے ان کی توقیر و احترام کو لازم و واجب قرار دیا تھا اور ان کے اعزاز و اکرام کو کتاب و سنت کے ساتھ حکمرانی کا لازمہ اور بادشاہ کا ہنر ٹھہرایا تھا ۔[2]"

سلطان التمش کی تخت نشینی کے وقت علماء کی ایک جماعت نے قاضی وجیہہ الدین کاشانی کی سربراہی میں سلطان سے ایک وفد کی شکل میں ملاقات کی ۔ وفد کا مقصد یہ تھا کہ التمش سے خط آزادی دیکھے بغیر اس کی بیعت نہ کی جائے ۔ چونکہ التمش ایک خرید کردہ غلام تھا ۔ موصوف نے علماء کے وفد کو خط آزادی دکھایا ۔ تب علماء نے بیعت کی[3] ۔ سلطان نے سلطنت کو مضبوط و مستحکم کرنے کے لیے ، خلیفۂ بغداد کی طرح علماء کے ساتھ اتحاد قائم کیا ۔ لیکن التمش کی علماء نواز پالیسی نے علماء کے کردار پر کوئی صحت مند اثر مرتب نہ کیا ، بلکہ اس کے برعکس علماء میں کلمۂ حق کی ادائیگی کی

---

1. Mohammad Bashir Ahmad, *The Administration of Justice in Medieval India*, Allahabad, 1941, pp. 105-6.

۲ ۔ مولوی محمد حفیظ اللہ ، "سلاطین ہندکی علم پروری" ، پٹنہ ، ۱۹۵۶ء ، ص ۳۵ ۔

۳ ۔ "سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات" ، محولہ بالا ، ص ۵۱-۶۰

جرأت بھی نہ رہی جیسا کہ سلطانہ رضیہ کی غیر شرعی نامزدگی (تخت نشینی) پر کسی عالم نے احتجاج نہ کیا[1] ۔

خلیق احمد نظامی نے کہا ہے کہ علماء کے ایک طبقے نے اپنا وقار و مرتبہ، نازیبا اور مکروہ سیاست میں ملوث ہوکر ختم کر دیا تھا ۔ علماء کے علمی انحطاط اور اخلاق کمزوری کی اس سے بدتر کیا مثال ہوگی کہ انھوں نے شرعی رخصت کا جواز تلاش کر کے سلطان کیقباد کو اسلام کے ارکان (نماز و روزہ) کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دے دیا تھا[2] ۔

غیاث الدین تغلق نے، غاصب حکمران اور ہندو الاصل ناصر الدین خسرو کے عہد میں مسلمانوں کو غیر مسلموں کے غلبہ اور تسلط سے نجات دلائی ۔ خسرو نے عنان حکومت سنبھالنے کے بعد علماء و مشائخ کی ہمدردی و تعاون حاصل کرنے کے لیے ان لوگوں میں شاہی خزانہ تقسیم کر دیا تھا ۔ غیاث الدین نے اس رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا ۔ ان میں سے بعض مشائخ نے تو رقمیں خود بخود واپس کر دیں ۔ لیکن شیخ نظام الدین نے عذر پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس رقم میں سے میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے[3] ۔

سلطان محمد بن تغلق نے اپنے تدبر اور دور اندیشی سے برصغیر میں اسلام اور اسلامی سلطنت کی توسیع اور استحکام کے منصوبہ کے تحت دیوگیر کو ایک ذیلی دارالخلافہ بنایا ۔ تا کہ تبلیغ و ہدایت کے ذریعہ اسلام کے احیاء و بقا کا کام انجام دے ۔ موصوف کا مقصد یہ تھا کہ جن مقامات پر مسلم آبادی کم ہے وہاں پر علماء و مشائخ کے ذریعہ تبلیغ و ہدایت سے کام لے اور جو کام جہاد بالسیف کے ذریعہ ممکن نہ تھا، اس کو رشد و ہدایت کے ذریعہ ممکن بنائے، مگر بعض علماء کے عدم تعاون کی بناء پر موصوف اپنی اسکیم میں کامیاب نہ ہو سکا[4] ۔

---

1. *Some Aspects of Religion and Politics in India during the 13th Century*, p. 172.
2. Ibid., p. 173.
3. Agha Mahdi Husain, *Rise and Fall of Muhammad bin Tughluq*, London, 1948, p. 41; برنی، ''تاریخ فیروز شاہی''، ص ۶۲۰-۶۳۰
''سلاطین دہلی کے مذہبی رحجانات''، محولہ بالا، ص ۳۱۴-۳۱۵
4. *Rise and Fall of Muhammad bin Tughluq*, pp. 72-113;
''سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات''، محولہ بالا، ص ۳۴۲

عہد فیروز شاہی میں علم فقہ اور اس کی ترویج :

عہد فیروز شاہی میں فقہ کی مشہور کتاب "فتاویٰ فیروز شاہی" مولانا یعقوب کرمانی نے سلطان کے حکم سے تالیف کی - لیکن کتاب مکمل ہونے سے قبل موصوف کا انتقال ہوگیا - ان کی وفات کے بعد ایک دوسرے عالم نے (جنھوں نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا) نظر ثانی اور کچھ اضافے کے بعد اسے مکمل کیا - "ھدایہ" اور "وقایہ" کے بعد یہ کتاب بہت معتبر سمجھی جاتی ہے[1] - فقہ کی دوسری کتاب "تفسیر تاتار خانی" مولانا علاؤالدین حنفی نے مدون کی[2] -

تحریک مہدوی :

تحریک مہدوی کا فتنہ پہلی مرتبہ عہد فیروز شاہی میں ظاہر ہوا تھا مگر اسے فوراً دبا دیا گیا - ہندوستان میں اس تحریک کے بانی سید محمد جونپوری ہیں - عہد لودھی میں یہ تحریک عوامی شکل اختیار نہ کرسکی مگر عہد سور میں اس نے ایک عوامی تحریک کی شکل اختیار کی[3] -

عہد زیر بحث میں علماء کے کردار کا خلاصہ :

عہد ما قبل کی طرح عہد سلاطین میں بھی علماء حق موجود تھے - ہر دور میں علماء حق کا کردار ممتاز اور مثالی رہا ہے - علماء حق ، حق بات یا جس امر کو شرع کے مطابق صحیح خیال کرتے تھے اس امر کے اظہار کرنے میں کوئی عار یا جھجک محسوس نہ کرتے تھے - نیز سلاطین وقت کے غیر شرعی اعمال و افعال پر بے لاگ تنقید و تبصرہ کرتے رہتے تھے - اس کے علاوہ اس عہد میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو درباری زندگی کو شرک سمجھتا تھا اور سلاطین سے درباری طرز کی زندگی کو ختم کرنے کا مطالبہ کرتا

---

۱ - [ایضاً ، ص ۳۹٦ [ڈاکٹر قریشی صاحب نے اس کتاب کے مصنف کا نام "یعقوب کرانی" لکھا ہے ؛ *The Administration of the Sultanate of Delhi*, p. 18.]

۲ - "سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات" ، محولہ بالا ، ص ۳۹۷؛ شیخ محمد اکرام ، "آب کوثر" ، لاہور ، ص ۸۵ ؛

[نوٹ - ڈاکٹر ریاض الاسلام صاحب نے اس کتاب کا مصنف "مولانا انداپتی" کو بیان کیا ہے]

Dr. Riazul Islam, *Medieval India Quarterly*, Aligarh, July 1950, V. 1, No. 1, p. 32].

3. S. A. Rizvi, "Mehdi Movement in India", *Medieval India Quarterly* July 1950, V. 1, No. 1, pp. 11-32.

"سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات" ، محولہ بالا ، ص ۳۴۷-۳۴۸

تھا[1] - کچھ علماء ہنود کو ذمیوں کے حقوق دینے میں متفق تھے اور بعض علماء ہندوؤں کو ذمیوں کے حقوق دینے کے خلاف تھے - نیز ہندوؤں کے ساتھ سماجی روابط بڑھانے کے موید تھے - کچھ علماء اور فقہاء سماع بند کرنے کے طالب تھے ، جب کہ صوفیاء اور ان کے ہم نوا عوام سماع کے حق میں تھے - کچھ علماء چاہتے تھے کہ سلاطین فلسفہ سے دور رہیں[2] -

علماء حق کے علاوہ علماء سوء کا بھی ایک بہت بڑا طبقہ موجود تھا - رضیہ سلطانہ کی غیر شرعی نامزدگی اور سلطان کیقباد کو اہم اسلامی فرائض کی ادائیگی سے شرعی رخصت علماء کے جمود اور سکوت کی بیّن علامات ہیں - ان غیر شرعی امور پر کسی عالم کا تبصرہ یا تنقید راقم کی نظر سے نہیں گزرا -

مندرجہ بالا شواہد کے باوجود یہ امر اپنی جگہ مسلّم ہے کہ کوئی ایسی تحریری دستاویزات موجود نہیں جن سے یہ پتا چل سکے کہ سلاطین نے شرع کے نفاذ میں خلل ڈالنے کے لیے اپنا کوئی اثر و رسوخ استعمال کیا ہو یا علماء کے فیصلوں کو نظر انداز کیا ہو - بقول ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اگر علماء کو متہم ٹھہرایا جا سکتا ہے تو وہ صرف یوں کہ علماء نے فقہ کے سلسلے میں اجتہاد سے کام نہیں لیا اور اپنی تعمیری اور تخلیقی صلاحیتوں کا صحیح استعمال نہیں کیا[3] - مندرجہ بالا تمام حقائق کے باوجود یہ دور اسلامی شعائر کو قائم رکھنے میں علماء کا مرہون منت ہے -

فصل سوم

علماء کی سیاسی اور دینی خدمات عہد سور اور عہد مغلیہ میں :

بابر کی زندگی کے دو اہم واقعات سے علماء کے قریبی تعلقات کا پتا چلتا ہے - اول یہ کہ اند جان میں مولانا قاضی اند جان نے دشمنوں کا سد باب کرنے کے لیے بابر کو قلعہ میں محصور کر کے دشمنوں کی چالوں کو ناکامیاب بنا دیا - دوسرا واقعہ رانا سانگا کی کثیر فوج کے پیش نظر بابر نے شیخ زین الدین صدر الصدور کے سامنے اللہ سے اپنے گناہ کبائر (شراب نوشی اور داڑھی منڈوانے وغیرہ) سے آئندہ کے لیے توبہ کی اور بعد میں اپنی توبہ پر قائم بھی رہا[4] -

---

۱ - ''سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات'' ، محولہ بالا ، ص ۲۱-۲۳

۲ - ایضاً ، ص ۲۳

3. *The Administration of the Sultanate of Dehli*, p. 176.

۴ - ''منتخب اللباب'' ، حصہ اول ، ص ۶۱-۸۲

بابر کا جانشین ہمایوں تھا ۔ اس کی بیشتر زندگی جنگ و جدال اور سیاسی عدم استحکام میں گزری ۔ تاہم ہمایوں علماء کا قدردان تھا ۔ بادشاہ نے مولانا عبداللہ سلطان پوری کو ان کے تبحر علمی کی بناء پر شیخ الاسلام کا لقب دیا تھا[1] ۔

علماء اور تحریک مہدوی :

ہندوستان میں مہدوی تحریک کے بانی سید محمد جون پوری کے دو متشدد معتقدین شیخ عبداللہ لیازی اور شیخ علائی اس تحریک کے روح رواں تھے ۔ یہ دونوں بزرگ بڑے راسخ العقیدہ اور مستقل مزاج تھے ۔ چنانچہ مہدویت کی تبلیغ و اشاعت بڑے جوش و خروش کے ساتھ کرتے تھے ۔ اگر معاملہ تبلیغ و اشاعت کی حد تک محدود رہتا تو علماء سے ان کا ٹکراؤ نہ ہوتا اور کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش بھی نہ آتا ۔ مگر انہوں نے شرع کے معاملات میں معمولی معمولی اور غیر اہم باتوں میں بھی جبر و اکراہ سے کام لینا شروع کیا ۔ چنانچہ علماء عصر نے ان کے بے دینی عقائد (مہدویت) کی بناء پر ان کے قتل کرنے کا فیصلہ صادر کیا[2] ۔

سلیم شاہ سوری ، نیازی کو سزا دینے کے لیے بیانہ (بھرت پور) گیا ۔ شیخ علائی کو بھی طلب کیا ۔ شیخ کا برتاؤ آداب دربار کے خلاف تھا لہذا ان کو سزا دی مگر وہ بچ گئے ۔ شیخ نیازی نے صحت یاب ہونے کے بعد مہدویت سے تعلقات منقطع کر کے توبہ کر لی ۔ شیخ علائی نے توبہ نہ کی تو انھیں کوڑوں کی سزا دی گئی اور وہ مر گئے[3] ۔

علماء کا کردار اور اکبر کے عقائد میں تزلزل :

اکبر ابتدا میں راسخ العقیدہ مسلمان اور علماء کا قدردان تھا ۔ بقول ڈاکٹر شیخ محمد اکرام ، کئی ہندوؤں کو ڈرا دھمکا کر اپنے بزرگوں کے دین پر لایا تھا[4] ۔ اکبر

---

۱ ۔ ''منتخب التواریخ'' ، ص ۲۳۱-۲۶۹

[نوٹ : (۱) شیخ زین الدین وفائی نے فقہ حنفی کی کتاب ''فتح مبین'' کی شرح لکھی اور اس کا نام ''شرح مبین'' رکھا ۔ (۲) مولانا عبداللہ سلطان پوری عہد سلیم شاہ سور اور عہد اکبر میں مخدوم الملک جیسے ممتاز عہدہ پر فائز رہے ۔ ''منتخب التواریخ'' ، حاشیہ نوٹ ، ص ۲۶۹]

2. *Ulema in Politics*, pp.37-39; *Medieval India Quarterly*, p. 11 ;
''منتخب التواریخ'' ، ص ۲۷۳-۲۷۴

۳ ۔ ایضاً ، ص ۲۷۵ ؛ ''رود کوثر'' ، طبع چہارم ، ص ۳۲

۴ ۔ ''رود کوثر'' ، طبع چہارم ، ص ۹۳

کو گمراہ کرنے میں ان علماء کا زیادہ حصہ تھا جو سابقہ حکومتوں میں حکمرانوں کی سرپرستی سے مستفیض اور بہ حیثیت حاکم دوسروں پر حکم چلانے کے عادی تھے ۔ ان علماء نے مہدویت کی مخالفت سے پیدا ہونے والے حالات اور عوامل سے بھی چشم پوشی کی اور مستزاد یہ کہ علماء آپس میں ہی ایک دوسرے کی تحقیر ، تضحیک و تنقید کرتے تھے[1] ۔ اکبر کو گمراہ کرنے میں علماء کرام کا بھی بہت بڑا حصہ شامل تھا ۔ یوں تو دیگر علل و اسباب بھی بہت سے ہیں ، مگر سب سے بڑا سبب عبادت خانہ میں تعدد ازدواج پرملا عبدالقادر بدایونی کا بحث چھیڑنا تھا ۔ اس مسئلے پر علماء میں اختلاف پیدا ہوا ۔ نیز شیخ مبارک ناگوری نے اکبر کو امام وقت اور مجتہد روزگار قرار دینے کے سلسلے میں اگست ۱۵۷۹ء میں محضر طلب کیا اور اکبر کو امام عادل تسلیم کرا دیا[2] ۔

شیخ احمد سرہندی اور دربار جہانگیری :

اکبر کی وفات کے وقت راسخ العقیدہ علماء اور امراء طاقتور ہوگئے تھے ۔ کہا جاتا ہے کہ راسخ العقیدہ گروہ نے جہانگیر سے یہ وعدہ لیا تھا کہ وہ ان اسلامی اداروں کو بحال کر دے گا جو اکبر کے زمانے سے معطل ہو گئے تھے[3] ۔ عہد جہانگیری میں بھی علماء سوء حسب معمول غیر شرعی اعمال و بدعات کی تائید و توثیق کرتے رہتے تھے ۔ ان بدعات اور غیر شرعی رسومات کو ختم کرنے میں مجدد نے نمایاں حصہ لیا ۔ کچھ علماء سوء نے جہانگیر سے شکایت کی کہ مجدد اپنے تئیں خلیفہ اول سے بھی افضل سمجھتا ہے ۔

---

۱ ۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ، ''برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ'' ، ہلال احمد زبیری (مترجم) ، کراچی ، ۱۹۶۷ء ، ص ۱۷۴-۱۷۵

۲ ۔ ''برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ'' ، محولہ بالا ، ص ۱۷۷-۱۷۸ ؛ ''رودکوثر''، ص ۱۰۱ ؛
Aziz Ahmad, ***Studies in Islamic Culture in the Indian Environment***, **London, 1964, p. 170.**

[اس محضر پر مخدوم الملک شیخ عبدالنبی صدر الصدور، قاضی جلال‌الدین ملتانی صدر جہان ، غازی بدخشی اور شیخ مبارک نے دستخط کیے ۔ مگر شیخ مبارک کے علاوہ دیگر علماء نے بہ جبر دستخط کیے تھے ۔ ''منتخب التواریخ''، ص ۲۷۸ ؛ *Ulema in Politics*, p. 63
اکبر نے بعض علماء کو جلا وطن کیا اور بعض کو اعلیٰ عہدوں سے سبکدوش کرکے دیگر اعتقادی علماء کو مقرر کیا اور اس طرح اس نے اپنے نئے خیال ''دین الٰہی'' کی نشر و اشاعت کی ۔ مگر وہ اس مہم میں کامیاب نہ ہو سکا ۔ راقم]

۳ ۔ ''برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ'' ، محولہ بالا ، ص ۱۹۰

چنانچہ شیخ احمد کو دربار میں طلب کیا گیا ۔ بادشاہ ، ملاقات کے وقت ہتک آمیز رویے سے پیش آیا ۔ مگر شیخ بڑی جرات و ہمت کے آدمی تھے۔ بادشاہ سے مرعوب نہ ہوئے اور سوالات کے جوابات بڑی سنجیدگی اور دلائل کے ساتھ دیتے رہے ۔ جوابات مدلل، معقول اور صحیح تھے ۔ اس لیے بادشاہ کا عتاب اور غصہ کچھ سرد ہوا ۔ اسی اثنا میں ایک ابن الوقت منصب دار نے بادشاہ سے عرض کیا کہ حضور! آپ ظل اللہ ہیں اور شیخ نے روایتی سجدہ نہیں کیا ۔ اس کے بعد بادشاہ مغضوب ہوا اور شیخ کو قلعہ گوالیار میں ۱۶۱۸ء میں نظر بند کرنے کا حکم دے دیا[1] ۔ اگلے سال آپ کو رہا کر دیا گیا ۔ رہائی کے وقت مجدد کو یہ اختیار دیا گیا کہ اگر آپ چاہیں تو وطن چلے جائیں اور چاہیں تو شاہی لشکر کے ساتھ رہیں ۔ شیخ نے اپنے بزرگ باقی باللہ کی ہدایت کے تحت فوج کے ساتھ رہنا پسند کیا ۔ چونکہ شیخ کو بادشاہ اور اراکین سلطنت سے ان کے عقائد کے متعلق گفتگو کرنے کا یہ اچھا موقع تھا ۔ آپ کا موقف تھا کہ تبلیغ و ہدایت کے ذریعہ لوگوں کو دگر اعتقادی کے راستے سے ہٹایا جائے اور صحیح الاعتقادی کی طرف لایا جائے[2] ۔ مجدد نے تبلیغ دین اور دینی امور کی اصلاح کے لیے جو کام کئے ان میں مندرجہ ذیل اہمیت کے حامل ہیں :-

۱ ۔ حکومت اور عمال سے غیر اسلامی رسومات اور بدعات کو ترک کرانے کی کوشش کی ۔

۲ ۔ علماء عصر کو قرآن و حدیث کی جانب مبذول کرایا ۔

۳ ۔ اکثر صوفیا اس وقت محی الدین ابن عربی کے نظریے ''وحدت الوجود'' کے پیرو تھے ، مجدد نے ''وحدت الشہود'' کی جانب مائل کیا ۔ نیز تصوف اور سلوک کی اصلاح کر کے اس کی حدود متعین کیں ۔

۴ ۔ ولادت اور نبوت کا فرق واضح کرکے اس میں مدارج اور نوعیت کا فرق ظاہر کیا[3]۔

---

۱ ۔ برہان احمد فاروقی، ''حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کا نظریہ توحید''، لاہور، ۱۹۳۰ء، ص ۲۶-۳۱
[مجدد کا نام شیخ احمد الفاروقی نقشبندی تھا ۔ والد شیخ عبدالاحد معروف عالم فاضل تھے ۔ ولادت ۱۵۶۲-۱۵۶۳ء سرہند میں ہوئی ۔ والد نے علم درسی کی تعلیم مکمل کرائی ۔ سترہ سال کی عمر میں سلسلہ چشتیہ میں تربیت حاصل کی ۔ بعد کو خواجہ باقی باللہ کی زیر ہدایت نقشبندی سلسلے میں منسلک ہو گئے ۔ وفات ۱۲ نومبر ۱۶۲۴ء ہے ۔ تقویم تاریخی ، ص ۲۰۹]
[نوٹ : ڈاکٹر قریشی صاحب نے وفات ۱۶۲۶ء لکھی ہے جو خلاف واقعہ ہے -]؛
Ulema in Politics, p. 97.

2. *Ulema in Politics*, p. 96 ;
''حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کا نظریہ توحید'' ، محولہ بالا ، ص ۳۳

۳ ۔ ایضاً ، ص ۳۵-۳۶

اس طرح آپ نے اپنی کوششوں سے تصوف و غیر اسلامی تصور کو تبدیل کیا اور اسے اسلامی تعلیم کے بہت قریب کر دیا ۔ اس حیرت انگیز انقلاب کی بدولت آپ اپنی زندگی میں ہی اسلامی ممالک کے اکثر محروسات میں مجدد تسلیم کئے جانے لگے[۱] ۔

ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر کا عہد علماء ، فضلا اور قضات کے لیے مثالی تھا ۔ آپ کے دور میں عدل اور انصاف کا محکمہ کلیتاً علماء و قضات کے سپرد تھا[۲] ۔

اسلامی ہند میں عالمگیر سے پہلے اسلامی فقہ پر کوئی جامع کتاب مدون نہ تھی ۔ اس لیے موصوف نے ۱۶۶۲ء میں ماہرین فقہ کی ایک جماعت مقرر کی ۔ جس کی قیادت شیخ نظام الدین برہان پوری نے کی اور ''فتاویٰ عالمگیری'' مرتب کی ۔ یہ کتاب ۱۶۷۰ء میں مدون ہوئی اور اس پر دو لاکھ روپے صرف ہوئے[۳] ۔

فصل چہارم

مسلمانوں کے سیاسی زوال کے علل و اسباب اور علماء کا سیاسی شعور :

شاہ ولی اللہ کی ولادت ۱۷۰۳ء/۱۱۱۴ھ میں ہوئی اور شاہ عبدالرحیم کی وفات کے بعد آپ نے مدرسہ رحیمیہ کی مسند تدریس سنبھالی ۔ مدرسہ رحیمیہ میں بارہ سال تک درس دینے کے بعد مزید تحقیق کے لیے مکہ مکرمہ چلے گئے ۔ قیام حجاز میں آپ نے دیگر اسلامی سلطنتوں کے سیاسی ، معاشی اور معاشرتی حالات کا جائزہ لیا ۔ قیام حجاز میں ہی شاہ صاحب کو باطنی مشاہدے سے اس امر کا یقین ہو گیا تھا کہ ہندوستان میں ملت اسلامیہ کو اور اس کے مستقبل کو آئندہ خطرات سے محفوظ کرنا ، خدا کی جانب سے آپ پر فرض اور مقرر ہو گیا ہے ۔ اس لیے آپ نے علمی ، اصلاحی اور تعمیری

---

1. *Studies in Islamic Culture in the Indian Environment*, p. 188.

۲ ۔ ''منتخب اللباب ، محولہ بالا ، حصہ سوم ، ص ۱۹۸

۳ ۔ ''منتخب اللباب'' ، محولہ بالا ، حصہ دوم ، ص ۳۷۶-۳۷۷ ؛

4. *The Administration of Justice in Medieval India*, pp. 42, 43.

[محمد بشیر صاحب نے اس کتاب کی تدوین میں محمد جمیل ، ضیا الدین ، جلال الدین ، اور محمود حسین کے نام بیان کیے ہیں جب کہ مصنف ''تاریخ مسلمانان بھارت و پاکستان'' نے اس کتاب کی تدوین میں بیس اکیس علماء کی شرکت بیان کی ہے ۔
''تاریخ مسلمانان بھارت و پاکستان'' ، ج ۱ ، ص ۵۸۹]

پروگرام مرتب کیا[1] ۔ موصوف نے اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے دو واضح اصول مرتب کئے :

(الف) قرآن کریم کے ابدی فلسفہ حیات کے تحت انسانوں کی رہنمائی اور اصلاح و فلاح قرآنی منشا کے مطابق کرنا ۔

(ب) معاشرت ، حکومت ، ملت اور اجتماعات میں تمام اخلاقی اور عملی خرابیوں کے علل و اسباب پر غور و فکر کرنا ، معاشی اور اقتصادی عدم توازن کے اصلاح کی تدابیر سوچنا[2] ۔ آپ نے معاشرے کی تمام برائیوں کا سدباب "فک کل نظام" یعنی مکمل سیاسی ، معاشی ، اور تمدنی تبدیلی کو قرار دیا[3] ۔

شاہ صاحب نے قرآن کے اسرار و رموز کو سمجھانے کے لیے قرآن کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا ۔ کیونکہ اس وقت مسلمانوں کی عام فہم زبان فارسی تھی ۔ شاہ صاحب نے تمام برائیوں کا اصل سبب ''عدم توازن'' (معاشی و اقتصادی) میں عدم مساوات اور کمزوری کو قرار دیا ۔ آپ نے اس کا علاج یہ تجویز کیا کہ معاشرہ کا ہر فرد ملک کی تعمیر میں دیانتداری اور محنت و صلاحیت سے اپنا حصہ ادا کرے[4] ۔ شاہ صاحب نے اپنی اصلاحی تحریک میں بلا تفریق مذہب و ملت ہر شخص کے لیے بنیادی حقوق کا بحال کرنا ضروری سمجھا یعنی مکان ، لباس ، کھانا ، تعلیم اور استطاعت نکاح کو ایک حکمران کے فرائض میں قرار دیا ۔ نیز عدل و انصاف ، یکساں شہری آزادی ، ملک کے ہر باشندے کے لیے لازم و ملزوم اور ان کا حق قرار دیا[5] ۔

شاہ صاحب کا طریقہ اصلاح و انقلاب :

شاہ صاحب جہاد فی سبیل اللہ کے حامی تھے ۔ موصوف کے خیال میں یہ انقلاب پیشہ ورانہ ملازمین اور عسکری سپاہیوں کے ذریعہ نہیں آ سکتا تھا ۔ آپ نے اس پروگرام

---

۱ ۔ ''شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک'' ، ص ۳۱-۳۲ ؛
Syed Moinul Haq, *The Great Revolution of 1857*, Karachi, 1968, p. 37.

[نوٹ : شاہ صاحب نے مکہ مکرمہ میں شیخ ابو طاہر مدنی سے چودہ ماہ تک تحصیل علم کیا اور ۵ جولائی ۱۷۳۲ء کو دہلی واپس آ گئے ۔ ''شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک'' ، ص ۳۱-۳۳]

۲ ۔ ''شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک'' ، ص ۳۷

3. *Ulema in Politics*, pp. 124, 125 ; ''علماء ہند کا شان دار ماضی'' ، ج ۲ ، ص ۵-۶

۴ ۔ ''شاہ ولی اللہ اور ان کے سیاسی مکتوبات'' ، ص ۴۶-۵۳ معہ حاورق

۵ ۔ ایضاً ص ، ۱۶ ؛ ''علماء ہند کا شان دار ماضی'' ، ج ۲ ، ص ۱۱

کی تدوین کے لیے رفقاء کی ایک مرکزی جماعت تیار کی ۔ دوسری طرف اپنی تحریک کو امراء و سرداران کے حلقے میں پہنچا کر عام اور مقبول بنایا[1] ۔ اس تحریک کے زعماء میں مولانا محمد عاشق پھلتی ، مولانا نور اللہ بڈھانوی ، مولانا محمد امین کشمیری اور مولانا ابو سعید رائے بریلوی قابل ذکر ہیں ۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے کچھ دیگر علماء کا ذکر بھی کیا ہے جن کو بخوف طوالت بیان نہیں کیا جا رہا[2] ۔ شاہ صاحب کی وفات (۱۷۶۲ء) کے بعد انقلابی جماعت کی قیادت آپ کے خلف اکبر امام عبدالعزیز نے سنبھالی[3] ۔

جماعت مجاہدین کا قیام اور ان کی سیاسی سرگرمیاں :

شاہ صاحب کے مخصوص تربیت یافتہ علماء میں حسب تفصیل بالا علماء اور آپ کی اہل (اولاد) تھی ۔ امام عبدالعزیز کے تربیت یافتہ افراد میں دیگر افراد کے علاوہ سید احمد شہید بھی تھے ۔ بقول ڈاکٹر محمود حسین صاحب سید احمد کو ۱۷ ، ۱۸ سال کی عمر میں تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا ۔ بعدہ امام صاحب کے ایما پر مالوہ میں خان پنڈاری کی ملازمت کی اور بہت جلد عسکری مہارت حاصل کر لی ۔ ۱۸۱۷ء میں دہلی واپس آ گئے[4] ۔ اس کے بعد امام صاحب نے سید احمد کو بیعت کرنے کی اجازت دے دی ۔ سب سے پہلے مولانا عبدالحئی (داماد امام عبدالعزیز)اور مولانا محمد اسمٰعیل شہید، برادر زادہ امام عبدالعزیز نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی ۔ بعدۂ ملک کے اطراف و جوانب

---

۱ - ''برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ'' ، محولہ بالا ، ص ۲۴۸ ؛ ''شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک'' ، ص ۵۹

2. Board of Editors, *A History of the Freedom Movement*, Karachi. V. I, pp. 25-26

۳ - ''علماء ہند کا شان دار ماضی'' ، ج ۲ ، ص ۳۳-۳۴

[ڈاکٹر شان محمد صاحب نے شاہ صاحب کی وفات ۱۷۶۵ء لکھی ہے جو خلاف واقعہ ہے ۔ مزید برآں موصوف نے دوسری فاش غلطی مولانا عبدالعزیز کی ولادت اور وفات کے سلسلے میں کی ہے ۔ یعنی امام صاحب کی ولادت ۱۷۵۰ء اور وفات ۱۸۲۸ء لکھی ہے ۔ جب کہ امام صاحب کی ولادت ۱۷۴۶ء اور وفات ۱۸۲۴ء ہے ۔ حیرات ہے کہ موصوف کو اس مقالہ پر علی گڑھ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی ہے ، جب کہ مشہور و معروف علماء کے سن ولادت و سن وفات تک صحیح نہیں لکھے] ؛

Shan Mohammad, *Syed Ahmad Khan : A Political Biography*, Meerut, 1969, p. 17.

۴ - ''شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک'' ، ص ۹۶-۹۹

(*A History of the Freedom Movement*, V. I, pp. 550-58, *fn.*)

سے بہت سے لوگ بیعت ہونے لگے[1] ۔ بقول ڈاکٹر قریشی صاحب ، امام صاحب نے اپنی وفات سے قبل شاہ محمد اسحق کو پارٹی کا قائد اور سید احمد شہید کو جہاد پارٹی کا امیر مقرر کیا تھا ۔ سید احمد شہید ، ۱۸۲۱ء میں حج کو چلے گئے اور ۱۸۲۴ء میں حج سے واپس ہوئے ۔ اس وقت امام عبدالعزیز فوت ہو چکے تھے ۔[2] بقول مولانا سندھی سید احمد شہید کو جہاد پر جانے سے قبل دہلی گروپ نے ، جن میں زیادہ تر غیر تربیت یافتہ افراد تھے ، پارٹی کا امیر المومنین منتخب کر لیا تھا ۔ جس کے نتیجے میں امام صاحب کی بنیادی پالیسی کمزور ہو گئی ۔ جس کے تحت مولانا اسحٰق کو امیرالمومنین منتخب کیا گیا تھا ۔ اس کی بنا پر تحریک کے بنیادی اور اساسی خیالات کو عملی جامہ پہنانے میں بڑا دھکا لگا[3] ۔

امام عبدالعزیز کے چند اہم فتاویٰ :

عالمگیر کی وفات کے بعد ہندوستان میں سرعت کے ساتھ یکے بعد دیگرے سیاسی تبدیلیاں ہوتی رہیں ۔ دولت مغلیہ روز بروز زوال پذیر ہوتی گئی ۔ ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی کے بعد انگریزوں کا غلبہ و اقتدار بڑھتا گیا ۔ ۱۷۹۹ء میں سلطان ٹیپو کی وفات کے بعد دکن پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور ۱۸۰۳ء میں دہلی بھی کمپنی کی گرفت میں آ گئی ۔ اب انگریزوں نے اپنی عیاری سے عوام کو گمراہ کرنا شروع کر دیا ۔ مگر شاہ ولی اللہ کے تربیت یافتہ افراد پر ان کا اثر نہ چل سکا ۔ ان حالات کے پیش نظر امام عبدالعزیز نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے دیا ۔[4] امام صاحب نے ایک دوسرا فتویٰ بھی صادر کیا ۔ جس کے تحت مغربی زبان کی تعلیم اور انگریزوں کی ملازمت کو جائز قرار دیا ۔ بشرطیکہ اس تعلیم کا مقصد مفید اور حصول علم ہو اور ملازمت سے اسلام اور شریعت اسلام کے بیان کرنے میں ان کی ملازمت مزاحم یا حائل نہ ہو ۔[5]

---

۱ ۔ ''موج کوثر'' ، ص ۱۶ ؛ ''مولانا عبیداللہ سندھی : حالات زندگی ، تعلیمات و سیاسی افکار'' ، ص ۳۳۳

۲ ۔ ایضاً ، ص ۳۳۳ ؛ *Ulema in Politics*, p. 216

۳ ۔ ''شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک'' ، ص ۱۰۱ مع حاورق ؛ *Ulema in Politics*, p. 216

۴ ۔ ''علمائے ہند کا شان دار ماضی'' ، ج ۲ ، ص ۸۵
[مولانا محمد میاں نے اس فتویٰ کا سن ۱۸۰۶ء لکھا ہے ۔]

۵ ۔ ''برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ'' ، ص ۲۰۱ ؛ *The Great Revolution of 1857*, p. 28

سید احمد شہید اور تحریک جہاد :

شاہ ولی اللہ کی حیات میں مرہٹوں نے اور امام عبدالعزیز کی حیات میں سکھوں نے مسلمانوں پر ناقابل بیان مظالم ڈھائے ۔ امام صاحب نے سید احمد کو تحریک جہاد کا کام سونپا ۔ سید احمد نے حج سے واپسی کے بعد ۲۱ دسمبر ۱۸۲۶ء سکھوں کے خلاف جہاد کی تاریخ مقرر کر دی ۔[1] سید صاحب بڑا طول طویل راستہ طے کرکے مقام جہاد پہنچے ۔ ابتداء میں آپ کو بڑی کامیابی ہوئی ۔ سکھوں نے سازش کرکے امیر پشاور یار محمد خاں کے ذریعہ آپ کو زہر دلوایا مگر آپ بال بال بچ گئے ۔ اسی درمیان میں پشاور پر قبضہ ہوگیا اور یار محمد خاں مارا گیا ۔ ۲۳ فروری ۱۸۲۸ء کو مولانا عبدالحئی کا انتقال ہوگیا[2] ۔

پشاور پر قبضہ کے بعد مجاہدین نے شرعی عدالتیں قائم کیں ۔ لیکن رؤسا اور سرداروں کی مخالفت کی بنا سے اس پر عمل دخل نہ ہو سکا ۔ مقامی لوگوں میں نفرت و حقارت اور عناد بہت بڑھ گیا اور نوبت قتل و غارت گری تک پہنچی ، یہاں تک کہ ان شقی القلبوں نے قضات ، ائمہ ، خطباء اور مجاہدین کو نمازوں میں قتل کر دیا ۔ چنانچہ سید احمد نے اپنا صدر مقام تبدیل کرکے پہلے راج دواری اور پھر بالا کوٹ کو منتخب کیا ۔[3] مجاہدین بالا کوٹ میں تھے کہ ایک غدار مسلمان نے بغاوت کرکے مخبری کر دی ۔ سکھوں نے بے خبری میں حملہ کیا ۔ مجاہدین نے اپنا دفاع کیا مگر بے سروسامانی کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکے اور بالآخر ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو سید صاحب مولانا محمد اسمٰعیل معہ دیگر جانبازوں کے شہید ہو گئے ۔ ''انا للہ و انا الیہ راجعون'' سید صاحب کی وفات کے بعد تحریک مجاہدین ختم نہ ہوئی بلکہ ایک دوسرے مرحلے میں داخل ہو گئی ۔[4]

---

۱ ۔ ''برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ'' ، ص ۲۵۳ معہ پاورق ؛
''موج کوثر'' ، ص ۲۱-۲۵ معہ پاورق

۲ ۔ ''برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ'' ، ص ۲۵۸-۵۹ ؛
محمد جعفر تھانیسری ، ''حیات سید احمد شہید'' ، کراچی ، ۱۹۶۸ء ، ص ۲۲۸ ؛
A History of the Freedom Movement, V. I, pp. 581-82.
[مولانا عبدالحئی کی وفات سے تحریک جہاد کو بڑا نقصان پہنچا ۔ راقم]

۳ ۔ ''حیات سید احمد شہید'' ، محولہ بالا ، ص ۲۳-۳۰

۴ ۔ ''شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک'' ، محولہ بالا ، ص ۱۳۱ ؛
A History of the Freedom Movement, V. I. p. 597. ;
The Great Revolution of 1857, p. 52.
[نوٹ : سید صاحب کی شہادت کی خبر کے بعد مجاہدین نے آپ کی نعش کو بہت تلاش کیا ۔ مگر جب نہ ملی تو خیال کیا کہ آپ شہید نہیں ہوئے بلکہ روپوش ہو گئے ۔ مگر

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مختصر یہ کہ مجاہدین کی ظاہری ناکامی تو شبہ سے بالاتر ہے (جس کے علل و اسباب بخوف طوالت بیان نہیں کیے جا سکے) مگر اس کے باوجود مجاہدین نے ''جہاد فی سبیل اللہ'' اور رضائے الٰہی جو ان کا اصل مقصد و منشا تھا ، حاصل کر لیا ۔ تاہم مجاہدین ۱۸۷۰ء بلکہ اس کے بعد بھی انگریزوں سے نبرد آزما رہے ۔

تحریک کا دوسرا مقصد شاہ ولی اللہ کی تحریک احیاء و تجدید دین و اصلاح معاشرہ کی تبلیغ تھی ۔ چنانچہ عہد برطانیہ میں عیسائی مبلغین کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو مناظروں اور تقاریر کے ذریعہ سے علماء نے روکا اور اس طرح فتنہ ارتداد کی بیخ کنی کی ۔

تحریک کا تیسرا مقصد مسلم حکمرانوں کو ہندوستان میں ، اسلامی حکومت کی بقا اور استحکام کے لیے دعوت دینا تھا ۔ شاہ صاحب چاہتے تھے کہ ہندوستان میں بسنے والے ہر فرد و طبقہ کی فلاح و بہبود ہو اور ملک میں پر امن ماحول پیدا ہو تا کہ لوگ امن و امان کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں ۔[1]

عہد برطانیہ میں سید احمد شہید کی تحریک کو وہابیت کے نام سے موسوم کیا گیا ۔ حالانکہ اس تحریک کے بانیوں اور تحریک کا وہابیت سے کوئی تعلق نہ تھا ۔

بنگال میں احیاء اسلام و تحریک جہاد یا فرائضی تحریک :

اس تحریک کے بانی حاجی شریعت اللہ تھے۔ موصوف ۱۸۲۰-۱۸۲۱ء میں دوبارہ حج سے واپس آئے ۔ قیام حجاز میں آپ نے اپنے استاد شیخ طاہر سنبل (Tahir Sombal) سے تحریک شروع کرنے کی اجازت حاصل کی ۔ آپ فرائض کی ادائیگی پر بہت زور دیتے تھے اور ہندوانہ رسومات کو ترک کرا کے ، شعائر اسلام پر عمل کرانا چاہتے تھے ۔ اس لیے آپ کی تحریک ''فرائضی'' کے نام سے موسوم ہو گئی ۔ ابتدا میں یہ تحریک اضلاع ڈھاکہ ، فرید پور ، باقرگنج اور میمن سنگھ میں شروع ہوئی اور بعد میں وسیع ہوتی گئی ۔[2] آپ نے

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

تحقیق جدید سے پتا چلا ہے کہ آپ کا جسد مبارک سکھوں نے اپنے قبضے میں کر کے شیخ وزیر گولہ انداز کے لڑکے سے شناخت کرایا اور اپنی فوج کے مسلمانوں اور ملکوں سے نماز جنازہ پڑھوا کر فوجی اعزاز کے ساتھ دفنا دیا ۔ سید صاحب کی ایک کچی قبر آج بھی بالا کوٹ میں موجود ہے ۔ ''حیات سید احمد شہید'' (ص ۲۸۹)]

۱ ۔ ''شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات'' ، 'مقدمہ' از خلیق احمد نظامی ، ص ۲۱-۲۲ ؛ سر سید اور وہابی تحریک ، ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' ، ج ۶ ، نمبر ۳۹ ، ۱۸ دسمبر ۱۸۷۱ء ، ص ۷۷۸ ، ک ۱

2. Moinuddin Ahmad Khan, *A History of the Fara'idi Movement in Bengal* (*1818-1906*), part I-II, Karachi, 1965, pp. 11-12.

اسلامی احکامات پر سختی سے عمل کیا اور لوگوں کو بھی اس پر عمل کرنے کا پابند بنایا ۔ آپ کی اصلاحات اس قسم کی تھیں کہ آپ وہابی مشہور ہونے لگے ۔ آپ نے بنگال کو ''دارالحرب'' قرار دیا اور جمعہ و عیدین کے اجتماعات کو ناجائز قرار دیا مگر مسلم عوام ان اجتماعات کو جماعت کی شکل میں ہی ادا کرتے تھے ۔ اس لیے بسا اوقات اس مسئلے میں بدمزگی پیدا ہو جاتی تھی ۔ انگریزوں نے سید احمد شہید کی تحریک کی طرح اس کو بھی وہابی مشہور کیا ۔ مگر امر واقعہ اس کے خلاف ہے ۔[1]

حاجی صاحب کی وفات کے بعد آپ کے خلف محمد محسن یا محسن الدین عرف دودو میاں نے تحریک کی قیادت سنبھالی اور اس کو منظم کرکے ایک نئی روح پھونک دی ۔ دودو میاں نے اعلان کیا کہ زمین خدا کی ملکیت ہے ، اس لیے کسی کو حق وراثت حاصل نہیں ، لہذا مالیہ وصول نہیں کر سکتا ۔ یہ امر زمینداروں اور باغات کے مالکوں کو شاق گذرا ، لہذا ان لوگوں نے حکومت کی سازش سے اس تحریک کو ختم کرا دیا ۔ دودو میاں کو زہر دلوا کر ہلاک کیا گیا ۔[2]

نثار علی عرف تیتو میر کی تحریک :

تیتو میر یا تیتو میاں کی تحریک بھی ''طریقہ محمدیہ'' کی ایک اصلاحی شکل تھی اور فرائضی تحریک کی ہم شکل تھی ۔ آپ نے ندیا ، بنگال کے چوبیس پرگنوں میں اپنی تنظیم کو منظم کیا ۔ تیتو میر ۲۲-۱۸۲۱ء میں سید احمد شہید سے کلکتے میں ملے اور آپ کے مرید ہو گئے ۔ مگر یہ بات ابھی تحقیق طلب ہے کہ آپ سید احمد کے نامزد خلیفہ تھے ۔[3] آپ نے ہندو زمینداروں کے ناجائز دباؤ اور ہتک آمیز رویے کے خلاف سخت احتجاج کیا اور سختی سے مخالفت کی ۔ زمینداروں نے آپ کے خلاف معاندانہ رویہ

---

1. *A History of the Fara'idi Movement in Bengal*, pp. 60, 72 ;
''موج کوثر'' ، محولہ بالا ، ص ۵۸-۵۹
("The Fara'idis identified themselves with the Hanafi school of Law. *Ibid.*, p. 60.) [یہ عبارت ڈاکٹر معین الدین احمد خاں نے بیان کی ہے -]

2. *A History of the Freedom Movement*, V. I, pp. 548, 49 ;
''سرگذشت مجاہدین'' ، ص ۲۱۵ معہ حاروق ؛
''برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ'' ، محولہ بالا ، ص ۲۷۱
(نوٹ : مولانا غلام رسول مہر نے بحوالہ فضلی صاحب سکریٹری حکومت پاکستان یہ لکھا ہے کہ دودو میاں کو زہر دلوایا گیا تھا) ۔

3. *A History of the Fara'idi Movement in Bengal*, Part-I, p. lxi.

اختیار کیا اور شدت انتقام سے مشتعل ہو کر مسلمانوں کی داڑھیوں پر بھی ٹیکس عائد کر دیا[1] ۔ آپ کے طرز عمل سے ہندو زمیندار اور انگریز باغبان نیل برافروختہ ہو گئے اور مسلم کسانوں کو قید کر لیا ۔ ان مظلوموں نے عدالتوں سے رجوع کیا مگر عدالتوں میں کوئی شنوائی نہ ہوئی ۔ جب یہ لوگ حصول انصاف سے نا امید ہو گئے تو نارکل باریہ (Nerkul Baria) میں معز الدین کی قیام گاہ پر بانسوں کا ایک حصار قائم کیا ۔ پرگنہ کے داروغہ کو زخمی کر دیا اور گایوں کو ذبح کرکے ان کا خون مندروں میں چھڑک دیا ۔ مزید برآں ان کی پارٹی نے برطانوی اقتدار کے خاتمے کا اعلان کرکے مسلمانوں کے اقتدار کی بحالی کا بھی اعلان کر دیا ۔ آخر کار پولیس اور فوج سے دو بدو جنگ ہوئی اور ۱۹ نومبر ۱۸۳۱ء کو تیتو میر اور ان کے معتقدین کو شکست ہوئی ۔ ڈاکٹر معین الدین احمد خان نے تیتو میر کی تحریک کو مختصر تحریک کے نام سے موسوم کیا ہے ۔[2] ان بزرگوں کی جدوجہد نے مسلم عوام کو بیدار کیا اور ان تحریکات کی بدولت بیسویں صدی کے وسط میں حصول پاکستان کی جدوجہد میں دیگر علاقوں کے علاوہ بنگال اور پنجاب نے بھی نمایاں خدمات انجام دیں ۔[3]

---

1. *Ibid.*, p. lxxvi.

2. *Ibid.*, pp. lxviii-lxix-lxx-lxxi ; "موج کوثر" ، محولہ بالا ، ص ۵۹-۶۰

3. *A History of the Freedom Movement*, V.I, p. 555 ; *Ulema in Politics*, p. 181; "موج کوثر" ، محولہ بالا ، ص ۵۶ - ۶۱ ؛ "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ، محولہ بالا ، ص ۲۷۲

باب دوم

۱۸۵۷ء اور اس کے بعد ملک کے سیاسی حالات اور علماء کی جدوجہد

فصل اول

جنگ آزادی میں علماء کا سیاسی کردار اور ان کے عملی کارنامے :

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ، اہل ہند نے ملک سے بیرونی طاقت کے اخراج اور حصول آزادی کے لیے جد و جہد کی تھی ۔ عہد برطانیہ سے ، ملکی اور غیر ملکی مؤرخ اس جنگ کو بغاوت (Mutiny) کے نام سے موسوم کرتے چلے آئے ہیں جو ایک تاریخی غلطی ہے[1] ۔

جنگ آزادی کے علل و اسباب متنوع بھی ہیں اور مختلف فیہ بھی ۔ ان پر مؤرخین نے بالتفصیل بحث بھی کی ہے ۔ یہاں موضوع کی مناسبت سے ہم صرف مذہبی وجوہات سے مختصر بحث کر رہے ہیں :-

(الف) **قضات اور کمپنی کا عہد :** مغل تاجدار سے کمپنی نے عہد کیا تھا کہ ہم قضات کا عہدہ برقرار رکھیں گے ۔ ابتدا میں اس عہد پر عمل ہوتا رہا ، مگر جیسے جیسے انگریزوں کا اقتدار و غلبہ مضبوط ہوتا گیا ، ویسے ویسے اس عہد میں کمزوری اور لچک پیدا ہوتی گئی تا آں کہ ۱۸۶۵ء میں قضات کو ختم کر دیا[2] ۔

---

۱ ۔ مولانا حسین احمد مدنی ، ''نقش حیات'' ، ج ۲ ، دیو بند ، ۱۹۵۴ء ، ص ۴۸
[مولانا مدنی نے کہا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ طلب حقوق کے لیے لڑی گئی تھی] ۔

2 - Syed Moinul Haq, *The Great Revolution of 1857*, Karachi, 1968, pp. 79,80;
ڈبلیو ۔ ڈبلیو ۔ ہنٹر ، ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' (مترجم) ڈاکٹر صادق حسین ، ۱۹۴۴ء ، لاہور ، ص ۲۲۸-۲۲۹ ؛ ''فرنگیوں کا جال'' ، ص ۸۰ ۔

(ب) ایک برطانوی مؤرخ مسٹر لڈلو اور ایک دوسرے مؤرخ پروفیسر ماکس ملر (Prof. Max Muller) اور تیسرے برطانوی باشندے (Capt. Alexander Hamilton) نے علیحدہ علیحدہ بیان کیا ہے کہ جب سے ہم نے دیسی طریقہ تعلیم کو ختم کیا ہے ۔ تب سے ہندوستانی بے علم ہوتے جا رہے ہیں ۔ ملر نے سرکاری کاغذات کے حوالے سے لکھا ہے "کہ برطانیہ سے قبل بنگال میں اسی ہزار دیسی مدارس تھے" ۔ نیز کیپٹن نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ "شہر ٹھٹھہ میں عالمگیر اورنگ زیب کے زمانے میں چار سو کالج مختلف علوم و فنون کے تھے"[1] ۔

(ج) عہد سلطنت دھلی و عہد مغل میں معلمین اور متعلمین کے لیے وظائف اور عطیات دیے جاتے تھے، نیز اوقاف کی آمدنی سے مدرسین و طلباء کی مستقلاً مالی اعانت کا اہتمام تھا ۔ ۱۸۳۵ء میں اوقاف کی ضبطی سے یہ مدارس تباہ و برباد ہوگئے[2] ۔

(د) **ارتداد یا تبدیلی مذہب :** کمپنی نے شروع عملداری سے ہی پادریوں کی سرپرستی کی ۔ ان پادریوں نے مختلف طریقوں سے زرکثیر صرف کرکے لوگوں کو مرتد بنانا شروع کیا ۔ چنانچہ لوگوں کو خدشہ ہوا کہ ہمارا دین و مذہب بھی محفوظ نہ رہ سکے گا[3] ۔

(ہ) **مسلمانوں کے ساتھ نسلی امتیاز :** مسلمان عرصہ دراز سے برصغیر کے حکمران تھے ۔ مگر کمپنی کے عمال اور حکام وجہ اور بلا وجہ مسلمانوں سے ہندوؤں کے مقابلے میں ترجیحی اور عصبیت کا برتاؤ کرتے تھے[4] ۔

---

۱ ۔ اراکین مجلس قاسم المعارف ، "تعلیمی ہند" ، دیو بند، س ن ، ص ۱-۳ ، (بحوالہ تاریخ ہند)؛ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ، "اسلام کا سرچشمۂ قوت" ، (مرتبہ) شہیر نیازی ، لاہور ، ۱۹۷۱ء ، طبع دوم ، ص ۱۵

۲ ۔ "فرنگیوں کا جال" ، ص ۱۷۱؛ "نقش حیات" ، ج ۱ ، محولہ بالا ، ص ص ۱۱۲-۱۱۳؛
Board of Editors, *A History of the Freedom Movement*, Vol. 2, pt. 2, Karachi, 1960, pp. 254, 57;
"دارالعلوم دیوبند" ، ص ۱۱۳؛ (ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ، ص ۷)

۳ - Aziz Ahmad, *Studies in Islamic Culture in the Indian Environment*, London, 1964, p. 263.
"اسباب بغاوت ہند" ، ص ۲۲-۲۳ ؛ مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۱۵۲

4. *Studies in Islamic Culture in the Indian Environment*, p. 263.

(و) **چربی سے تیار شدہ کارتوس :** ان کارتوسوں میں گائے کی چربی اور سؤر کی چربی استعمال کی جاتی تھی جو ہندو اور مسلمان دونوں کے لیے قابل اعتراض تھی اس لیے یہ امر بھی دونوں قوموں کے لیے بے چینی کا سبب بنا ۔[1]

مختصر یہ کہ ۱۸۵۷ء میں ایسے حالات پیدا ہوگئے تھے کہ یہ ہنگامہ اور شورش بپا ہوئی ۔ سب سے پہلے ۱۰ مئی ۱۸۵۷ع کو میرٹھ کی فوج نے اپنے ساتھیوں کی سزا کے خلاف بغاوت کی ۔ آخر کار یہ بغاوت (جنگ آزادی) بڑھتے بڑھتے پورے ملک میں پھیل گئی ۔ اس گروہ کے افراد دھلی پہنچے اور بہادر شاہ ظفر کو ، اس کے انکار اور سیاسی معذوری کے باوجود ، بادشاہ تسلیم کر لیا اور کمپنی کی حکومت کے خاتمہ کا اعلان کر دیا ۔[2]

بہادر شاہ ظفر کو بادشاہ تسلیم کرنے کے بعد جنگ آزادی دھلی ، آگرہ ، کانپور ، مراد آباد ، شاہ جہان پور ، سہارن پور، شاملی، مظفر نگر ، میرٹھ، جھانسی ، الہ آباد ، رام پور ، لکھنؤ اور روھیل کھنڈ وغیرہ وغیرہ میں پھیل گئی ، جس میں بلا امتیاز مذھب و ملت اہل وطن نے حصہ لیا ۔ علماء کرام اور خصوصاً مسلک ولی اللہ سے وابستہ حضرات نے اس جنگ میں بھر پور حصہ لیا ۔[3]

امام عبد العزیز کی تحریک انقلاب ، جنگ آزادی سے بہت پہلے سرحد اور اس کے قرب و جوار میں شروع تھی ۔ اس تحریک کے آخری امام مہاجر مکی حاجی امداد اللہ تھے۔ ان حضرات میں سے جو لوگ دھلی میں تھے ، جامع مسجد دھلی میں جمع ہوئے اور ایک فتوئ جہاد صادر کر دیا ۔[4]

---

1. Thompson & Garratt, *Rise and Fulfilment of British Rule in India*, Allahabad. 1958, pp. 389, fn., 394.
2. S. Moinul Haq (ed.), *Memoirs of Hakeem Ahsanullah Khan*, Karachi, 1969, p. 1;
"نقش حیات" ج ۲ ، محولہ بالا ، ص ص ۳۹-۴۰
3. *The Great Revolution of 1857*, p. 46;
"نقش حیات" ج ۲ ، محولہ بالا ، ص ۴۱؛
محمد میاں ، "علماء ہند کا شان دار ماضی" ، ج ۴ ، دہلی ، ۱۹۴۷ء ، ص ص ۶۰-۶۱؛
"نقش حیات" ج ۲ ، محولہ بالا ، ص ۵۳
۴ ۔ "نقش حیات" ج ۲ ، محولہ بالا ، ص ۵۳؛
"علماء ہند کا شان دار ماضی" ج ۴ ، محولہ بالا ، ص ص ۱۹۷-۲۰۰

معدودے چند علماء نے اس فتویٰ کی مخالفت کی ۔ اس فتویٰ کے صادر ہونے کے بعد ملک میں سبز پرچم لہرانے کا بھی اعلان کر دیا گیا ۔[1]

فتویٰ جہاد پر دستخط کرنے والے علماء کے اسماء گرامی :

(۱) مولانا سید نذیر حسین ۔
(۲) رحمت اللہ ۔
(۳) مفتی صدر الدین آزردہ ۔
(۴) مفتی کریم اللہ عرف سید رحمت علی ۔
(۵) محمد ضیاء الدین ۔
(۶) عبد القادر ۔
(۷) فقیر احمد سعید دہلوی ۔
(۸) محمد میر خان یا میر محمد خان یا میر خان محمد ۔
(۹) محمد عبد الکریم ۔
(۱۰) فقیر سکندر علی ۔
(۱۱) محمد کریم اللہ ۔
(۱۲) مولوی عبدالغنی ۔
(۱۳) خادم العلماء محمد عبد الغنی ۔
(۱۴) فرید الدین ۔
(۱۵) محمد سرفراز علی ۔
(۱۶) سید محبوب علی جعفری ۔

---

1. Ziaul Hasan Farooqi, *The Deoband School and the Demand for Pakistan*, Bombay, 1963, p. 17.

[نوٹ : ڈاکٹر سیدمعین الحق نے بیان کیا ہے کہ جنگ آزادی ہند کےلیے ملک کے سربراہوں (Leaders) نے ۳۱ ، مئی ۱۸۵۷ء کی تاریخ مقرر کی تھی ۔ مگر میرٹھ کے سپاہیوں نے قبل از وقت نافرمانی کرکے جنگ کا اعلان کر دیا جس کے نتیجے میں جنگ آزادی کے رہنماؤں کا منظم اور طے شدہ منصوبہ درہم برہم ہو گیا ۔ چنانچہ یہی سبب جنگ آزادی کی نا کامیابی کا ہوا] ؛

The Great Revolution of 1857, pp. 73-75

(۱۷) ابو احمد محمد حامی الدین ۔
(۱۸) سید احمد علی ۔
(۱۹) الٰہی بخش ۔
(۲۰) محمد مصطفےٰ خان ولد حیدر شاہ نقش بندی ۔
(۲۱) محمد انصار علی ۔
(۲۲) مولوی سعید الدین ۔
(۲۳) حفیظ اللہ خان ۔
(۲۴) مولوی نور الحق عفی عنہ ۔
(۲۵) سراج العلماء ضیاء الفقہاء مفتی عدالت عالیہ محمد رحمت علی خان ۔
(۲۶) واللہ والغنی وانتم الفقراء ۔
(۲۷) حیدر علی ۔
(۲۸) سیف الرحمٰن ۔
(۲۹) سید عبد الغنی عفی اللہ عنہ ۔
(۳۰) محمد ہاشم ۔
(۳۱) یا حافظ محمد ۔
(۳۲) امداد علی عفی عنہ ۔
(۳۳) خادم شرع شریف رسول الثقلین قاضی القضاۃ محمد علی حسین[1] ۔

مندرجہ ذیل علماء نے فتویٰ جہاد پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا :

(۱) مولانا سید ظہیر حسین ۔ (۲) مولانا شیخ محمد تھانوی ۔
(۳) مولانا محبوب علی اور (۴) مولانا خواجہ ضیاء الدین ۔

آخر الذکر کے متعلق اغلب رائے یہ ہے کہ بعد میں آپ نے دستخط کر دیے تھے[2] ۔

---

۱ ۔ "علماء ہند کا شان دار ماضی" ج ۴ ، محولہ بالا ، ص ۱۹۹

۲ ۔ "فرنگیوں کا جال"، محولہ بالا ، ص ۹۵؛
"علماء ہند کا شان دار ماضی" ، ج ۴ ، محولہ بالا ، ص ص ۱۹۲-۹۷
(نوٹ : مولانا محبوب علی کو جنگ کے بعد کمپنی نے جاگیر اور سند عطا کی مگر آپ نے اسے قبول نہ کیا)؛
The Memoirs of Hakeem Ahsanullah Khan, p. 35, fn.

جنگ آزادی کے فتویٰ صادر ہونے کے بعد جنگ کا سب سے بڑا اور اہم مرکز بھی دہلی ہی تھا ۔ مگر دیگر مختلف مقامات پر بھی جہاد کے مراکز قائم ہوگئے ، جہاں علماء کرام نے جہاد حریت میں نمایاں اور مثالی کردار پیش کیا ۔[1]

فتویٰ جہاد پر دستخط کرنے والے علماء کرام کے حالات زندگی بخوف طوالت قلم بند نہیں کیے جا رہے ہیں ۔

محاذ شاملی تھانہ بھون پر علماء کرام کی جنگ آزادی :

دھلی میں فتویٰ جہاد جاری ہونے کے بعد ہندوستان کے مختلف مقامات پر جنگی مراکز قائم ہوگئے ۔ ان میں سے ایک اہم مرکز شاملی تھانہ بھون کا بھی تھا ۔ یہ مرکز حاجی امداد اللہ اور ان کے رفقاء کار نے قائم کیا تھا ۔ حاجی صاحب امام عبدالعزیز کی اصلاحی اور انقلابی پارٹی کے آخری امام تھے ۔ حاجی صاحب ، چوں کہ شاہ ولی اللہ کی تحریک سے وابستہ تھے ۔ اس لیے اس جماعت کے اکابرین و معتقدین (جو زیادہ تر علماء تھے) آپ کے حلقۂ ارادت میں جہاد کے لیے جمع ہو گئے[2] ۔ حاجی صاحب نے جنگ کی اطلاع پا کر ایک اجلاس طلب کیا ۔ اس اجلاس میں مولانا محمد قاسم نانوتوی ، مولانا رشید احمد گنگوہی ، مولانا فیض الحسن سہارن پوری ، مولانا رحمت اللہ کیرانوی ، مولانا محمد منیر اور مولانا محمد یعقوب نے شرکت کی[3]۔ اس کے بعد مولانا کیرانوی کو دھلی بھیجا گیا ۔ مولانا کیرانوی نے دھلی سے واپس آکر حاجی صاحب کو تفصیلی حالات سے آگاہ کیا ۔ لہٰذا حاجی صاحب نے اپنی جماعت کی عسکری تنظیم کی اور خود امیر جماعت مقرر ہوئے اور دیگر علماء کو مختلف شعبوں اور امور کا نگران بنایا گیا[4] ۔ شروع شروع میں

---

۱ ۔ ''نقش حیات'' ، ج ۲ ، محولہ بالا ، ص ۴۳ ؛
مفتی انتظام اللہ شہابی ، ''ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء'' ، دہلی ، س ن ، ص ۱۲

۲ ۔ ''نقش حیات'' ، ج ۲ ، محولہ بالا ، ص ص ۳۱-۳۲
مولانا مفتی عزیز الرحمن ، ''تذکرہ شیخ الہند'' ، بجنور ، ۱۹۶۵ء ، ص ۲۷؛
محمد انوارالحسن ، ''حیات امداد اللہ'' ، کراچی ، ۱۹۶۵ء ، ص ۵۱ ۔
(نوٹ : حاجی امداد اللہ خلف حافظ محمد امین (۱۲۸۳ھ/۱۸۰۸ء) میں تھانہ بھون میں پیدا ہوئے تھے ۔ آپ کا نام امداد حسین تھا ۔ لیکن شاہ محمد اسحٰق نے تبدیل کرکے امداد اللہ رکھ دیا تھا ۔ آپ کی وفات مکہ معظمہ (۱۳۱۷ھ/۱۸۹۸ء)میں ہوئی ۔ ''علماء ہند کا شان دار ماضی'' ، ج ۴ ، ص ۲۸۲ معہ حاورق)

۳ ۔ ''علماء ہند کا شان دار ماضی'' محولہ بالا ، ج ۴ ، ص ۲۹۰

۴ ۔ ایضاً ، ص ۲۹۲-۲۹۳ ؛ ''نقش حیات'' ، ج ۲ ، محولہ بالا ، ص ۴۳؛
''بیس بڑے مسلمان'' ، محولہ بالا ، ص ۹۵

مجاہدین کو بڑی کامیابی ہوئی ، حتیٰ کہ ایک موقع پر برطانوی سپاہ کا توپ خانہ بھی مجاہدین نے اپنے قبضے میں کر لیا ۔ نیز برطانوی سپاہ کو شکست دے کر تھانہ بھون اور قرب و جوار کے علاقے میں اسلامی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا ۔ اس معرکہ میں حافظ محمد ضامن حاجی صاحب کے معتمد شہید ہو گئے[1] ۔

۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو برطانوی سپاہ نے دھلی پر دوبارہ قبضہ کر لیا ۔ سقوط دھلی اور دیگر مقامات پر انگریزی سپاہ کے قبضے کی خبروں سے مجاہدین کا جوش جہاد اور عزم و ہمت پست ہونے لگے ۔ اسی درمیان میں تھانہ بھون اور شاملی پر بھی انگریزی افواج نے قبضہ کر لیا ۔ سقوط دھلی اور شاملی پر قبضہ کے بعد حاجی صاحب اور ان کی جماعت بھی منتشر ہو گئی ۔ امیر المجاہدین حاجی امداد اللہ اور کچھ رفقاء ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے اور کچھ لوگ ہندوستان میں ہی رہے ۔ جن میں سے بعض حضرات کو سزا ہو گئی اور کچھ حضرات سزا سے بچ بھی گئے[2] ۔

جنگ ختم ہونے کے بعد یوں تو انگریزوں نے تمام اہل وطن کو نشانہ ظلم بنایا مگر مسلمان اور خصوصاً علماء ان کی بربریت اور بہیمیت کا زیادہ شکار ہوئے[3] ۔

علماء اور مرکز جہاد :

دھلی اور شاملی کے مراکز کے علاوہ دیگر مختلف مقامات پر بھی مجاہدین جنگ لڑ رہے تھے ۔ ان مراکز پر بھی علماء کرام ، وطن عزیز کو آزاد کرانے کے لیے کوشاں تھے ۔

دھلی جنگ آزادی کا اہم اور بڑا مرکز تھا مگر لکھنؤ بھی اہم مراکز میں سے ایک تھا ۔ سقوط دھلی کے بعد مجاہدین آہستہ آہستہ لکھنؤ منتقل ہوتے رہے ۔ اس وقت لکھنؤ میں برجیس قدر ایک کم سن اور نا تجربہ کار شہزادہ حکمران تھا ۔ اس لیے اس کی والدہ حضرت محل نے مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی کو برجیس قدر کا سرپرست بنا لیا تھا ۔ مولانا کی صفات ، کردار اور اہلیت کا اعتراف انگریز مؤرخین نے بھی کیا ہے[4] ۔

---

1. *A History of the Freedom Movement*, Vol. 2, pt. 1, p. 303; *The Great Revolution of 1857*, p. 37,39; *The Great Revolution of 1857*, p. 380

۲ ۔ "تذکرہ شیخ الہند"، محولہ بالا ، ص ۹۳ ؛ "حیات امداد اللہ" ، ص ۶۱؛

۳ ۔ "نقش حیات" ج ۲ ، محولہ بالا ، ص ۴۷ - ۴۹ ؛ "بیس بڑے مسلمان" ، محولہ بالا ، ص ۹۵

۴ ۔ "ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء" محولہ بالا ، ص ۴۳؛
"علماء ہند کا شان دار ماضی" ، ج ۴ ، محولہ بالا ، ص ۴۶۹

دھلی کی طرح لکھنؤ میں بھی مجاھدین کی کوئی باقاعدہ تنظیم نہ تھی ۔ شاہ صاحب کی آمد پر تمام مجاھدین نے آپ کو امیرالمجاھدین تسلیم کر لیا ۔ لکھنؤ میں شیعہ سنی تعصب پہلے ہی سے تھا ۔ شاہ صاحب کی عمومی اور عوامی مقبولیت کی بناء پر تنازعہ اور زیادہ ابھر کر سامنے آنے لگا ۔ آپس کے نفاق سے مسلمانوں کو بڑا نقصان پہنچا ۔ لکھنؤ میں سخت مقابلہ کے باوجود مجاھدین کامیاب نہ ہوئے ۔ چنانچہ شاہ صاحب برجیس قدر معہ رفقاء قصبہ محمدی میں منتقل ہو گئے اور ایک عارضی حکومت قائم کر لی ۔ اس عارضی حکومت میں موزوں افراد کو محکمہ جات تقسیم کر دیے گئے[1] ۔ قصبہ محمدی میں شاہ صاحب کی حکومت کے ابھی پوری طرح قدم بھی نہ جمے تھے کہ سرکالن کیمبل (Sir Colin Campbell) نے ایک بڑی فوج کے ساتھ حملہ کیا ۔ سخت مقابلے کے باوجود شاہ صاحب کامیاب نہ ہو سکے[2] ۔ مولانا احمد اللہ شاہ کو راجہ پوائین نے جنگ کے متعلق گفتگو کرنے کا بہانہ بنا کر بلایا اور اپنی گڑھی میں محصور کر لیا اور راجہ بلدیو سنگھ نے اچانک بندوق سے حملہ کر دیا اور آپ ۱۵ جون ۱۸۵۸ء کو جائے وقوعہ پر ہی شہید ہو گئے[3] ۔

مولانا احمد اللہ شاہ کی دیانت داری ، بہادری ، خلوص اور مجاھدانہ کارناموں کا اعتراف دوست اور دشمن سب ہی نے کیا ہے ۔ دو غیر ملکی مؤرخین نے مولانا کی دیانت داری اور بہادری کے متعلق حسب ذیل رائے ظاہر کی ہے :

> "The Moulvi fought with great courage, and fully deserved this tribute from a contemporary historian : 'He had not stained his sword with assassination, he had connived at no murders ; and he fought manfully, honestly, stubbornly in the field against the strangers who had seized his country'.[4]

---

۱ ۔ "ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء"، محولہ بالا ، ص ص ۳۵ - ۳۸؛
"علماء ہند کا شان دار ماضی" ج ۴ ، محولہ بالا ، ص ۰ ۷ ۴؛
The Great Revolution of 1857, pp. 446-64.

2. *A History of the Freedom Movement*, Vol. II, pt. 1, pp. 320-21;
"غدر کے چند علماء" ، محولہ بالا ، ص ۳۱

3. *Ibid.*, pp. 320-21; "غدر کے چند علما" ، محولہ بالا ، ص ۳۱

4. *Rise and Fulfilment of British Rule in India*, p. 406.

مختصر یہ کہ جنگ آزادی کی فکری داغ بیل شاہ ولی اللہ نے ڈالی - ۱۸۰۶ء میں شاہ عبدالعزیز نے فتویٰ دار الحرب جاری کیا اور علماء کی تنظیم کی - ۱۸۳۱ء میں سید احمد شہید ہوئے۔ اس جماعت کے آخری امام حاجی امداد اللہ مکہ معظمہ ہجرت کر گئے - علماءِ کرام نے اسلامی حمیت اور استخلاص وطن کے لیے جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا - ان علماء میں سے بیشتر نے اعلاء کلمۃ الحق کی خاطر کڑی سے کڑی سزا بھی بخوشی برداشت کی ، حتیٰ کہ ان میں سے بعض نے اپنی جانِ عزیز تک قربان کر دی[۱] -

فصل دوم

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہندوستان کے سیاسی حالات مسلمانوں اور خصوصاً علماء کی بیداری اور تعلیمی تحریکات :

۱۸۵۷ء کی جنگ کے خاتمہ کے بعد ملکہ وکٹوریہ نے ۱۸۵۸ء میں کمپنی کی حکومت کو ختم کر کے برِ صغیر کو اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا اور ایک فرمان کے ذریعہ اہل ہند کو مذہبی حقوق کے ساتھ ہمہ قسم کی (جان و مال و عزت و آبرو وغیرہ) آزادی کے تحفظ کی ضمانت کا اعلان کیا - لیکن افسوس کہ اس فرمان کے بعد بھی عمل اس کے برعکس ہی ہوتا رہا[۲] -

ناکام جنگ آزادی کے بعد اہل ہند عموماً اور مسلمان خصوصاً بد حالی کا شکار ہوئے۔ مسلمانوں کے معاشی زوال میں منجملہ دیگر اسباب کے ایک سبب ان کا سیاسی انحطاط بھی تھا - یعنی پولیس ، فوج اور عدالتوں سے ان کی برطرفی اور بے دخلی ان کے

---

۱ - ''نقش حیات'' ، ج ۲ ، محولہ بالا ، ص ص ۳ - ۴ ، ۱۳۱؛

The Great Revolution of 1857, p. 52.

۲ - سید فضل حسین ، ''سیاست ہند مابعد غدر'' ، لکھنؤ ، س ن ، ص ۲

(ملکہ وکٹوریہ کا اعلان یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو سرکاری گزٹ میں شائع ہوا تھا -)

لیے سب سے بڑی نا انصافی تھی ۔ اور ان کے پرانے نظام مالیات سے انحراف صریحاً وعدہ خلافی تھی[1] ۔ اس کے علاوہ منصب قضاء کی غیر موجودگی بھی ان کے لیے بڑی نا انصافی تھی ۔ ہنٹر کی رائے کے مطابق "مسلمانوں کی بے وفا جماعت" کے ساتھ حکومت کا رویہ اس قسم کا ہونا چاہیے تا کہ اس سے نہ صرف حکومت کے انصاف کی تعریف ہو بلکہ رائے عامہ میں بھی وہ قابل ستائش ہو[2] ۔

مسلمانوں کا نئی راہیں تلاش کرنا :

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد مسلمان انتہائی پستی اور زوال سے ہمکنار تھے ۔ برِ صغیر کے موجودہ حالات کے پیش نظر ، اس وقت مسلمانوں کی کسی سیاسی یا نیم سیاسی تنظیم یا جماعت کا قیام و عمل ممکنات میں سے نہ تھا اور نہ ہی بیرون ہند دیگر اسلامی سلطنتوں میں اتنی طاقت تھی کہ وہ ہند میں مسلمانوں کے کھوئے ہوئے اقتدار کو بحال کرانے میں کوئی موثر ذریعہ بن سکیں اور نہ ہی ہندوستانی نواب و رؤساء میں اتنی طاقت تھی کہ وہ منظم و متحد ہو کر غلبہ یا اقتدار بحال کرا سکیں[3] ۔ ان حالات کا فطری تقاضا یہ تھا کہ مسلمانان ہند کوئی ایسی جامع پالیسی اختیار کریں جو موثر ہو اور حکومت اس میں مداخلت نہ کر سکے ۔ تاکہ مسلمان اپنی بد حالی اور روز افزوں تنزلی سے نجات حاصل کر سکیں ۔ چنانچہ ان حالات کے پیشِ نظر ولی اللہی مسلک کے کچھ علماء نے ایک نیا تعلیمی اور اقتصادی ڈھانچہ مرتب کرنے کا فیصلہ کیا ، تا کہ علم کی روشنی میں جہالت کو دور کیا جا سکے اور سیاسی پس ماندگی کو سیاسی بیداری میں تبدیل کیا جا سکے ۔

اسلامی مدارس اور انگریزوں کی پالیسی :

عہد مغلیہ تعلیمی اعتبار سے ایک ترقی یافتہ دور تھا ۔ جنگِ آزادی سے قبل قدیمی درسگاہوں میں سب سے بڑا اور اہم مرکز "مدرسہ رحیمیہ" دہلی میں تھا ۔ مگر ۱۸۵۷ء

---

1. C. H. Philips (Ed.), *The Evolution of India and Pakistan*, London, 1962. p. 175; "ہمارے ہندوستانی مسلمان" ، محولہ بالا ، ص ۲۳۱

۲ ۔ ایضاً ، ص‌ص ۲۸۰ - ۲۹۳

۳ ۔ "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ، محولہ بالا ، ص ۳۰۵

(ڈاکٹر سید معین الحق نے تحریر کیا ہے کہ یہ جنگ اہل ہند کی آخری فوجی جدوجہد تھی جو بیرونی طاقت سے چھٹکارا حاصل کرکے آزادی حاصل کرنے کے لیے لڑی گئی تھی ۔ "تاریخ ہند و پاکستان ؛ آخری دور" ، ص ۱۳۴)

کی جنگ آزادی کے بعد دینی درسگاہیں یا تو تباہ و برباد کر دی گئیں یا اوقاف کی بے قاعدگیوں اور بے ضابطگیوں کی وجہ سے ختم ہو گئیں[1] -

اس دور انحطاط میں مسلک ولی اللہ کے کچھ علماء نے ایک دینی مدرسہ کے قیام کی ضرورت محسوس کی - اور دیو بند میں ایک دینی درسگاہ کے قیام کا فیصلہ کیا گیا - اس مدرسہ کا نصب العین ایک طرف مسلمانوں کو دینی اقدار پر قائم و بر قرار رکھنا تھا تو دوسری طرف عیسائی مبلغین اور ہندوؤں کے مناظروں اور مقابلوں کا دلائل و براہین کے ساتھ جواب دے کر مسلمانوں کے دین اور ایمان کی حفاظت کرنا تھا[2] -

دارالعلوم دیو بند کی تاسیس اور اس کا قیام :

مدرسہ دیوبند ایک کہنہ مگر معروف مسجد چھتہ میں قائم کیا گیا - مدرسہ دیو بند کے قیام کی تاریخ اور سن کے تعین میں مؤرخین کا اختلاف ہے - اس کے سن کے تعین اور اس کے متعلق حوالہ جات مقالے کے تعلیقہ میں پیش کیے گئے ہیں - تا ہم معاصرانہ مواد سے یہ بات خود بخود متعین ہو جاتی ہے کہ اس مدرسہ کا قیام ۱۵ محرم الحرام ، ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء کو ہوا[3] -

بانی دارالعلوم دیوبند اور اختلاف آراء :

اکثر و بیشتر مؤرخین ، مولانا محمد قاسم نانوتوی کو اس مدرسہ کا بانی تسلیم کرتے ہیں ، مگر مولانا مفتی عزیز الرحمان مصنف "تذکرہ شیخ الہند" اس امر میں دیگر مؤرخین سے متفق نہیں ہیں - آپ کے خیال میں حاجی محمد عابد حسین صاحب اس مدرسہ کے موسس و بانی ہیں[4] - البتہ یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ سید عابد حسین نے سب سے پہلے اس مدرسہ کے لیے چندہ جمع کیا - دوسرے دن مولوی محمد قاسم نانوتوی کو مدرس کی خدمات کے لیے تحریر کیا - مولوی محمد قاسم نے مدرسی کے لیے مولوی محمود صاحب کی خدمات

---

۱ - "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، محولہ بالا ، ص ۱۸٦

۲ - "بیس بڑے مسلمان" ، محولہ بالا، ص ص ۳۱ - ۳۲؛

The Deoband School and the Demand for Pakistan, pp. 23-25.

۳ - "اخبار سائنٹفک سوسائٹی" ، علی گڑھ ، جولائی ۱۸٦۷ء ، ج ۲ ، نمبر ۲۹ ، ص ۳٦۱ ، ک ۱ ؛

"القاسم" ، ذی قعدہ ۱۳۳۰ھ ، ص ص ۱۸ - ۱۹

(اس رسالہ میں مدرسہ ہذا کی پہلے سال کی آمدنی اور ۱۲۸۳ھ کی آمدنی ۱۵۳۰ روپے بیان کی گئی ہے - "القاسم" ، ص ص ۱۸-۱۹)

۴ - "تذکرہ شیخ الہند" ، محولہ بالا ، ص ص ۱۳۹ - ۱۴۰ -

حاصل کیں ۔ بعد ازاں مدرسہ کی تعمیر و توسیع کے لیے مولانا نانوتوی نے ایک جامع منصوبہ تیار کیا اور دیوبند سے باہر ایک قطعہ زمین اس کی عمارت کے لیے حاصل کر کے ۱۸۷۶ء میں موجودہ درسگاہ کی بنیادیں قائم کیں[1] ۔

مدرسہ کا نصاب اور مدت تعلیم :

سرسید کی رائے میں مولانا محمد قاسم نانوتوی دور رس اور روشن خیال عالم تھے ۔ مولانا نے طلباء کے لیے تفسیر ، حدیث ، فقہ اور اصول فقہ کو اسلامی علوم کے حصول کے لیے ضروری خیال کیا ۔ نیز قرآن و سنت کی تعلیم پر زیادہ زور دیا ۔ ان علوم کی تکمیل کے لیے چھ سال کی مدت کو مناسب خیال کیا ۔ مولانا کی رائے میں دینی علوم کے علاوہ سائنسی و صنعتی علوم کا حاصل کرنا مانع اسلام نہیں تھا ۔ مولانا نانوتوی کے بعد مولانا گنگوھی مدرسہ کے سربراہ ہوئے ۔ آپ نے فلسفہ کی تعلیم کو نصاب سے خارج کر دیا[2] ۔

مدرسہ میں طلباء کی تربیت :

مدرسہ دیو بند میں تکمیل تعلیم کے ساتھ ساتھ ہر طالب علم کے لیے فزیکل ٹریننگ (جسمانی تربیت) بھی ضروری تھی ۔ یہ تربیت ظاہرہ اس نام سے موسوم تھی ، مگر اندرونی طور پر ایک فوجی یا نیم فوجی تربیت تھی ۔ چنانچہ لوگ اس مدرسے کو طنزاً "دارالحرب" کے نام سے موسوم کرتے تھے ۔ منجملہ دیگر شعبہ جات کے مولانا نانوتوی نے "محکمہ قضا" ہی قائم کیا تھا اور موصوف خود قاضی القضاۃ تھے[3]۔

دارالعلوم کی خدمات :

ناکام جنگ آزادی کے نو ، دس سال بعد ، بڑے پرآشوب اور نازک دور میں مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی ۔ اس وقت ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں ، مسلمانوں کے دین و

---

1. S. M. Ikram, *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*, Lahore, 1970, pp. 12-13 ; *A History of the Freedom Movement*, Vol. 2, pt. 2, p. 416 ; *The Deoband School and the Demand for Pakistan*, pp. 23, 24.

۲ ۔ "تہذیب الاخلاق" ، علی گڑھ ، یکم ذی الحجہ ۱۲۹۰ھ ، ج ۳ ، نمبر ۱۸ ، ص ۲۰۹ ، ک ۲؛

"دارالعلوم دیو بند" ، محولہ بالا ، ص ۲۳

The Deoband School and the Demand for Pakistan, pp. 30-31.

3. *Ibid*, pp. 31, 37.

مذہب پر جارحانہ اور شدید حملے ہو رہے تھے ۔ خصوصاً عیسائی مبلغین ، اسلام پر نازیبا حملے کرکے اپنی پوری قوت اور بساط کے ساتھ ہندوستان میں بھی اسپین کی تاریخ دھرا کر اسلام کی روشن شمع کو گل کر کے اپنا سکہ جمانا چاہتے تھے ۔ چنانچہ اس دارالعلوم نے ایسے مجاہدین اور مبلغین پیدا کیے ، جنھوں نے علم و عمل اور روحانیت و اخلاص سے مسلمانان ہند کی صحیح خطوط پر رہبری کی اور مناظروں و تقاریر سے عیسائی مبلغین کے سیلاب کو روکا ۔ نیز زندگی کے ہر شعبہ میں انھوں نے اپنی خدمات پیش کیں ۔ اور مخلوق خدا کو علم کے نور سے منور ، مستفید اور مستفیض کرتے رہے[1] ۔

دارالعلوم کے فضلاء اور مصنفین :

دارالعلوم دیو بند کا مخصوص انداز فکر اس ادارے کی تصانیف سے نمایاں اور ظاہر ہے ۔ اس ادارے نے اپنے صد سالہ دور میں متعدد فضلاء و مصنفین پیدا کیے ۔ ان بزرگوں کی ملکی اور ملی خدمات تاریخ ہند کے ناقابل فراموش اوراق ہیں ۔ جنھوں نے ہندوستان کی سیاسی قیادت اور حصول آزادی کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں ان میں سے مخصوص حضرات کے اسماء گرامی یہ ہیں : ''مولانا محمد قاسم نانوتوی ، مولانا رشید احمد گنگوہی ، شیخ الہند مولانا محمود حسن ، مولانا شبیر احمد عثمانی ، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا حسین احمد مدنی ، مفتی کفایت اللہ دہلوی ، اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی وغیرہ''[2] ۔

تحریک علی گڑھ :

کمپنی کے اقتدار کے ساتھ ساتھ ، ہندوستانیوں کا سیاسی اور اقتصادی زوال شروع ہوگیا تھا ۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی نے اس امر پر مہر تصدیق ثبت کر دی ۔ یعنی ملک کے اقتصادی زوال میں منجملہ دیگر اسباب کے ایک بڑا سبب یہ تھا کہ برطانوی حکومت کے قیام کے بعد دیسی صنعت و حرفت بالکل تباہ و برباد ہوگئی تھی[3] ۔ دور ہم عصر میں اس بات کی ضرورت تھی کہ مسلمانوں کو موجودہ صنعتی ، سائنسی (علمی اور

---

۱ ۔ محمد انوار الحسن ، ''حیات امداد اللہ'' ، کراچی ، ۱۹۶۵ء ، ص ۱۳ - ۱۴ ؛ ''دارالعلوم دیو بند''، ص ص ۵۱ - ۵۳

۲ ۔ ''دارالعلوم دیو بند'' ، محولہ بالا ، ص ۵۳ - ۵۵

3. M.S. Jain, *The Aligarh Movement : Its Origin and Development*, Agra, 1965, p. 4; ''اسباب بغاوت ہند'' ، محولہ بالا ، ص ۴۷؛ ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' ج ۴ ، محولہ بالا ، ص ۲۳

عملی) میدان میں آگے بڑھایا جائے ، تاکہ موجودہ وقت کے تقاضوں کو پورا کیا جا سکے۔ اللہ تعالی نے اس کام کے لیے سرسید کو بصیرت و دانائی عطا کر کے ، وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی طاقت و صلاحیت دے دی تھی ۔ چنانچہ اس کام کے لیے سرسید نے ایک مثبت اور واضح لائحہ عمل مرتب کیا[1] ۔

سر سید احمد خان :

سر سید احمد خان کے ننھیال اور ددھیال کے اکثر افراد عہد مغلیہ اور عہد کمپنی میں ممتاز عہدوں پر فائز رہے تھے ۔ آپ کی تعلیم قدیم طرز کے مدرسوں میں ہوئی ۔ خصوصاً مدرسہ امام عبدالعزیز اور مدرسہ مظہر جان جاناں سے آپ نے فیض حاصل کیا[2] ۔ سرسید کی خدمات اور ان کے علمی و عملی، سیاسی اور ملکی کارنامے بہت طول طویل ہیں جن کو ہم اپنے مختصر مقالہ میں پیش کرنے سے قاصر ہیں ۔ البتہ اس جگہ یہ بات بتلانا ضروری ہے کہ علماء کے ساتھ موصوف کے تعلقات کیسے تھے ؟ تاکہ اس مغالطہ کا ازالہ ہو سکے جس کے پیش نظر عام تاثرات یہ ہیں کہ علماء نے سر سید کی تعلیمی پالیسی کی مخالفت کی تھی ۔ حالاں کہ تحقیق کے پیش نظر یہ بات صحیح نہیں ہے ۔

سرسید اور علماء کی مخالفت :

بیشتر مؤرخین نے عام طور پر عوام و خواص میں یہ تاثر پیدا کیا ہوا ہے کہ علماء نے سر سید کی تعلیمی پالیسی کی مخالفت کی تھی ۔ در اصل علماء نے سر سید کی مخالفت کے سلسلے میں جو مؤقف اختیار کیا تھا اس کے تین اہم پہلو حسب ذیل ہیں :۔

(ا) سر سید کی تعلیمی پالیسی ،

(ب) سر سید کے مذہبی افکار ، اور

(ج) سر سید کے سیاسی افکار ۔

موضوع کی مناسبت سے اس مقام پر سر سید کی تعلیمی پالیسی اور مذہبی افکار زیر بحث ہیں ۔ راقم کی تحقیق اور جستجو کے باوجود کوئی ایسا مستند مواد حاصل نہ ہوسکا جس کی بنا پر اس عام تاثر کی تصدیق ہو سکے کہ علماء نے بالعموم سر سید کی مخالفت کی۔ غور طلب امر یہ ہے کہ جن لوگوں نے سر سید کی تعلیمی پالیسی کی مخالفت کی وہ واقعی

---

۱ ۔ "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ، محولہ بالا ، ص ص ۳ ۔ ۴ ۔ ۵

2. *A History of the Freedom Movement*, Vol. 2, pt. 2, pp. 451-55.

"موج کوثر" ، محولہ بالا ، اشاعت ہفتم، ص ص ۷۸ ۔ ۸۰

عالم تھے بھی یا نہیں ، اور جن علماء نے سرسید کی مخالفت کی تو وہ کس بنا پر کی - یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ۱۸۰۶ء میں سرسید کی تحریک سے ستر سال قبل، امام عبدالعزیز نے فتویٰ صادر فرما کر انگریزی تعلیم کا حصول مسلمانوں کے لیے جائز قرار دے دیا تھا[1] - نیز یہ کہ عصر زیر بحث میں مولانا محمد قاسم نانوتوی مدرسہ دیو بند کے سرپرست اور معروف علماء میں سے تھے - سر سید نے اپنے خط (جو "تہذیب الاخلاق" میں شائع ہوا تھا) میں اس بات کا تشکر کے ساتھ اعتراف کیا ہے کہ مولانا قاسم سائنسی اور جدید علوم کا حصول مسلمانوں کے لیے ضروری خیال کرتے تھے - مندرجہ بالا ناقابل تردید حقیقت کی موجودگی میں علماء کا سر سید کی تعلیمی پالیسی سے عمومی مخالفت کرنا بعید از قیاس ہے[2] -

دوسرا سوال یہ ہے کہ وہ کون عالم تھے جنھوں نے سر سید کی تعلیمی پالیسی کی مخالفت کی - اس کا جواب مولانا حالی نے یہ دیا ہے کہ "سر سید کے مخالفین میں دو سرکاری ملازم ، مولوی امداد علی ، ڈپٹی کلکٹر کان پور اور مولری علی بخش خان ، سب جج گورکھپور پیش پیش تھے -" اول تو ان کا عالم دین ہونا مشتبہ ہے ، دوم مولانا حالی نے خود یہ اعتراف کیا ہے کہ ان اصحاب کی تحریریں اور مخالفت کا باعث کوئی مذہبی جوش اور دینی حمیت نہ تھی بلکہ سر سید سے ان کی مخالفت ذاتیات پر مبنی تھی[3] -

اصل میں سر سید سے علماء کے نزاع کا سبب سر سید کی تعلیمی پالیسی نہ تھی بلکہ ان کے مذہبی افکار تھے - یہ افکار و رجحانات "تہذیب الاخلاق" میں ان کے مضامین شائع ہونے کے بعد منظر عام پر آئے - یہ رسالہ ۱۸۷۰ء میں جاری ہوا تھا - اس رسالے میں سر سید کے کچھ مضامین اسلام کے مروجہ بنیادی عقائد کے خلاف شائع ہوئے تھے - علماء نے ان مضامین کو اسلام کے خلاف خیال کرتے ہوئے سر سید کے مذہبی افکار کی مخالفت کی[4] -

---

۱ - "اسباب بغاوت ہند"، محولہ بالا، ص ص۲۰ - ۲۱
"علماء ہند کا شاندار ماضی" ، ج ۴ ، محولہ بالا ، ص ص ۳۹

۲ - "تہذیب الاخلاق" ، علی گڑھ ، یکم ذی الحجہ ۱۲۹۰ھ ، ج ۴ ، نمبر ۸ ، ص ۲۰۹ ،ک ۲

۳ - خواجہ الطاف حسین حالی ، "حیات جاوید" ، حصہ دوم ، طبع ثانی ، ص ص ۲۲۶

۴ - "حیات جاوید" ، حصہ دوم ، محولہ بالا ، ص ص ۲۱۸ - ۲۲۷

(نوٹ : علی گڑھ کالج کی مخالفت میں جو بھی مضامین شائع ہوئے ان میں یہ کہیں نہیں لکھا تھا کہ انگریزی پڑھنا کفر ہے ، بلکہ یہ لکھا تھا کہ جس شخص کے عقائد اسلام کے مروجہ بنیادی اصولوں کے خلاف ہوں ، اس شخص کی مدد و اعانت کرنا جائز و درست نہیں -)

"موج کوثر" ، محولہ بالا، بار ہفتم ، ص ص ۹۱ - ۹۲؛

Syed Ahmad Khan : A Political Biography, pp. 73, 99.

مولوی وحید الدین سلیم نائب مدیر "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" نے بھی اس بارے میں وضاحت سے روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ "ابتدا میں کالج کی مخالفت کا سبب یہ غلط فہمی تھی کہ علماء کرام ، سر سید کے بعض مذہبی عقائد کو اسلام کے خلاف سمجھتے تھے اور ان کے نزدیک سر سید کے عقائد کی تعلیم علی گڑھ کالج میں ہوتی تھی - مگر رفتہ رفتہ جیسے جیسے حالات معلوم ہونے لگے یہ مخالفت کم ہوتی گئی[1] -

سرسید اور علماء کا تعاون :

سرسید کی تعلیمی پالیسی کو کامیاب بنانے میں مولوی سمیع اللہ خان سرفہرست ہیں - موصوف کے علاوہ مولانا الطاف حسین حالی ، مولانا شبلی نعمانی ، محسن الملک ، مولوی مہدی علی خان اور نواب وقار الملک مشتاق حسین وغیرہ ہیں - اول الذکر دونوں حضرات علماء کے زمرہ میں شامل ہیں[2] -

مولانا شبلی نعمانی :

مولانا شبلی ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ کالج میں بہ حیثیت نائب پروفیسر مقرر ہوئے - اسی درمیان میں آپ کی ملاقات پروفیسر آرنلڈ سے ہوئی اور آپ نے فرنچ زبان سیکھی[2] - ابتدا ہی سے مولانا کی زندگی کا مقصد علمی خدمات تھا - آپ نے ۱۸۸۳ء میں اعظم گڑھ میں ایک نیشنل اسکول قائم کیا - یہ مدرسہ ۱۸۸۷ء میں مڈل اسکول ہوگیا - اس کے بعد آپ نے اسلامی تاریخ پر متعدد کتابیں لکھیں - مثلاً "المامون" ، "سیرۃ النعمان" ، "الفاروق" ، اور "الغزالی" وغیرہ[3] -

---

۱ - "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" ، علی گڑھ ، ۳۰ جنوری ۱۹۰۷ء ، ص ۳ ، ک ۲

2. *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*, pp. 73-100.
A History of the Freedom Movement, Vol.2, pt. 2, pp. 338-531.

۳ - مولانا سید سلیمان ندوی ، "حیات شبلی" ، اعظم گڑھ ، ۱۹۴۳ء ، ص ص ۱۱۱-۱۳۰ ؛
محمد مہدی، "تذکرہ شمس العلماء مولانا شبلی" ، بمبئی ، ۱۹۲۵ء ، ص ص ۱ - ۸
Studies in Islamic Culture in the Indian Environment, pp. 60, 250.

۴ - بقول شیخ محمد اکرام ، مولانا شبلی نے آئندہ کام کرنے والے والوں کے لیے ایک سیاسی تحریک کی بنیاد قائم کی - جس کا مقصد ایک اسلامی ریاست کا تصور تھا - مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے اس تصور کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے لیے ایک جامع اور متعین پروگرام پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا ہے - مولانا شبلی، مولانا آزاد اور مولانا مودودی ایک ہی کڑی سے وابستہ ہیں -
Modern Muslim India and the Birth of Pakistan, pp. 120, 132.

دارالعلوم ندوہ کا قیام :

دور حاضر میں دو قسم کے تعلیمی ادارے کام کر رہے تھے - ایک خالص دینوی اور دوسرے خالص دنیوی (مثلاً دارالعلوم دیو بند، فرنگی محل، خیر آباد اور مظہر العلوم وغیرہ دینی ادارے ہیں اور دارالعلوم علی گڑھ سائنسی اور علوم جدیدہ یعنی دنیوی علوم کے لیے مخصوص تھا مگر وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ایک ایسے ادارے کی ضرورت تھی جو علوم قدیم اور علوم جدید کی تعلیم بیک وقت مہیا کر سکے - لہذا اس ضرورت کے تحت مولانا محمد علی مونگیری نے علماء ہند کے سامنے ندوۃ العلماء کے قیام کا تصور پیش کیا[۱] - چنانچہ ۱۳۱۰ھ/۹۳-۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیض عام کان پور کے جلسہ دستار بندی کے موقعہ پر علماء کی مجلس مشاورت نے علماء کی ایک مستقل انجمن قائم کرنے کا فیصلہ کیا - چنانچہ ۱۳۱۰ھ/۹۳-۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیض عام میں ہندوستان کے نامور علماء (بہ استثناء اختلاف عقائد و مسلک) جمع ہوئے اور علماء کی ایک انجمن قائم ہوئی اور انجمن کا نام ''ندوۃ العلماء'' تجویز ہوا[۲] - مولانا محمد علی مونگیری کو اس کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا گیا - اس جلسے کے شرکاء میں ، شیخ الہند ، مولانا اشرف علی تھانوی ، مولانا خلیل احمد سہارن پوری ، مولانا لطف اللہ علی گڑھی کے علاوہ دیگر دس معروف علماء بھی شریک تھے - ندوۃ العلماء کا خاکہ مرتب کرنے میں مولانا شبلی کا رول بھی اہم تھا - مولانا شبلی جب ندوہ کے نگران تھے تب انہوں نے ندوہ کو اپنے خیالات کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی - موصوف ۱۹۰۵ء تا ۱۹۱۲ء دارالعلوم ندوہ کے معتمد رہے لیکن ۱۹۱۲ء میں منتظمین ندوہ سے کچھ اختلافات کی بنا پر آپ نے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا تھا[۳] -

مولانا شبلی اور دارالمصنفین اعظم گڑھ کا قیام :

مولانا شبلی نے دیگر تعلیمی اور قومی خدمات کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑا کام یہ کیا کہ ۱۹۱۴ء میں ایک انجمن ''دارالمصنفین'' (An Academy of

---

۱ - سید محمد الحسنی (رہنما و نگران) ، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی ، ''سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری (بانی ندوۃ العلماء)'' ، لکھنؤ ، ۱۹۶۴ء، بار اول ، ص ۱۱۵

A History of the Freedom *Movement*, Vol. 2, pt. 2, p. 418.

۲ - ''سیرت مولانا محمد علی مونگیری'' ، محولہ بالا ، ص ص ۱۱۵ - ۱۱۷

۳ - ایضاً ، ص ۱۱۲ - ۱۱۹

''حیات شبلی'' ، محولہ بالا ، ص ص ۳ ، ۴ ، ۵ اور ۴۱۲

(Authors) اعظم گڑھ میں قائم کی اور اپنا ذاتی بنگلہ اور نجی کتب خانہ بھی وقف کر دیا ۔ حالانکہ موصوف اس ادارے کے سرسبز ہونے سے پہلے ہی فوت ہوگئے ۔ مگر آپ کی وفات کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی نے اس ادارے کو مولانا شبلی کی خواہشات کے مطابق ترقی و عروج کی منازل سے ہم کنار کیا ۔ اس اکیڈمی کا ماہانہ رسالہ "معارف" علمی دنیا میں بڑی اہمیت اور عزت کا حامل سمجھا جاتا ہے[1] ۔

فصل سوم

انڈین نیشنل کانگریس کی تاسیس اور مسلمانوں کا رد عمل

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد اہل ہند بیرونی طاقت کے غلام ہوگئے تھے ۔ آزادی سے محرومی کے اس احساس نے اہل ہند کو سیاسی بیداری اور تنظیم نو کی طرف متوجہ کیا ۔ اس کے علاوہ ملک کے اخبارات و جرائد نے بھی سیاسی بیداری پیدا کرنے میں اہم کردار انجام دیا ۔ مزید برآں خود انگریزی تعلیم اور مغربی خیالات کا نفوذ بھی آزادی کے جذبات کو ابھارنے میں مدد و معاون ہوا[2] ۔ انگریزوں نے ہندوستان کی سیاسی بے چینی کا اندازہ لگا کر کانگریس کا قیام ضروری سمجھا ۔ چنانچہ لارڈ ڈفرن (Lord Dufferin) وائسرائے ہند کے ایماء سے ۱۸۸۵ء میں کانگریس کا قیام عمل میں آیا[3] ۔

تشکیل کانگریس سے قبل مسلمانوں کا سیاسی وجود :

کمپنی کے ابتدائی دور میں مسلمان سیاست سے الگ تھلگ رہے ۔ اس کی وجہ مغربی تعلیم سے بے اعتنائی ، اس کے حصول سے روگردانی اور فرنگی حکومت سے بے زاری تھی ۔ اس کے برعکس ہندوؤں نے ابتداء سے ہی برطانوی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا

---

1. *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*, pp. 130-31.
A History of the Freedom Movement, Vol. 2, pt. 2, p. 425.
نوٹ : (بیگم صاحبہ بھوپال نے دارالمصنفین کے قیام و ترقی میں خاطر خواہ مالی اعانت کی ۔ "حیات شبلی" ، محولہ بالا ، ص ص ۲۹۴ - ۲۹۵)
۲ ۔ مولانا محمد میاں ، "علماء حق" ، حصہ اول ، دہلی ، ۱۹۴۷ء ، ص ص ۱۰
"مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، محولہ بالا ، ص ۲۹۳
3. Syed Razi Wasti, *Lord Minto and the Indian Nationalist Movement (1905-1910)*, Oxford, 1964, p. 2.
K. K. Aziz, *The Making of Pakistan : A Study in Nationalism*, London, 1976, p. 21.

تھا ۔ کیونکہ ان کے قائدین نے شروع سے ہی ان کو مغربی تعلیم کی طرف متوجہ اور راغب کر دیا تھا ۔ انگریزی تعلیم کی بدولت ہندو انگریزوں سے قریب ہوتے گئے ۔ جب کہ مسلمان ان سے علیحدہ اور کھچے کھچے رہتے تھے ۔ مزید برآں ہندوؤں کے لیے حکومت کی تبدیلی صرف حکمرانوں کی تبدیلی تھی ، جب کہ مسلمانوں کی نظر میں بیرونی حکمران غاصب کی حیثیت رکھتے تھے[1] ۔

کانگریس کی تشکیل اور قومی بیداری :

قیام کانگریس سے قبل اور اس وقت بھی نظم و نسق کی ہر سطح پر تمام اختیارات انگریزی حکام کے ہاتھوں میں تھے اور اہل ہند کو یا ان کے نمائندوں کو عمل داری یا مشورہ میں شریک نہیں کیا جاتا تھا ۔ کانگریس نے جس قسم کے مطالبات (انتخابات اور پارلیمانی نظام حکومت) کی داغ بیل ڈالی ، اس کا انجام دور اندیش لوگوں ، خصوصاً سرسید نے بھانپ لیا تھا ۔ حالانکہ سرسید ابتدا ہی سے ہندو مسلم اتحاد کے حامی و موید تھے[2] ۔ ۱۸٦۷ء میں کچھ تنگ نظر ہنود نے زبان کا مسئلہ (اردو ہندی نزاع) شروع کیا ۔ اس نزاعی مسئلے نے سرسید کی قومی اتحاد کی امیدوں کو بڑا صدمہ پہنچایا اور اس کے بعد سے ہی سرسید نے محسوس کیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بہ حیثیت ایک قوم مل کر سیاسی اور سماجی میدان میں کام کرنا دشوار ہے[3] ۔ اس کے علاوہ ہندوؤں کی تحریکات بھی مختلف ناموں سے کام کر رہی تھیں ۔ ان تحریکات کا مقصد ، ہندو رسم و رواج کا احیاء اور ویدوں کی تعلیم کی تجدید تھی ۔ غرض یہ کہ ہندو مسلم اتحاد کی راہ میں پے در پے رکاوٹیں اور مشکلات پیدا ہو رہی تھیں[4] ۔

سرسید مسلمانوں کو ایک علیحدہ قوم سمجھتے تھے ۔ اسی کے پیش نظر ۱۸۸۳ء میں بلدیاتی اداروں میں نمائندگی کے مسئلے پر آپ نے مسلمانوں کے لیے جداگانہ نیابت اور

---

1. *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*, p. 41 ;
Lord Minto and the Indian Nationalist Movement, p. 6 ;
The Making of Pakistan, pp. 75, 77 ;
خلیق احمد نظامی ، "تاریخی مقالات" ، دہلی ، ۱۹٦٦ء ، ص ۲۷۳

۲ ۔ "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ، محولہ بالا ، ص ص ۳۲۲ - ۳۲۳
The Making of Pakistan, pp. 18, 19 ;
The Modern Muslim India and the Birth of Pakistan, pp. 38-39.

3. *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*, pp. 30-31 ;
4. *Lord Minto and the Indian Nationalist Movement*, pp. 4,5.
A History of the Freedom Movement, Vol. II. pt. II, pp. 508-9.

علیحدہ نمائندگی کا مطالبہ کیا[1] ۔ سرسید نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ عقل و بصیرت سے کام لیں ۔ نیز حکومت پر تکیہ لگا کر نہ بیٹھیں اور نہ ہی کسی دوسری قوم کے سہارے پر زندہ رہنا گوارا کریں اور خودی اور خود اعتمادی کی بناء پر اپنا مستقبل روشن اور درخشندہ بنائیں[2] ۔

سرسید کے سیاسی مسلک کے بارے میں علماء کا مؤقف :

سرسید کے خیال کے مطابق کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت نافع نہ تھی ۔ تاہم علماء میں سے کچھ حضرات نے سر سید کے سیاسی مسلک کی تائید نہ کی اور مسلمانوں کو کانگریس میں شرکت سے منع نہ کیا ۔ اس سلسلے میں عزیز الرحمٰن جامعی نے بیان کیا ہے اور جس کی تائید مولانا حسین احمد مدنی نے بھی کی ہے کہ ۱۸۸۶ء میں علماء لدھیانہ نے ''انڈین نیشنل کانگریس'' کی شرکت کے لیے ہندوستان کے مختلف صوبوں اور ریاستوں میں پھیلے ہوئے علماء سے فتاویٰ حاصل کیے ۔ ان علماء میں فتویٰ پر دستخط کرنے والے حضرات کی تعداد ایک ہزار تھی ۔ جنھوں نے بالاتفاق رائے ''مسلمانوں کی کانگریس میں شرکت'' جائز قرار دی تھی ۔ علماء کے فتاویٰ ''نصرۃ الابرار'' میں شائع ہوئے تھے ۔ ان میں صراحت کے ساتھ تحریر ہے کہ کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت جائز ہے[3] ۔

مولانا رشید احمد گنگوھی اور کانگریس :

مولانا رشید احمد گنگوھی اس وقت دارالعلوم کے امیر اور سرپرست تھے۔ کانگریس میں شرکت اور عدم شرکت کے سوال نے مسلمانوں میں ایک بےچینی کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی ۔ لہذا مسلم عوام نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے مولانا گنگوھی سے رجوع کیا ۔ چنانچہ موصوف اور مولانا محمود حسن نے کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت کو جائز قرار دے دیا ۔ ان بزرگوں کے علاوہ اندرون ملک اور بیرون ممالک کے علماء مثلاً مدینہ منورہ و بغداد شریف وغیرہ کے علماء نے بھی، علماء ہند کے اس فتویٰ کو جائز قرار دے دیا ۔ اس فتویٰ کے صادر کرنے میں علماء کا موقف یہ تھا کہ دنیاوی امور میں مسلمانوں کی شرکت

---

1. *Lord Minto and the Indian Nationalist Movement*, p. 6 ;
   Mohammad Noman, *Muslim India*, Allahabad, 1942, p. 34.
2. *Muslim India*, p. 34 ;
   A History of the Freedom Movement, Vol. 2, pt. 2, p. 526.

۳ ۔ عزیز الرحمٰن جامعی خلف مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ، ''مسلمانوں کی ڈیڑھ سو سالہ قربانیوں کا جائزہ'' ، دہلی، سن ، ص ۱۰

(نوٹ ۔ اس فتویٰ کی تمام تفصیلات رسالہ ''نصرۃ الابرار'' بابت ۱۸۹۰ھ میں درج ہیں ۔)؛ ''نقش حیات'' ، ج ۲ ، محولہ بالا ، ص ۱۰۰

ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنے میں مانع و حارج نہیں[1] -

مختصر یہ کہ کانگریس کی تشکیل اور سر سید کی سیاسی جماعتوں کے قیام کے بعد مسلمان اب ہمت و جرأت کر کے سیاسی میدان میں رفتہ رفتہ سامنے آنے لگے اور جنگ آزادی کی ناکامیابی کے بعد علماء جو گوشہ نشین یا سیاست سے کنارہ کش ہوگئے تھے وہ بھی بالواسطہ یا بلا واسطہ ملکی معاملات میں حصہ لینے لگے -

فصل چہارم

ثمرۃ التربیت کا قیام اور اس کا سیاسی پس منظر

۱۸۵۷ء سے قبل برصغیر میں سیاسی ، نیم سیاسی ، اور سماجی تحریکات نے مقامی اثرات کے تحت کام کرنا شروع کر دیا تھا - ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد اہل وطن نے اپنے عقائد اور مقامی رسم و رواج کے تحت انقلابی جماعتیں بنانا شروع کر دی تھیں - ان جماعتوں میں سے چند جو ہمارے موضوع سے مناسبت رکھتی ہیں ، حسب ذیل ہیں :-

۱- ہندوؤں نے عصبیت کی بنا پر تقریبات کی آڑ میں مسلمانوں کو پریشان اور دق کرنے کے لیے ''مذہبی میلے'' منعقد کرنے شروع کر دیے تھے - ان میں سے ایک میلہ بنام ''گنپتی میلہ'' کے نام سے بمبئی اور پونا میں منعقد کیا جاتا تھا - اس تحریک کا مقصد مسلمانوں کو سماجی طور پر پریشان کرنا تھا[2] -

---

۱ - "نقش حیات" ، ج ۲ ، محولہ بالا ، ص ۱۰۷ ؛
"مسلمانوں کی ڈیڑھ سو سالہ قربانیوں کا جائزہ" ، محولہ بالا ، ص ۱۰ ؛
"مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، محولہ بالا ، ص‌ص ۲۹۳ - ۲۹۴ ؛
"کانگریس و مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ" ، محولہ بالا ، ص‌ص ۴۰ - ۴۱
(مولانا گنگوہی کا فتوئ جس میں مسلمانوں کی شرکت کانگریس میں جائز قرار دی تھی، اس باب کے تعلیقہ میں درج کیا جا رہا ہے - راقم)

2. *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*, pp. 45-46 ;
The Making of Pakistan. p. 80 ;
"علماء حق" ، حصہ اول ، محولہ بالا ، ص‌ص ۱۱۸ - ۱۲۱

۲- ۱۸۵۷ء میں دیانند سرسوتی نے "آریہ سماج" قائم کی - جس کا مقصد ہندوؤں کو ویدانت کی قدیم تعلیم اور نظام کی طرف متوجہ کرکے مسلمانوں کے خلاف دشمنی کی فضا پیدا کرنا تھا[1] -

۳- ۱۸۸۲ء میں دیانند نے ایک انجمن بنام "تحفظ گاؤکشی" قائم کی -

۴- بینکم چندر چٹرجی (Bankim Chandra Chatterjee) ایک بنگالی ناول نویس تھے - موصوف کے تمام ناول مسلمانوں کے خلاف بغض و عناد پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتے رہے[2] -

۵- پنجاب کی تحریک جس میں پرمانند اور لالہ لاجپت رائے تھے ، اپنی ماہیت میں معتدل تھی[3] -

۶- ایک اور تحریک دہلی میں قائم کی گئی جس کے سربراہ "ہردیال" دہلوی تھے - یہ انقلابی تحریک عوامی تھی اور اس میں ہندو ، مسلم ، سکھ عیسائی وغیرہ سب ہی شریک ہو سکتے تھے[4] -

۷- ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام ملک میں سیاسی سرگرمیوں کی ابتداء کا سبب بنا -

۱۸۵۷ء سے قبل شاہ ولی اللہ کے سیاسی افکار اور امام عبدالعزیز کی تحریک انقلاب جنگ آزادی تک کسی نہ کسی شکل میں سرگرم عمل تھی - مدرسہ دیو بند ایک طرح سے ولی اللہی دبستان فکر ہی کی پیدا وار تھا - اس لیے کہ دارالعلوم کے بانیوں میں وہی علماء پیش پیش تھے جو فکری اعتبار سے ولی اللہی تحریک سے منسلک تھے - اس ادارے کے سب سے پہلے طالب علم محمود حسن تھے (آپ کا اصل نام محمود حسن تھا مگر اکثر مصنفین نے آپ کا نام محمود الحسن لکھا ہے) - موصوف نے ۱۲۹۷ھ/۱۸۷۹ء -

---

1. Khalid Bin Sayeed, *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd Ed., Karachi, 1968, p. 22 ;

"تواریخ کانگریس" ، محولہ بالا ، ص‌ص ۱۲ - ۱۳

2. Abdul Hamid, *Muslim Separatism in India : A Brief Survey*, Karachi, 1971, p. 27.

۳ - "علماء حق" ، حصہ اول ، محولہ بالا ، ص ۱۲۱

۴ - ایضاً ، حصہ اول ، ص‌ص ۱۲۱ - ۱۲۳

۱۸۸۰ء میں ایک انقلابی اور سیاسی جماعت بنام ''ثمرۃ التربیت'' قائم کی[1] ۔ مولانا نے اپنی پارٹی کا نام معنی خیز یعنی تربیت کا پھل رکھا ۔ اس پارٹی کا مقصد یہ تھا کہ مستقبل میں جب ہندوستان آزاد ہو تو حصول آزادی میں حصہ لے کر سیاسی تحریک کو کامیاب بنایا جائے ۔ نیز حصول آزادی کے سلسلے میں ہندوستان اور بیرون ہندوستان خصوصاً اسلامی ممالک سے روابط پیدا کر کے آزادی پسند ممالک کا تعاون حاصل کیا جائے ۔ چنانچہ مدرسہ دیو بند کے فارغ التحصیل طلبا کو افغانستان ، ایران ، بغداد اور عرب وغیرہ ممالک میں بھیجا گیا ۔ جنھوں نے اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے خفیہ طور پر اہم کردار ادا کیا[2] ۔ ''ثمرۃ التربیت'' نے تیس اکتیس سال تک مسلسل اور خفیہ کام کیا اور اس مدت کے تمام حالات صیغہ راز میں ہیں ۔ اس خفیہ تنظیم کا پبلک محاذ ۱۹۱۰ء میں ''جمعیۃ الانصار'' کے قیام سے عوام کے سامنے منظر عام پر آیا ۔ جیسا کہ آئندہ کی تفصیلات سے معلوم ہوگا[3] ۔

---

۱ ۔ ''القاسم'' ، ذی قعدہ ۱۳۳۰ھ/ اکتوبر ۱۹۱۲ء ، ص ۱۸ ؛
''تذکرہ شیخ الہند'' ، محولہ بالا ، ص ۱۵۲ ؛
''علماء حق'' ، حصہ اول ، محولہ بالا ، ص‌ص ۱۲۸ - ۲۹ ؛
Studies in Islamic Culture in the Indian Environment, p. 205.
(نوٹ :۔ مولانا محمود حسن خلف مولانا ذوالفقار علی ۔ ولادت ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء، وفات ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء ہے ۔ موصوف مدرسہ دیو بند کے سب سے پہلے طالب علم تھے ۔ ۱۸۷۳ء میں آپ کو سند فضیلت ملی ۔ موصوف کے والد سرکاری ملازم تھے ۔ پھر بھی انھوں نے مدرسہ دیو بند کے قیام اور توسیع میں حاجی عابد حسین صاحب کی معاونت اور مدد کی ۔ مولانا محمود حسن فراغت کے بعد بھی اس مدرسہ میں بہ حیثیت مدرس چہارم مقرر ہوئے اور اپنی وفات تک اسی ادارے سے منسلک رہے ۔ ''تذکرہ شیخ الہند'' ، ص ۵۱)

۲ ۔ ''القاسم'' ، ربیع الثانی ۱۳۳۹ھ ، ج ۱ ، ش ۹ ، ص ۹ ؛
''علماء حق'' ، حصہ اول ، محولہ بالا ، ص‌ص ۱۲۹-۱۳۰ ؛
''تذکرہ شیخ الہند'' ، محولہ بالا ، ص ۱۵۲

3. *The Deoband School and the Demand for Pakistan*, pp. 56-57 ;
''القاسم'' ، شوال ۱۳۳۰ھ ، ص ۱۴ ؛
(نوٹ :۔ ضیاء الحسن صاحب نے ''جمعیۃ الانصار'' کا قیام ۱۹۰۹ء میں لکھا ہے مگر اصل میں یہ جماعت ۱۹۱۰ء میں قائم ہوئی ۔ نیز شیخ محمد اکرام نے ۱۹۰۶ء میں اس کا قیام بیان کیا ہے اور اس جلسہ میں صاحبزادہ آفتاب احمد خان کی شرکت بیان کی ہے ۔ مگر یہ سن بھی خلاف تحقیق ہے ۔)
Modern uslim India and the Birth of Pakistan, p. 114 ;
The Deoband School and the Demand for Pakistan, p. 56 ;
''القاسم'' ، ربیع الثانی ۱۳۲۹ھ ، ج ۱ ، نمبر ۹ ، ص ۹

جمعیۃ الانصار کا قیام اور اس کے مقاصد :

مولانا محمود حسن کی تحریک "ثمرۃ التربیت" عرصہ تیس سال سے خفیہ مگر عملی کام کر رہی تھی ۔ مگر اصل میں یہ تحریک امام عبدالعزیز کی تحریک انقلاب سے منسلک اور اس تحریک کا نتیجہ تھی ۔ موصوف نے اب اس بات کو محسوس کیا کہ اس تحریک کو عوام سے روشناس کرایا جائے تاکہ عوام و خواص اس میں نمایاں حصہ لے سکیں ۔ چنانچہ موصوف نے ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۲۷ھ/۱۲ اکتوبر ۱۹۱۰ء کو اس تنظیم کو ایک دوسری تنظیم بنام "جمعیۃ الانصار" کی شکل میں مدرسہ دیو بند میں قائم کیا ۔ "القاسم" کے بیان کے مطابق اس کے ابتدائی اجلاس میں دس ہزار افراد نے شرکت کی مگر مولانا محمد میاں نے اس جلسے میں تیس ہزار افراد کی شرکت بیان کی ہے اور اس کی تصدیق ضیاء الحسن فاروقی نے بھی کی ہے ۔ لیکن مولانا محمد میاں کا بیان جس میں تیس ہزار افراد کی شرکت بیان کی گئی ہے، مشکوک معلوم ہوتا ہے ۔ چونکہ "القاسم" نہ صرف ہم عصر رسالہ ہے بلکہ اس تحریک کا حامی اور دارالعلوم دیو بند سے متعلق بھی ہے ، لہذا "القاسم" کی خبر درست اور واقعہ کے متعلق صحیح معلوم ہوتی ہے[1] ۔ نیز اس جلسے میں صاحبزادہ آفتاب احمد خان نے ایک تجویز طلبا کے تبادلہ علم کی پیش کی جو منظور ہوئی ۔ اس کی رو سے مسلمان عربی دان طلبا کے لیے انگریزی علوم کا حاصل کرنا طے پایا اور انگریزی طلبا کے لیے دینی علوم کا حاصل کرنا طے پایا ۔ اس تجویز کا ایک مقصد علوم دنیاوی اور علوم دینی کی تکمیل تھا اور دوسرا مقصد طلبا کے اس میل جول سے ، دیو بند اور علی گڑھ کے رشتہ اخوت و محبت کو مضبوط بنانا تھا[2] ۔

مولانا محمود حسن نے "جمعیۃ الانصار" کا ناظم مولانا عبیداللہ سندھی کو مقرر کیا اور مولانا سندھی نے بڑی جانفشانی اور تندہی سے اس جماعت کو منظم کیا ۔ اس کا

---

۱ ۔ "القاسم" ، شوال ۱۳۳۰ھ/دسمبر ۱۹۱۲ء ، ص‌ص ۶-۱۲ ؛
"علماء حق" ، حصہ اول ، محولہ بالا ، ص ۱۳۰-۱۳۱ ؛
The Deoband School and the Demand for Pakistan, p. 58.

۲ ۔ "القاسم" ، شوال ۱۳۳۰ھ ، ص ۴ ؛ اور ربیع الثانی ۱۳۲۹ھ ، ص ۶ ؛
"علماء حق" حصہ اول ، محولہ بالا ، ص ۱۳۱ ؛
"تذکرہ شیخ الہند" ، محولہ بالا ، ص ۱۵۳-۱۵۴ ؛
(نوٹ :۔ طلبا کے تبادلے کی اسکیم بڑی اہم اور نافع تھی مگر اس کا ثمرہ بہت تلخ برآمد ہوا ۔ یعنی علی گڑھ کالج کے ایک طالب علم نے جو دیو بند میں زیر تعلیم تھا، آگے چل کر خفیہ پولیس کا کردار پیش کیا) جس کے نتیجے میں شیخ الہند گرفتار ہوئے ۔
"علماء حق" ، حصہ اول ، ص ۱۳۱ ؛
The Deoband School and the Demand for Pakistan, p. 58.

پہلا اجلاس ۱۵ ، ۱۶ اور ۱۷ اپریل ۱۹۱۱ء بمقام مراد آباد زیر سرپرستی قاضی محمد شوکت حسین رئیس اعظم مراد آباد میں منعقد کیا[1] ۔

جمعیۃ الانصار کے اغراض و مقاصد :

اس جماعت کے اغراض و مقاصد میں سب سے اہم اور بڑا مدعا یہ تھا کہ مدرسہ دیو بند کے مقاصد کی تائید و حمایت کی جائے ۔ ان فرائض کے ادا کرنے کے لیے جمعیۃ نے پانچ شعبے قائم کیے :

''(الف) تکمیل التعلیم ، (ب) نظام تعلیم ، (ج) الارشاد ، (د) التالیف و الاشاعت ، اور (ہ) جلسہ علمیہ اور پانچویں شعبے کا نام 'جمعیۃ الانصار' رکھا''[2] ۔

مفتی عزیزالرحمٰن مصنف ''تذکرہ شیخ الہند'' نے اس جماعت کے حسب ذیل مقاصد بیان کیے ہیں :-

(ا) قرآن مجید اور احادیث کے لطائف و اسرار سے عام مسلمانوں کو مانوس کرنا۔

(ب) عقائد و اعمال کی اصلاح کے لیے علمی مضامین کا پڑھا جانا ۔

(ج) مسلمانوں کے مذہبی علوم و معارف کی حفاظت اور اشاعت کے وسائل و ذرائع پر عموماً اور مدارس کی اصلاح و حمایت پر خصوصاً بحث و مشورہ کرنا[3] ۔

مفتی صاحب نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ شیخ الہند کا اصل مقصد دینی اور دنیاوی فلاح و بہبود کے پس منظر میں یہ تھا کہ اس طرح مسلمانوں کو مجتمع کر کے حصول آزادی کی دوڑ میں شریک کیا جائے تاکہ مسلمان اپنا کھویا ہوا وقار و سلطنت اب سیاسی تحریک میں منسلک ہو کر حاصل کر سکیں ۔ نیز اس عمل اور طریقے کے ذریعہ سے مسلمانوں کے دلوں سے خوف و ہراس اور سیاسی انجماد کو دور کیا جائے اور اس تربیت کے ذریعہ ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ بھی ابھارا جا سکے تاکہ لوگوں میں جرأت ، ہمت ، حوصلہ اور مردانگی پیدا ہو سکے[4] ۔

---

۱ - ''القاسم'' ، ربیع الاول ۱۳۲۹ھ ، ج ۱ ، نمبر ۱۸ ، آخری صفحات

۲ - ایضاً، ص ۶ ؛

''تذکرہ شیخ الہند'' ، محولہ بالا ، ص ۱۵۳

۳ - ''تذکرہ شیخ الہند'' ، محولہ بالا ، ص ۱۵۳

۴ - ایضاً ، ص ۱۵۳

جمیعۃ الانصار کی کار کردگی :

مولانا سندھی ، شیخ الہند کے مخصوص تربیت یافتہ اور اسلام و قوم کے شیدائی تھے ۔ آپ نے جمیعۃ کی تنظیم کے لیے ایک اخبار "الانصار" دیو بند سے شائع کیا ، تاکہ اس کے ذریعہ جمیعۃ کے اغراض و مقاصد کی اشاعت و ترویج آسانی سے ہوتی رہے ۔ اس طرح مراد آباد سے بھی دیگر اخبار اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا گیا[1] ۔ جمیعۃ کی کار کردگی کی بنا پر حکومت ، اس جماعت اور اراکین سے خلاف ہوگئی ۔ حکومت کے عتاب کی وجہ سے اس جماعت نے وقتاً فوقتاً ، طریقہ کار اور ناموں کی تبدیلی کے ساتھ جمیعۃ کے اغراض و مقاصد کی نشر و اشاعت جاری رکھی ۔ "جمیعۃ الطلبا" کا قیام بھی اس سلسلے کی ایک کڑی تھی ۔ اس جماعت کو کامیاب بنانے میں مولانا سندھی کے علاوہ مندرجہ ذیل رفقاء کا بھی خصوصی حصہ تھا :-

"(الف) مولانا محمد صادق کراچوی (ب) مولانا ابو محمد لاہوری ، اور (ج) مولانا احمد علی" ۔

مولانا سندھی نے ۴ جمادی الثانی ، ۱۳۳۱ھ/۱۱ مئی ۱۹۱۳ء کو اراکین اور شرکا جمیعۃ کے عدم تعاون اور اندرونی خلفشار سے غیر مطمئن ہوکر اپنا استعفی پیش کر دیا تھا ۔ اس طرح موصوف نے ۱۳ اکتوبر ، ۱۹۱۰ء تا ۱۱ مئی ، ۱۹۱۳ء تک بہ حیثیت ناظم کام کیا[2] ۔

شیخ الہند نے مولانا سندھی کے مستعفی ہونے کے بعد اس جمیعۃ کو ایک نئی شکل میں عوام کے سامنے پیش کیا اور اس کا نام "نظارۃ المعارف" اور بعدہ تحریک "ریشمی رومال" ہوا ۔ ان تحریکات میں بھی مولانا محمود حسن نے مولانا سندھی کی سیاسی خدمات حاصل کیں ۔ یہ خدمات تاریخ ہند میں بڑی اہم اور ناقابل فراموش ہیں ، جن کا تفصیلی ذکر اگلے باب میں کیا جائے گا ۔

تعلیقۃ - ۱

باب - ثانی ، فصل دوم

دارالعلوم دیو بند کے قیام اور اس کی تاسیس کے سلسلے میں مقالہ کے متن میں اخبار "سائنٹفک سوسائٹی" ، علی گڑھ ، ۱۹ جولائی ، ۱۸۶۷ء ، کے صفحہ ۳۶۱ ک ۱ ، کی نقل

---

۱ - ایضاً ، ص ۱۵۳-۵۳

Modern Muslim India and the Birth of Pakistan, p. 114.

۲ - "تذکرہ شیخ الہند" ، محولہ بالا ، ص۱۵۳ - ۵۳

"القاسم" ، صفر ۱۳۳۲ھ دسمبر ۱۹۱۳ء ، ص ۵

A History of the Freedom Movement, Vol. 2. pt. 2, p. 418.

پیش کی جا چکی ہے۔ اس مواد اور حوالے کی روشنی میں یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ اس مدرسہ کا قیام ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء کے علاوہ کسی اور سن میں ہوا ہوگا۔ تاہم ایک مزید حوالہ رسالہ "القاسم" ذی قعدہ ۱۳۳۰ھ مطابق اکتوبر ۱۹۱۲ء کا بھی پیش کیا جاتا ہے۔ جس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔

"مدرسہ اسلامیہ دیو بند کی شہرت و مقبولیت بھی اسی قاعدہ کے ساتھ ہوئی۔ چند اہل اللہ اور ان کے ساتھ بعض اہل شہر اس کے لیے کمربستہ ہوئے اور معمولی طور پر مدرسہ قائم ہوا۔ دیو بند کی ایک کہنہ مگر معروف مسجد چھتہ میں اس کی ابتدا ہوئی۔ جناب مولوی ملا محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ پندرہ (-/۱۵) روپے ماہوار پر مدرس مقرر ہوئے اور سب سے اول حضرت مولانا محمود حسن صاحب سلمہ نے استاد کے سامنے کتاب کھولی"۔

"یہ حقیقت ہے کہ ابتدائے مدرسہ میں جس کے لیے کوئی شان دار افتتاحی جلسہ منعقد ہوا نہ دلیا کے ذی وجاہت اصحاب اس میں شریک ہوئے، فقط دیو بند کے چند حضرات رکن تھے اور انہیں کے قلیل مقدار چندہ پر مدار تھا۔ چندہ کی کل رقم پہلے سنہ میں چار سو چھیانوے روپے اور موازی چار آنے (۴۹۶-۴) تھی اور اس کی تدریجی ترقی کی افتاد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۲۸۴ھ میں ایک ہزار پانچ سو دس یعنی (۱۵۱۰-۰۰) اور ۱۲۸۵ھ میں دو ہزار ایک سو ترپن یعنی (۲۱۵۳-۰۰) ہوئی۔ اسی طرح آہستہ آہستہ دیو بند سے گزر کر مدرسہ نے مسلمانان ہند میں بلا تخصیص مقبولیت عام حاصل کر لی"[1]۔

"القاسم" کی مندرجہ بالا عبارت سے یہ بات خود بخود واضح اور ثابت ہے کہ مدرسہ دیو بند ۱۲۸۳ھ میں قائم ہوا تھا۔ اس بیان کی مزید تصدیق مولانا قاری محمد طیب، مصنف "دارالعلوم دیو بند کی صد سالہ زندگی" سے بھی ہوتی ہے، موصوف نے اس ادارہ کے قیام کا سن ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ / ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء بیان کیا ہے[2]۔ مولانا کے بیان میں سن ھجری کی تاریخ تو صحیح ہے مگر سن عیسوی غلط ہے۔ کیوں کہ مصنف تقویم تاریخی کے اعتبار سے ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ کو ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء تھا۔ لہٰذا سن عیسوی ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء ہے جس کی تائید "سائنٹفک اخبار" کے مندرجہ بالا بیان سے بھی ہوتی ہے[3]۔

---

۱ - "القاسم"، ذی قعدہ ۱۳۳۰ھ مطابق اکتوبر ۱۹۱۲ء، ص ص ۱۸-۱۹

۲ - "دارالعلوم دیو بند"، ص ۱۶

۳ - عبدالقدوس ہاشمی، "تقویم تاریخی"، کراچی، ۱۹۶۵ء، ص ۳۲۱

ضیاء الحسن فاروقی نے بھی اس ادارے کے قیام کا سن ۱۸۶۷ء بیان کیا ہے جو غیر تحقیقی ہے[1] ۔

تعلیقہ ۔ ۲

مولانا محمد قاسم نانوتوی کی وفات پر سرسید کا تعزیتی خط ، جو "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" میں ۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء کو شائع ہوا تھا، حسب ذیل ہے :-

"جناب مولوی محمد قاسم نے ۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء کو بعارضہ "ضیق النفس" بمقام دیو بند انتقال فرمایا ۔ ایسے شخص کے لیے رونا جس کے بعد اس کا جانشین نظر نہ آوے ، نہایت رنج و غم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے ۔ مولوی محمد اسحٰق کو تعلیم و تربیت دے کر مولانا محمد قاسم نے اپنا جانشین بلکہ کچھ باتوں میں ان سے زیادہ ۔ محمد قاسم نے مولوی مملوک علی سے تمام کتابیں پڑھی تھیں ۔ مولوی مظفر حسین کاندہلوی کی صحبت نے اتباع سنت پر راغب کر دیا اور حاجی امداد اللہ صاحب کے فیض صحبت نے ان کے دل کو ایک نہایت اعلیٰ رتبہ کا دل بنا دیا تھا ۔ عام مسلمانوں کی بھلائی کا بھی ان کو خیال تھا ۔ انھیں کی کوششوں سے علوم دینیہ کی تعلیم کے لیے نہایت مفید مدرسہ دیو بند میں قائم ہوا ۔ علاوہ ازیں ان کی کوششوں سے مسلمانی مدرسے دیگر چند مقامات میں بھی قائم ہوئے ۔ ہماری سمجھ میں مولانا کی کسی سے ناراضگی یا مولانا سے کسی کی ناراضگی ہوائے نفسی یا ضد یا عداوت پر محمول نہیں کر سکتے ۔ ان کے تمام کام للہیت اور ثواب آخرت کی نظر سے تھے ۔ کسی شخص کو مولوی محمد قاسم اپنے ذاتی تعلقات کے سبب اچھا یا برا نہیں جانتے تھے ۔ بلکہ اچھے یا برے کام پر خدا کے واسطے اچھا یا برا جانتے تھے ۔ حب للہ اور بغض للہ مولوی محمد قاسم دنیا میں بے مثال تھے ۔ درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے ۔ دیو بند کا مدرسہ ان کی یادگار ہے اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل رہے ۔ تاکہ قوم کے دل پر ان کی یادگار کا نقش جما رہے"[2] ۔

---

1. *The Deoband School and the Demand for Pakistan*, p. 28

۲ ۔ "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" ، ۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء ، ج ۱۵ ، نمبر ۳۳ ، ص ص ۳۶۴-۳۶۸ ، ک ۱ - ۲

فتویٰ مولانا رشید احمد گنگوہی ، بسلسلہ کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت :

یہ فتویٰ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے اپنی کتاب ''کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ'' میں شائع کیا ہے - مولانا گنگوہی کے فتویٰ کا سن اشاعت ۱۳۰۶ھ/ ۱۸۸۸ء ہے - فتویٰ کی نقل حسب ذیل ہے :-

''اگر ہندو مسلمان باہم شرکت بیع و شراء و تجارت میں کرلیویں اس طرح کہ کوئی نقصان دین میں یا خلاف شرع معاملہ کرنا اور سود و بیع فاسد کا قصہ پیش نہ آوے جائز ہے اور مباح ہے - مگر سید احمد سے تعلق رکھنا نہیں چاہیے اگرچہ وہ خیر خواہی قوم کا نام لیتا ہے یا واقع میں خیر خواہ ہو مگر اس کی شرکت مال کار اسلام و مسلمانوں کو سم قاتل ہے - ایسا میٹھا زہرپلاتا ہے کہ آدمی ہرگز نہیں بچتا - پس اس کے شریک مت ہونا اور ہنود سے شرکت معاملہ کر لینا - اور اگر ہنود کی شرکت سے اور معاملہ سے بھی کوئی خلاف شرع امر لازم آتا ہو یا مسلمانوں کی ذلت و اہانت یا ترقی ہنود ہوتی ہو ، وہ کام بھی حرام ہے - جیسا کہ اوپر لکھا گیا - اس طرح پر ہے اور بس - فقط بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ''[1] -

مولانا رشید احمد نے سرسید کے متعلق ایک سوال کا جواب دیا تھا - جس میں سائل نے یہ سوال کیا تھا کہ سرسید احمد خان نیچری نے ایک ایسوسی ایشن قائم کی ہے - جس نے ۸ اگست ۱۸۸۸ءکو اس بات کی ترغیب دی ہے کہ اس ایسوسی ایشن میں بڑے بڑے ہندو ذی وجاہت شامل ہیں - ہر شخص پانچ روپے ماہوار چندہ ادا کرکے اس کا ممبر بن جائے - سائل نے دریافت کیا تھا ایسی جماعت میں مسلمانوں کی شرکت اور ان کی مدد کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں - اور نیچری لوگ بدخواہ اسلام ہیں یا نہیں ؟ مندرجہ بالا فتویٰ ان سوالات کا جواب ہے[2] -

---

۱ - مفتی محمد شفیع ، ''مسلم لیگ اور کانگریس کے متعلق شرعی فیصلہ'' ، دیو بند ، ۱۳۶۵ھ ص ص ۴۰-۴۱

۲ - ''مسلم لیگ اور کانگریس کے متعلق شرعی فیصلہ'' ، ص ۴۰

باب سوم

بیسویں صدی کے آغاز سے ۱۹۱۴ء تک علماء کا سیاسی کردار اور ملک کی سیاسی کیفیت

(الف) بیسویں صدی کے آغاز سے ۱۹۰۶ء تک برصغیر کی سیاست کا خاکہ

فصل اول

اندرونی صورت حالات

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد برصغیر میں سلطنت مغلیہ کا خاتمہ ہو گیا۔ اس طرح اسلامی سلطنت اور حاکمیت کا آخری نشان بھی ختم ہو گیا۔ مسلمانوں کی سلطنت اور حاکمیت چلے جانے کے بعد برصغیر میں انھیں اپنی سیاسی، سماجی اور تاریخی حیثیت کا احساس ہوا۔ اب مسلمانان ہند ایک کمزور اور عددی اقلیت کے سوا کچھ نہ تھے[1]۔ مسلمانان ہند اور ان کے سیاسی رہنماؤں کو ہندوستان میں اپنا مستقبل مایوس کن اور بے کیف نظر آ رہا تھا[2]۔ آزادی کے کچھ پہلے مسلمان مالی، تعلیمی، اقتصادی، تنظیمی، غرض ہر اعتبار سے ہندوستان کی دیگر ملل کے مقابلے میں پس ماندہ تھے۔

برصغیر ایک وسیع خطۂ ارض ہے، جس میں کئی قومیں آباد ہیں۔ انگریزوں نے اپنی سیاسی بقاء و استحکام کے لیے یہ ضروری خیال کیا کہ ہم یہاں پر ہندو مسلم اتحاد پیدا نہ ہونے دیں۔ چوں کہ دونوں قوموں کے متحد ہو جانے سے برطانیہ کو اپنی حکومت کی بقاء اور استحکام کو خطرہ لاحق تھا۔ اس عمل کو بروئے کار لانے کے لیے برطانیہ نے پہلا طریقہ یہ اختیار کیا کہ ہندوؤں کو ان کی اکثریت کی بناء پر زیادہ سیاسی حقوق حاصل کرنے کا مستحق بتلایا اور اس طرح ایک سیاسی جماعت یعنی ''انڈین نیشنل کانگریس'' کی داغ بیل ڈلوائی۔ دوسری طرف مسلمانوں کو اس طرح بھڑکایا کہ ہنود

1. K.K. Aziz, *The Making of Pakistan*, London, 1967, p. 18.
2. Khalid bin Sayeed, *Pakistan: The Formative Phase*, 2nd ed., Karachi, 1968, p. 13.
3. *Ibid.*, pp. 13-14.

آپ سے اعتقاد اور عمل میں بالکل متضاد ہیں ۔ یعنی آپ توحید پرست ہیں اور ہنود بت پرست ہیں ۔ لہٰذا آپ کا اور ہندوؤں کا اتحاد کیسے قائم ہو سکتا ہے ہم اس طرح اپنا سیاسی مقصد حاصل کرنے کے لیے ایک قوم کو دوسری قوم کے خلاف مشتعل اور متنفر کرتے رہے[1] ۔

مزید برآں حکومت نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ اس بڑے ملک میں ہم تنہا قابض و دخیل نہیں رہ سکتے ۔ ہمیں ہندوستانیوں کی حمایت اور تعاون حاصل کرنا بھی ضروری ہے ۔ اس کے پیش نظر حکومت کبھی مسلمانوں کو اپنا یار و مددگار و حمایتی بناتی تھی اور کبھی ہندوؤں کے ساتھ اتحاد و میل ملاپ کر کے اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرتی تھی[2] ۔

عہد اسلامی میں ہندو مسلم تہوار پر امن طور پر منائے جاتے تھے اور دونوں قوموں کے افراد ایک دوسرے کی خوشی و غم میں برابر کے شریک ہوتے تھے ۔ مگر اب معاملات اس کے برعکس اور متضاد تھے ۔ جیسا کہ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام نے بیان کیا ہے کہ محرم کے موقع پر ہندو لڑکے محرموں کے جلوسوں پر پتھراؤ کرتے تھے ، اور دسہرہ کے موقع پر مسلمانوں کے مقامات مقدسہ جیسے مساجد و خانقاہوں وغیرہ کے سامنے باجے بجانا اور ان کی بے حرمتی کرنا وغیرہ اب ہندوؤں کا ایک معمول سا بن گیا تھا ۔ اس طرح سے مسلمانوں کے جذبات کو برانگیختہ کیا جاتا تھا ۔ انگریز یہ سب کچھ بالواسطہ یا بلاواسطہ کراتے تھے ۔ تا کہ ہندو مسلم فسادات رونما ہو کر ملک کی فضا مکدر اور نفرت انگیز ہو جائے[3] ۔

ہندوؤں نے خود بھی مسلمانوں کے خلاف مختلف طریقوں سے زہریلا پروپیگنڈہ کیا ۔ مثلاً ایک بنگالی ناول نویس بینکم چندرا چٹرجی (Bankim Chandra Chatter-jee) نے اپنے ناولوں کے ذریعہ مسلمانوں کے خلاف نفرت اور تحقیر کے جذبات کو ابھارا۔ یہی نہیں بلکہ اس طریقے کو عملی شکل میں جاری کیا ۔ مزید برآں چٹرجی نے ہندوؤں

---

1. *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd. ed , pp. 23-24;
مولوی سید طفیل احمد منگلوری ، "روح روشن مستقبل" ، بدایوں ، ۱۹۳۶ء ، ص ص ۱۴-۱۵

2. *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd ed., p. 23.

3. S. M. Ikram, *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*, Lahore, 1970, pp. 212-213 ;
مولوی سید طفیل احمد منگلوری ، "مسلمانوں کا روشن مستقبل"، دهلی ، ۱۹۴۵ء ، ص ۳۰۱ ؛
ایضاً "روح روشن مستقبل" ، ص ص ۳-۴

کو مشورہ دیا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کے ساتھ تعاون کریں[1] ۔ سرسید نے سول سروسز کے امتحانات میں عمر کی قید کم کرنے پر سرسریندر ناتھ بنرجی کے ساتھ تعاون کیا تھا ۔ مسٹر بیک پرنسپل علی گڑھ کالج کو سرسید کا بنرجی کے ساتھ تعاون اور اتحاد انگریزوں کے مفاد کے خلاف نظر آیا اور انھوں نے (مولانا منگلوری کے بیان کے مطابق) "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ" گزٹ میں سرسید کے نام سے بنگالیوں کے خلاف مضامین شائع کرائے ۔ غرض رفتہ رفتہ دونوں فرقوں میں نفاق اور کشیدگی پیدا ہوتی گئی[2] ۔

۱۸۸۵ء میں کانگریس کے قیام کے بعد مسلمانوں میں دو زاویہ نگاہ پیدا ہو گئے تھے ۔ علماء کا بڑا طبقہ کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت کے خلاف نہ تھا ۔ مگر سرسید کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت کو پسند نہیں کرتے تھے ۔ للہذا سرسید نے مسلمانوں کو کانگریس میں شریک ہونے سے منع کیا[3] ۔

مولانا طفیل احمد منگلوری کے بیان کے مطابق مسٹر بیک پرنسپل علی گڑھ کالج نے ہندو مسلم نفاق کو بڑھانے میں سرسید سے کانگریس کے بعض مطالبات کے خلاف جوابی مطالبات پیش کرائے[4] ۔

کانگریس کے قیام کے بعد سے ہندوؤں میں حقوق خود اختیاری حاصل کرنے کا جذبہ تیز تر ہوگیا ۔ اگرچہ تحریک آزادی کا یہ ایک افسوسناک پہلو ہے کہ ہندوؤں کی سیاسی تحریکات میں فرقہ پرست اور تنگ نظر عناصر شروع ہی سے پیش پیش رہے ۔ اب مسلمانان ہند کو اس امر کا بھی احساس ہوا کہ ہمیں بھی اپنے سیاسی حقوق اور سماجی

---

1. ***Pakistan* : *The Formative Phase*, 2nd. ed., pp. 22-23.**

۲ ۔ "روح روشن مستقبل" ، ص ۴

۳ ۔ ایضاً ، ص ۵

۴ ۔ ایضاً ، ص ص ۱۱-۱۲

(نوٹ : مولانا منگلوری نے بیان کیا ہے کہ سرسید نے اپنا مشن یہ قرار دیا کہ ہندوستان میں سول سروسز کے امتحان جاری نہ ہوں ، ملک کو حکومت خود اختیاری نہ دی جائے ، ہندوستانیوں کو ہتھیار نہ دیے جائیں ، سرحد کے مسلمانوں پر گولہ باری بند نہ کی جائے ، افواج کے اخراجات کم نہ کیے جائیں ، نمک کا محصول نہ گھٹایا جائے اور نہ انکم ٹیکس کم کیا جائے ۔ مولانا موصوف کے بیان کے مطابق انگریز اس بات کے کوشاں رہتے تھے کہ ہندو اور مسلم اتحاد قائم نہ ہو ۔ تا کہ دونوں قومیں متحد ہو کر تاج برطانیہ کے خلاف کوئی عملی قدم نہ اٹھا سکیں ۔ "روح روشن مستقبل" ، ص ۱۱)

و تعلیمی بہبود کے لیے اپنی کوئی علیحدہ سیاسی تنظیم قائم کرنی چاہیے تا کہ مستقبل قریب میں جب ہندوستانیوں کے سیاسی حقوق بحال کرنے کا موقع یا مسئلہ پیش آئے تو مسلمانوں کی اپنی تنظیم بھی ان کے سیاسی حقوق کی نگرانی کر سکے[1] -

فصل دوم

انگریزوں کی پالیسی

انگریزوں نے بحیثیت تجار برصغیر میں بمقام مدراس ، بمبئی اور بنگال کے ساحلوں پر اپنا کاروبار شروع کیا - مسلم حکمرانوں نے اپنی روایتی رواداری اور فراخ دلی کے ساتھ ان تاجروں کے لیے تجارتی مراعات منظور کیں - شہنشاہ عالمگیر کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ روز بروز کمزور اور انحطاط پذیر ہوتی گئی - چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ملک کی سیاسی کمزوری اور اہل ہند کے آپس کے عدم تعاون سے فائدہ اٹھاتے ہوئے برصغیر کی سیاست میں آہستہ آہستہ دخیل ہو کر ملک پر اپنا قبضہ جما لیا -

۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریہ نے کمپنی کی حکومت کو ختم کر کے ملک کا اقتدار براہ راست تاج برطانیہ کے تحت کر دیا - اس تبدیلی سے دو اہم نتیجے رونما ہوئے - اول یہ کہ کمپنی کی اجارہ داری اور بدعنوانیاں ختم ہو گئیں - دوم یہ کہ اس تبدیلی سے ہندوستانیوں کو قدرے اطمینان نصیب ہوا ، کیونکہ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد اہل ہند وجہ اور بلا وجہ ظلم و ستم کا نشانہ بنائے جا رہے تھے - اب اس ظلم میں کچھ کمی واقع ہوگئی - سرسید نے اہل ہند کی نیابت کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا کہ قانون ساز اداروں میں ہندوستانیوں کو بھی شریک کیا جائے - اس مطالبے پر ۱۸۶۱ء میں آئینی اصلاحات کا پہلا قانون پاس کیا گیا - جس کی رو سے پہلی مرتبہ تین ہندوستانیوں کو کونسل کا ممبر بنایا گیا - حالانکہ یہ تینوں ممبر ہندو تھے اور اس طرح ابتداء ہی سے مسلمانوں کے حقوق کو نظر انداز کیا گیا[2] -

---

۱ - ڈاکٹر سید معین الحق، ''تاریخ ہند و پاکستان : آخری دور''، کراچی، ۱۹۵۰ء ، ص ۱۵۴؛
Modern Muslim India and the Birth of Pakistan, p. 45.

2. *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*, p. 193;
''تاریخ ہند و پاکستان ؛ آخری دور'' ، ص ۱۵۳ ؛ ''تاریخ دستور ہند'' ، ص‌ص ۷۱-۷۴

۱۸۶۱ء میں اہل ہند کو آئینی اصلاحات کی پہلی قسط دی گئی تھی ۔ اس کے بعد لارڈ رپن نے ۱۸۸۲ء میں مقامی حکومت خود اختیاری (لوکل بورڈ ، ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل کارپوریشن وغیرہ میں) یعنی مقامی اداروں میں ہندوستانیوں کو نمائندگی دیئے جانے کا قانون منظور کرایا ۔ تاکہ اس نظام کے تحت عوام کو مقامی مجالس یا مقامی اداروں میں سیاسی تجربہ حاصل ہو سکے ۔ لارڈ رپن کی توجہ سے ہندوستان میں ضلعی مجالس اور بلدیات کی تنظیم نو کی طرف توجہ کی گئی ۔ اس بل کے پاس ہونے سے قبل سر سید نے یہ بات محسوس کی کہ یورپین طرز کی حکومتوں میں تمام فیصلے کثرت آراء پر عمل میں آتے ہیں اور ہندوستان میں مسلمانوں کی عددی اقلیت ہے ۔ لہٰذا اس طرز حکومت میں مسلمانوں کی بھلائی اس امر میں مضمر ہے کہ ان کو علیحدہ نیابت کا حق ملنا چاہیے ۔ اس امر کے پیش نظر سرسید نے مقامی اداروں میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ نمائندگی کا مطالبہ کیا[1] ۔

۱۸۸۵ء میں تشکیل کانگرس کے بعد ہندوستان میں سیاسی بیداری کی رفتار تیز ہوگئی اور حقوق خود اختیاری کا مطالبہ بھی بڑھتا گیا ۔ کانگریس نے اپنے پہلے ہی اجلاس میں ہندوستانی لیجسلیٹو کونسلوں کے نقائص دور کرنے کا مطالبہ کیا ۔ نیز یہ کہ کونسلوں میں منتخب نمائندوں کو شامل کرنے پر زور دیا ۔ عوامی مطالبے کے تحت حکومت برطانیہ نے ۱۸۶۱ء کے قانون ہند میں ترمیم کر کے ۱۸۹۲ء میں اہل ہند کو آئینی اصلاحات کی ایک اور قسط دی ۔ اس ترمیم کا مقصد یہ تھا کہ اہل ہند مجلس قانون ساز میں بالواسطہ شریک ہو کر عوام کی نمائندگی کر سکیں ۔ ہندوستانیوں کے لیے یہ پہلا موقعہ فراہم کیا گیا تھا ، جس کی بناء پر وہ انتخابات میں حصہ لے کر مجلس قانون ساز میں اپنے ملک و عوام کی نمائندگی کے قابل ہوئے تھے ۔ اس ترمیم سے اہل ہند کو دو فائدے ہوئے اول یہ کہ حکومت نے عوامی نمائندگی کا بنیادی اصول منظور کر لیا ۔ دوم یہ کہ ملک میں سیاسی حقوق حاصل کرنے کی جد و جہد میں اضافہ ہوا[2] ۔

اہل ہند کو قانون ساز اداروں میں نمائندگی کا حق (جو محض جزوی تھا) ملنے کے بعد یہ احساس پیدا ہوا کہ اب حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ ہندوستانیوں کو بھی

---

1. Mohammad Noman, *Muslim India*, Allahabad, 1942, pp. 33-35;
"تاریخ دستور ہند" ، ص ص ۸۳-۸۶

2. Syed Razi Wasti, *Lord Minto and The Indian Nationalist Movement*, Lahore, 1964, p. 14;
I. H. Qureshi, *The Struggle for Pakistan*, Karachi, 1965, p. 23 ;
S. L. Sikkri, *Studies in Constitutional History of India*, Jullundur City, 1964, pp. 89-90 ;
پی پتابھی سیتا رامیہ ، "تواریخ کانگریس" ، لاہور ، ۱۹۴۰ء ، ص ۲۹

دیگر مقبوضات برطانیہ کی طرح خود مختاری دی جائے اور حکومت کا نظم و نسق اہل ہند کے سپرد کیا جائے۔ ابھی اس مطالبے کا آغاز ہی ہوا تھا کہ ۱۸۹۸ء میں سرسید کی وفات ہو گئی۔ سرسید کی موت سے کچھ عرصے قبل ہندوؤں نے لسانی تنازع (بابت اردو، ہندی رسم الخط) کو جو کچھ عرصے کے لیے وقتی طور پر دب گیا تھا، پھر دوبارہ شروع کر دیا۔ یوپی میں زبان کا یہ مسئلہ ۱۸۶۷ء سے دونوں قوموں کے مابین مابہ النزاع چلا آ رہا تھا۔ اس مسئلے میں مسلمانوں کا موقف یہ تھا کہ ۱۸۳۵ء سے سرکاری عدالتوں اور عام بول چال میں اردو زبان ہی رائج الوقت ہے اور ہندوستان کی بیشتر آبادی اس زبان کو بولتی اور سمجھتی ہے۔ نیز یہ کہ یہ زبان ہندوستان کی مروجہ زبانوں سے مل کر پیدا ہوئی ہے۔ کسی بیرونی ملک یا کسی خاص قوم کی قدیمی زبان نہیں ہے۔ اس لیے یہ زبان ہندوستانی ہے اور صرف اسی زبان کو سرکاری طور پر رائج رہنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن ہندو اس زبان سے بلاوجہ مخاصمت رکھتے تھے اور عہد برطانیہ میں شروع ہی سے اس زبان کو ختم کرانے کے خواہشمند تھے[1]۔

اردو ہندی نزاع کے دوبارہ شروع ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ۱۸۹۵ء میں سرانٹونی میکڈونل (Sir Anthony Mac Donnell) یوپی کے گورنر مقرر ہوئے۔ موصوف کے عہد گورنری میں بہار میں اردو کی بجائے بہاری رائج ہو چکی تھی۔ لہٰذا موصوف جب یوپی کے گورنر مقرر ہو کر آئے تو ہندی نواز ہندوؤں کو اس کی آمد سے بڑی ہمت اور تقویت پیدا ہوئی اور ہندوؤں کے معزز اور سربرآوردہ اشخاص نے گورنر یوپی کے نام ایک یاد داشت مرتب کی۔ جس میں ہندی زبان کو رائج کرنے کا مطالبہ دہرایا گیا۔ یعنی یہ کہ تمام سرکاری عدالتوں میں اردو زبان کی بجائے ہندی بھاشا اور ناگری رسم الخط جاری ہونا چاہیے۔ ہندوؤں کی اس جد و جہد کے نتیجے میں بالآخر ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء کو حکومت یوپی نے ایک ریزولیوشن کے ذریعہ اردو کے ساتھ ساتھ ہندی زبان کو بھی سرکاری طور پر رائج کر دیا[2]۔ ناگری رسم الخط رائج کرنے کے ساتھ ساتھ حکومت نے ایک پابندی یہ بھی عائد کر دی تھی کہ کوئی شخص کسی عہدے پر اس وقت تک مقرر نہ کیا جائے گا جب تک کہ اسے ناگری اور اردو میں سرعت کے

---

1. Abdul Hamid, *Muslim Separatism in India : A Brief Survey (1858-1947)*. Reprinted with corrections, O.U.P., 1971, pp. 37-38;
   ڈاکٹر شیخ محمد اکرام، "موج کوثر"، کراچی، ۱۹۶۶ء، ساتویں بار، ص ۱۱۶
2. Ziaul Hasan Farooqi, *The Deoband School and the Demand for Pakistan*, Bombay, 1963, p. 47;
   Board of Editors, *A History of the Freedom Movement*, Vol. 3, pt. 1, p. 30.

ساتھ لکھنے پڑھنے کی مہارت نہ ہو ۔ اس ریزولیوشن کی روشنی میں مسلمانوں میں اس مسئلے کی مخالفت اور ان کی پریشانی میں اضافہ ہوا اور اس کی بناء پر ہندو مسلم نفاق بڑھتا ہی گیا ۔ نیز دونوں قوموں کے درمیان بغض و عناد کی ایک مستقل خلیج قائم ہوگئی[1] ۔

فصل سوم

مسلمانان ہند کی سیاسی حیثیت اور ان کے مسائل

کانگریس نے اپنے قیام کے بعد ملک میں سیاسی جماعت کی حیثیت سے اپنی اجتماعی جد و جہد شروع کر دی تھی - ۱۸۹۲ء کی آئینی اصلاحات سے کانگریس مطمئن نہ تھی اور مزید قانونی مراعات حاصل کرنے کے لیے برابر کوشاں تھی - سرسید نے مسلمانوں کو کانگریس کی شرکت سے منع کیا تھا اور مسلمانوں کا خواندہ طبقہ زیادہ تر سرسید کا ہمنوا تھا - ۱۸۵۷ء کے خونی واقعات کے پیش نظر مسلمان ابھی تک سیاست میں عملی کردار ادا کرنے میں پس و پیش کر رہے تھے مگر زمانے کے بدلتے ہوئے حالات نے سرسید کو اس بات پر غور کرنے کے لیے مجبور کر دیا کہ اب مسلمانوں کو اپنا سیاسی وقار حاصل کرنے کےلیے ایک سیاسی جماعت کی تشکیل ناگزیر ہے لہٰذا سرسید نے Central National Muhammadan Association ۱۸۷۷ء میں قائم کی[2] ۔ بعدہ سرسید نے انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قائم کی اس کے بعد ۱۸۹۳ء میں محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کی ۔ شمالی ہند میں مسلمانوں کی یہ سب سے پہلی سیاسی تنظیم تھی ۔ (حالانکہ بعض مؤرخین یہ مقام انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کو دیتے ہیں) سرسید کی وفات (۱۸۹۸ء) کے بعد محسن الملک نواب مہدی علی خاں کالج کے سکریٹری اور سرسید کے قائم مقام مقرر ہوئے[3] ۔ نواب محسن الملک کو بھی اردو ہندی قضیہ کا سامنا کرنا پڑا ۔ چوں کہ ۱۹۰۰ء میں حسب تفصیل بالا گورنر

---

۱ - "روح روشن مستقبل"، ص ص ۲۵-۲۶

2. *The Struggle for Pakistan*, p. 26.

3. K.K. Aziz, *The Making of Pakistan*, London, 1967, p. 23;

M. S. Jain, *The Aligarh Movement : Its Origin and Development*, Agra, 1965, p. 60;

Syed Sharifuddin Pirzada, *Foundations of Pakistan (1906-1924)*, Vol. I, Karachi, 1969, p. 8;

I. H. Qureshi, *The Muslim Community of Indo-Pakistan Subcontinent*, The Hague, 1962, pp. 250-51;

Modern Muslim India and the Birth of Pakistan, pp. 73-75.

یو پی نے سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں اردو کے ساتھ ساتھ ہندی زبان کو بھی رائج کر دیا تھا۔ اس زمانے میں علی گڑھ کالج مسلمانان ہند کی سیاست کا مرکز تھا ۔ نواب محسن الملک نے اردو کے ساتھ ساتھ یوپی میں ہندی زبان کے رائج ہونے پر یکم مئی ۱۹۰۰ء کو علی گڑھ میں ایک مختصر سا جلسہ منعقد کیا ۔ اس کے بعد ۱۳ مئی ۱۹۰۰ء کو علی گڑھ ٹاؤن ہال میں ایک دوسرا جلسہ بصدارت نواب لطف علی خان منعقد کیا گیا ۔ اس جلسے نے متفقہ طور پر اردو کے تحفظ کے لیے "اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن" کے نام سے ایک جماعت قائم کی اور محسن الملک کو اس سلسلہ میں اختیار دے دیا کہ وہ اردو کی بقاء و تحفظ کے لیے مناسب کارروائی عمل میں لائیں ۔ جلسہ ہذا کی جملہ کارروائی گورنر یوپی کو بڑی شاق گذری اور موصوف نے اس کارروائی پر بڑی سخت نکتہ چینی کی ۔ مگر نواب محسن الملک نے گورنر کے غم و غصہ کے باوجود ۱۸ اگست ۱۹۰۰ء کو لکھنو میں اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کا ایک اجلاس طلب کیا ۔ برصغیر میں مسلمانان ہند کا یہ جلسہ سیاسی اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل تھا[1] ۔ نواب محسن الملک نے اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے اردو کی حمایت میں تقریر کی اور حکومت سے سخت احتجاج کیا اور فرمایا کہ ہمارا یہ احتجاج سرسید کی پالیسی سے انحراف نہیں ہے ۔ نیز یہ کہ جلسہ نے متفقہ طور پر ہندی نافذ کرنے والے ریزولیوشن کو واپس لینے کا مطالبہ کیا[2] ۔ اس جلسہ کی کارروائی اور احتجاج سے گورنر یوپی اور بھی زیادہ برافروختہ ہوئے اور نواب محسن الملک کے اس اقدام کو گورنر نے حکومت کے اور اپنے ذاتی وقار کا مسئلہ بنا لیا ۔ چنانچہ گورنر نے کالج کے ٹرسٹیوں کو دھمکی دی کہ محسن الملک کو دونوں کاموں یعنی کالج کی سکریٹری شپ یا اردو کی حمایت میں سے ایک کام منتخب کر لینا چاہیے اور اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو حکومت کالج کی امداد منسوخ کر دے گی ۔ نواب محسن الملک نے گورنر کی اس دھمکی یا تہدید اور دباؤ کے تحت ۲۶ اگست ۱۹۰۰ء کو کالج کی سکریٹری شپ سے استعفا دے دیا ۔ مگر موصوف نے اردو کی حمایت کو ملک کی بقا اور مسلمانوں کے لیے ضروری خیال کیا ۔ اس کے برعکس ٹرسٹیوں اور آپ کے احباب و رفقاء نے آپ کی خدمات کو کالج کی بقا کے لیے ضروری خیال کیا ۔ اور آپ سے اپنا استعفیٰ واپس لینے کی درخواست کی ۔ لہٰذا موصوف نے رفقاء اور دوستوں کے اصرار پر کالج کے

---

1. *Muslim Separatism in India*, pp. 47-48 ; *Modern Muslim India and The Birth of Pakistan*, p. 77 ; *The Aligarh Movement : Its Origin and Development*, p. 66 fn;

"البشیر" ، ۳ ستمبر ۱۹۰۰ء ، ج ۲ ، ن ۲۹ ، ص ۳ ، ک ۱-۲

2. *Muslim Separatism in India*, p. 47;
A History of the Freedom Movement, Vol. III, pt. 1, pp. 29-30;
The Aligarh Movement : Its Origin and Development, p. 66.

احیاء و بقاء کی خاطر اپنا استعفا واپس لے لیا ۔[1]

گورنر یوپی اور ہندی نواز ہندوؤں نے اپنی دشمنی اور عناد سے مسلمانان ہند کو یہ احساس دلایا کہ اب وہ متحد اور متفق ہو کر اپنے سیاسی اور سماجی حقوق کے لیے اپنے پورے وسائل اور یک جہتی کے ساتھ کوشش کریں تاکہ مستقبل قریب میں ہندوستان کو ملنے والی سیاسی آزادی میں اپنا جائز اور بنیادی حصہ حاصل کر سکیں ۔ ۱۸۹۲ء کی آئینی اصلاحات اور آئندہ ملنے والی دستوری اقساط کے پیش نظر ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے اب ایک کل ہندوستان کی بنیاد پر علیحدہ سیاسی تنظیم ناگزیر تھی[2] ۔

ملک کے سیاسی حالات اور سماجی تقاضوں کے پیش نظر اب علماء نے بھی مسلم عوام کی سیاسی بیداری میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا ۔ اس سلسلے میں ۱۸۸۶ء میں علماء لدھیانہ نے کانگریس میں مسلمانوں کے شامل ہونے کا فتویٰ دیا تھا ۔ ان علماء میں مولانا محمد صاحب اور ان کے دو بھائی مولانا عبدالعزیز اور مولانا عبداللہ صاحب پیش پیش تھے ۔ نیز مولانا رشید احمد گنگوھی اور مولانا محمود حسن دیو بندی اور دیگر علماء دیو بند نے بھی کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت کے لیے فتوے جاری کیے ۔ اس سلسلے میں علماء دیوبند اور دیگر ہزاروں علماء کا مؤقف یہ تھا کہ دنیاوی امور میں مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنے میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے ۔ البتہ اس امر کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ وہ دنیاوی امور جن میں مسلمانوں اور ہندوؤں کا ساتھ مل کر کام کرنا جائز ہے وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کے منافی نہ ہوں ۔ مزید برآں ۱۸۹۳ء میں ندوۃ العلماء کی تحریک بھی شروع ہو چکی تھی ۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ علماء اپنے فروعی

---

1. *Muslim Separatism in India*, p. 47; *A History of the Freedom Movement*, Vol. III, pt. 1, pp. 29-30;

"البشیر" ، ۱۷ ستمبر ۱۹۰۰ء ، ص ۵ ؛ "موج کوثر" ، ص ۱۱۹

(نوٹ : شیخ محمد اکرام نے بیان کیا ہے کہ نواب محسن الملک کے استعفیٰ کی خبر سے ملک کے طول و عرض میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا ۔ نیز اسلامی انجمنوں نے جلسے منعقد کر کے موصوف سے استعفیٰ واپس لینے کی اپیل کی ۔ تب نواب صاحب نے ٹرسٹیوں اور احباب کے اصرار پر بقیہ میعاد کے لیے اپنا استعفیٰ واپس لے لیا ۔ "موج کوثر" ، ص ص ۱۱۹-۱۲۰)

2. *Muslim Separatism in India*, p. 47;

"روح روشن مستقبل" ، ص ۴۹؛ "تاریخ دستور ہند" ، ص ۸۹

اختلافات دور کر کے دنیاوی امور اور سائنسی علوم میں زمانہ اور وقت کے ساتھ مل کر کام کریں[1] ۔

انگریز اس بات کے خواہاں تھے کہ مسلمانان ہند سیاسی طور پر بیدار نہ ہوں ۔ اس سلسلے میں مسٹر ماریسن پرنسپل علی گڑھ کالج کا کردار بہت واضح ہے ۔ یعنی بقول مولانا طفیل احمد منگلوری ، مسٹر ماریسن اور دیگر انگریز اردو ہندی قضیہ کے سلسلےمیں مسلمانوں کی سیاسی بیداری سے بہت فکر مند تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمانان ہند اپنی کوئی سیاسی تنظیم نہ بنائیں ۔ اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے مسٹر ماریسن نے جمہوری طرز کی حکومت کے عیوب و نقائص بیان کرتے ہوئے ایک طویل مضمون ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' میں شائع کیا ۔ جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ ''ہندوستانیوں کا یہ خیال غلط ہے کہ جمہوری حکومت سے ان کی اصلاح ہو جائے گی ۔ امریکہ کے پرائیویٹ شخصوں کی زندگیاں بالکل جدا ہیں ۔ نیز انگلستان کی پارلیمنٹ کا اخلاق اس قوم کے لوگوں کے پرائیویٹ اخلاق سے گھٹا (کذا) ہوا ہے ۔ پس ہندوستان کی پارلیمنٹ مذہبی اور قومی تعصبات سے کس طرح بری ہو سکے گی ۔ کیوں کہ اس ملک میں زبردست تعصبات ہیں''[2] ۔

مسلمانان ہند کی سیاسی بیداری اور مسلم اخبارات کا کردار :

اخبارات اور خصوصاً مسلم صحافت نے مسلمانان ہند کو بیدار کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ۔ اسی عہد میں ہندوستان کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کے نئے اخبارات بھی جاری ہوئے ۔ ان مسلم اخبارات نے ایک طرف تو کانگریس کی سیاسی جد و جہد پر تنقید کی اور دوسری طرف مسلمانوں کی بھلائی اور بہبود کے لیے آواز اٹھائی ۔ ان اخبارات میں ''محمڈن آبزرور'' ، ''دی وکٹوریہ'' ، ''مسلم ہیرالڈ'' ، ''رفیق'' اور ''امپیریل'' وغیرہ کانگریس کی پالیسیوں کے خلاف لکھتے تھے ۔ ان اخبارات کے علاوہ ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ

---

۱ ۔ عزیز الرحمٰن جامعی خلف مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی،''مسلمانوں کی ڈیڑھ سو سالہ قربانیوں کا جائزہ'' ، دھلی ، س ۔ ن ، ص ۱۰ ؛
مولانا سید حسین احمد مدنی ، ''نقش حیات'' ، دیوبند : ۱۹۵۴ء ، ج ۲، ص‌ص ۲۵۹-۲۷۱ ؛
محمد مہدی ، ''تذکرہ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی مرحوم'' ، بمبئی ، ۱۹۲۵ء، ص‌ص ۲۲-۲۵
(نوٹ : علماء لدھیانہ اور علماء دیو بند اور دیگر علماء کے فتاویٰ رسالہ ''نصرت الابرار'' شائع شدہ ۱۸۹۰ء میں موجود ہیں ۔ ص ص ۱۳-۳۰ ؛
(Aziz Ahmad, *Islamic Modernism in India and Pakistan*, London, 1967, p. 190.

۲ ۔ ''روح روشن مستقبل'' ، ص ۲۹

گزٹ" بھی جو سب سے پرانا اور علمی اعتبار سے ممتاز تھا، کانگریس کی مخالفت میں پیش پیش تھا[1]۔ ۱۸۹۵ء میں "وکیل" امرتسر سے جاری ہوا ۔ مولوی انشاء اللہ خان اس اخبار کے مدیر تھے ۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی کچھ عرصہ اس اخبار کی ادارت کے فرائض انجام دیئے تھے[2] ۔ ۱۹۰۲ء میں اخبار "وطن" جاری ہوا ۔ لاہور سے "پیسہ اخبار" جاری ہوا ۔ "وکیل" اور "پیسہ اخبار" نے خلافت عثمانیہ کی حمایت میں پرزور اداریے لکھے[3] ۔ ۱۹۰۳ء میں منشی سراج الدین احمد نے جو مولانا ظفر علی خان کے والد تھے ۔ ایک اخبار "زمیندار" جاری کیا ۔ سیاسی اعتبار سے جو اہم اور ٹھوس کردار اس اخبار نے پیش کیا ، اس کی مثال ملنا مشکل ہے[4]۔

ملک کی سیاسی فضا جب اردو ہندی قضیہ کے مسموم اثرات سے مکدر تھی ، اس زمانے میں پنجاب ، سرحد اور صوبہ اودھ میں اسی فی صد اخبارات اردو ہی میں شائع ہوتے تھے ۔ نیز یہ کہ کئی اردو اخبارات کا انتظام و انصرام بھی ہندو اصحاب ہی کرتے تھے ۔ اس امر سے اردو زبان کی مقبولیت اور اس کی عمومیت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا تھا ۔ مگر اس ناقابل انکار حقیقت کی موجودگی کے باوجود متعصب ہندو ، اردو کو ختم کرنے کے درپے تھے[5] ۔

فصل چہارم

مسلمانان ہند کی سیاسی بیداری ، مسلم لیگ کا قیام اور جداگانہ انتخاب کا مطالبہ

مسلمانان ہند اب سیاسی طور پر بیدار ہوتے جا رہے تھے اور سرسید کا سیاسی مسلک یعنی "وفا داری حکومت" اب متروک ہوتا جا رہا تھا ۔ اس سیاسی بیداری میں، اخبارات ، مسلم زعماء اور علماء نے بڑا اہم اور نمایاں کردار پیش کیا ۔ ملک کی موجودہ سیاسی فضا نے مسلمانان ہند کو اپنی علیحدہ سیاسی تنظیم قائم کرنے اور متحد ہونے پر مجبور کیا ۔ دوسری طرف ہندوستان میں برطانوی طرز جمہوریت (پارلیمانی نظام) کے رفتہ رفتہ رائج

1. *The Struggle for Pakistan*, pp. 26-27.
2. *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*, p. 205.
3. *Ibid.*
4. *Ibid.*, pp. 205-6.
5. *The Indian Journal of Politics*, Jan.-Dec. 1969, pp. 80-82.

ہونے کے امکانات بڑھتے جا رہے تھے - جس کی بناء پر پڑھے لکھے طبقے نے خصوصاً اور مسلم عوام نے عموماً اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ اگر ہم نے اپنے سیاسی مفادات کی نگرانی کے لیے مستقبل قریب میں کوئی سیاسی تنظیم یا جماعت قائم نہ کی تو ہم آئندہ ہمیشہ کے لیے اکثریتی طبقے کے غلام و محکوم ہو جائیں گے - اس سلسلے میں سر سید نے ۸۸۳ ء میں مسلمانوں کے لیے ایک شاہراہ متعین کر دی تھی - یعنی موصوف نے جداگانہ انتخابات کی اہمیت اور افادیت سے مسلمانان ہند کو پہلے سے ہی آگاہ کر دیا تھا - لہٰذا مسلمانان ہند اب سنجیدگی کے ساتھ اپنی سیاسی جماعت قائم کرنے کی طرف متوجہ ہوگئے[۱] کانگریس کے قیام نے مسلمانوں کی سیاسی بیداری میں مہمیز کا کام کیا - ۱۸۹۲ء میں مولانا محمد علی مونگیری نے مختلف مکاتیب فکر کے علماء و فضلاء کو جمع کیا اور (حسب تفصیل سابق) ایک انجمن بنام "ندوۃ العلماء" ۱۳۱۰ھ/۹۳-۱۸۹۲ء میں قائم کی[۲] - اس جماعت کا مقصد علماء و فضلاء کو دنیاوی، علوم و سائنسی تحقیقات سے آگاہ کرنا تھا - نیز علماء کے آپس کے فروعی اختلافات کو دور کر کے اعتدال اور درمیانی راہ (میانہ روی) اختیار کرنے کے لیے فضا ہموار کرنا تھا - اس جماعت میں مختلف الخیال علماء نے متحد اور متفق ہوکر مسلمانان ہند کی اصلاح و فلاح کے لیے کوششیں شروع کر دی تھیں[۳] -

ہندوؤں نے اس درمیان میں تین طرح کی تحریکیں شروع کیں - ان تحریکات میں پہلی تحریک کانگریس کی تھی جو سیاسی حقوق کی جد و جہد میں پیش پیش تھی - دوسری تحریک انسداد گاؤ کشی کی تھی اور تیسری تحریک کا مقصد مذہب کے نام پر ہندو میلے اور جلسے وغیرہ منعقد کر کے ہندوؤں کو متحد اور منظم کرنا تھا - دوسری اور تیسری تحریکات کی زد براہ راست مسلمانوں پر پڑتی تھی - نیز گاؤ کشی بند کرانے کے لیے ہندو اپنے حریفوں کا سماجی اور اقتصادی مقاطعہ بھی کرتے تھے - تاکہ اس طرح مسلمانوں پر دباؤ ڈالا جائے[۴] - ابھی ملک میں یہ تحریکات جاری ہی تھیں کہ یو - پی میں اردو ، ہندی زبان کا دبا ہوا قضیہ پھر شروع ہوا - اس قضیہ نے دونوں قوموں کے درمیان بغض و عناد

---

(۱) "روح روشن مستقبل" ، ص‌ص ۳۰ - ۳۳؛
Modern Muslim India and the Birth of Pakistan, pp. 40-45.

(۲) سید محمد الحسنی ، "سیرت مولانا محمد علی مونگیری" ، لکھنو ، ۱۹۶۴ء ، بار اول، ص‌ص ۱۱۵ - ۱۱۷ ؛ مولانا سید سلیمان ندوی ، "حیات شبلی" ، اعظم گڑھ ، ۱۹۴۳ء ، ص‌ص ۳۰۳-۳۰۴

(۳) "موج کوثر" ، ص‌ص ۱۸۷ - ۱۸۸

4. ***Muslim Separatism in India***, pp. 29-30;
"مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۳۰۳؛
The Indian Journal of Politics, Vol. 3, Nos. 1 & 2, Jan.-Dec 1969, p. 78.

کی خلیج کو وسیع تر بنا دیا[1] ۔ نواب محسن الملک اور دیگر اہل الرائے مسلمان اس قضیہ اور اس سے پیدا ہونے والے اثرات سے بہت متاثر ہوئے ۔ نواب محسن الملک اردو کی بقا اور سلامتی کو مسلمانوں کی سیاسی اور سماجی بقا کے لیے لازم سمجھتے تھے ۔ ادھر گورنر یو ۔ پی سر میکڈانل کے یو ۔ پی سے چلے جانے کے بعد گورنر جیمس لے ٹوچے (James La Touche) نے گورنر یو ۔ پی کا عہدہ سنبھالا ۔ آنے والے گورنر نے اہل ہند کی تمام اقوام کو ان کے جائز حقوق کی آزادی کا یقین دلایا اور ساتھ کے ساتھ اردو کا بھی سابقہ مقام کسی حد تک بحال کر دیا[2] ۔ محسن الملک مسلمانوں کی بھلائی کی خاطر اس بات کے خواہش مند تھے کہ اردو کے تحفظ و بقا کی کوئی مستقل صورت نکل آئے ۔ چنانچہ موصوف نے ۱۹۰۳ء میں ایک انجمن بنام ''انجمن ترقی اردو'' قائم کی جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک ذیلی تنظیم تھی[3] ۔

برصغیر میں پائی جانے والی سیاسی بے چینی کے تحت سیاسی تحریک کا عمل اور سیاسی مطالبات اب روز بروز بڑھتے جاتے تھے ۔ مسلمانوں نے ان امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے ۲۱-۲۲ اکتوبر ۱۹۰۱ء کو سید شریف الدین بیرسٹر کی صدارت میں مسلمانوں کا ایک جلسہ بمقام لکھنؤ منعقد کیا[4] ۔ اس جلسے میں سر سید کے رفیق کار نواب وقار الملک نے مسلمانوں کے سیاسی حقوق و تحفظ پر روشنی ڈالی ۔ موصوف نے مسلمانوں کی اس حق تلفی پر بھی روشنی ڈالی جو کہ پبلک سروسز کی ملازمتوں میں مسلمانوں کے ساتھ برتی جا رہی تھی ، جس کی بناء پر مسلمانوں کی تعداد سرکاری ملازمتوں میں بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی ۔ نیز یہ کہ موجودہ نظام کے تحت مسلمانوں کا قانون ساز اداروں میں بھی منتخب ہونا عملاً محال تھا ۔ ان تمام امور پر غور و خوض کے بعد وقار الملک نے اس جلسے کے سامنے ایک سیاسی جماعت کی تشکیل پر زور دیا تاکہ مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی نگرانی کی جا سکے ۔ لہٰذا اس جلسے نے متفقہ طور پر ایک سیاسی جماعت کی تشکیل

---

۱ ۔ ''مسلمانوں کا روشن مستقبل''، ص ۳۳۳

2. *A History of the Freedom Movement*, Vol. 3, pt. 1, p. 31;
Modern Muslim India and the Birth of Pakistan, p. 78.

3. *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*, p. 78.

(نوٹ : انجمن ترقی اردو کے پہلے سیکرٹری مولانا شبلی مقرر ہوئے ۔ موصوف نے ۱۹۰۵ء تک اس عہدہ پر کام کیا ۔ نیز متعدد کتابیں اور ترجمے تیار کرائے ۔ بوجہ اپنی علالت دو سال بعد اس عہدے سے سبکدوش ہو گئے۔ ''مسلمانوں کا روشن مستقبل''، ص ۲۳۹)

4. *The Indian Journal of Politics*, Vol. 3, Nos. 1 & 2, Jan.-Dec. 1969, p. 82;
A History of the Freedom Movement, Vol. 3, pt. 1, p. 31,

منظور کی[1] ۔ مزید برآں یہ بھی طے کیا کہ اس قسم کی سیاسی جماعتیں دیگر صوبوں اور ضلعوں میں بھی قائم کی جائیں تاکہ ہر مقام کے مسلمان اپنے سیاسی ، اقتصادی ، سماجی اور تعلیمی مسائل کو حل کرنے میں ایک دوسرے کے مدد و معاون ثابت ہوں ۔ اس کو بروئے کار لانے کے لیے وقار الملک نے کچھ مقامات کے دورے بھی کیے اور تحریک کے مقاصد کی تکمیل کے لیے بساط بھر کوشش بھی کی ۔ مگر مسلمانوں نے اپنی عام بے حسی اور جمود کے تحت اس تحریک سے بے اعتنائی برتی جس کی بنا پر وقار الملک کو اپنی اس جد و جہد میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی[2] ۔ اس ناکامیابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ زیادہ تر سرسید کی اس پالیسی سے اب بھی متاثر تھا جس کے تحت مسلمانوں کو سیاست سے علیحدہ رہنے کا مشورہ دیا گیا تھا ۔ تاہم ۱۹۰۳ء میں شاہجہان پور یو۔پی میں مسلمانان ہند کا ایک جلسہ عام منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں ایک سیاسی انجمن بنام "محمڈن پولیٹکل ایسوسی ایشن" کا قیام عمل میں آیا ۔ اس جلسہ میں مولانا عبداللہ جان نے سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ مسلمانان ہند کے لیے اب اپنی سیاسی تنظیم قائم کرنا بے حد ضروری ہے[3] ۔

تقسیم بنگال :

کچھ عرصہ سے حکومت اس بات پر غور کر رہی تھی کہ بنگال کا بہت بڑا اور بے ڈول صوبہ دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے ۔ تاکہ انتظامی اور عدالتی امور کی انجام دہی میں سہولت اور آسانی پیدا ہو سکے ۔ اس زمانہ میں لارڈ کرزن (Lord Curzen) وائسرائے ہند تھا ۔ لارڈ کرزن نے تقسیم بنگال کی اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ۱۹۰۳ء میں خط و کتابت کے ذریعہ سیکرٹری آف اسٹیٹ برائے انڈیا کو اپنا منصوبہ پیش کیا ۔ اس درمیان میں سرکاری طور پر خط و کتابت کے ذریعے تقسیم کے ہر پہلو پر غور کیا گیا اور بالآخر فروری ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کے فیصلے کو آخری

---

1. *Lord Minto and the Indian Nationalist Movement*, p. 59;
   A History of the Freedom Movement, Vol. 3, pt. 1, pp. 31-32.
2. *Lord Minto and the Indian Nationalist Movement*, p. 59;
   A History of the Freedom Movement, Vol. 3, pt. 1, p. 32.
3. *The Indian Journal of Politics*, Jan.-Dec. ; 1959, p. 38.
   Lord Minto and the Indian Nationalist Movement, pp. 59-60.

(نوٹ : اس سیاسی انجمن کا ایک جلسہ ۲۶ جولائی ۱۹۰۳ء کو بصدارت صاحبزادہ آفتاب احمد خان ، علی گڑھ میں منعقد ہوا ۔ صاحبزادہ صاحب نے فرمایا کہ مسلمانوں کا یہ خیال غلط ہے کہ ہر سیاسی تحریک میں حصہ لینے سے حکومت ناراض ہوتی ہے ۔ پر امن جلسہ کرنا حکومت کی بد خواہی نہیں ۔ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۳۴۳)

شکل دے کر ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۵ء میں اس کو نافذ کر دیا گیا ۔ ڈاکٹر خالد بن سعید نے بیان کیا ہے کہ لارڈ کرزن نے دارالخواص میں فروری ۱۹۱۲ء میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ "تقسیم بنگال کی اسکیم کا میں موجد نہیں بلکہ یہ اسکیم میرے عہد سے بیس سال قبل زیر بحث آ چکی تھی"[1] ۔ اس تقسیم کے نتیجے میں قدرتی طور پر نئے صوبے مشرقی بنگال اور آسام میں مسلمان اکثریتی فرقہ بن گئے ۔ ہندو بنگالیوں نے اس تقسیم کو مسلمانوں کے حق میں اور اپنے خلاف تصور کیا ۔ لہٰذا انھوں نے اس فیصلے سے مشتعل ہو کر زبردست احتجاجی مظاہرے اور جلسے کیے اور جگہ جگہ ہزاروں جلسے کر ڈالے ۔ عرضداشتوں پر لاکھوں افراد کے دستخط کروا کر حکومت سے اپنا فیصلہ واپس لینے کا مطالبہ کیا ۔ مسلمانان ہند اس معاندانہ اور شدید شورش کو دیکھ کر ششدر و حیران رہ گئے[2] ۔ مزید برآں ہندوؤں نے اس تقسیم کے خلاف احتجاج کے طور پر سودیشی تحریک شروع کی ۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی مال کا بائیکاٹ کیا جائے تاکہ حکومت کو اقتصادی بحران کا سامنا کرنا پڑے اور اس طرح حکومت دباؤ میں آ کر اپنا فیصلہ واپس لے سکے ۔ دوسری طرف مسلمانوں کو بھی اس تحریک میں شرکت کے لیے مجبور کیا جاتا تھا ۔ مگر مسلمانوں کی بھاری اکثریت نے متفقہ طور پر تقسیم بنگال کی حمایت کی[4] ۔

ابھی یہ احتجاج اور شورش جاری ہی تھی کہ انگلستان میں برسراقتدار قدامت پرست پارٹی بیس سال حکومت کرنے کے بعد دسمبر ۱۹۰۵ء میں مستعفی ہوگئی اور لبرل پارٹی برسراقتدار آ گئی ۔ لبرل حکومت آئین ہند میں ترمیم کرنے کی خواہاں تھی[3] ۔ اس وقت

---

1. *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd Ed., pp. 6-24;
The Struggle for Pakistan, p. 27;
Muslim Separatism in India, pp. 52-54;
"برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ، ص ۳۲۸

2. *Muslim Separatism in India*, pp. 54-55;
Lord Minto and the Indian Nationalist Movement, p. 60;
The Indian Journal of Politics, Jan.-Dec. 1969, p. 84;
"برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ، ص ۳۲۸

3. *Muslim Separatism in India*, pp. 53,55,57;
Lord Minto and the Indian Nationalist Movement, pp. 60-61;
"مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۶۴م؛ "تاریخ دستور ہند" ، ص ۸۹

4. *Lord Minto and the Indian Nationalist Movement*, pp. 8-9;
"تاریخ دستور ہند" ، ص ۸۹

لارڈ مارلے (Lord Morley) سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہند تھے ۔ موصوف نے میزانیہ (Budget) پر تقریر کرتے ہوئے پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ حکومت برطانیہ ہندوستان کو آئینی اصلاحات کی ایک مزید قسط دینا چاہتی ہے ۔ اس قسط سے موجودہ مجالس مقننہ میں توسیع اور انتخابات کے اصول میں مزید وسعت حاصل ہو جائے گی' ۔ لارڈ مارلے کا یہ بیان جب نواب محسن الملک نے اخبار میں دیکھا تو وہ اس وقت بمبئی میں مقیم تھے ۔ موصوف نے وہاں سے ۴ اگست ۱۹۰۶ء کو ایک خط علی گڑھ کالج کے پرنسپل مسٹر ڈبلیو ۔ اے ۔ جے ۔ آرچ بولڈ (W.A.J. Archbold) کو جو شملہ میں گرمیوں کی تعطیل گذار رہے تھے لکھا ۔ نواب صاحب نے خط میں تحریر کیا تھا کہ :

"آپ والسرائے ہند سے مسلمانوں کے ایک وفد کی ملاقات کا وقت تعین کر لیجیے ۔ تاکہ ملک کو ملنے والی نئی اصلاحات میں مسلمانان ہند بھی اپنے حقوق اور مناسب حصے کا مطالبہ پیش کر سکیں اور اس طرح سے مستقبل میں اپنے سیاسی حقوق کی نگہداشت اور نگرانی کرسکیں" ۔

اس سلسلے میں محسن الملک نے والسرائے ہند کے پرائیویٹ سکریٹری مسٹر ڈن لوپ اسمتھ (Dunlop Smith) سے بڑی رابطہ قائم کیا ۔ اس خط و کتابت کے نتیجے میں لارڈ منٹو نے نواب صاحب کے مجوزہ وفد کو ملاقات کا وقت دے دیا[۲]۔

والسرائے سے وفد کے لیے ملاقات کا وقت ملنے کے بعد نواب صاحب کے سامنے سب سے پہلا مسئلہ وفد کے لیے مناسب افراد کا انتخاب تھا ۔ چنانچہ موصوف نے ہندوستان کے زعماء اور اکابرین و عمائدین کو وفد میں شرکت کے لیے مدعو کیا ۔ دوسری جانب وفد کے ساتھ لے جانے کے لیے ایک عرض داشت تیار کی ۔ اس عرض داشت کی تیاری میں نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی نے بڑی مدد کی ۔ نواب محسن الملک نے مرتب شدہ عرضداشت کو ۱۶ ستمبر ۱۹۰۶ء کو لکھنؤ کے ایک جلسہ عام میں منظور کرایا ۔

---

1. *Lord Minto and the Indian Nationalist Movement*, p. 61;
"برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ، ص ۳۲۸

2. *Lord Minto and the Indian Nationalist Movement*, pp. 61-69;
A History of the Freedom Movement, Vol. 3, pt. 1, pp. 32-33;
"برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ، ص‌ص ۳۲۸-۳۲۹

(نوٹ : ڈاکٹر شان محمد صاحب کے بیان کے مطابق والسرائے کے پاس وفد لے جانے کا خیال سب سے پہلے حاجی محمد اسمٰعیل رئیس دتاولی ، ضلع علی گڑھ کے ذہن میں پیدا ہوا تھا ۔)

The Indian Journal of Politics, Jan. - Dec. 1969, pp. 85-86;

مزید برآں موصوف نے اس عرضداشت کے سلسلے میں مسلمانوں کی مختلف جماعتوں اور انجمنوں سے بھی مشورہ کیا تھا تاکہ ہر طبقہ کی تائید حاصل ہو سکے[1]۔

مسلمانان ہند کا یہ سب سے پہلا سیاسی وفد تھا جو وائسرائے ہند سے ملا۔ اس وفد میں ملک کے ہر حصہ اور طبقہ کے زعماء اور قائدین شریک تھے۔ اس وفد کی قیادت سر سلطان محمد شاہ آغا خان سوم نے کی۔ اس وفد میں پینتیس زعماء شریک تھے۔ وفد نے یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو شملہ میں وائسرائے سے ملاقات کی[2]۔ وفد ہٰذا نے وائسرائے کی توجہ ان امور کی طرف مبذول کرائی کہ ہندوستان میں موجودہ قانون نمائندگی کے تحت مسلمانوں کا حصہ لوکل سیلف گورنمنٹ اور مقننہ میں خاطر خواہ نہیں ہے۔ للہذا ہم درخواست کرتے ہیں کہ ملک کو ملنے والی آئندہ آئینی اصلاحات میں مسلم قوم کو بہ حیثیت ایک قوم علیحدہ نیابت کی بنیاد پر مقننہ اور مقامی اداروں میں اس کا جائز حصہ دیا جائے[3]۔

وائسرائے ہند نے وفد کو اطمینان دلایا کہ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کو علیحدہ نمائندگی دی جائے اور اس سلسلے میں، میں اپنی حکومت سے بھی سفارش کروں گا کہ وہ آپ کے مطالبات کو آپ کی خواہشات کے مطابق طے کرے۔ وائسرائے نے یہ بھی فرمایا کہ اقلیتوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے کچھ زائد نشستیں ملنی چاہئیں تاکہ پاسنگ کا اصول تسلیم کر لیا جائے۔ حالانکہ اس اصول کے تسلیم کرنے کے بعد مسلمانوں کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ بلکہ وہ اکثریتی صوبوں میں بھی اپنی آبادی کے لحاظ سے کم نشستیں حاصل کر سکے اور اقلیتی صوبوں میں کچھ زائد نشستیں ملنے کے باوجود وہ اقلیت میں ہی رہے[4]۔ وائسرائے ہند سے ملاقات اور مطالبات پیش کرنے کے بعد

---

1. *Lord Minto and the Indian Nationalist Movement*, p. 69;
The Indian Journal of Politics, Jan. - Dec., 1969 p. 91.

2. *Lord Minto and the Indian Nationalist Movement*, p. 69.
(نوٹ: ڈاکٹر عبدالحمید صاحب نے اس وفد میں شرکاء کی تعداد ۳۶ بیان کی ہے۔
(*Muslim Separatism in India*, p. 75

3. *Lord Minto and the Indian Nationalist Movement*, pp. 70-71;
"برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ"، ص ۳۲۹
(نوٹ: ڈاکٹر قریشی صاحب نے بیان کیا ہے اس وفد نے خاص طور سے جداگانہ قومی رائے دہی اور جداگانہ فہرست رائے دہندگان کی بنیاد پر انتخابات کا مطالبہ کیا تھا۔ "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ"، ص ۳۳)

4. *Lord Minto and the Indian Nationalist Movement*, pp. 71-72;
"برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ"، ص ۳۳۰

یہ امر اشد ضروری ہوگیا کہ اب ان مطالبات کو تسلیم کرانے اور آئندہ سیاسی و سماجی حقوق کے تحفظ و نگرانی کے لیے مسلمانان ہند کی ایک سیاسی جماعت تشکیل کی جائے۔ چنانچہ یہ ضرورت نواب سلیم اللہ خان ڈھاکہ کی دعوت پر بمقام ڈھاکہ نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، اور دیگر زعماء ملت کی جد و جہد کے نتیجے میں پوری ہوگئی جب کہ مسلمانان ہند نے ایک سیاسی جماعت بنام ''آل انڈیا مسلم لیگ'' ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ءکو قائم کی[1]۔

---

1. *Foundations of Pakistan*, p. 1 (Introduction), 50;
''برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ''، ص ۳۳۰

باب سوم

(ب) ۱۹۰۶ء-۱۹۱۴ء برصغیر کی سیاست کا خاکہ

فصل اول

تقسیم بنگال کے علل و اسباب ، اس کا سیاسی پس منظر ، ہندوؤں کا ردعمل :

تقسیم بنگال کے متعلق مختصراً صفحات بالا میں بیان کیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ ۱۸۵۳ء میں سب سے پہلے سرچارلس گرانٹ (Sir Charles Grant) نے فورٹ ولیم پریزیڈنسی کو دو صوبوں میں تقسیم کرنے کی ضرورت محسوس کی[1]۔ اس کے بعد یعنی ۱۸۵۳ء سے لے کر ۱۲ فروری ۱۹۰۵ء تک کم و بیش ہر وائسرائے ہند نے اس صوبے کی تقسیم کو ضروری خیال کیا ۔ اس تقسیم کی بہت سی وجوہات میں سے چھ حسب ذیل تھیں :

(اول) سب سے پہلی اور اہم وجہ انتظامی اُمور میں دقتوں اور دشواریوں کو دور کرنا تھا۔

(دوم) کلکتہ پورے صوبے کا دارالخلافہ تھا اور عدالت عالیہ بھی یہیں تھیں ۔ عوام کو دور دراز مقامات سے حصول انصاف کے لیے کلکتہ ہی آنا پڑتا تھا۔ اس طرح عوام کو بلاوجہ مالی بار برداشت کرنا پڑتا تھا ۔

(سوم) تعلیمی ، صنعتی ، اور حرفتی ادارے بھی زیادہ تر مغربی بنگال میں ہی تھے ۔ نیز ملک کی سائنسی اور صنعتی ترقی میں بھی مشرقی بنگال کے عوام پس ماندہ تھے ۔ مگر یہ بات بڑی اہم ہے کہ حکومت نے بنگال کی تقسیم کا فیصلہ مندرجہ بالا علل و اسباب کی بناء پر نہیں ، بلکہ بنگال کے بے ڈول اور وسیع و عریض صوبے کی وسعت کے پیش نظر کیا تھا[2]۔

---

1. *A History of the Freedom Movement*, Vol. 3, pt. 1, p. 1;
شریف الدین پیرزادہ ، "پاکستان منزل بہ منزل" ، کراچی ، ۱۹۶۵ء ، ص ۹۵

2. *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd ed., p. 23;
A History of the Freedom Movement, Vol. 3, Pt. 1, p. 3;
"برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ، ص ۳۲۸

لارڈ کرزن نے ۱۹۰۳ء میں تقسیم بنگال کی اسکیم کو حکومت کے سامنے پیش کیا اور بالآخر ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو صوبے کی تقسیم کا سرکاری اعلان کر دیا گیا اور نئے صوبے کا دارالخلافہ ڈھاکہ کو بنایا گیا[1]۔

تقسیم بنگال کے سلسلے میں بنگالی ہندوؤں نے کانگریس کی مشارکت اور معاونت سے اس تقسیم کے خلاف جو احتجاجی مظاہرے ، بائیکاٹ اور دیگر تخریبی کارروائیاں کیں ، ہندوستان کی سیاسی تحریک میں اس سے قبل اس قسم کی کوئی مثال نہیں ملتی -

ہندوؤں کی اس سیاسی بیداری اور احتجاجی جلسوں اور جلوسوں کے نتیجے میں حکومت ہند نے دسمبر ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کو منسوخ کر دیا ۔ حالانکہ اس کے برعکس حکومت نے مسلمانوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ تقسیم بنگال کا فیصلہ قطعی اور ناقابل تبدیل ہے ۔ مگر اس کے باوجود مسلمانوں کے حقوق اور مطالبات کو نظر انداز کر دیا گیا[2] ۔

تنسیخ بنگال کے علاوہ ۱۹۱۱ء میں اور اس کے بعد بھی کئی ایسے واقعات رونما ہوئے جنھوں نے مسلمانوں کی انگریزوں کے ساتھ روایتی وفاداری کو متزلزل کر دیا اور انھیں اپنے مستقبل کی سیاسی پالیسی کے بارے میں بالکل نئے سرے سے سوچنے پر مجبور کر دیا ۔ مثلاً ۱۹۱۱ء میں طرابلس پر برطانیہ کی حمایت و مدد سے اٹلی کا قبضہ ، بلقان کی ریاستوں کا برطانیہ کی مدد و تعاون سے سلطنت عثمانیہ پر حملہ اور مسجد کان پور کا خونی حادثہ ، ان حالات نے مسلمانان ہند کو اپنے مستقبل کی فکر اور اپنے سیاسی حقوق کے لیے بیدار کیا[3] ۔

علماء کا سیاست میں حصہ :

ہندوستان میں سلطنت اسلامیہ کے قیام سے لے کر اورنگ زیب عالمگیر کے عہد تک علماء حکومت پر اثر انداز رہے ۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد علماء نے غیر سرکاری طور پر مسلم عوام کی سیاسی رہنمائی کی۔ شاہ ولی اللہ اور ان کے ہم مسلک علماء نے مسلمانوں کی سیاسی بیداری اور عوام کے حقوق کی بحالی کے لیے تاریخ میں بڑے اہم کارنامے انجام دیے ۔ مسلک ولی اللہ والے علماء نے بیسویں صدی سے قبل ایک تحریک "دارالعلوم دیو بند" اور

---

1. *Lord Minto and the Indian Nationalist Movement*, p. 26; *Muslim Separatism in India : A Brief Survey*, p. 48.
2. *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd ed., p. 30.
3. Rajendra Prasad, *India Divided*, 1946, p. 17; *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*, p. 114.

دوسری تحریک "ندوۃ العلماء" کے نام سے قائم کی ان تحریکات کا اصل مقصد اسلامی اقدار کا احیا و بقاء نیز علماء کی نئے خطوط پر تنظیم اورسائنسی، صنعتی اور حرفتی علوم کا حاصل کرنا تھا۔

مولانا محمود حسن نے (حسب تفصیل سابق) ۱۲۹۷ھ/۱۸۷۹-۱۸۸۰ء میں ایک جماعت "ثمرۃ التربیت" کے نام سے قائم کی تھی - اس انجمن کا احیاء اور تجدید ۱۳۲۷ھ/ ۱۹۰۹-۱۹۱۰ء میں شیخ الہند کی صدارت اور مولانا عبید اللہ سندھی کی نظامت میں بنام "جمعیۃ الانصار" ہوئی[1] - علماء دیوبند اور علماء ندوہ عملی طور پر سیاست میں سرگرم عمل تھے - بیسویں صدی کے آغاز سے مولانا شبلی نعمانی ، مولانا حسرت موہانی ، مولانا محمد علی ، مولانا شوکت علی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندوستان کی سیاست میں عملی حصہ لینا شروع کر دیا تھا[2] - مولانا شبلی کا عقیدہ تھا اور انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہندو مسلم اتحاد ضروری ہے اور انھوں نے کہا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد اور متفق ہو کر اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے چاہئیں[3] - مولانا شبلی نے مسلم سیاست کے متعلق اپنے مسلسل مضامین بنام "مسلمانوں کی سیاسی کروٹ" لکھے۔ ان مضامین میں مولانا نے مسلم لیگ کی تنگ نظری پر بھی تنقید کی[4] - مولانا شبلی نے مسلم لاء کے سلسلے میں وقف علی الاولاد پر بھی مضامین لکھے اور حکومت کو یہ بات باور کرائی کہ اسلامی قانون میں وقف علی الاولاد مسلمانوں کا قانونی حق ہے - لہذا مسلمانوں کو آئین کے تحت اس کا حق اور قانونی تحفظ ملنا چاہیے - مسلم لیگ نے بھی اس مسئلے کے متعلق ایک ریزولیوشن پاس کیا تھا[5] -

مولانا حسرت موہانی فارغ التحصیل عالم نہ ہونے کے باوجود سیاسی اور سماجی حلقوں میں مولانا کے نام سے ہی معروف تھے[6]۔ مولانا حسرت موہانی نے ۱۹۰۴ء میں کانگریس

---

1. *Deoband School and the Demand for Pakistan*, pp. 56-57;
مولانا مفتی عزیز الرحمٰن، "تذکرہ شیخ الہند" ، بجنور ، ۱۹۶۵ء ، ص ص ۱۵۲-۱۵۳

۲ - شیخ نیاز احمد ، "کلیات حسرت" ، لاہور ، ۱۹۶۸ء ، ص ص ۲۱-۲۲

3. *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd. ed., pp. 36-42.
4. *Ibid.*, p. 36.
5. *Foundations of Pakistan*, pp. 136-37;
"تذکرہ شمس العلماء مولانا شبلی" ، ص ۳۶

۶ - "اردوئے معلیٰ" (ماهنامہ) جولائی ۱۹۰۳ء ، ج ۱ ، نمبر ۱ ، ص ن

(نوٹ : مولانا حسرت موہانی قصبہ موہان میں ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے - ۱۹۰۳ء میں بی-اے پاس کیا اور اسی سال ماهنامہ رسالہ "اردوئے معلیٰ" جاری کیا - آپ پہلے کانگریس میں ، پھر مسلم لیگ میں شامل ہوئے - آپ سید الاحرار کے لقب سے مشہور تھے- ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو واصل بحق ہوئے - "کلیات حسرت" ، ص ۲-۱۹)

ضیاء الدین احمد برنی ، "عظمت رفتہ"، کراچی ، ۱۹۶۱ء ، ص ۱۰۴

میں شرکت کی ۔ ۱۹۰۷ء میں جب کانگریس دو ٹکڑوں میں بٹ گئی تو آپ وقتی طور پر گنگا دھر تلک کی پارٹی کے ساتھ کانگریس سے علیحدہ ہو گئے ۔ آپ نے ۱۹۰۳ء میں ماہنامہ ''اردوئے معلیٰ'' علی گڑھ سے جاری کیا[۱] ۔ مولانا حسرت موہانی نے عصر حاضر کی مصری سیاست پر اقبال سہیل کا ایک مضمون اپنے رسالے میں شائع کیا ۔ یہ مضمون برطانیہ کی نظر میں قابل اعتراض تھا ۔ مولانا حسرت نے مصری سیاست والے قابل اعتراض مضمون کو اپنی طرف منسوب کر لیا ۔ یہ مضمون ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا تھا ۔ اس مضمون میں مصطفےٰ کمال کی وفات کے موقع پر برطانیہ کی پالیسی پر بے لاگ تبصرہ اور تنقید کی گئی تھی ۔ اس تنقید پر مولانا حسرت کو باغی قرار دیا گیا ۔ نیز اس جرم کی پاداش میں دو سال قید با مشقت کی سزا سنائی گئی ۔ مولانا بیسویں صدی کے سب سے پہلے ہندی مسلمان تھے جنھوں نے سیاسی قیدی کی حیثیت سے سزا پائی ۔ اگر آپ معافی مانگ لیتے تو سزا سے نجات مل جاتی ۔ مگر موصوف کے ضمیر نے ایسا کرنا گوارا نہ کیا[۲] ۔ اس زمانے میں سیاسی قیدیوں کے لیے جیل میں اے ۔ بی ۔ سی کلاسیں نہ تھیں ۔ لہذا موصوف کو دو سال تک اخلاقی مجرموں کی طرح جیل کی سختیاں جھیلنی پڑیں ۔ ۱۹۱۰ء میں جیل سے رہائی ملی[۳] ۔

مولانا محمد علی جوہر ۱۹۰۲ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کر کے ہندوستان کو لوٹے اور رام پور کے محکمہ تعلیم میں افسر تعلیم مقرر ہوئے[۴] ۔ اس کے بعد آپ کو ریاست بڑودہ میں اعلیٰ ملازمت مل گئی ۔ مگر آپ کی حریت پسند فطرت نے باوجود حکومت

---

۱ ۔ (ماہنامہ) ''اردوئے معلیٰ'' ، جولائی ۱۹۰۳ء ، ج ۱ ، نمبر ۱ ، ص ۳۵

۲ ۔ ''معارف'' ، ۹ ستمبر ۱۹۱۸ء ، ج ۳ ، ش ۹ ، ص ۳۶۲ ؛ ''عظمت رفتہ'' ، ص ۱۸۷

(نوٹ : بقول مولانا سید سلیمان ندوی ۱۹۰۸ء میں یہ مضمون اقبال سہیل نے ''اردوئے معلیٰ'' میں شائع کرایا تھا ۔ مگر یہ مضمون قابل اعتراض تھا اس لیے مولانا حسرت موہانی نے اس مضمون کو اپنی طرف منسوب کر کے ساری ذمہ داری اپنے ہی سر لے لی ۔ ''کلیات حسرت'' ، بار سوم ، ص ۲۶)

۳ ۔ ''معارف'' ، ۹ ستمبر ۱۹۱۸ء ، ج ۳ ، ش ۹ ، ص ۳۶۲

4. *Muslim Community of Indo-Pakistan Sub-continent*, pp. 267-68.

(نوٹ : محمد علی ۱۸۷۸ء میں ریاست رام پور میں پیدا ہوئے ۔ آپ کے والد عبدالعلی خان ریاست رام پور میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے ۔ ایام طفولیت میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا ۔ لہٰذا آپ کی تعلیم اور تربیت آپ کی والدہ آبادی بیگم عرف بی اماں نے کی ۔ ۱۹۳۱ء میں انگلینڈ میں وفات پائی اور بیت المقدس میں دفن ہوئے ۔ مولانا خورشید علی مہر ، ''سیرت محمد علی'' ، دہلی ، ۱۹۳۱ء ، ص ۱۲-۱۳ ؛ ''حیات جوہر'' ، ص ۷-۸)

و آسائش کے غلامی کی زنجیروں کو پسند نہ کیا اور رخصت لے کر ریاست بڑودہ کو خیر باد کہہ دیا ۔ اس کے بعد نواب صاحب ریاست جاوہ نے آپ کو وزارت کی پیش کش کی جو آپ نے قبول نہ کی ۔ ۱۹۰۶ء میں تشکیل مسلم لیگ کے وقت صوبوں میں سے جن معزز حضرات کو منتخب کیا گیا ، ان میں سے مولانا محمد علی کو صوبہ آگرہ سے ممبر صوبائی مسلم لیگ منتخب کیا گیا[1] ۔ کم و بیش ۱۹۰۶ء ہی سے محمد علی کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے ۔

دسمبر ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں ایجوکیشنل کانفرنس کے موقع پر مسلم لیگ کی تشکیل عمل میں آئی تو مولانا اس میں مشیر و شریک تھے ۔ نیز مسلم لیگ کے آئین کی تشکیل میں بھی آپ نے اہم کردار ادا کیا ۔ مولانا کا ذاتی ریکارڈ جامعہ ملیہ دہلی میں محفوظ ہے ۔ راقم الحروف نے اس ریکارڈ کو جامعہ ملیہ ، دہلی کی لائبریری میں جا کر دیکھا ہے ۔ اس میں بہت سے ایسے کاغذات ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے بہت جلد ایک اہم سیاسی حیثیت حاصل کر لی تھی ۔ مثلاً ۲۶ فروری ۱۹۰۹ء کو ملک کی سیاسی حالت کے متعلق کامن روم لنکتران ڈبلیوسی سے مولانا محمد علی کو ایک خط موصول ہوا تھا جس میں جدا گانہ انتخابات اور مسلمانوں کو علیحدہ نمائندگی سے متعلق تحریر تھا ۔ نقل خط حسب ذیل ہے :

"Lord Minto has openly and clearly acknowledged the principle of separate and substantial representation to the Muslims[2]".

اس کے علاوہ ۱۶ مئی ۱۹۰۹ء کو گورنر بمبئی نے ایک خط کے ذریعہ مولانا محمد علی کو مندرجہ ذیل اطلاع دی :

"Six seats for Muslims whereas five was asked by Provincial Muslim League of Bombay[3]".

ان کاغذات میں لندن سے آئے ہوئے اور بھی دیگر خطوط ہیں ۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا محمد علی کا لندن میں مقیم مسلم لیڈروں سے اور لندن کے سیاسی حلقوں سے رابطہ تھا ۔

---

1. *Lord Minto and the Indian Nationalist Movement*, p. 225;
(نوٹ : شریف الدین پیرزادہ صاحب نے محمد علی کا نام بہ حیثیت ممبر صوبائی مسلم لیگ ضلع گجرات سے بیان کیا ہے ۔)
Foundations of Pakistan, p. 11.

2. *Original Letters* (*Records*) *of Maulana Mohamed Ali* in Jamia Millia, Delhi of 1909 dated 26-2-1909 and 16-5-1909, taken by me; *Foundations of Pakistan*, p. 10.

3. *Ibid.*, dated 16-5-1909; *Foundations of Pakistan*, p. 10.

مولانا محمد علی حریت پسند ، حق گو اور نڈر السان تھے - جذبۂ حریت و قومی خدمات و ایثار کو عملاً پورا کرنے کے لیے ریاست بڑودہ سے دو سال کی رخصت حاصل کی اور کلکتہ میں ایک انگریزی اخبار ''کامریڈ'' (Comrade) ۱۴ جنوری ۱۹۱۱ء سے جاری کیا - انھوں نے بہ حیثیت ایک صحافی ملک و قوم کی خدمت کرنا زیادہ پسند کیا - ''کامریڈ'' اپنی پالیسی میں صلح کل ، اتحاد بین الاقوامی کا مناد ، وطنی اختلافات کا دشمن اور حکومت کی انتظامی کمزوریوں پر آزادی سے نکتہ چینی کرنے والا تھا - اس اخبار نے بہت مختصر عرصے میں اپنے بلند پایہ علمی مضامین کی بدولت نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونی ہندوستان سے بھی اپنی متانت اور عظمت کا اعتراف کرا لیا تھا - ۱۹۱۲ء میں ہندوستان کا دارالخلافہ جب کلکتے سے دہلی منتقل ہوا تو آپ نے بھی ''کامریڈ'' کا دفتر دہلی منتقل کر دیا[1] -

مولانا ابو الکلام آزاد کا اصل نام احمد تھا - ہندوستانی سیاست میں الجھنے سے قبل آپ اتحاد اسلامی کے حامی تھے - آپ کو عربی ، فارسی اور اردو میں مہارت تامہ تھی - صحافتی زندگی میں داخل ہونے کے بعد آپ نے مغربی علوم اور انگریزی سے واقفیت حاصل کی - پہلے آپ کا خیال تھا کہ جو تحریک برعظیم تک محدود ہو وہ اسلام کی کوئی مفید خدمت انجام نہیں دے سکتی[2] -

---

1. *The Comrade*, Vol. I, No. 1, dated 14-1-1911;
Modern Muslim India and the Birth of Pakistan, p. 136;
''روح روشن مستقبل'' ، ص ۶۲ ؛
صالح الدین خان نشتر بلرامی ، ''سوانح عمری مولانا محمد علی جوہر'' ، علی گڑھ ، ۱۹۳۱ء ، ص ۹
(نوٹ : مولانا محمد علی نے ''کامریڈ'' کے پہلے شمارے میں علماء دیو بند اور صاحبزادہ آفتاب احمد خان کی ان کوششوں کا ذکر کیا ہے - جن میں طلباء دیو بند کو سائنسی اور فنی علوم حاصل کرنے کے لیے اور طلباء علی گڑھ کو دینی تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا گیا تھا - آفتاب احمد خان نے جمعیۃ الانصار کے جلسے میں شرکت کی تھی اور اسی جلسے میں یہ تجویز عمل میں آئی تھی -)
2. *The Comrade*, dt. 14-1-1911, p. 86, col. 1;
''برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ'' ، ص ۳۳۵-۳۳۶؛
(نوٹ : مولانا کا نام احمد، تاریخی‌نام فیروز بخت‌تھا - ۱۸۸۸ء میں مکہ میں پیدا ہوئے- والد صوفی خیر الدین قادری نقشبندی صوفی تھے - آبائی وطن قصور اور دہلی تھا - ننھیال مدینہ منورہ ہونے کی وجہ سے مادری زبان عربی تھی - تعلیم والد سے حاصل کی - ۱۹۵۸ء میں دہلی‌میں وفات پائی -)
Abul Kalam Azad, *India Wins Freedom*, **Bombay, 1959, p. 1-10;**
''موج کوثر'' ، ص ۲۵۰

مولانا کو ابتدا ہی سے مضمون نگاری اور اخبار نویسی کا شوق تھا۔ شروع شروع میں آپ نے مختلف اخبارات میں ادارت کے فرائض انجام دیے۔ مولانا شبلی نے آزاد کے سیاسی اور اجتماعی معتقدات پر بڑا اثر ڈالا۔ مولانا آزاد نے زعماء علی گڑھ کی حکومت کے ساتھ تعاون کی پالیسی سے شدید اختلاف کیا، اور اس پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے اسے مسلمانوں کے سیاسی تعطل کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ مولانا آزاد نے ۱۹۱۰ء میں ندوۃ العلماء میں مولانا شبلی کے خیالات کی صحیح ترجمانی کرتے ہوئے کہا کہ نئی تعلیم نے مسلمانوں کو ملازمت حاصل کرنے کے علاوہ کوئی مفید اور ترقی و عروج کی راہیں نہیں دکھلائیں۔ ۱۹۱۲ء میں مولانا نے اخبار "الہلال" کلکتے سے نکالنا شروع کیا[1]۔

ڈاکٹر قریشی صاحب فرماتے ہیں:

"مولانا آزاد اپنے ابتدائی ایام سے ہی یعنی سیاست میں حصہ لینے کے آغاز سے کانگریس کی طرف مائل تھے اور مسلمانوں کی علیحدہ تنظیم کو پسند نہ کرتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تعمیر اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بھی خلاف تھے۔ آپ کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو تمام سیاسی معاملات میں ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے[2]"۔

یہ ایک عجیب سی بات ہے کہ مولانا آزاد ایک طرف اسلام ازم اور قرآن کی طرف رجوع ہونے کی دعوت دیتے ہیں اور دوسری طرف وہ مسلمانوں کے جدا گانہ سیاسی وجود کے خلاف تھے۔ مگر سب سے زیادہ حیرت اس بات کی ہے کہ مولانا نے کوئی مثبت پروگرام بھی پیش نہیں کیا، جس پر مسلم قوم کو عملاً چلایا جاتا۔ مولانا کا سیاسی تضاد ایک معمہ اور ناقابل فہم عمل ہے[3]۔ مگر بشمول عبدالوحید خان بعض مورخین نے اپنے خیالات سے یہ تاثر دیا ہے کہ ۱۹۲۳ء تک مولانا کانگریس سے تعاون اور تائید کے حامی ہوتے ہوئے اپنی پالیسی "صراط مستقیم" پر گامزن تھے۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کو قرآن اور اس کی روشنی میں اپنے لیے آئندہ کا سیاسی لائحہ عمل مرتب کرنا چاہیے۔ جب کہ قریشی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ مولانا ابتداء ہی سے کانگریس کی حمایت اور تائید کرتے تھے۔

---

1. *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*, pp. 126-27;
"موج کوثر"، ص ۲۵۶-۲۵۷
2. I. H. Qureshi, *Ulema in Politics*, Karachi, 1972, pp. 234-35.
3. *Ibid.*, pp. 234-35.

گمان غالب یہ ہے کہ مولانا آزاد اپنے ابتدائی ایام میں مستقل مزاج نہ تھے کیونکہ ایک طرف تو موصوف پان اسلام ازم اور "صراط مستقیم" جیسی پالیسیوں کی تائید و حمایت کرتے تھے اور دوسری طرف مسلمانوں کی جدا گانہ تنظیم کے بھی خلاف تھے - یہی نہیں بلکہ آپ نے مسلمانان ہند کو مشورہ دیا تھا کہ وہ کانگریس کے ساتھ مل کر اپنا سیاسی مقصد یا مقام حاصل کریں - مولانا نے اس بات کا صحیح اندازہ نہیں لگایا کہ ماضی میں مسلمان حکمران تھے اور آج کل وہ ایک عددی اقلیت ہیں ، اور موجودہ جمہوری نظام کے تحت ، اکثریت کا فیصلہ ہی قابل قبول اور قابل عمل ہوتا ہے ، خواہ وہ فریق ثانی کو پسند ہو یا نا پسند - ایسی صورت میں مسلمانان ہند کا ہندوؤں کے ساتھ مل کر سیاسی مقاصد حاصل کرنا ان کے معاشی ، معاشرتی اور تمدنی اقدار کو خیر باد کہہ دینے کے مترادف تھا - مزید برآں مولانا نے بھی مسلمانان ہند کے مستقبل اور سیاسی اقتدار کے لیے کوئی مثبت لائحہ عمل پیش نہیں کیا ، الا اس کے کہ مسلمان ، کانگریس کے ساتھ مل کر اپنے جدا گانہ سیاسی وجود کو کانگریس یا ہندو ازم میں ضم یا ختم کر دیں[1] -

دول یورپ کی ترکی کے خلاف معاندانہ پالیسی کی مذمت کرنے میں مولانا نے اپنے اخبار کے ذریعہ ترکوں کی جرمن کے ساتھ دوستی و اتحاد کی حمایت کی - ترکی حکومت کی اس حمایت کی مہم میں مولانا محمد علی ، مولانا ظفر علی خان اور علماء دیو بند نے بھی تائید کی ، اور اس سلسلے میں ان حضرات نے خصوصی کارنامے انجام دیے - جن کی تفصیلات اگلے باب میں بیان کی جائیں گی -

مولانا ظفر علی خان کے والد منشی سراج الدین نے اخبار "زمیندار" لاہور سے جاری کیا تھا - اپنے والد کے انتقال کے بعد اخبار "زمیندار" کی ذمہ داری مولانا ظفر علی خان نے سنبھالی - آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۱۰ء سے ہوتا ہے - آپ نے ہندوستان کی ہر سیاسی تحریک میں حصہ لیا - مثلاً تحریک کانگریس ، تحریک مسلم لیگ ، تحریک خلافت، احرار اور اتحاد ملت وغیرہ - "الہلال" کی مانند اخبار "زمیندار" نے بھی مسلمانان ہند کے سیاسی شعور کو بیدار کرنے میں بڑا اہم اور مثبت کردار ادا کیا[2] -

---

1. *Ulema in Politics.*, p. 235.

(۲) "عظمت رفتہ" ، ص ۲۴۲-۲۴۹:
(نوٹ : مولانا ظفر علی خان ، ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۸۳ سال کی عمر میں وفات پائی -)

***Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*, p. 136.**

فصل دوم

بیرونی سیاست اور پان اسلام ازم :

سید جمال الدین افغانی نے پان اسلام ازم کی تحریک اس مقصد سے شروع کی تھی کہ مسلمانان عالم کو متحد کر کے خلیفۃ المسلمین کے جھنڈے تلے جمع کیا جائے۔ چونکہ اس وقت عالم اسلام میں سلطان ترکی سے زیادہ باوقار اور وسیع کوئی دیگر اسلامی سلطنت نہ تھی ، اس لیے سید جمال الدین نے مسلمانان عالم کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ سلطان ترکی کو قانوناً اور اخلاقاً اپنا خلیفہ تسلیم کر لیں[1]۔ سلطان عبدالحمید ثانی نے بھی (۱۸۷۶ء - ۱۹۰۹ء) اپنے آپ کو عالم اسلام سے بہ حیثیت خلیفہ متعارف کرایا۔ ۱۸۷۷ء کی جنگ روس و ترکی میں مسلمانان ہند نے ترکی کی مالی مدد اسی تصور یعنی خلافت عثمانیہ سے عقیدت کی بنا پر کی تھی بقول ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب "سلطان ٹیپو نے تو ۱۷۸۵ء ہی میں سلطان ترکی کو خلیفہ تسلیم کر لیا تھا"۔ مگر مسلمانان ہند نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے کچھ بعد سے سلطان ترکی کو اپنا خلیفہ تصور کرنے کا آغاز کیا[2]۔ سلطان ترکی اب صرف دولت عثمانیہ کے سربراہ ہی نہ تھے ، بلکہ وہ عالم اسلام کے خلیفہ بھی تھے۔ حالانکہ ادارہ خلافت صرف سنی مسلمانوں کی حد تک قابل تسلیم تھا ، اور شیعہ حضرات خلیفہ کو مذہبی اور روحانی اعتبار سے خلیفہ یا امیرالمومنین تسلیم نہیں کرتے تھے۔ مگر دولت عثمانیہ پر یورپین اقوام کی جارحانہ اور غاصبانہ کارروائیوں نے ہند کے شیعہ حضرات کو بھی خلافت کو بچانے کے لیے آمادہ کیا۔ چنانچہ جنگ طرابلس اور بلقان میں دیگر مسلمانان ہند کے شانہ بشانہ شیعہ حضرات نے بھی خلافت اور اسلامی سلطنت کو اغیار کے قبضے و تسلط سے محفوظ و مامون رکھنے کے لیے ہمہ قسم کا تعاون اور مدد کی[3]۔

---

1. *The Struggle for Pakistan*. p. 37;

"پیسہ اخبار" ، ۲۰ دسمبر ۱۹۰۳ء ، ص ۶ ، ک ۱ ؛

"معارف" ، نومبر ۱۹۲۱ء ، ج ۸ ، نمبر ۵ ، ص ص ۳۴۷ - ۳۴۹

2. E. Lipson, *Europe in the 19th & 20th Centuries (1815-1939)*, London, eighth edition, 1960, p. 272;
Muslim Community of Indo-Pakistan Sub-continent, p. 271;
Studies in Islamic Culture in the Indian Environment, p. 53;
The Struggle for Pakistan, p. 38.

3. K. K. Aziz, *The Making of Pakistan*, p. 109;
The Struggle for Pakistan, p. 38.

خلافت کا تصور رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وفات کے بعد خلفاء راشدین کے زمانے سے مسلمانوں کی سیاسی فکر کا حصہ رہا ہے ۔ خلافت کا تصور اسلامی سلطنت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نیابت ، ملی رشتہ، اخوت اور اسلام کی حفاظت و بقا کا ضامن خیال کیا جاتا تھا ۔ عہد مغلیہ میں عالمگیر اسلامی خلافت کا تصور کمزور پڑ گیا تھا اور سلاطین مغل خود اپنے آپ کو اس جلیل القدر منصب کا اہل سمجھنے لگے ۔ ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کی ناکامی کے ساتھ مسلمانان ہند کے سیاسی اقتدار کا آخری نشان بڑی ختم ہوگیا ۔ اب مسلمانان ہند کے لیے انگریزوں کے ساتھ تعاون کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا ۔ لیکن انیسویں صدی کے ختم ہونے سے قبل ان میں سیاسی بیداری کی لہر دوڑ گئی تھی ۔ مسلمانان عالم میں اس وقت لے دے کر ایک سلطنت ترکی بڑی اسلامی حکومت خیال کی جاتی تھی ۔ نیز مسلمانان عالم عموماً اور مسلمانان ہند خصوصاً دولت عثمانیہ کے حکمران کو روحانی اور دینی حیثیت سے اپنا خلیفہ یا پیشوا مانتے تھے ۔ مگر یورپی قومیں اسلام سے اپنی دیرینہ مخاصمتوں اور سازشوں کے تحت ، دولت عثمانیہ کو بھی ختم کرنے کے در پے تھیں[1] ۔

یورپ اور ترکی کی دیرینہ مخاصمت اور معاندانہ روش سے متعلق اجمالاً[2] حسب ذیل تبصرہ درج ہے :

صلح نامہ پیرس :

یہ معاہدہ ۳۰ مارچ ۱۸۵۶ء کو یورپ کے سات ملکوں اور دولت عثمانیہ کے مابین طے ہوا ۔ اس صلح نامہ کی ایک شرط کے تحت دولت عثمانیہ کو باقاعدہ دول یورپ کا ایک ممبر بنا لیا گیا تھا ۔ نیز اس کی آزادی اور اس کے مقبوضات کی سالمیت کے لیے بھی متحدہ طور پر ضمانت دی گئی تھی[3] ۔ اس کے علاوہ اور دیگر ضمنی معاہدات بھی ہوتے رہے مگر دول یورپ کے کسی ملک نے اپنے معاہدات اور قول و قرار میں ترکی کے ساتھ اخلاص اور دیانت داری کا ثبوت نہیں دیا ۔ چنانچہ ۱۸۷۰ء میں معاہدہ پیرس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے روس نے بحر اسود پر اپنا تسلط قائم کر لیا اور دول یورپ کے کسی ملک نے اس معاہدہ کا پاس لحاظ نہ کیا اور نہ ہی روس کو اس معاہدے کی پابندی کے لیے مجبور

---

1. **Aziz Ahmad**, ***Studies in Islamic Culture in the Indian Environment***, **London, 1964, p. 55;**
The Aligarh Movement : Its Origin and Development, **pp. 130-31;**
"نقش حیات" ، ج ۲ ، ص ۸۲

2. ***Europe in the 19th & 20th Centuries***, **pp. 271-73;**
"نقش حیات" ، ج ۲ ، ص ۸۲ - ۸۳

کیا[۱] ۔ دول یورپ کے دیگر ممالک بھی دولت عثمانیہ کے خلاف سازش کر کے وقتاً فوقتاً ترکی کے علاقوں کو غصب کرتے رہے ۔ ۱۸۷۷ - ۷۸ء میں روس نے ترکی کے خلاف جنگ شروع کی اور ۱۸۷۸ء میں ترکی کے بعض یورپی مقبوضات پر جبراً قبضہ کر لیا[۲] ۔

دول یورپ کے ان جارحانہ اقدامات کو مسلمانان ہند نے ترکی کے خلاف ایک گہری سازش خیال کیا اور مسلمانان ہند نے عموماً اور علماء دیو بند نے خصوصاً اپنے ترک بھائیوں کی مالی امداد کی ۔ علماء دیو بند نے اس مالی امداد کی ابتداء ۱۸۷۷ - ۷۸ء میں روس اور ترکی کی جنگ کے موقعہ پر کی ۔ چنانچہ "القاسم" کی اطلاع کے مطابق اس وقت مسلمانان ہند کی عام بے حسی کے باوجود مولانا محمد قاسم نانوتوی اور دیگر علماء دیو بند کی اپیل پر دو لاکھ روپے سے زائد کی رقم دولت عثمانیہ کو روانہ کی گئی ۔ حالانکہ حکومت برطانیہ نے اس زمانے میں بھی مسلمانان ہند کی وفاداری کو مشکوک خیال کرتے ہوئے ان پر کڑی نگرانی کی تھی ۔ نیز یہ کہ بیرونی ممالک سے خط و کتابت پر بھی سنسر قائم کر دیا تھا[۳] ۔

دول یورپ ، دولت عثمانیہ کو مختلف بہانوں اور حیلوں سے زچ کرتے رہتے تھے ۔ مثلاً کبھی ملک میں اندرونی اصلاحات کا دباؤ ڈالتے تھے اور کبھی ملک کے نوجوانوں کو حکومت کے خلاف مشتعل کر کے ان کو نافرمانی کرنے کے لیے ابھارتے تھے ۔ لہٰذا ان علل و اسباب کی بنا پر دولت عثمانیہ کو ضرورت اور بلا ضرورت زر کثیر خرچ کر کے اپنی افواج میں اضافہ کرنا پڑتا تھا ۔ غرض یہ کہ دول یورپ ترکی کے خلاف اعصابی اور فوجی محاذ قائم کیے ہوئے تھے۔ آخر کار ۱۸ اپریل، ۱۸۹۷ء کو ترکی اور یونان میں باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی ۔ حالانکہ ترکوں نے اس دفعہ یونانیوں کو شکست دے دی ۔ مگر اس صدی کے آخر میں دول یورپ نے ترکی کو ان کے ساتھ معاہدات ختم کرنے پر مجبور کر دیا تھا ۔ اور اسے اپنے مقبوضات خالی کرنے پر برابر دباؤ ڈالا جا رہا تھا[۴] ۔

---

1. *Europe in the 19th and 20th Centuries*, pp. 38-270-72.
2. *Ibid*., p. 38; *The Aligarh Movement : Its Origin and Development*, p. 130;
   قاضی عبدالغفار، "آثار جمال الدین افغانی" ، دہلی ، ۱۹۴۰ء، (مقدمہ)، ص (ا)
   "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" ، ۳ جولائی ، ۱۸۷۷ء، ج ۱۲ ، ش ۳۱ ، ص ۳۳۶ ، ک ۲
3. *The Aligarh Movement ; Its Origin and Development*. pp, 130-31;
   "القاسم" ذی الحجہ ، ۱۳۳۰ھ مطابق نومبر ۱۹۱۲ء، ص ۱۹ - ۲۰
4. *Europe in the 19th and 20th Centuries*, pp. 272-73;
   "وکیل"، امرتسر ، ۱۵ اپریل ۱۸۹۷ء ، ص ۱۰ - اور ۲ اگست ۱۸۹۷ء، ص ۳-۴

مسلمانان ہند نے ۱۸۷۷ء کی طرح اس جنگ یعنی ۱۸۹۷ء میں بھی ترکی کی امداد کے لیے چندہ جمع کیا ۔ اور ڈھاکہ ، بانکی پور ، کان پور ، اور علی گڑھ وغیرہ میں خاص طور پر چندہ جمع کیا گیا ۔ نیز یہ کہ ۱۷ جولائی ۱۸۹۷ء کو ترکوں کی فتح یابی کے موقع پر لکھنؤ میں دو جلسے منعقد کیے گئے ۔ مولوی ہدایت رسول نے ان جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے امیر کابل کے رسالہ ''تقویم الدین'' کی بہت تعریف کی ۔ جس کی پاداش میں زیر دفعہ ۱۲۴ (الف) مولانا پر مقدمہ قائم کیا گیا[1] ۔ اس کے علاوہ جامع مسجد علی گڑھ میں زیر صدارت مولوی سراج الحق ایک جلسہ برائے چندہ مظلومین ترک منعقد ہوا اور اس جلسے میں چندہ بھی موصول ہوا ۔ غرض یہ کہ مسلمانانِ ہند نے ترک بھائیوں کی حتی المقدور مدد کی[2] ۔

اسی طرح دول یورپ نے ترکی مقبوضات کو غصب کرنے کے منصوبے ۱۹۰۹ء میں مکمل کر لیے تھے ۔ اور ان منصوبوں کو بروئے کار لانے کے لیے ۱۹۱۱ء میں جنگ طرابلس اور پھر ۱۹۱۲ء میں بلقانی ریاستوں نے ترکی کے خلاف جنگ شروع کر دی[3] ۔

پان اسلام ازم (Pan-Islamism) :

پان اسلام ازم کا مطلب مسلمانان عالم کا سیاسی اتحاد یا اتحاد اسلام ہے[4] ۔ پان اسلام ازم کے بانی سید جمال الدین افغانی تھے ۔ موصوف نے عالمِ اسلام کو متحد اور مربوط کرنے کے لیے بین الاقوامی سطح پر کوشش کی ، موصوف نے اس سلسلے میں ہندوستان اور بیرون ہندوستان بشمول اسلامی ممالک متعدد سفر کیے اور اپنی زندگی بھر اسلامی اتحاد کے لیے کام کرتے رہے ۔ ممدوح نے اس مقصد عظیم کی تکمیل کے لیے ممکنہ سعی بلیغ کی حتی کہ اپنی دنیوی خواہشات تک کو خیر باد کہہ دیا تھا اور شادی تک نہیں کی[5] ۔ پروفیسر عزیز احمد نے امریکن اورینٹل سوسائٹی کے ''جرنل'' ستمبر ۱۹۶۹ء میں بیان کیا ہے کہ سید جمال الدین کی آمد سے پہلے ہی ہندوستان میں ''پان اسلام ازم''

---

۱ ۔ ''وکیل''، امرتسر، ۲ اگست ۱۸۹۷ء ، ج ۳، نمبر ۱۸، ص ۳ ، ک ۱-۴

۲ ۔ ایضاً ، ۲۴ مئی اور ۶ جون ۱۸۹۷ء ، ص ص ۳ ، ۱۲

3. *Europe in the 19th and 20th Centuries*, pp. 277-78;
Muslim Separatism in India, p. 85.

''تذکرہ شیخ الہند'' ، ص ۱۶۱-۱۶۲

۴ ۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی ، ''تاریخی مقالات'' ، دہلی ، ۱۹۶۶ء ، ص ۲۵۸ (حاشیہ)

۵ ۔ ''آثار جمال الدین افغانی'' ، ص ص ۳۲ ، ۳۰۹-۳۱۰؛ ''تاریخی مقالات'' ، ص ص ۲۵۸-۲۵۹

کا تصور پیدا ہو گیا تھا ۔ سید موصوف نے چار مرتبہ ہندوستان کا سفر و قیام کیا ۔ جس میں پہلا سفر ۱۸۵۴ء میں ، دوسرا قیام ۱۸۵۹ء میں ، تیسرا قیام ۱۸۶۹ء میں اور چوتھا قیام ۱۸۸۰ء تا ۱۸۸۲ء میں کیا ۔ موصوف کا چوتھا قیام بڑی اہمیت کا حامل تھا ۔ موصوف نے مختلف مسلم اور غیر مسلم ممالک کے سفر بھی کیے ۔ جن میں حجاز ، بغداد ، ترکی ، انگلستان ، روس ، پیرس ، ایران اور امریکہ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ موصوف کی تحریک "پان اسلام ازم" کا مقصد اسلامی اتحاد اور اسلامی اقدار کا احیاء و تجدید کے علاوہ سیاسی اہمیت کا بھی حامل تھا[1] ۔

سید جمال الدین افغانی جب چوتھی مرتبہ ہندوستان آئے تو ہندوستان کے رہنما سر سید احمد خان سے ان کے کچھ بنیادی اختلافات پیدا ہو گئے ۔ پروفیسر عزیز احمد کے بیان کے مطابق ان کے اختلافات کی تین خاص وجوہات تھیں :۔

(الف) جمال الدین افغانی ، سرسید کے علم الکلام اور ان کی توجیہات و تاویلات کو غلط گردانتے تھے[2] ۔

(ب) افغانی ، سر سید کے مذہبی خیالات و اعتقادات اور ان کی تعلیمی پالیسی کو مسلمانوں کے مستقبل کے لیے سیاسی غلامی میں اضافہ کا باعث خیال کرتے تھے ۔ جب کہ افغانی برطانیہ کے سخت مخالف تھے[3] ۔

(ج) سر سید عالم اسلام کے سیاسی اتحاد اور عالم اسلام کے تصور خلافت کے مخالف تھے ۔ اور انھوں نے مسلمانان ہند کو پان اسلام ازم کی شرکت سے

---

۱ ۔ ایضاً، ص‌ص ۲۵۸-۲۵۹ معہ حاشیہ ؛

Journal of the American Oriental Society, July 1969, Vol. 89, No. 3, pp. 476-479;

"اردوئے معلی" ، یکم مئی ۱۹۱۳ء ، ص‌ص ۲۴-۳۵

"آثار جمال الدین افغانی" ، ص ۳۲

(نوٹ : (اول) قاضی محمد عبدالغفار نے سید کا پہلا سفر ہند ۱۸۵۳ء لکھا ہے جب کہ پروفیسر عزیز احمد نے ۱۸۵۴ء لکھا ہے؛

(دوم) جمال الدین ابن سید صفیر قریہ اسعد آباد کابل میں ۱۸۳۸-۳۹ء میں پیدا ہوئے اور ۹ مارچ ۱۸۹۷ء بعارضہ سرطان ، قسطنطنیہ میں وفات پائی ۔ جمال الدین افغانی اپنے عزم و ارادے میں اس قدر راسخ تھے کہ انھوں نے پان اسلام ازم کو اپنی زندگی کا جزو اعظم بنا لیا تھا ۔ حتیٰ کہ اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل تک لہ کی اور مرتے وقت تک مجرد زندگی گذاری ۔ "وکیل"، امرتسر ، ۱۲ اپریل ۱۸۹۷ء، ص ۲، ک ۲ ، (ذ) "آثار جمال الدین افغانی" ، ص‌ص ۳-۶ ، ۳۰۹-۳۱۰)

2. *Studies in Islamic Culture in the Indian Environment*, p. 55.

3. *Ibid.*, p.55.

بھی منع کیا تھا[1]۔

بقول مولانا طفیل احمد منگلوری "اس مخالفت کا ایک بین ثبوت یہ تھا کہ ۱۸۸۲ء میں سرسید نے مصر اور برطانیہ کی جنگ کے دوران برطانیہ کی حمایت حاصل کرنے کے لیے مولوی سمیع اللہ خان کو مصر روانہ کیا تھا، تا کہ وہ مصری جوانوں کو برطانیہ کی مخالفت کرنے سے روکیں"۔ اس زمانے میں افغانی، مصر سے ملک بدر ہوکر ہندوستان میں مقیم تھے۔ موصوف (افغانی) سرسید اور مولوی سمیع اللہ خان سے برطانیہ کی حمایت کی بناء پر ناخوش تھے اور عربی رسالوں میں ان کے خلاف مضامین بھی شائع کرتے رہتے تھے[2]۔ ۱۸۹۷ء میں یونان اور ترکی کی جنگ میں برطانیہ نے یونانیوں کی حمایت کی تو مسلمانان ہند نے برطانیہ کی اس پالیسی کے خلاف اظہار ناراضگی کیا۔ مگر سر سید اور حاجی محمد اسماعیل نے انگریزوں کی حمایت کی۔ نیز انگریزوں کو بھی نص قرآن کے تحت "اولوالامر" کے زمرہ میں شریک کرکے ان کی سیاسی حمایت کرتے رہے[3]۔

سید افغانی نے "پان اسلام ازم" کو عالم اسلام سے متعارف کرانے کے لیے اٹھارہ سال کی عمر سے کوشش کی تھی۔ آپ کو عربی، فارسی اور یورپین علوم میں کافی دسترس تھی۔ اس سلسلے میں کابل، ہندوستان، مکہ معظمہ اور پھر استنبول اور ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء میں قسطنطنیہ پہنچے۔ استنبول میں سید موصوف کو "انجمن دانش عثمانی" کا رکن بنایا گیا۔ مگر شیخ الاسلام حسن فہمی آفندی نے حسد کی بناء پر ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء میں سلطان سے شکایت کر کے موصوف کو خارج البلد کرا دیا[4]۔ اس کے بعد ۲۲ مارچ ۱۸۷۱ء کو آپ مصر پہنچے۔ آپ کی علمی اور سیاسی شہرت کا تاریخی دور یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ مصر میں آپ کے مستقل قیام کا ارادہ نہ تھا۔ مگر ریاض پاشا وزیر اعظم مصر آپ کے فضل و کمال سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے خود اصرار کرکے شیخ کو مصر میں قیام کرنے پر مجبور کیا۔ اور ایک ہزار عروش مصری کا ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ افغانی نے جامع اظہر میں درس دیا۔ ان کے تلامذہ میں مفتی عبدہ جیسے باکمال

---

1. *Ibid.*, p. 56.

۲ - "مسلمانوں کا روشن مستقبل"، ص ۲۷۳

۳ - ایضاً، ص ص ۲۷۳-۲۷۴

۴ - ایضاً، ص ۲۷۴

۵ - "مسلمانوں کا روشن مستقبل"، ص ۲۷۴؛ "تاریخی مقالات"، ص ۲۵۸، حاشیہ؛ "آثار جمال الدین افغانی"، ص ص ۷۶-۷۸؛ "معارف"، اکتوبر ۱۹۲۱ء، ص ۲۷۴؛ "اردوئے معلی"، یکم مئی ۱۹۰۴ء ص ۲۸

اور معروف شخص تھے ۔ مگر مصر میں بعض قدامت پسند علماء آپ کے مخالف ہو گئے ۔ چنانچہ ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۹ء میں مصر سے بھی خارج البلد کر دیے گئے[1] ۔ ستمبر ۱۸۷۹ء میں افغانی مصر سے نکلنے کے بعد ہندوستان پہنچے اور ہندوستان میں آ کر ایک رسالہ بزبان فارسی "رد نیچر" شائع کیا ۔ اسی زمانے میں مصر میں شورش برپا ہوئی تو حکومت ہند نے آپ کو کلکتہ میں نظر بند کر دیا ۔ مصری شورش فرو ہونے کے بعد آپ کو آزادی مل گئی[2] ۔ "معارف" کے بیان کے مطابق آپ یہاں سے امریکہ اور پھر لندن گئے ۔ اس کے بعد تین سال تک پیرس میں مقیم رہے ۔ پیرس میں ایک اخبار "عروۃ الوثقلی" جاری کیا ۔ یہ رسالہ ۱۳۰۱ھ / مئی ۱۸۸۴ء میں جاری کیا گیا تھا ۔ اس رسالے کی آپ نے ادارت کی ۔ اس کے صرف اٹھارہ نمبر نکلے تھے ۔ ۱۳۰۳ھ - ۱۸۸۴ء میں آپ لندن چلے گئے ۔ آپ کا خیال تھا کہ لندن سے مجد جا کر ایک متمدن اسلامی سلطنت کے قیام کی کوشش کریں گے[3] ۔

۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۶-۸۷ء تا ۱۳۰۹ھ / ۱۸۹۱-۹۲ء ، افغانی نے ماسکو ، طہران ، بغداد اور بصرہ وغیرہ میں قیام کیا ۔ قیام ماسکو میں آپ نے افغانستان ، ایران ، اور ترکی کے مابین اتحاد کی تجویز پیش کی ۔ لیکن اس خیال میں ان کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی ۔ آپ پھر لندن چلے گئے اور وہاں سے ایک اخبار ۱۳۰۹ھ/ ۱۸۹۱-۹۲ء بزبان عربی اور انگریزی "ضیاء الخافقین" کے نام سے نکالنا شروع کیا[4] ۔ اس کے بعد ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء میں افغانی ، سلطان اعظم کی دعوت پر استنبول چلے گئے ۔ یہاں آپ چار سال تک مقیم رہے ۔ سید افغانی نے اسلامی ممالک کے اتحاد اور بین الاقوامی تنظیم پر بہت زور دیا ، اسی اتحاد کو وہ بین الاقوامی سطح پر اسلام کی ترقی ، احیاء اور عظمت کی بنیاد قرار دیتے تھے ۔ افغانی کے اسی جذبے نے آپ کو افغانستان ، ایران ،

---

۱ ۔ "آثار جمال الدین افغانی" ، ص ص ۸۱-۸۵ ؛ "معارف" اکتوبر ۱۹۲۱ء ، ص ۲۷۶؛ "اردوئے معلی" ، یکم مئی ۱۹۰۴ء ، ص ص ۲۸-۲۹

۲ ۔ "آثار جمال الدین افغانی" ، ص ص ۱۲۰-۱۲۸

(نوٹ : قاضی محمد عبدالغفار نے افغانی کا یہ سفر ہندوستان کا پانچواں سفر لکھا ہے ، جب کہ پروفیسر عزیز احمد نے اسے چوتھا سفر بیان کیا ہے ۔)

۳ ۔ "معارف"، اکتوبر ۱۹۲۱ء ؛ ج ۸ ؛ ش ۴ ، ص ص ۲۷۷-۲۸۲؛
"اردوئے معلی"، یکم مئی ۱۹۰۴ء ، ص ص ۲۹-۳۰؛
"تاریخی مقالات" ، ص ۲۵۹ ، حاشیہ ؛ "آثار جمال الدین افغانی" ، ص ۱۷۰

۴ ۔ ایضاً ، ص ۲۵۲

ہندوستان ، مصر اور ترکی وغیرہ میں سیاسی خدمات کے لیے ابھارا تھا ۔ آپ اپنی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے لندن ، پیرس ، ماسکو اور پیٹر برگ وغیرہ میں بھی سیاسی کارنامے انجام دیتے رہے[1] ۔

افغانی کو اقوام عالم کی تاریخ ، اخلاق ، عادات اور سیاسی امور سے خاص دلچسپی اور واقفیت تھی ۔ آپ زندگی کے آخری دور میں قسطنطنیہ میں مقیم رہے ۔ سلطنت عثمانیہ نے آپ کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا ۔ نیز حکومت کی جانب سے تمام آسائش و آرام بھی مہیا کیا گیا تھا ۔ آپ کو علوم عقلی و نقلی خصوصاً فلسفہ قدیم و جدید ، تاریخ اسلام اور احوال اسلام میں وسیع معلومات حاصل تھیں ۔ آپ کی زندگی کا اصل مقصد یہ تھا کہ تمام روئے زمین کے مسلمان متحد اور متفق ہو کر سلطنت عثمانیہ کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں ۔ اس مقصد کے حصول میں آپ نے تمام عمر صرف کر دی مگر افسوس ! وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے اور ۹ مارچ ۱۸۹۷ء کو اس دار فانی سے رخصت ہو گئے[2] ۔

۱۸۸۶ء میں ایک انجمن بنام "انجمن اسلام" قائم ہوئی ، مگر یہ انجمن اس وقت نہ چل سکی ۔ پھر ۲۳ جون ۱۹۰۳ء کو لندن میں مسلمانوں کی ایک جماعت بنام "پین اسلامک سوسائٹی" قائم ہوئی ۔ اس سوسائٹی کا یہ مقصد تھا کہ روئے زمین کے مسلمانوں کی مذہبی ، تمدنی ، اخلاقی اور ذہنی اصلاح کی جائے ۔ اسلامی تعلقات اور رشتۂ اخوت کو مضبوط کیا جائے ۔ باہمی میل ملاپ کے وسائل مہیا کیے جائیں ۔ غیر قوموں میں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں ، انھیں بذریعہ تحریر و تقریر دور کیا جائے ۔ اخبار و رسائل شائع کر کے غلط اور مسموم پروپگنڈے کا جواب دیا جائے ۔ اس سوسائٹی نے اس عرصے میں اپنے فرائض کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا[3] ۔ یورپ میں "پین اسلام ازم" سے متعلق یہ تصور تھا کہ تمام دنیا کے مسلمان یورپین قوموں کے خلاف کمر بستہ ہیں اور وہ اس انتظار میں ہیں کہ جب ان کو

---

۱ ۔ "معارف"، نومبر ۱۹۲۱ء ، ج ۴ ، نمبر ۵ ، ص ص ۳۴۴-۳۴۹ ؛
"اردوئے معلیٰ"، یکم مئی ۱۹۰۴ء ، ص ص ۳۰-۳۱

۲ ۔ ایضاً، ص ص ۳۳-۳۵؛ "وکیل" امرتسر ، ۹ مارچ ۱۸۹۷ ، ص ۹ ، ک ۲؛
"معارف"، نومبر ۱۹۲۱ء ، ص ص ۳۴۷-۳۴۸؛ "آثار جمال الدین افغانی" ، ص ۲۹۰

۳ ۔ "پیسہ اخبار"، ۲۰ دسمبر ۱۹۰۳ء، ص ۶ ، کالم ۱ ؛
The Struggle for Pakistan p. 37
(نوٹ ; مدیر "پیسہ اخبار" نے "انجمن اسلام" کے محرکین کی نشاندھی نہیں کی) ۔

موقعہ ملے وہ یورپین اقوام پر حملہ آور ہوں[1] ۔ ڈاکٹر عبد الحمید نے یورپین اقوام کے اس خدشے کے متعلق لکھا ہے کہ یہ امر واقعات اور حقیقت کے خلاف ہے ۔ اصل میں پان اسلام ازم کا مقصد یہ تھا کہ تمام عالم اسلام ایک مرکز کے تحت مجتمع ہوکر اپنی بکھری ہوئی اور منتشر طاقت کو متحد کر لے ۔ لہٰذا "پان اسلام ازم" سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہیں تھا کہ عالم اسلام یورپین اقوام کے خلاف کمر بستہ ہو کر ان پر حملہ آور ہوگا[2] ۔

مولانا ابوالکلام آزاد ، سید افغانی کے "نظریہ پان اسلام ازم" کے موید تھے ۔ مولانا موصوف نے سرسید کے نظریہ "حکومت برطانیہ کی وفاداری" کو باطل قرار دیا ۔ نیز مولانا نے "پان اسلام ازم" کی توضیح کرتے ہوئے اس کے پانچ ستون یا پانچ بنیادی اصول قرار دیے :

(ا) ایک خلیفہ یا امام کی حمایت میں مسلمانوں کا اجماع ،
(ب) خلیفہ کا اقتدار مضبوط کرنا ،
(ج) خلیفہ کی اطاعت کرنا ،
(د) دارالاسلام کے لیے ہجرت کرنا اور
(ہ) جہاد کرنا ۔

جہاد کی مختلف شکلیں اور نوعیتیں ہو سکتی ہیں ۔ مولانا نے فرمایا تھا کہ "قرآنی حکم کے مطابق جہاد ان لوگوں کے خلاف جائز ہے ، جو دارالاسلام کے کسی حصے یا شہر پر قبضہ کریں"۔ مولانا کی نظر میں سلطان ترکی سے مسلمانوں کی سیاسی وفاداری مسلمانوں کا حق تھا[3] ۔

فصل سوم

جنگ طرابلس و بلقان اور مسلمانان ہند کا رد عمل

طرابلس اور اطالوی جنگ کی وجوہات :

افریقہ کی ساحلی حکومتیں سلطنت عثمانیہ کے قبضے میں تھیں ۔ بعد میں رفتہ رفتہ یہ حکومتیں خود مختار ہوتی گئیں ۔ یہ ریاستیں نو آبادیات اور تجارتی منڈی بنانے کی

---

1. *Muslim Separatism in India*, p. 85;
"مسلم گزٹ"، لکھنؤ، ۱۱ ستمبر ۱۹۱۲ء ، ص ۳
2. *Muslim Separatism in India : A Brief Survey*, p. 85;
"آثار جمال الدین افغانی" ، ص ص ۳۰۹-۳۱۰
3. *Studies in Islamic Culture in the Indian Environment*, pp. 66-67.

غرض سے مغربی ممالک کے لیے مرکز توجہ تھیں ۔ چنانچہ انگلستان نے مصر پر اور فرانس نے الجزائر اور تونس پر اپنا تسلط قائم کر لیا ۔ ۱۹۰۴ء میں فرانس اور انگلستان میں ایک معاہدہ ہوا جس میں انگلستان کا قبضہ مصر پر بلا شرکت غیرے تسلیم کر لیا گیا اور فرانس کو مراکش کی آزاد حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے انگلستان نے معاوضتاً مدد دینا منظور کیا[1] ۔ دولت عثمانیہ کے خلاف دول یورپ کی ریشہ دوانیاں عرصے سے جاری تھیں ۔ ۱۹۰۹ء میں یورپ کے بعض دول نے دولت عثمانیہ کو غصب کرنے کے منصوبے مکمل کر لیے تھے[2] ۔ ۱۹۱۰ء میں اڈنبرا (اسکاٹ لینڈ) میں تمام دنیا کی مشنری انجمنوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی ۔ اس کانفرنس میں یہ مسئلہ زیر غور تھا کہ عیسائیت کی اشاعت میں جو رکاوٹ اسلام نے پیدا کی ہوئی ہے ، اس کا سدباب کس طرح کیا جائے ۔ منجملہ دیگر امور کے اس کانفرنس میں یہ بھی طے پایا کہ پادریوں کی ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جو اپنے آپ کو اسلامی تاریخ اور عربی زبان کی تحصیل و اسلامی روایات کو حاصل کرنے کے لیے وقف کر دے ۔ چنانچہ پرجوش پادریوں کی ایک بڑی تعداد اس کام کی تکمیل کے لیے متوجہ ہوئی تاکہ اس عمل کے تحت لوگوں کو آسانی کے ساتھ گمراہ کیا جا سکے[3] ۔ دول یورپ (بہ استثناء جرمنی) اور عیسائیوں کی یہ تمام تدابیر اسلام اور پرستاران اسلام کو کمزور بلکہ دنیا سے نیست و نابود کرنے کی کوششیں تھیں ۔ اٹلی سالہا سال سے طرابلس کو غصب کرنا چاہتا تھا ۔ چنانچہ اس نے ۱۹۱۱ء میں یکایک طرابلس پر حملہ کر دیا ۔ اس حملے کے بعد بلقانی ریاستوں نے بھی اپنے ناپاک عزائم کو پورا کرنے کے لیے ایک دوسرے سے گفت و شنید شروع کی اور متحد و متفق ہو کر ترکی پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں[4] ۔

جنگ بلقان اور اس کی ابتداء :

"لکھنؤ مسلم گزٹ" نے بحوالہ "بلنٹ" لکھا ہے کہ برطانیہ کی وزارت خارجہ کو

---

۱ ۔ "نقش حیات" ، ج ۲ ، ص ۱۱۴؛ "اردوئے معلی"، جنوری ۱۹۱۲ء ، ص ۲۷

۲ ۔ "تذکرہ شیخ الہند" ، ص ص ۱۶۱-۱۶۲

(نوٹ : ان معاہدات کے علاوہ انگلستان ، فرانس اور روس کے درمیان "ٹرپل ان ٹنٹی" کے نام سے ایک سیاسی اتحاد موجود تھا ۔ اس کے علاوہ اٹلی ، جرمنی اور آسٹریا کا سیاسی اتحاد موسوم بہ "ٹرپل الائنس" بھی "ٹرپل ان ٹنٹی" کی طرح ایک عرصے سے قائم تھا ۔ "اردوئے معلی"، جنوری ۱۹۱۲ء ، ص ۲۸)

۳ ۔ رئیس احمد جعفری (مرتب)، "علی برادران" ، لاہور ، ۱۹۶۳ء ، ص ۲۱۳

4. Ram Gopal, *Indian Muslim : A Political History (1885-1947)*, Bombay, 1959, p. 122.

اس بات کا علم ہوا کہ سابق وزیر ترکی سعید پاشا طرابلس کی بندرگاہ طبروق کو بحری اسٹیشن بنانے کے لیے جرمنی کو ٹھیکہ کے طور پر دینے والے ہیں ۔ (''مسلم گزٹ'' نے اس کی تاریخ بیان نہیں کی ہے ۔ گمان اغلب ہے کہ یہ انکشاف نومبر ۱۹۱۲ء سے پہلے ہی ہوا ہوگا ۔) سرایڈورڈ گرے اس خبر سے پریشان ہوئے اور انھوں نے اس علاقے پر اٹلی کے قبضے کو جرمنی کے قبضے سے کم خطرناک سمجھا ۔ لہٰذا برطانیہ نے اٹلی کو طرابلس پر حملہ کرنے کی اجازت دے دی ۔ اس کے بعد لارڈ کچنر کو مصر بھیجا تاکہ وہ مصر کو وعدے کے مطابق غیر جانب دار رکھنے کی کوشش کرے ۔ نیز یہ کہ برطانیہ کے اس عمل سے افریقہ میں عساکر عثمانی کو خشکی کی جانب سے کوئی مدد بھی نہ مل سکے[۱] ۔

جنگ طرابلس ، بلقان اور مسلمانان ہند کی بے چینی :

دول یورپ کی ملک ہوس گیری اور تاخت و تاراج کی بدولت دنیاء اسلام عجیب مشکل اور پریشانی میں مبتلا تھی ۔ یوں تو اطراف عالم کے مسلمان یا تو محکوم ہو چکے تھے یا پھر اپنی ہی مقامی مشکلات میں مبتلا تھے ۔ ترک انیسویں صدی کے ختم تک دول یورپ سے کیے ہوئے معاہدات کی پابندی کرتے چلے آتے تھے ۔ مگر حالات کی تبدیلی نے انھیں اب اس بات کے سمجھنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اقوام یورپ انھیں کم زور اور بے دست و پا کرنا چاہتے تھے ۔ جنگ طرابلس کے موقع پر مسلمانان عالم نے ترکی مقبوضات کی حفاظت کو اپنا فرض خیال کرتے ہوئے ترکوں کی ہر جائز اور قانونی مدد کی تاکہ دشمنان اسلام کے ناپاک عزائم کو کام یاب نہ ہونے دیا جائے[۲] ۔ ان حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لندن کے اخبار ''ٹائمز'' نے لکھا :

''ترکی اور اٹلی کی جنگ کی بناء پر نیز برطانیہ کی اس پالیسی کے نتیجے میں ، جس کے تحت روس کی مداخلت کو ایران میں جائز قرار دیا گیا ، اب مسلمانان عالم میں ''پان اسلام ازم'' کا خیال از سر نو زندہ ہو رہا ہے اور یہ ایک خوفناک خطرہ ہے[۳] ۔''

---

۱ ۔ ''مسلم گزٹ'' لکھنؤ ، ۱۸ دسمبر ۱۹۱۲ء ، ج ۱ ، نمبر ۴۹ ، ص ۲

(نوٹ : مندرجہ بالا عبارت کی تصدیق ''اردوئے معلی'' اور ''مسلم گزٹ'' کے علاوہ کسی اور سند سے نہ ہو سکی - راقم)؛

ایضاً ، نومبر ۱۹۱۲ء ، ج ۱۳ ، نمبر ۵ ، ص ۲۷

۲ ۔ ''اردوئے معلی'' جنوری ، ۱۹۱۲ء ، ص ص ۲۷۔۳۰

۳ ۔ ''مسلم گزٹ'' لکھنؤ ، ۱۱ ستمبر ۱۹۱۲ء ، ج ۱ ، نمبر ۳۵ ، ص ۳

(نوٹ : اخبار ''ٹائمز'' کا حوالہ ایڈیٹر ''مسلم گزٹ'' نے دیا تھا) ۔

مولانا محمد علی نے مسلمانان عالم کو ایک مخصوص اور متعین مقصد یعنی اپنی سیاسی قوت کو یکجا کرنے کی خاطر متحد ہونے پر زور دیا ۔ مولانا محمد علی کی رائے میں جہاں تک مراکش ، طرابلس ، ایران اور مقدونیہ وغیرہ کے غصب کرنے کا تعلق تھا ، ''پان اسلام ازم'' اس سلسلے میں بہت مفید اور کارآمد خدمت انجام دے سکتا تھا[1] ۔

مسلمانان ہند نے اپنے ترک بھائیوں کی جو خدمات انجام دیں ان کو مندرجہ ذیل چار درجوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے :

(اول) مالی امداد ،

(دوم) طبی امداد ،

(سوم) اخلاقی امداد اور

(چہارم) عوام و اخبارات کی آواز ۔

مالی امداد :

مسلمانان ہند ہمیشہ اپنے مسلم بھائیوں کی مصیبت کے وقت مالی امداد کرتے رہے تھے ۔ یعنی یہ کہ ۱۸۷۷ء کی روس و ترکی کی جنگ میں علماء دیوبند خصوصاً مولانا قاسم نانوتوی نے (حسب تفصیل بالا) چندہ فراہم کر کے بقول ''القاسم'' دو لاکھ روپے سے زائد کی رقم ترکی قونصل مقیم بمبئی کے ذریعہ ترکوں کو روانہ کی[2] ۔ اس کے بعد ۱۸۹۷ء میں یونان اور ترکوں کی جنگ میں بھی اہل ہند نے چندہ فراہم کر کے معرفت ''وکیل'' امرتسر دولت عثمانیہ کو روانہ کیا[3] ۔ پھر جنگ طرابلس و بلقان میں بھی شیخ الہند مولانا محمود حسن نے ترکوں کی امداد کے متعلق فتویٰ جاری کیا ۔ جس میں ترکوں کی امداد کو مباح قرار دیا گیا[4] ۔ پروفیسر عزیز احمد نے بیان کیا ہے کہ علماء دیوبند نے جنگ عظیم اول میں ترکوں کی امداد کے سلسلے میں سب سے پہلے پیش قدمی کی اور

---

1. *The Comrade*, 14th June 1913, p. 480, C. 1, Vol. 5, No. 2.

۲ ۔ ''القاسم'' ، ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۲ء ، ص ص ۱۹-۲۰ ؛
مولانا سید حسین احمد مدنی ، ''سفر نامہ شیخ الہند اسیر مالٹا'' ، دہلی ، ۱۹۴۷ء ، ص ص ۱۵-۱۶

۳ ۔ ''وکیل'' امرتسر ، ۲۶ اپریل ، ۱۸۹۷ء ، ص ۱۴ ، ک ۱

۴ ۔ ''سفرنامہ شیخ الہند اسیر مالٹا'' ، ص ص ۱۵-۱۶ ؛ ''حیات شبلی'' ، ص ۹۵ ۔
''مسلم گزٹ'' لکھنؤ ، ۳۱ دسمبر ۱۹۱۲ء ، ص ۳ ، ک ۱ ۔

مولانا محمود حسن نے بڑی جد و جہد کی ۔ ترکوں کی مالی اعانت کے سلسلے میں ایک لاکھ سے زائد فتوے شائع کرا کر تقسیم کیے ۔ دارالعلوم اور اس سے متعلق مدارس کے مدرسین اور طلباء کے وفود ہند کے اطراف و جوانب سے حتیٰ کہ دیہاتوں تک سے بھی چندہ جمع کرکے لائے ۔ نیز ان بزرگوں نے دورے کرکے رؤسا ، علماء ، مشائخ اور عوام کو مواعظ و نصائح کے ذریعہ چندہ دینے کی ترغیب دی ۔ اس جماعت کی مساعی جمیلہ سے ایک خطیر رقم اندازاً تین لاکھ روپے مقامی انجمنوں اور اخبارات کے ذریعہ سے ترکی روانہ کی گئی ۔ اس کے علاوہ اراکین دارالعلوم کے توسط سے بھی پچھتر ہزار روپے سے زائد کی رقم نیشنل بینک کے توسط سے پریسیڈنٹ(صدر) ہلال احمر قسطنطنیہ کے نام روانہ کی گئی[1]۔ مزید برآں شیخ الہند نے مدرسہ کی تعطیل کرا دیں تاکہ مدرسین و طلباء چندہ فراہم کرنے کی مہم میں حصہ لے سکیں ۔ اس کے علاوہ مولانا محمود حسن نے خود اپنی تنخواہ اور تمام ملازمین و مدرسین کی تنخواہیں بھی چندہ میں دے دیں ۔ طلباء نے موصوف کے ایماء پر اپنے اپنے انعامات اور مطبخ کی خوراک تک چندہ میں دے ڈالی ۔ اس طرح تقریباً ایک ڈیڑھ لاکھ روپے ترکی کو بھیجا گیا ۔ حکومت ترکی نے شکریہ کے طور پر ایک رومال جس میں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیراہن مبارک رکھا تھا ، وہ بطور تبریک دارالعلوم کو بھیجا جو دارالعلوم کے پاس اب بھی تبرکاً موجود ہے[2]۔ اس کے علاوہ تمام مسلمانان ہند نے چندہ کی مہم میں حصہ لیا ۔ مولانا محمد علی نے مساکین اور محرومین کی امداد کے لیے ایک ہزار پونڈ کی رقم وزیراعظم دولت عثمانیہ کو روانہ کی جس کی وصولیابی کی رسید بذریعہ تار ایڈیٹر "کامریڈ" کو معہ شکریہ وزیراعظم ترکی کی جانب سے موصول ہوئی[3] ۔ ترکوں کی امداد کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ :

> "جنگ بلقان میں مسلمانان ہند نے اپنے روحانی و مذہبی پیشوا سلطان روم اور اپنے ہم مذہب بھائیوں کے ساتھ ہمدردی کے پیش نظر چندہ فراہم کرکے ترکوں کی امداد کے لیے روانہ کیا ۔ چندہ کی اس مہم میں بہت سے ہندوؤں نے بھی حصہ لیا تھا[4]۔"

---

1. *Islamic Modernism in India and Pakistan*, p. 133 ;
"مسلم گزٹ" لکھنؤ ، ۳۱ دسمبر ۱۹۱۲ء ، ج ۱ ، ش ۱۵ ، ص ۳ ، ک ۱؛
"القاسم" ، ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ ، ص ۲۰

۲ ۔ "تذکرہ شیخ الہند" ، ص ۱۶۳

۳ ۔ "ہمدرد" ، ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء ، ص ۱ ، ک ۱-۲

۴ ۔ "الہلال" ، ۱۶ جولائی ۱۹۱۳ء ، ج ۳ ، نمبر ۴ ، ص ۵۷ ، ک ۲

طبی امداد :

جنگ کے دوران مالی امداد کے علاوہ مجروحین و مضروبین کی مدد کےلیے طبی امداد کی بھی سخت ضرورت تھی۔ مسلمانان ہند نے اس امر کا احساس کرتے ہوئے ترکوں کی طبی امداد کے لیے ایک انجمن "ہلال احمر" قائم کی ۔ مولانا محمد علی نے مسلمانان ہند سے ترکی طبی مشن کے لیے چندہ کی اپیل کی ۔ اس اپیل کو لوگوں نے فراخ دلی کے ساتھ لبیک کہا اور اس پر عمل بھی کیا[1] ۔ "علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کی اطلاع کے مطابق ہندوستان سے ہلال احمر کا پہلا طبی مشن یکم دسمبر ۱۹۱۲ء کو روانہ ہوا ۔ اس مشن میں ۶ سرجن ، ۱۰ ڈریسرز ، دو ڈولی بردار اور دو ملازم تھے۔ اس طبی مشن کو ڈاکٹر سہروردی نے ینگ مسلم ایسوسی ایشن اور انجمن ضیاء الاسلام ، ہلال احمر کلکتہ ، بمبئی اور مدراس سے مرتب کیا تھا ۔ یہ مشن ڈاکٹر محمد حسین کی زیر نگرانی روانہ ہوا اور ڈاکٹر سہروردی جو اس وقت ایڈنبرا میں تھے، وہیں سے براہ راست قسطنطنیہ پہنچے تھے[2]۔ اس طبی مشن کے متعلق عصر حاضر کی شائع شدہ کتب میں کوئی ذکر راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزرا ۔ البتہ ۱۹۱۳ء کے اوائل میں ایک دوسرے میڈیکل مشن کا ذکر متعدد کتب میں موجود ہے ۔ یہ وفد ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں ۱۹۱۳ء کے اوائل میں قسطنطنیہ روانہ ہوا ۔ اس وفد میں آٹھ ڈاکٹر ، ۲ ڈریسرز ، ایک درجن کے قریب ایمبولینس، بئیررز اور اس کے ممبران میں چھ طالب علم تھے[3] ۔ اس سلسلے میں ایک خط ڈاکٹر انصاری کی خط و کتابت کی فائل سے راقم کو نہرو میوزیم دہلی سے دستیاب ہوا ہے ۔ جس کی نقل حسب ذیل ہے :

> Lucknow : 26th November 1912, My Dear Ansari,
> "Maulana Abdul Bari Farangi Mahal had a talk with the commissioner of Lucknow Lovet, in the course of which he remarked, "No mission will be allowed to go. The certified

---

۱ ۔ "علی برادران" ، ص ۱۱۳

(نوٹ : انجمن ہلال احمر دہلی میں مسلمانان ہند نے قائم کی تھی ۔ نیز ترکی میں ہلال احمر علیحدہ سے قائم تھی جو "ہلال احمر ترکی" کے نام سے تھی) ۔

۲ ۔ "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" ، ۱۱ دسمبر ۱۹۱۲ء ، ج ۱۲ ، نمبر ۹۴ ، ص ۱۴ ، ک ۔ ۱ ۔

3. *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd ed., p. 38;
Muslim Separatism in India : A Brief Survey, p. 101;
چودہری خلیق الزمان ، "شاہ راہ پاکستان" ، کراچی ، ۱۹۶۷ء ، ص ۲۵۴

doctors may be allowed to go but nobody else will be allowed to accompany them."

Sd/- Nizamud din Husain[1].

ڈاکٹر شیخ محمد اکرام نے بیان کیا ہے کہ اس طبی مشن کی ترتیب میں مولانا ابوالکلام کا خصوصی حصہ تھا ۔ مگر چودھری خلیق الزمان کے بیان کے مطابق یہ مشن مولانا محمد علی نے بھیجا تھا ۔ بہرحال یہ طبی مشن مسلمانان ہند کی جانب سے بیرون ہند میں خیر سگالی کا ایک عملی نمائندہ تھا[2] ۔ اس مشن نے ترک مجروحین و مضروبین کی تیمار داری بڑے خلوص ، جذبۂ ایثار اور ہمدردی کے تحت انجام دی ۔ سلطان‌ترکی اور ترکی عوام نے ہندوستانی مسلمانوں کی اس بےلوث ہمدردی اور قربانی سے متأثر ہوکر مسلم رشتہ اخوت و محبت کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے پر بہت زور دیا اور یہ کوشش برابر جاری رہی[3] ۔ یہ طبی وفد چھ ماہ قیام کرنے کے بعد ۳ جولائی ۱۹۱۳ء کو بمبئی واپس پہنچ گیا ۔ ڈاکٹر انصاری نے ہندوستان کا دورہ کرکے اپنے مشن کی خدمات اور ترکوں کے متعلق صحیح معلومات فراہم کیں اور یہی اس مشن کا سب سے بڑا اور اہم نتیجہ تھا ۔ یعنی وحدت اور باہم دگر رشتۂ اخوت کی تجدید و احیاء اس کا ثمرہ تھا ۔ جو خاطر خواہ برآمد ہوا[4] ۔

اخلاقی امداد :

دول یورپ اور ترکوں کی جنگوں نے مسلمانان ہند کو اپنے ہم مذہب بھائیوں کی ہمدردی اور مدد کے لیے مجبور کر دیا تھا ۔ اس سلسلے میں مسلمانان ہند نے دامے ، درمے، سخنے اپنے بھائیوں کی مدد و اعانت میں حتی المقدور کوششیں کیں ۔ چناں چہ مسلم لیگ کونسل نے اٹلی کے حملہ کی شدید مخالفت کرتے ہوئے عوام کو مشورہ دیا کہ وہ اٹلی کی اشیاء کا مقاطعہ یا بائیکاٹ کریں ۔ مسلمانان ہند نے مساجد میں نمازوں کے بعد ترکوں کی کام یابی کے لیے دعائیں مانگیں ۔ مولانا شبلی نے "پان اسلام ازم" پر ایک بڑی پر درد و پر اثر نظم لکھی ۔ ڈاکٹر اقبال نے مسلمانان ہند کی بے چینی کا اظہار ایک نظم کی شکل

1. *Original Papers of Dr. Mukhtar Ahmad Ansari*, Real No. 1, Form 9,6, 1911 dt, 20, 11, 1912, taken by me from Nehru Museum and Library, Teen Morti House, New Delhi.
2. *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*, p. 152;
"شاہ راہ پاکستان" ، ص ۲۵۳
3. *Muslim Separatism in India*, pp. 101-2 ;
Ibid., p. 101;
"الہلال" ، ۸ جنوری ۱۹۱۳ء ، ج ۲ ، نمبر ۲ ، ص‌ص ۲۲-۱۳۱

میں بطور احتجاج کیا - نیز بادشاہی مسجد لاہور میں ایک بڑے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے احتجاجی تقریر کی[1] - طلباء علی گڑھ نے ایک ریلیف فنڈ قائم کیا اور انھوں نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ اپنے کھانوں میں گوشت اور اچھا کھانا نہیں کھائیں گے اور اس طرح جو بچت ہوگی - اسے ترک مجروحین کی مدد کے لیے روانہ کریں گے - مزید برآں طلباء نے اپنے قیمتی کپڑے اور تعیش کا سامان اور جیب خرچ تک بھی ترکوں کی مدد کے لیے روانہ کیا - اسکول کے طلباء نے یہاں تک قربانی دی کہ وہ صبح بغیر ناشتہ کیے ہوئے پڑھنے چلے جاتے تھے - علاوہ ازیں کالج کے طلباء ہر شام کو کالج کی جامع مسجد میں جمع ہوکر بعد نماز مغرب ترکوں کی فتح و کامرانی کے لیے دعائیں مانگتے تھے[2] - مسلمانان ہند نے اپنے پورے وسائل اور توجہ کے ساتھ ترکوں کی ہمہ قسم کی مدد کے لیے کام کیا - "ریڈکریسنٹ سوسائٹی" تمام بڑے بڑے شہروں میں چندہ جمع کرنے کے لیے دورہ کرتی تھی اور ٹرکش بانڈ بیچ کر چندہ جمع کرتی تھی[3] - سید امیر علی نے "برٹش ریڈ کریسنٹ سوسائٹی" (British Red Crescent Society) کی طرف سے اپیل کی کہ وہ ترک مجروحین کی مالی اعانت کرے - آغا خان مرحوم نے دو ہزار پونڈ کی خطیر رقم برٹش ریڈکریسنٹ سوسائٹی کے فنڈ میں جمع کی تاکہ مذکورہ رقم سے ترک مجروحین اور مضروبین کی اعانت اور دیکھ بھال آسانی سے ہو سکے - اس کے ساتھ ساتھ آغا خان نے مسلمانان ہند کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے مستقبل کے نئے منصوبے مثلاً (مسلم یونیورسٹی کی تعمیر وغیرہ) فی الحال ملتوی کر دیں اور اس مد میں جمع کی ہوئی رقم بطور قرض حسنہ ترکوں کی مدد کے لیے دے دیں اور اس طرح اپنی ہمدردی کا عملی ثبوت دیں[4] -

مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نے ۱۹۱۱ء میں جامع مسجد دہلی میں ترک اور عرب زخمیوں کے لیے چندہ جمع کیا - چندہ جمع کرنے کی مہم میں مولانا شوکت علی ہمیشہ پیش پیش ہوتے تھے - غازی انور پاشا مسلمانان ہند کی ان عملی ہمدردیوں سے غیر معمولی طور پر متأثر تھے اور بڑے ممنون بھی تھے - دیگر علماء مثلاً مولانا ظفر علی خان نے بھی ترکوں کی حمایت اور مدد کے لیے بہت کچھ کام کیا تھا[5] -

---

1. *A History of the Freedom Movement*, Vol. III, I pt., p. 108.
2. *Muslim Separatism in India*, p. 101.
3. *Ibid.*, p. 101.
4. *A History of the Freedom Movement*, Vol. 3, pt. 11, pp. 108-9; *Muslim Sepatatism in India*, p. 101-2.
5. "عظمت رفتہ"، ص ص ٦٦-٦٧، ٢٤٣-٢٤٥

(نوٹ : مولانا شوکت علی ولد مولانا عبدالعلی ریاست رام پور میں پیدا ہوئے - آپ کی اور

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

مسلم اخبارات اور پریس کی خدمات :

ہندوستان میں اس وقت جو اخبارات و رسائل شائع ہوتے تھے - ان میں "الہلال" ، "کامریڈ" ، اور "زمیندار" برطانیہ کی مخالفت اور "پان اسلام ازم" کی تائید میں پیش پیش تھے - یوں تو دیگر اخبارات مثلاً "مدینہ" بجنور ، "مسلم گزٹ" لکھنو ، "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" ، "پیسہ اخبار" لاہور ، وغیرہ بھی ترکوں کی حمایت میں اپنے اپنے مضامین اور اداریے شائع کرتے رہتے تھے[1] - مولانا محمد علی نے "کامریڈ" کے ابتدائی ایام میں برطانیہ کے خلاف تلخ و تند لہجہ استعمال نہیں کیا تھا - مگر مسلمانوں کو مسلسل اور اذیت ناک حالات کا سامنا کرنے پر "کامریڈ" نے اپنا نقطہ نظر بدل دیا - یعنی تنسیخ بنگال ، جنگ طرابلس و بلقان ، حادثہ انہدام مسجد کان پور وغیرہ ایسے دل خراش واقعات تھے جن کی بناء پر مولانا محمد علی کو اپنا طرز تحریر بدلنا پڑا[2] - مولانا ظفر علی خان نے مسلم عوام اور خصوصاً مسلمانان پنجاب کو بیدار کرنے میں نمایاں اور اہم سیاسی کردار ادا کیا - موصوف "پان اسلام ازم" کے پر زور حامی تھے - جنگ طرابلس اور بلقان میں مولانا نے ترکوں کی حمایت اور تائید میں بہت کچھ کام کیا - "الہلال" اور "زمیندار" نے مسلمانان ہند میں صحیح قسم کا سیاسی شعور پیدا کیا - موصوف ۱۹۱۲ء میں ترکوں کے لیے مالی امداد لے کر قسطنطنیہ گئے تو سلطان محمد خامس نے آپ کو شرف باریابی بخشا اور آپ کی پر خلوص خدمات کو استحسان اور عزت کی نظر سے دیکھا[3] - "القاسم" نے بھی ترکوں کی مالی امداد اور ہلال احمر کے قیام میں مسلمانان ہند کی بروقت رہنمائی کی - نیز "القاسم" کی اطلاع کے مطابق وائسرائے ہند سے ترکی مجروحین کی مدد کے لیے فنڈ جمع کرنے کی منظوری حاصل کر لی تھی - "القاسم" نے شیخ الہند کے فتویٰ "متعلق استفسار

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

مولانا محمد علی کی تربیت آپ کی والدہ بی اماں نے کی - علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہوئے - ۱۹۱۱ء سے سیاست میں عملی حصہ لیا - مختلف ادوار میں خلافت کمیٹی ، انجمن خدام کعبہ ، تحریک ترک موالات ، موتمر عالم اسلامی حجاز ، نہرو رپورٹ ، آل پارٹیز مسلم کانفرنس ، مسلم یونی ٹی بورڈ ، مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ اور دیگر تمام سیاسی اور سماجی تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا - ۸ دسمبر ۱۹۳۸ء کو وفات پائی - "مسلم یونیورسٹی گزٹ"، ۸ دسمبر ۱۹۳۸ء، ج ۲ ، ش ۳۹ ، ص۱) -

1. *A History of the Freedom Movement*, Vol. 3, pt. 1, pp. 108-10.
2. *Modern Muslim India and The Birth of Pakistan*, pp. 151-52; *Muslim Separatism in India*, p. 103.
3. *Muslim Separatism in India*, p. 101; "عظمت رفتہ" ، ص ص ۲۴۳-۲۴۵

امداد ترکی" کی نشر و اشاعت میں بھی کافی نمایاں حصہ لیا ۔ اس طرح مسلمانان ہند کو ترغیب کے ذریعہ ہر طرح سے مدد و اعانت کے لیے آمادہ کیا ۔ مختصراً یہ کہ مسلم اخبارات نے حتی المقدور ترکوں کی مدد اور عالم اسلام کے اتحاد اور رشتہ اخوت و محبت کو بڑھانے میں بڑا اہم اور نمایاں کردار پیش کیا[1] ۔

مسلم پریس کی ضبطی :

جنگ طرابلس و بلقان کی وجہ سے مسلمانان ہند بڑے پریشان اور بے چین تھے ۔ نیز یہ کہ مسلمانان ہند اپنی مساعی بہ حیثیت امن پسند اور قانون کا احترام کرتے ہوئے آئینی حدود میں رہ کر ہی کر رہے تھے ۔ مسلم پریس خصوصاً "زمیندار"، "کامریڈ"، "الہلال" اور "ہمدرد" وغیرہ اس سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دے رہے تھے اور مسلم عوام کو ترکوں کی ہمدردی اور مدد کے لیے آمادہ کرنے میں بہت بڑا کردار پیش کر رہے تھے ۔ حکومت اس زمانے میں انڈین پریس ایکٹ اور انڈین ڈیفنس رولز وغیرہ جیسے کالے قوانین پر سختی سے عمل پیرا تھی ۔ چناں چہ انڈین پریس ایکٹ کے تحت "زمیندار" سے کئی مرتبہ ضمانت طلب کی گئی ۔ مولانا ظفر علی خان نے اخبارات کو پریس ایکٹ کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے متعدد بار قربانیاں پیش کیں ۔ "زمیندار" سے کئی بار بھاری ضمانتیں طلب کی گئیں اور اس کے پریس کو بحق سرکار ضبط کیا گیا ۔ مگر مولانا ظفر علی خان نے بڑی جرأت اور مردانگی سے ان تمام مصائب و آلام کو بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا[2] ۔

اسی درمیان میں جنگ عظیم اول بھی شروع ہو چکی تھی ۔ نیز اٹلی اور بلقانی ریاستوں کے قبضہ کے متعلق برطانیہ کی پالیسی بھی ترکی کے خلاف تھی اور ناجائز قابضین کو حق ملکیت دینے کا فیصلہ بھی کر لیا گیا تھا ۔ برطانیہ کا یہ فیصلہ مسلمانان ہند کے ساتھ کیے ہوئے وعدوں اور یقین دہانیوں کے خلاف تھا ۔ برطانیہ نے مسلمانان ہند سے وعدہ کیا ہوا تھا کہ ترکوں کے ساتھ حق و انصاف کی روشنی میں کام لیا جائے گا اور مسلمانان عالم کے مذہبی اور روحانی خلیفہ کو کسی قسم کی کوئی گزند نہ پہنچنے دی جائے گی ۔ وزیراعظم برطانیہ مسٹر لائیڈ جارج (Lloyd George) نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ ترکی مقبوضات کو ختم نہیں کیا جائے گا اور تمام مقبوضات واپس کر دیے جائیں

---

۱ ۔ "القاسم"، ذی قعدہ ۱۳۳۰ھ، ص ص الف و ب؛
ایضاً، ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ، ص ص ۱۹-۲۰

2. *Foundations of Pakistan*, p. 343;
Pakistan : The Formative Phase, 2nd ed., p. 39; "عظمت رفتہ"، ص ص ۲۴۳-۲۴۴

گئے[1]۔ لیکن جب مسلم پریس نے برطانیہ کے مسلمانوں سے کیے ہوئے وعدوں اور یقین دہانیوں کی طرف توجہ مبذول کرائی تو ان کے خلاف انڈین ڈیفنس رولز اور انڈین پریس ایکٹ حرکت میں لایا گیا اور ان کے خلاف مقدمات قائم کیے گئے ۔ نیز اخبارات کو ختم کرکے ان کے پریس کی ضمانتیں بھی ضبط کی گئیں ۔ ان اخبارات میں "زمیندار" ، "کامریڈ" ، "الہلال" ، "مسلم گزٹ" اور "ہمدرد" سرفہرست تھے[2]۔ مولانا محمد علی نے ۲۶ ستمبر ۱۹۱۴ءکو "کامریڈ" میں ایک مضمون (The Choice of Turks) "ترکوں کو انتخاب کے فیصلہ کا حق" لکھا جس کی بناء پر "کامریڈ" اور "ہمدرد" سے دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی ۔ نیز ۲۶ ستمبر ۱۹۱۴ء کی "کامریڈ" کی اشاعت کی تمام کاپیاں بھی ضبط کر لی گئیں[3]۔

حادثہ انہدام مسجد کان پور :

کان پور میں ایک پختہ سڑک بنام اے ۔ بی ۔ روڈ کی تعمیر کا نقشہ گورنمنٹ نے اپریل ۱۹۰۹ء میں منظور کر لیا تھا ۔ اس نقشے کے مطابق اگر یہ روڈ سیدھی تعمیر ہوتی تو مسجد کے مقابل کا مندر منہدم ہوتا تھا ۔ اہل ہنود نے اس خطرے کے پیش نظر مندر کے انہدام کو روکنے کے لیے در پردہ کوششیں کیں اور مندر کے انہدام کی تجویز مسترد کر دی گئی ۔ نومبر ۱۹۱۲ء میں گورنر متحدہ صوبجات جب کان پور آئے تو مسلمانان کان پور نے ان سے استدعا کی کہ مسلمانوں کے مذہبی احساسات و رجحانات

---

1. *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd ed., pp. 44-45.
2. *Foundations of Pakistan*, p. 343.
3. Copy from Original Papers of Maulana Mohamad Ali, taken by me from Jamia Millia, New Dehli, Home Deptt., Notice dt. 2-11-1914;

(نوٹ : (اول) اس سلسلے میں مولانا محمد علی کی اصل خط و کتابت محفوظ ہے ۔ جس کو ضمیمہ باب ہذا میں پیش کیا جا رہا ہے ۔

(دوم) "کامریڈ" کا پہلا پرچہ ۱۴ جنوری ۱۹۱۱ء کو کلکتے سے جاری ہوا ۔ دہلی سے اس کا پہلا پرچہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو شائع ہوا ۔

(سوم) "ہمدرد" کا پہلا پرچہ ۲۴ فروری ۱۹۱۲ء کو جاری ہوا ۔

(چہارم) "الہلال" کا پہلا پرچہ جون ۱۹۱۲ء کو شائع ہوا اور ۱۹۱۵ء میں الہلال پریس ضبط ہوا ۔ مگر پانچ ماہ بعد "البلاغ" شائع ہوا ۔ "البلاغ" ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء سے ۲۴ مارچ ۱۹۱۶ء تک جاری رہا ۔ "علی برادران" ، ص ص ۱۱۰-۱۱۱ (ذ) "البلاغ"، ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء، ج ۱ ، نمبر ۱۲ ، ص ۱۲ (ذ) ۔

Abul Kalam Azad, *India Wins Freedom*, pp. 7-9; *The Muslim Community of Indo-Pakistan Subcontinent*, p. 267.

کو مد نظر رکھتے ہوئے مسجد کا انہدام روکا جائے۔ گورنر موصوف نے اپنی تقریر میں کہا کہ مندر اور مسجد دونوں عبادت گاہیں قابل احترام ہیں ان میں سے کسی کو بھی گزند نہ پہنچنے دیا جائے گا۔ (بحوالہ "ہیرالڈ آف انڈیا"، ۲۴ نومبر، ۱۹۱۲ء) لیکن در پردہ متولی اور حکومت میں یہ طے ہوگیا کہ مسجد کا مشرقی حصہ جسے منہدم کیا گیا تھا، اس کا معاوضہ حکومت ادا کرے گی۔ مگر جس وقت اس خفیہ سازش کا انکشاف ہوا تو مسلمانان کان پور نے پانچ علماء سے جن میں مولانا آزاد سبحانی بھی تھے اس بارے میں استفسار کیا۔ فتویٰ کی رو سے زیر بحث مسجد کا مشرقی حصہ مذہباً اور شرعاً جزو مسجد قرار دیا گیا۔ لہٰذا شرع کی رو سے اس حصے کی بیع یا مبادلہ خلاف شریعت تھا[1]۔ اس فتویٰ کے باوجود حکومت نے ۳۰ جون ۱۹۱۳ء کو مجسٹریٹ کان پور کے حکم سے متولی مسجد کان پور کو مطلع کیا کہ حکومت نے مسجد کے منہدم ہونے والے حصے کا معاوضہ دینا طے کیا ہے مگر ساتھ کے ساتھ یہ بھی وعدہ لیا گیا کہ یکم جولائی ۱۹۱۳ء کو یعنی انہدام مسجد کے بعد زر معاوضہ کا اعلان عام کیا جائے۔ چنانچہ حسب پروگرام یکم جولائی ۱۹۱۳ء بحکم مجسٹریٹ کان پور مسجد ہذا کا انہدام کر دیا گیا۔ حکومت کے اس عمل سے کان پور اور اطراف و جوانب کے مسلمانوں میں عام بے چینی پھیل گئی[2]۔

۳ اگست ۱۹۱۳ء کو مسلمانان کان پور نے مسجد کے منہدم حصے کو دوبارہ تعمیر کرنا چاہا۔ مجسٹریٹ کان پور نے تعمیر کرنے سے روکا اور ساتھ کے ساتھ مجمع کو منتشر کرنے کے لیے فائرنگ کا حکم دے دیا۔ اس ہنگامے میں بارہ آدمی شہید ہوگئے اور ۳۳ آدمی زخمی ہوئے۔ کچھ افراد گرفتار ہوئے، گرفتار ہونے والے افراد میں دیگر افراد کے علاوہ حافظ احمد اللہ، حافظ ابو سعید خان، محمد یٰسین خان بہادر اور مولانا آزاد سبحانی بھی شریک تھے۔ مزید برآں گرفتار شدگان میں کچھ مسلمان لڑکے بھی شریک تھے۔ گرفتار شدگان کی کل تعداد ۱۰۵ تھی جن پر مقدمہ چلایا گیا[3]۔

قیام مجلس دفاع مسجد مقدس اور ماخوذین مقدمہ :

مسلمانان ہند میں برطانیہ کے خلاف بے چینی اور عدم اعتماد کی فضا تنسیخ تقسیم بنگال سے ہی شروع ہو چکی تھی اور یہ بے چینی مسلسل پیش آنے والے حادثات و

۱۔ "علی برادران"، ص ص ۳۲۹-۳۳۰؛
"الہلال"، ۲۳ جولائی ۱۹۱۳ء، ج ۲، ص ص ۷۸-۷۹، ک ۲
۲۔ ایضاً، ۲۳ جولائی ۱۹۱۳ء، ص ص ۷۸-۷۹، ک ۱-۲
۳۔ ایضاً، ٦ اگست ۱۹۱۳ء، ج ۳، ص ص ۹۷-۹۸، ک ۲

واقعات مثلاً جنگ طرابلس و بلقان اور اب مسجد کے انہدام سے اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اس قسم کے واقعات سے مسلمانان ہند کا حکومت برطانیہ پر سے اعتماد اٹھتا جا رہا تھا۔ اکابرین نے مسجد کی حفاظت اور اسیران زیر حراست کے مقدمہ کی پیروی کے لیے ایک دفاعی کمیٹی قائم کی۔ اس کمیٹی کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد، خزانچی مسٹر اے۔ رسول اور سکریٹری آنریبل مولوی فضل حق مقرر ہوئے۔ اس کمیٹی کے سامنے اس وقت دو کام بڑے اہم اور حل طلب تھے:

(الف) اصل مسجد کا دفاع اور

(ب) ماخوذین مقدمہ کی اعانت و پیروی۔

لہذا طے پایا کہ امر اول کی نسبت وائسرائے ہند سے رجوع کیا جائے اور تمام مسلمانان ہند کا ایک نمائندہ وفد اس امر کو وائسرائے ہند کے سامنے پیش کرے۔ اگر وائسرائے ہند اس امر پر توجہ نہ دے تو پھر ممتاز حضرات کا ایک دوسرا وفد اس معاملے کو وزیر ہند اور ممبران پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرنے کے لیے انگلستان جائے تاکہ وزیر ہند اور ممبران پارلیمنٹ سے مل کر اس معاملے کا خاطرخواہ اور قابل قبول حل نکالا جائے[1]۔

علاوہ ازیں مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی و مولانا عبدالباری اور دیگر حضرات نے بھی اس المناک واقعہ پر سخت احتجاج کیا اور اپنا ذاتی اثر و رسوخ بھی معاملے طے کرانے کے لیے استعمال کیا[2]۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند معہ قائم مقام گورنر صوبہ متحدہ جات ڈی۔ سی۔ بیلی کان پور پہنچے۔ مسلمانوں کے وفد نے جس میں مہاراجہ محمود آباد، مسٹر مظہر الحق، مولانا عبدالباری فرنگی محلی وغیرہ شامل تھے، وائسرائے کا استقبال کیا۔ دوران ملاقات وائسرائے نے مولانا عبدالباری سے بے تکلف گفتگو کی اور مولانا سے کہا کہ آپ عالم دین ہیں۔ مسلمانوں کو نصیحت کریں کہ اب اس حادثے کو بھلا دیں۔ میں اس کا مناسب فیصلہ کر دوں گا۔ چنانچہ وائسرائے ہند یہ طے کیا کہ محلہ مچھلی بازار میں ۸ فٹ بلند ایک چھت بنا کر اس کا دالان اس طرح بنایا جائے جیسا کہ پہلے تھا اور ماخوذین مقدمہ کو بری کر دیا جائے[3]۔

دوسری طرف مولانا محمد علی اور سید وزیر حسین سیکرٹری مسلم لیگ حادثہ مسجد کان پور کی تحقیق کے دوران انگلینڈ روانہ ہوگئے تاکہ ممبران پارلیمنٹ اور وزیر ہند کو

۱۔ ایضاً، ۱۷ ستمبر ۱۹۱۳ء، ج ۳، نمبر ۱۲، ص ۲۰۹، ک ۲؛
"ہمدرد"، ۹ اگست ۱۹۱۳ء، ص ۳، ک ۴ اور ۱۴ اگست ۱۹۱۳ء ص ۲، ک ۳-۴

۲۔ "سیرت محمد علی"، ص ۳۳

۳۔ "الہلال"، ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۳ء، صص ۲۹۴-۲۹۵؛
Mohammad Noman, *Muslim India*, Allahabad, 1942, p. 130.

اس حادثے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے واقعات و حالات سے آگاہ کریں اور اس سلسلے میں مسلمانوں پر ہونے والی زیادتیوں کا بھی انسداد کرائیں ۔ یہ وفد ۶ ستمبر ۱۹۱۳ء کو عازم لندن ہوا ۔ اس کے بعد ۳۰ ستمبر ۱۹۱۳ء کو مولانا ظفر علی خان بھی انگلستان روانہ ہوگئے تاکہ وفد کے ساتھ مل کر اس اہم کام میں ان کا ہاتھ بٹائیں ۔ اس وفد کو اپنے مشن میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی اور ۲۰ دسمبر ۱۹۱۳ء کو یہ وفد ہندوستان واپس آ گیا ۔ بمبئی میں انجمن ضیاء الاسلام اور اہل بمبئی کی طرف سے ان حضرات کا استقبال کیا گیا[1] ۔

فصل چہارم

تاسیس انجمن خدام کعبہ

دول یورپ کی ہوس ملک گیری اور مسلمانوں کے خلاف جارحانہ اقدام نے مسلمانان ہند کو خانہ کعبہ کی حرمت اور عزت کی بقا و تحفظ کی طرف متوجہ کیا ۔ اماکن مقدسہ یعنی مکہ معظمہ ، مدینہ منورہ اور بیت المقدس کو غیر مسلموں کے قبضے میں جانے سے بچانا ضروری تھا ۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ حجاج اور زوار کے سفر کے لیے اس وقت صرف ایک ہی کمپنی تھی ۔ سارے کام پر کمپنی کی اجارہ داری تھی ۔ کمپنی کے گماشتے یعنی دلال اول اول تو بہت کم کرایوں کا اعلان کرتے تھے ۔ جس کی بنا پر عازمین حج جوق در جوق بندرگاہ پر پہنچ جاتے تھے ۔ پھر یہ کمپنی کرایوں میں اضافہ کر دیا کرتی تھی ۔ نیز دیگر ناجائز طریقوں سے بھی حجاج کو لوٹا جاتا تھا ۔ ان وجوہات کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلم زعماء نے ایک انجمن بنام "انجمن خدام کعبہ" ، ۶ مئی ۱۹۱۳ء کو قائم کی[2] ۔ اس کا آغاز مولانا شوکت علی اور مولانا عبدالباری کی کوششوں سے عمل میں

---

1. *Muslim Separatism in India: A Brief Survey*, p. 102;
"ہمدرد"، ۷ ستمبر ص ۸ ص ۸ ، ۲۰ اور ۳۰ دسمبر ۱۹۱۲ء ص‌ص ۶ ، ۳ ، اور ۲ ، کالم ۳ و ۴

۲ ۔ "القاسم"، جمادی الثانی ۱۳۳۱ھ، ص ۸؛
"اردوئے معلیٰ"، مئی ۱۹۱۳ء ، ج ۱۳ ، نمبر ۵ ، ص ۱ (ضمیمہ)؛
"حیات اجمل" ، ص ۲۸ ؛ "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ، ص ۳۵۰ ۔
(نوٹ : (اول) ماخذ میں کمپنی کا نام ظاہر نہیں کیا ہے ۔"سرحد اور جد و جہد آزادی" ، ص‌ص ۱۳۴-۱۳۵
(دوم) ایڈریانوپل پر ترکوں کی شکست ، لیبیا پر اٹلی کا قبضہ ، مراکش پر فرانسیسی التداب ، کا قیام نیز ترکی پر بلقانی ریاستوں کا حملہ یہ سب ایسے واقعات تھے جس نے اہل الرائے مسلمانوں کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ اگر یہی لیل و نہار باقی رہے تو کسی دن اماکن مقدسہ بھی اغیار کی دسترس سے محفوظ نہ رہ سکیں گے ۔ "حیات اجمل" ، ص ۲۸)

آیا تھا ۔ چنانچہ ۶ مئی ۱۹۱۳ء کو مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے مکان واقع لکھنؤ میں اس جماعت کا پہلا اجلاس منعقد ہوا ۔ اس جلسے میں اس انجمن کے اغراض و مقاصد اور اس کے قواعد و ضوابط کا اعلان کیا گیا اور اس انجمن کا نام "انجمن خدام کعبہ" رکھا گیا[1] ۔

انجمن خدام کعبہ کے اغراض و مقاصد :

انجمن خدام کعبہ کے اغراض و مقاصد حسب ذیل تھے :

(الف) دنیا کے سب سے پہلے مرکز توحید یعنی خانۂ کعبہ کی حرمت کو برقرار رکھنا ۔ اس کی ہمہ قسم کی خدمت بجا لانا ۔ نیز غیر مسلموں کے ہاتھوں سے اسے محفوظ رکھنا ۔

(ب) جان نثاران کعبہ اور حامیان توحید کی ایک ایسی جماعت تیار کرنا جو صدق دل سے حرم محترم پر اپنی جان و مال قربان کر سکے ۔

(ج) داعیان اسلام کو جہاں ضرورت ہو ، تبلیغ اسلام کے لیے روانہ کرنا ۔

(د) جا بجا ابتدائی اسلامی مدارس اور یتیم خانے قائم کرنا ۔

(ہ) بیت اللہ شریف سے مسلمانوں کی محبت اور عقیدت کو مضبوط کرنا ۔ نیز خانۂ کعبہ کی آمد و رفت کے ذرائع و وسائل کو وسیع اور سہل الحصول بنانا[2] ۔

اغراض مذکورہ (الف) میں مذکور غرض انجمن کا اساسی مقصد تھا ۔

انجمن خدام کعبہ کے اراکین و عہدیداران :

اس انجمن کی رکنیت کے لیے طے کیا گیا کہ ہر کلمہ گو مرد و خواتین اس انجمن کے رکن بن سکتے ہیں اور وہ اراکین سب کے سب خادم کعبہ کہلائیں گے ۔ ہر رکن

---

۱ ۔ "ہمدرد"، ۱۶ مئی ۱۹۱۳ء ، ص ۲ ، ک ۲ ، ۳ اور ۴
(نوٹ : مولانا عبدالباری کا نام قیام الدین محمد عبدالباری بن عبدالوہاب تھا ۔ آپ کی ولادت ۹ ربیع الثانی ۱۲۹۵ھ/۱۰ مارچ ۱۸۷۸ء اور وفات ۴ رجب ۱۳۴۴ھ/۲۰ جنوری ۱۹۲۶ء ہے ۔ "اردوئے معلی" ، فروری ۱۹۲۶ء ، ص ۱ اور "الجمعیۃ"، ۴ رجب المرجب ۱۳۴۴ھ ، ص ۲۰ ، ک ۳)

۲ ۔ "ہمدرد" ، ۱۶ مئی ۱۹۱۳ء ، ص ۳

کے لیے رکن بننے سے قبل ایک حلف وفاداری بھی اٹھانا لازم تھا[1] - مندرجہ ذیل حضرات کو ایک سال کے لیے اراکین انجمن اصلیہ مقرر کیا گیا :-

"مولانا عبدالباری فرنگی محلی خادم الخدام، حکیم عبدالولی لکھنؤی، ڈاکٹر ناظر الدین لکھنؤی ، مولانا محمد علی معتمدین خادم الخدام ، مولانا شوکت علی ، مشیر حسین قدوائی ، بیرسٹر لکھنؤ -"

خدام کعبہ کے لیے ایک بیج جس پر خدام کعبہ تحریر تھا - سینہ پر لگانا ضروری تھا[2] - اس انجمن کا صدر مقام دہلی تھا - مگر اس کی شاخیں شہروں ، قصبوں ، حتی کہ دیہاتوں تک میں تھیں - انجمن کو مقبول عام بنانے کے لیے مولانا عبدالباری اور مولانا شوکت علی نے مختلف مقامات کے دورے کیے جن میں بریلی ، بدایوں، دیوبند وغیرہ خاص اہمیت کے حامل تھے- ان حضرات نے بریلی میں مولوی احمد رضا خان بریلوی سے ملاقات کی جو اس تحریک سے متفق ہوگئے - بدایوں میں مولانا عبدالمقتدر، مولانا عبدالماجد بدایونی، اور مولانا عبدالحامد بدایونی سے ملے - انھوں نے بھی اس انجمن کے اغراض و مقاصد سے اتفاق کیا - نیز علماء دیوبند نے بھی اس انجمن کے اغراض و مقاصد کو مستحسن خیال کیا - اس طرح علماء کے مختلف الخیال گروہ اس انجمن کے مقاصد پر متحد تھے[3] -

انجمن خدام کعبہ کی خدمات :

مولانا ابوالکلام آزاد نے تحریر فرمایا ہے کہ مولانا شوکت علی معتمد انجمن خدام کعبہ حسب الحکم خادم الخدام مولانا عبدالباری ۲۶ جون ۱۹۱۳ء کو بمبئی پہنچے تاکہ حجاج و زوار کو جائے قیام اور ٹکٹ وغیرہ خریدنے میں مدد کریں اور ممبران انجمن کا ایک وفد ترتیب دیں تاکہ مذکورہ وفد دوران سفر کل حالات و ضروریات کا تفصیلی جائزہ لے سکے ، جس کی روشنی میں انجمن اپنے مقاصد کی بہتر پیروی کر سکے - نیز شریف مکہ اور دولت عثمانیہ کے حکام سے تبادلۂ خیالات کرکے یہ وفد حجاج اور زوار کے لیے جو آسانیاں اور سہولتیں ممکن العمل ہوں ، بہم پہنچائے - نیز تمام حالات و واقعات کی مکمل

---

۱ - "اردوئے معلی" ، یکم مئی ۱۹۱۳ء ، ص ۲ (ضمیمہ) -
(نوٹ : مولانا آزاد نے انجمن "خدام کعبہ اجلاس اصلیہ" لکھا ہے - "الہلال" ، ۸ جولائی ۱۹۱۳ء ، ص ۴۳

۲ - "ہمدرد" ، ۱۶ مئی ۱۹۱۳ء ، ص ۴، ک ۴ ؛
"اردوئے معلی" ، مئی ۱۹۱۳ء ، ص ۲ (ضمیمہ) ؛
"علی برادران" ، ص ص ۳۱۴-۳۲۱

۳ - "ہمدرد" ، ۶ - ۷ جون ۱۹۱۳ء ، ص ۷ اور ۸ جون ۱۹۱۳ء ، ص ص ۵-۶ ؛
"القاسم"، جمادی الثانی ۱۳۳۱ھ ، ص ۸

رپورٹ دفتر انجمن ہذا کو بہم پہنچائے[1]۔ مزید برآں مولانا شوکت علی نے عازمین حج کو کھانا ساتھ لے جانے اور خود کھانا تیار کرنے کی تکلیف کو بھی دور کرایا۔ عازمین حج کو یہ تکالیف عرصے سے در پیش تھیں۔ چنان چہ مولانا شوکت علی نے ایک عرصے کی کشمکش کے بعد حکومت کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ عازمین حج کے لیے جہاز پر کھانا تیار دے اور اس کھانے کی قیمت ٹکٹ کی قیمت کے ساتھ وصول کر لی جائے۔ غرض اس انجمن نے حجاج و زوار کے لیے بڑے اہم اور ضروری کارنامے انجام دیے[2]۔ اس کے علاوہ اس انجمن نے برطانیہ کے خلاف برملا تحریک شروع کی۔ جیسا کہ مولانا عبدالحامد بدایونی نے اپنی یاد داشت نوشتہ ۲۲ مارچ ۱۹۷۰ء میں بیان فرمایا ہے کہ :

''علی برادران جس وقت بدایوں گئے تو مولانا عبدالمقتدر نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا اور ان کو مجاہدین کے خطاب سے ملقب کیا۔ علی برادران نے اپنی آمد کی غرض بیان کرتے ہوئے کہا کہ انگریزوں نے ترکی مقبوضات کو غصب کر لیا ہے اور اپنے مستبدانہ رویے سے ہمیں اس بات پر مجبور کیا ہے کہ ہم جزیرۃ العرب اور خدمت کعبہ کی حفاظت کے لیے آپ کی مدد اور دعا طلب کریں۔''

مولانا مقتدر ، مولانا عبدالماجد بدایونی اور مولانا عبدالحامد بدایونی نے پورے تعاون اور مدد کا یقین دلایا۔ اس تحریک نے خلافت کے لیے فضا ہموار کی۔ چوں کہ محرکین خدام کعبہ نے تحریک خلافت میں آئندہ چل کر بڑے کارنامے انجام دیے ، نیز یہ کہ مسلمانوں کے ہر طبقے میں اسلامی اخوت اور ہمدردی کا جذبہ پیدا کیا۔ نیز ترکی مجروحین کے لیے طبی وفد روانہ کیا۔ مسجد کان پور کے انہدام کے بعد مسلمانان ہند کو بیدار کیا اور ان کے لیے عبرت کا سامان پیدا کیا اور منجملہ ان امور کے اسلامی اتحاد اور ''پان اسلام ازم'' کا بھی کردار ادا کیا۔ اسلامی ممالک میں ''خدام کعبہ'' اپنی خدمات پیش کرتے رہے تھے[3]۔

فصل پنجم

انگریزوں کے اخراج کی کوششیں ۔ تحریک ریشمی رومال

پس منظر :

مولانا محمود حسن اگر ایک طرف بانیان دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی ، مولانا رشید احمد گنگوہی کے فیض یافتہ تھے تو دوسری طرف حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی

۱۔ ''سرحد اور جد و جہد آزادی''، ص ۱۳۵-۱۳۶

۲۔ ''الہلال''، ۸ جولائی ۱۹۱۳ء، ص ۲۳

۳۔ ''یادداشت مولانا عبدالحامد بدایونی''، مرتبہ راقم الحروف ، مؤرخہ ۲۲ مارچ ۱۹۷۰ء ،
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

جہاد پارٹی کے (جس نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں عملاً حصہ لیا تھا) تربیت یافتہ تھے ۔ مولانا محمود حسن کی تاریخ اسلام اور تاریخ ہند پر گہری نظر تھی ۔ شاہ ولی اللہ اور ان کے خلفاء کی جد و جہد نیز حاجی شریعت اللہ اور تیتومیر کی تحریکات بھی ان کے سامنے تھیں ۔ موصوف ان تحریکات سے متأثر تھے ۔ ان کی تربیت اور فکر میں انقلابی عنصر غالب تھا ۔ انھوں نے جوان العمری ہی میں ایک جماعت بنام ''ثمرۃ التربیت'' ۸۰-۱۸۷۹ء میں قائم کی تھی اور حالات کے تقاضوں کے روبرو یہ جماعت ۳۰ ، ۳۱ سال تک خفیہ کام کرتی رہی ۔ اس کے بعد مولانا نے ۱۹۱۰ء میں ''جمعیۃ الانصار'' کے نام سے ایک اور جماعت قائم کی ۔ مولانا عبیداللہ سندھی اس جماعت کے ناظم تھے ۔ انگریز اس جماعت کو حکومت کے خلاف سمجھتے تھے ۔ اس لیے وہ جماعت کے خلاف ہوگئے ۔ مجبوراً یہ جماعت ناموں کی تبدیلی کے ساتھ اپنا کام کرتی رہی ۔ مولانا سندھی نے دو سال چھ ماہ اور ۲۹ دن اس جماعت کی نظامت کے فرائض انجام دیے ۔ بعدہ موصوف نے استعفٰی دے کر عزلت اختیار کر لی ۔ مگر شیخ الہند جن کا مقصد ملک کو برطانیہ کی غلامی سے نجات دلانا تھا ۔ اس وقت کے حالات سے بہت مضطرب تھے ۔ یعنی تنسیخ بنگال ، طرابلس اور جنگ بلقان ۔ ترکوں کے خلاف دول یورپ کا گٹھ جوڑ ، ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ برطانیہ کی بد عہدی وغیرہ ایسے دلسوز واقعات تھے ، جن کی بناء پر شیخ الہند بڑے فکر مند رہتے تھے ۔ اسی درمیان میں شیخ الہند نے مولانا سندھی کو دوبارہ طلب کیا اور دہلی میں ایک جماعت ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' میں کام کرنے کا حکم دیا[1] ۔ ''نظارۃ المعارف

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

ص ص ۶-۷ (غیر مطبوعہ)؛ ''علی برادران'' ، ص ۳-۴-۱۵-۱۴؛

قاضی عبدالغفار مراد آبادی ، ''حیات اجمل'' ، علی گڑھ ، ۱۹۵۰ء ، ص ۱۲۸-۱۲۹

(نوٹ : مصنف ''حیات اجمل'' نے لکھا ہے کہ تحریک انجمن خدام کعبہ نے ہندوستان کی جدید تاریخ میں پہلی مرتبہ اس اعلان کے ذریعہ حجرہ نشین علماء اور مولویوں کو پبلک میدان سیاست میں شرکت کی دعوت دی ۔ اس سلسلے میں علی برادران کا یہ کارنامہ لائق تحسین ہے ۔ راقم الحروف اس امر میں مصنف ''حیات اجمل'' کے خیالات سے متفق نہیں ہے ، چوں کہ علماء کرام ہر زمانے میں سیاست میں عملی حصہ لیتے رہے ہیں ۔ تحریک سید احمد شہید ، تحریک ثمرۃ التربیت ، تحریک ندوہ ، تحریک جمعیۃ الانصار اور نظارۃ المعارف القرآنیہ اور تحریک ریشمی رومال وغیرہ سب اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں) ۔

نوٹ : (مولانا عبدالباری نے ۱۰ جون ۱۹۱۳ء کو بیان کیا تھا کہ یہ انجمن اتحاد چاہتی ہے اور ہر قسم کی مساوات اس کے پیش نظر ہے - ''علی برادران'' ، ص ۲۲۱) ۔

1. *Deoband School and and the Demand for Pakistan*, pp. 58-59;

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء میں شیخ الہند کی سرپرستی میں قائم ہوئی - جس میں حکیم اجمل خان اور نواب وقار الملک بھی شریک تھے اور نواب بیگم صاحبہ بھوپال بھی اس جماعت کی مدد و اعانت کرتی تھیں - مولانا عبیداللہ سندھی نے فرمایا کہ مولانا محمود حسن نے :

"جس طرح میرا تعارف دیوبند میں اپنی جماعت سے کرایا تھا - اسی طرح دہلی بھیج کر مجھے نوجوان قیادت سے ملانا چاہتے تھے"- مولانا محمود حسن نے "دہلی میں ملک کی نوجوان سیاسی قیادت مثلاً ڈاکٹر مختار احمد انصاری ، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی وغیرہ سے مولانا سندھی کو متعارف کرایا[۲] -"

نظارۃ المعارف القرآنیہ اور اس کے اصول اساسی :

اس جماعت کا قیام ۱۳ جون ۱۹۱۳ء کو عمل میں آیا - اس کا دوسرا جلسہ ۴ جولائی ۱۹۱۳ء کو مسجد فتح پوری دہلی میں منعقد ہوا - اس جماعت کے اصول

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

"سفرنامہ شیخ الہند اسیر مالٹا" ، صص ۹-۱۰

(نوٹ : ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے جمعیۃ الانصار کا قیام ۱۹۰۹ء لکھا ہے - لیکن یہ سن "القاسم" کے بیان کے مطابق صحیح نہیں ، بلکہ صحیح ۱۹۱۰ء ہے - "القاسم"، شوال ۱۳۳۰ء مطابق ستمبر ۱۹۱۲ء ، ص ۱۴ ؛

"نقش حیات"، ج ۲ ، ص ۱۳۰-۱۴۳

"تذکرہ شیخ الہند" ، صص ۱۸۶-۱۸۷

(نوٹ : مصنف "تذکرہ شیخ الہند" نے مولانا سندھی کا "جمعیۃ الانصار" سے تعلق چار سال بیان کیا ہے - راقم الحروف نے سن ابتداء تا آخر ایام شمار کرکے دو سال چھ ماہ ۲۹ دن نکالے ہیں - لہٰذا مصنف ہذا کا بیان غیر تحقیقی ہے - "تذکرہ شیخ الہند" ص ۱۷۶) -

۲ - "تذکرۂ شیخ الہند" ، ص ۱۷۶ ؛

"علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" ، ۲۵ جون ۱۹۱۳ء ، ج ۱۳ ، شمارہ ۲۴ ، ص ۵ ، ک ۲

3. *Islamic Modernism in India and Pakistan*, pp. 195-96;

"نقش حیات" ، ج ۲ ، ص ۱۴۴-۱۴۵

(نوٹ : رسالہ "برہان" کی تحریر کے مطابق مولانا سندھی نے بیان کیا تھا کہ "اگر میں نے "جمعیۃ الانصار" اور "نظارۃ المعارف القرآنیہ" میں کام نہ کیا ہوتا تو ہمارا کابل جانا بے سود ہوتا - پھر حکومت افغان کے توسط سے ہمیں ہدایت مل جاتی تھی - ہم باہر جاکر سمجھ سکے کہ امام عبدالعزیز سے لےکر شیخ الہند تک ہمارے اکابر ایک ہی سلسلے میں کام کرتے رہے "- "برہان" ، مئی ۱۹۴۳ء ، ج دہم ، شمارہ ۵ ، ص ۳۳۴)

اساسی کا خلاصہ حسب ذیل ہے :

(ا) تعلیم یافتہ مسلمانوں کو قرآن مجید پڑھانا ،

(ب) اسلامی مکاتیب ، مدارس ، اسکول اور کالجوں میں معلمین قرآن تیار کرانا ،

(ج) قرآن کریم کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کرانا ،

(د) قرآن شریف کے مضامین کو عام فہم بنانا اور ان کی اشاعت و ترویج کے لیے تمام ممکنہ وسائل عمل میں لانا ،

(ہ) قرآن کریم پر غیر مسلموں کے اعتراضات کا تحریراً و تقریراً جواب دینا ،

(و) عربی دان گریجویٹس کو ایک سال میں پورا قرآن شریف اور حجۃ اللہ البالغہ کا پڑھانا ۔ اس کے ساتھ ساتھ ام الصحاح موطائے امام مالک معہ شرح شاہ ولی اللہ کو پڑھانا ۔ نیز بخاری ، مسلم ، ترمذی کے اس قدر حصص پڑھانا جس سے طلباء ان کتب سے واقف ہو جائیں[1] ۔

مولانا سندھی نے ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' میں علماء کرام کو انگریزی پڑھانے کا اہتمام کیا ۔ اور گریجویٹس کو مذہبی تعلیم پڑھانے کا انتظام کیا ۔ مولانا سندھی کی خاموش مگر مسلسل کوششوں نے چار حضرات کو تبلیغ اسلام کی خاطر بیرون ملک جانے کے لیے تیار کیا ۔ ان حضرات میں مولوی ضیاء الدین اور رئیس احمد قابل ذکر تھے ۔ علاوہ ازیں مولانا سندھی نے حفاظت و اشاعت اسلام کے لیے موزوں ترین اور قابل حضرات تیار کیے[2] ۔ چنانچہ مولانا سندھی کی اپیل پر مولوی محمد علی شاہ اور مولوی الیس احمد رفقاء ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کو اشاعت اسلام کے لیے انگلستان بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا[3] ۔ مولانا محمود حسن نے ۱۳۳۳ھ - ۱۹۱۵ء میں مولانا سندھی کو کابل جانے کا حکم دیا ۔ لیکن کابل جا کر کام کرنے کے متعلق کوئی جامع پروگرام یا عملی منصوبہ نہیں دیا ۔ مولانا سندھی نے تعمیل حکم کی اور مولانا کے نمائندہ کی حیثیت سے بغیر کسی مرتب پروگرام کے مولانا سندھی کابل چلے گئے ۔ مولانا سندھی

---

۱ - ''علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ''، ۲۵ جون ۱۹۱۳ء ، ج ۱۳ ، ش ۲۳ ، ص ۵ ، ک ۱-۲

۲ - ایضاً ، ۔ جنوری ۱۹۱۴ء ، ج ۱۴ ، ش ۱ ، ص ص ۸ - ۹ اور ۹ الف ، ک ۱-۲

۳ - ایضاً ، ۲۵ فروری ۱۹۱۴ء ، ص ص ۵-۶ ، ک ۱ ، ۱-۲

(نوٹ : الیس احمد اور مولوی الیس احمد غالباً ایک ہی شخص تھے مگر اخبار مذکور نے اس بات کی وضاحت نہ کی)

کو کابل جا کر معلوم ہوا کہ شیخ الہند جس جماعت کے نمائندہ تھے، وہ جماعت ۴۳ سال سے بغیر ظاہری تنظیم کے اپنا کام کر رہی تھی[1] ۔ مولانا سندھی کے کابل جانے کے بعد تحریک ریشمی رومال کے حالات منظر عام پر آتے ہیں ۔

تحریک ریشمی رومال :

تحریک ریشمی رومال کوئی بڑی تحریک نہ تھی ۔ لیکن ایک بڑی تحریک کی تاریخ کا ایک اہم اور دلچسپ واقعہ ضرور ہے ۔ اس بڑی تحریک کا مقصد یہ تھا کہ بعض بیرونی دول کی اعانت حاصل کرے اور ہندوستان میں انگریزوں کی فوج اور حکومت میں خلل پیدا کر کے ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلائی جائے ۔ علماء کا تعلق ویسے تو اس قبیل کی تمام کوششوں سے کم و بیش رہا ہے لیکن وہ واقعات جو تحریک ریشمی رومال سے متعلق ہیں یا اس کے سوابق اور لواحق ہیں ، ان میں علماء کرام کا کردار مرکزی ہے بلکہ تمام کارروائیوں کا سہرا ان ہی کے سر ہے ۔ اس لیے ہم محولہ بالا بڑی تحریک کے صرف ان پہلوؤں پر ہی روشنی ڈالیں گے. جن سے علماء متعلق رہے ہیں ۔ البتہ تحریک "ریشمی رومال" کے واقعات بالتفصیل بیان کرنا ضروری ہیں ۔ تحریک ریشمی رومال کئی تحریکات "ثمرة التربیت"، "جمعیة الانصار" اور "نظارة المعارف القرآنیه" کی آخری کڑی تھی[2] ۔ یہ تحریکات اور ہندوستان کی دیگر تحریکات آزادی ؛ ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں کام کرتی رہیں ۔ اس تحریک کے سربراہوں اور متفقین نے اپنے مشن کو کامیاب بنانے کے لیے مختلف ممالک مثلاً چین، رنگون، جاپان، فرانس اور امریکہ وغیرہ میں اپنے وفود بھیجے ۔ یہ وفود ۱۹۰۵ء سے لے کر ۱۹۲۲ء تک اندرون اور بیرون ملک اپنا کام کرتے رہے[3] ۔ یہ مقالہ ان تمام تحریکات کی تفصیل کا متحمل نہیں ہو سکتا ۔

---

۱ ۔ "تذکرہ شیخ الہند" ، ص ص ۱۷۶-۱۷۷

(نوٹ : مفتی عزیز الرحمان نے اس جماعت کے کام کرنے کی مدت پچاس سال بیان کی ہے ۔ مگر حساب کرنے سے صحیح مدت ۴۳ سال لگتی ہے ۔ "تذکرہ شیخ الہند" ، ص ۱۷۷)

(نوٹ نمبر ۲ : مولانا عبید اللہ سندھی ، ۱۰ مارچ ۱۸۷۳ء کو سیالکوٹ کے ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے ۔ سولہ سال کی عمر میں اسلام قبول کیا ۔ پچیس سال کی عمر میں دیوبند آئے ۔ سات سال دیوبند میں رہ کر درس نظامی کی تکمیل کی ۔ اس کے بعد سندھ چلے گئے ۔ شیخ الہند کے حکم سے ۱۹۱۵ء میں کابل گئے اور تحریک انقلاب میں براہ راست حصہ لیا ۔ ۱۹۴۴ء میں بمقام دینپور ، ریاست بہاولپور میں فوت ہوئے ۔ "برہان"، ستمبر ۱۹۴۴ء ، ص ۱۰۶ ؛ (ذ) "الجمعیة" ۲۹ اگست ۱۹۵۵ء ، ص ۴ ، ک ۳-۴)

۲ ۔ مولانا حسین احمد مدنی ، "تحریک ریشمی رومال" مولانا عبد الرحمان (مرتب) ، لاہور ، ۱۹۶۶ء ، ص ص ۸-۹

۳ ۔ ایضاً ، ص ص ۱۰-۱۲۵

شیخ الہند نے اپنی تحریکات کو کامیاب بنانے کے لیے مختلف کاموں اور امور کی نگرانی کے لیے مختلف شعبے اور علیحدہ علیحدہ افراد مقرر کیے ۔ مثلاً جنگی نقشوں کی تیاری کا منصوبہ ۔ اس منصوبے کے تحت دشمن کے اداروں کی جاسوسی دشمن کی فوجوں میں انقلابی کارکن بھیج کر حاصل کی جاتی تھی ۔ اس کام کی انجام دہی کے کارکن علیحدہ تھے ۔ مولانا سندھی کے سپرد یہ اہم کام کیا گیا اور ان کا معاون شیخ محمد ابراہیم کو بنایا گیا ۔ مولانا سندھی نے شیخ الہند کے حکم پر دوران قیام دہلی ، جرمنی ، فرنچ ، ترکی اور عربی زبانوں کی بہت سی کتابوں کے مطالعہ سے فن حرب میں کافی استطاعت بہم پہنچائی تھی ۔ جن کی بنا پر مولانا سندھی کو اس کام کی انجام دہی میں بہت مدد ملی[1] ۔ نیز دشمن کے ارادوں کی پالیسی کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے ڈاکٹر انصاری کی سرپرستی میں تحریک کے کارکن سی آئی ڈی میں ملازمت حاصل کر کے یہ خطرناک کام انجام دیتے تھے ۔ لیکن مولانا سندھی اور مولانا حسین احمد مدنی جنھوں نے علیحدہ علیحدہ اس تحریک کے حالات لکھے ہیں ، ان امور کی پوری تفصیلات بیان نہیں کی[2] ۔

اندرون ملک میں بغاوت کے مراکز :

شیخ الہند کے بہت سے مرید اندرونی و بیرونی ممالک میں پھیلے ہوئے تھے ۔ شیخ الہند نے اس کام کے لیے ایک مرکز اور آٹھ شاخیں قائم کی تھیں ۔ ضلع ہزارہ میں اس کا مرکز ''روگی'' تھا ، یہاں پر مجاہدین کی جماعت حاجی ترنگ زئی کی سرکردگی میں کام کر رہی تھی ۔ ڈھاکہ میں شیخ الہند کے مرید مولانا ریاض احمد کے وصیت نامے مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۱۴ء سے تحریک انقلاب کا پتا چلتا ہے کہ انقلابی کارروائی کی تاریخ ۱۹ فروری ۱۹۱۵ء مقرر کی تھی ۔ جب یہ کارروائی بروئے کار نہ آ سکی تو مرکز کے مجاہدین نے ''روگی'' اور دیگر مقامات پر جہاد شروع کر دیا اور وہاں انگریزوں کو بہت پریشان کرتے رہے[3] ۔

بیرون ملک امدادی مراکز کا کردار :

مفتی عزیزالرحمان نے بیان کیا ہے کہ مولانا سندھی جب کابل پہنچے تو انھیں یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ شیخ الہند کی جماعت کے نمائندے غیر منظم طور پر ''پچاس سال''

---

۱ ۔ ایضاً ، ص ص ۱۴۸-۱۵۰

۲ ۔ ایضاً ، ص ۱۵۳

۳ ۔ ''تحریک ریشمی رومال'' ، ص ص ۹۰ ، ۱۹۴۰ ; *Ulama in Politics*, p. 240.

(کذا ، صحیح ۳۴ سال) سے کام کر رہے تھے ۔ اس تحریک کا صدر مقام کابل میں تھا ۔ اس مرکز کے پہلے قائد راجہ مہندر پرتاب تھے اور بعد میں مولانا سندھی ہوئے ۔ اس مرکز کی چار برانچیں یا شاخیں تھیں :

"(اول) مدینہ منورہ ، جہاں مولانا حسین احمد مدنی ، بعدہ مولانا خلیل احمد نے کام کیا ۔

(دوم) استنبول یا قسطنطنیہ ، (سوم) انقرہ اور (چہارم) برلن (جرمنی)"

دوسری حکومتوں کو سلطنت ترکی کا حامی بنانا :

برلن میں ہردیال صاحب نے جرمن ترکی اتحاد کے لیے کوشش کی ۔ انقلابی لیڈروں نے جرمن ، ترکی اتحاد کی کوششوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی کوشش کی کہ روس کو بھی ترکی کا حامی بنایا جائے ۔ چنانچہ اس سلسلے میں دو مشن روس گئے ۔ پہلا مشن زار روس سے ملنے میں کامیاب نہ ہو سکا ۔ مگر دوسرے مشن نے زار روس سے ملنے کے بعد ایک خط سونے کی پٹری پر کندہ کرکے زار روس کو دیا ۔ اس خط کو زار روس نے انگریزوں کے حوالے کر دیا ۔ جس کی رپورٹ رولٹ بل میں درج کی گئی[1] ۔

حملہ کرنے کے راستوں کا تعین اور ان کا تحفظ :

انقلابی لیڈروں نے حملہ کرنے کے لیے ترکی فوجوں کو تیار کرنے کی تجویز پیش کی تھی ۔ مگر خشکی کا راستہ ایران اور افغانستان سے ہو کر گذرتا تھا ۔ ایران برطانیہ کے زیر اثر تھا ۔ اس لیے ایران سے افہام و تفہیم ممکن نہ تھی ۔ امیر حبیب اللہ بھی بذات خود جنگ میں شریک ہونا نہیں چاہتے تھے ۔ مگر انھوں نے ترکی افواج کو اپنے پہاڑی علاقے سے گذرنے کا راستہ متعین کر دیا تھا ۔ نیز یہ کہ امیر حبیب اللہ نے افغانی عوام کو ان کی اپنی مرضی پر جنگ میں شریک ہونے کا اختیار دے دیا تھا ۔ لیکن

---

۱ ۔ "تذکرہ شیخ الہند"، ص ۱۷۷؛
"تحریک ریشمی رومال" ، ص ص ۱۶۷-۱۵۰

(نوٹ : غیر منظم طور پر کام کرنے کی مدت (حسب تفصیل سابق) ۳۴ سال ہے ۔ مصنف "تذکرہ شیخ الہند" نے پچاس سال بغیر تحقیق کے لکھ دی ہے)

۲ ۔ "تحریک ریشمی رومال" ، ص ص ۱۵۰-۱۵۲

امیر حبیب اللہ صدق دل سے اس تحریک کے ساتھ نہ تھے[1]۔

ہندوستان کے اندرونی محاذوں پر بغاوت کا منصوبہ :

اس منصوبے کا آخری اور فیصلہ کن مقصد یہ تھا کہ جس وقت ترکی افواج حملہ آور ہوں تو ہندوستان کے اندرونی محاذوں پر بھی بغاوت شروع کی جائے۔ تاکہ تحریک کامیاب ہو سکے اور ۱۸۵۷ء کی طرح دشمن کی طاقت فرداً فرداً ہر ایک کو کچل نہ سکے[2]۔

تحریک ریشمی رومال کا اصل پہلو :

مولانا محمود حسن کی انقلابی جماعت مرکز یاغستان میں مولانا سیف الرحمان اور حاجی ترنگ زئی کی قیادت میں کام کر رہی تھی۔ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم اول کی ابتدا کے بعد شیخ الہند نے ان قائدین کو حکم بھیجا کہ اب خاموشی سے کام کرنے کا وقت نہیں بلکہ میدان میں سربکف ہو کر کام کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ ان قائدین نے شیخ الہند کو مرکز جہاد یاغستان آنے کی استدعا کی اور ساتھ کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ آپ کی موجودگی میں ہم لوگ بہتر کام انجام دے سکیں گے۔ شیخ الہند اب تک ان مراکز کو مالی امداد فراہم کر رہے تھے۔ جنگ عظیم کی وجہ سے راستے مخدوش ہو چکے تھے۔ اس لیے شیخ الہند بہ نفس نفیس خود تو مرکز جہاد پر نہ جا سکے مگر پھر بھی انہوں نے ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۵ء میں مولانا سندھی کو کابل روانہ کر دیا تاکہ وہ وہاں جا کر اس تنظیم کی رہنمائی کر سکیں[3]۔

۱۸/ستمبر ۱۹۰۵ء کو شیخ الہند بھی حجاز چلے گئے تاکہ وہاں جا کر اپنی تحریک کے لیے حکومت ترکی سے مدد اور اعانت حاصل کر سکیں۔ نیز ہندوستان پر

۱۔ ایضاً، ص ص ۱۷۳-۱۷۵؛

Muslim Separatism in India : A Brief Survey, p. 117

(نوٹ : ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب نے لکھا ہے کہ دیوبند کے رہنماؤں اور باب عالی (خلیفہ عثمانیہ) کے درمیان روابط کی تاریخ کا صحیح علم نہیں کیونکہ ان کی نوعیت راز دارانہ تھی۔ ان روابط کا پتا مولانا سندھی کی سرگرمیوں سے چلا جنھوں نے جنگ عظیم اول میں ترکوں کے لیے حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی اور موصوف خفیہ طور سے کابل میں شیخ الہند کی ہدایت پر گئے تھے۔ مولانا سندھی نے اگست ۱۹۱۵ء میں سرحد عبور کی اور شیخ الہند ۱۸ ستمبر ۱۹۱۵ء کو حجاز روانہ ہو گئے)

۲۔ "تحریک ریشمی رومال"، ص ۱۷۶؛

The Muslim Community of Indo-Pakistan Subcontinent, pp. 260-61, f.n.

3. *Deoband School and the Demand for Pakistan*, pp.58-59;

"نقش حیات"، ج ۲، ص ص ۱۳۵-۱۳۶ معہ حاورق

حملہ کرنے کا پروگرام بھی تیار کیا جا سکے ۔ اسی درمیان میں لاہور کے کچھ معزز خاندانوں کے کچھ طلباء کابل پہنچے۔ ان میں سے کچھ طلبا بہ حالت مسافرت انتقال کر گئے کچھ گرفتار ہوئے مگر بعد میں رہا کر دیے گئے ۔ رہا ہونے کے بعد باقی ماندہ طلباء کابل میں انقلابی لیڈروں سے ملے اور ترکی ، ایران ، چین ، جاپان اور روس وغیرہ میں تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے کام کرتے رہے[1] ۔

مولانا سندھی ۱۵/اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کابل پہنچے اور حکومت کابل نے انھیں قیام کی اجازت دے دی ۔ مولانا نے کابل میں ہندوستان کی انقلابی جماعتوں کے ساتھ مل کر کام شروع کیا ۔ ۱۹۱۶ء میں امیر حبیب اللہ نے مولانا سندھی سے کہا کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کریں ۔ اس درمیان میں مولانا سندھی ، ڈاکٹر انصاری کی معرفت انڈین نیشنل کانگریس سے رابطہ قائم کرتے رہے تا آن کہ ۱۹۲۲ء میں مولانا سندھی نے کابل میں نیشنل کانگریس کی شاخ قائم کی اور اس کا الحاق ۱۹۲۲ء میں ہی ڈاکٹر انصاری کی وساطت سے انڈین نیشنل کانگریس سے کیا[2] ۔ مولانا سندھی نے عرصہ سات سال تک کابل میں قیام کیا اور اس درمیان میں برطانیہ کے خلاف ہندوستان کی حریت پسند جماعتوں کے ساتھ مل کر کابل کو تحریک آزادی ہند کا ایک اہم مرکز بنا دیا تھا ۔ کابل سے مولانا سندھی روس گئے اور سوشلسٹ نظام سے متاثر ہوئے ۔ پھر آپ روس سے ترکی پہنچے جہاں آپ مصطفیٰ کمال کی اصلاحات اور کمال ازم سے متاثر ہوئے ، ترکی میں آپ نے "سرواراجیہ پارٹی" کا منشور بنایا جو انڈین نیشنل کانگریس کے زعماء کو بھیجا ۔ جس کا مطلب تھا عوامی راج ۔ آپ نیشنلزم کے حامی تھے ۔ ترکی سے آپ عرب گئے اور عرب قومیت کی حمایت کی[3] ۔ مگر سب سے پہلے زار روس نے اس راز (بغاوت) کی اطلاع برطانیہ کو دی ۔ اس اطلاع کے بعد برطانیہ نے امیر حبیب اللہ سے مطالبہ

---

1. *Muslim Separatism in India : A Brief Sursey*, p. 117;
The Muslim Community of Indo-Pakistan Sub-Continent, p. 261, *f.n.*

۲ ۔ "الجمعیۃ"، ۲۹ اگست ۱۹۵۵ء ، ص ۴ ، ک ۳؛ "تذکرہ شیخ الہند"، ص ۱۷۷؛
"نقش حیات" ، ج ۲ ، ص‌ص ۱۷۰-۱۷۱

پروفیسر محمد سرور ، "مولانا سندھی ، حالات زندگی ، تعلیمات اور سیاسی افکار" ، لاہور ، ۱۹۴۵ء ، ص‌ص ۲۲-۲۵

"برہان" ، اکتوبر ۱۹۴۴ء ، ص‌ص ۱۳۲-۱۳۱

2. *Ulema in Politics*, pp. 249, 314-15.

(نوٹ : ڈاکٹر قریشی صاحب نے لکھا ہے کہ مولانا سندھی نے "سرواراجیہ پارٹی" کے منشور کو ہندوستان بھیجا مگر انڈیا کی خفیہ پولیس سے یہ راز پوشیدہ نہ رہ سکا) ۔

گیا کہ ان لوگوں کو منتشر کر دیا جائے۔ چنانچہ امیر کابل نے ان میں سے کچھ افراد کو منتشر کر دیا اور کچھ افراد کو مقید کر لیا۔

مذکورہ بالا طلبہ میں سے دو طلبہ ایک فوجی سپاہی کے بیٹے تھے، جو گورنر پنجاب سے دوستانہ تعلقات رکھتا تھا۔ مولانا سندھی نے جولائی، ۱۹۱۶ء کو ایک خط جو زرد ریشمی کپڑے پر صاف اور خوش خط لکھا ہوا تھا۔ (یہ خط مولانا محمد میاں انصاری نے لکھا تھا) جو مذکورہ طلبہ کے ملازم کے ذریعہ شیخ عبدالرحیم سندھی کے پاس بھیجا جانا تھا۔ اصل میں یہ خط مولانا سندھی کا پیغام تھا جو شیخ الہند کو مکہ معظمہ بھیجنا تھا۔ مولانا سندھی نے ایک علیحدہ خط میں شیخ عبدالرحیم سندھی سے درخواست کی تھی کہ اس خط کو کسی معتمد حاجی کے ذریعہ شیخ الہند کے پاس مکہ مکرمہ پہنچا دیا جائے[1]۔ زرد ریشمی کپڑے پر لکھا ہوا یہ خط ملازم کے کوٹ کے استر میں سی دیا گیا۔ اس خط میں انگریزوں کے خلاف منصوبہ درج تھا۔ یہ ملازم بہ ظاہر اس سپاہی (گورنر کے دوست) کے پاس اس کے لڑکوں کی خیریت کہنے کے لیے آیا تھا۔ لیکن سپاہی نے اس ملازم سے بہ لطائف الحیل یہ راز معلوم کر لیا اور یہ راز اگست، ۱۹۱۶ء میں منکشف ہو گیا اور اس طرح یہ خط برطانوی حکام کے قبضے میں آ گیا۔ یہ خط (بعض مورخین نے خطوط کا لفظ استعمال کیا ہے) دنیا کے مسلمانوں کو اتحادیوں خصوصاً برطانیہ کے خلاف بغاوت کرنے کی ایک کوشش کے سلسلے میں لکھا گیا تھا۔ اس لیے یہ خط تاریخ میں ریشمی رومال کے نام سے موسوم ہے[1]۔ اس خط کی تیاری کے سلسلے میں مصنف "تحریک ریشمی رومال" نے تحریر فرمایا ہے کہ مولانا سندھی اور نصر اللہ خان نے مل کر ایک ماہر کاریگر سے ایک ریشمی رومال اس طرح بنوایا کہ اس کی بناوٹ میں معاہدہ کی پوری عبارت اور تاریخ حملہ کی عبارت عربی زبان میں تھی اور اس پر امیر حبیب اللہ خان، امان اللہ خان اور عنایت اللہ خان کے دستخط تھے۔ یہ دستخط ایک مرتبہ تو سلائی میں آگئے تھے پھر اس رومال پر

۱۔ مولانا محمد میاں، "علماء حق"، دہلی، ۱۹۴۷ء، حصہ اول، ص ۱۶۸؛
"برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ"، ص ۳۲۹ (حاشیہ)

(نوٹ: مولانا انصاری ۱۹۱۶ء میں حجاز سے غالب نامہ لے کر ہندوستان آئے اور اس کی کاپیاں ہندوستان و سرحد میں تقسیم کیں؛
Sedition Committee Report 1918, p. 177.

1. *The Muslim Community of Indo-Pakistan Sub-Continent*, p. 261 fn;
"برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ"، ص ۳۲۹ معہ حاشیہ
"علماء حق"، حصہ اول، ص‌ص ۱۶۵-۱۶۳

زرد رنگ کی روشنائی سے دوبارہ دستخط کرا دیئے تھے ۔ بقول مولانا حسین احمد مدنی اس خط کا لانے والا ایک کپڑے کا تاجر شیخ عبدالحق ، اس تحریک کا معتمد کارکن تھا ۔ یہ ریشمی رومال شیخ عبدالرحیم کے پاس سے حکومت نے برآمد کیا ۔ شیخ عبدالرحیم سندھی اس خط کو شیخ الہند کے پاس مکہ معظمہ پہنچانے والے تھے ۔ شیخ عبدالرحیم خود تو روپوش ہو گئے ، مگر یہ خط برآمد کر لیا گیا ۔ بقول مصنف ''تحریک ریشمی رومال'' اس خط کے راز کا انکشاف امیر حبیب اللہ خان اور ان کے لڑکے عنایت اللہ خان نے بذریعہ لاسلکی حکومت ہند کو کیا تھا[1] ۔

شیخ الہند اور حجاز میں سرگرمیاں :

شیخ الہند جب تک ہندوستان میں رہے ، سرحد میں تحریک کی پوری قیادت کرتے رہے ۔ یہ قیادت پیغامات اور ہدایات کے ذریعے ہوتی رہی ۔ شیخ الہند کی ان خفیہ سرگرمیوں کا علم حکومت برطانیہ کو ہوگیا تھا ۔ لہذا حکومت نے شیخ الہند کی نگرانی شروع کر دی تھی اور آپ کو گرفتار کرنا چاہتی تھی ۔ حالانکہ موصوف کی تحریک خفیہ تھی ۔ حتٰی کہ موصوف نے ارباب دارالعلوم تک کو اس تحریک کے بارے میں کچھ ظاہر نہیں کیا تھا ۔ جب آپ نے حجاز جانے کا قصد کیا تو ارباب مدرسہ کو اپنی روانگی سے قبل صرف یہ فرمایا کہ میرا ارادہ حرمین شریف جانے کا ہے ۔ مگر واپسی غیر متعین تھی ۔ لیکن آپ نے جلد واپس آنے کے لیے فرمایا تھا ۔ موصوف نے دارالعلوم کے متعلق فرمایا کہ "دارالعلوم اللہ کی امانت ہے ۔ ہر شخص کو اسے امانت سمجھ کر اس کام کو انجام دینے کی کوشش کرنا چاہیے"[2] ۔ حسب تفصیل بالا مولانا محمود حسن

---

۱ ۔ ''تحریک ریشمی رومال'' ، ص‌ص ۱۹۷-۲۰۱

(نوٹ : ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی نے اس خط کا لانے والا طلبہ مذکورہ کا ملازم بیان کیا ہے اور اس کی برآمد بھی اسی ملازم کے پاس سے ظاہر کی ہے ۔ اس کے برعکس مصنف "تحریک ریشمی رومال" نے اس کا قاصد عبدالحق تاجر کو بیان کیا ہے اور خط کی برآمد شیخ عبدالرحیم سندھی کے پاس سے ظاہر کی ہے ۔ ''برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ'' : ص ۳۲۹ ، حاشیہ)

(ذ) ''تحریک ریشمی رومال'' ، ص‌ص ۱۹۷-۲۰۱

(نوٹ : ڈاکٹر قریشی صاحب نے دوسرے خط کو مولانا انصاری سے منسوب کیا ہے ۔ جب کہ دوسرا خط مولانا سندھی نے ، عبدالرحیم سندھی کو لکھا تھا) ۔

Sedition Commttee Report **1918, p. 177;** ***Ulema in Politics*****, p. 249.**

۲ ۔ "سفر نامہ اسیر مالٹا" ، ص ۲؛ "تذکرہ شیخ الہند" ، ص‌ص ۲۲۳-۲۲۵

ذیقعدہ ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۶ ستمبر ۱۹۱۵ء بروز جمعہ جدہ جانے کے لیے روانہ ہو گئے[1] - موصوف نے پہلے حج بیت اللہ ادا کیا - اسی درمیان شیخ الہند نے ہندوستان کے ایک تاجر کی معرفت گورنر حجاز غالب پاشا سے ملاقات کی - شیخ الہند کی گفتگو کا ترجمہ تاجر مذکور نے غالب پاشا کو سمجھایا۔ شیخ الہند نے غالب پاشا سے دوسرے دن پھر ملاقات کی اور برصغیر کی تحریک آزادی کے متعلق تمام گفتگو تفصیل کے ساتھ ہوئی - مولانا کے اصرار پر گورنر نے انور پاشا کے نام تحریر لکھ دی ، جس میں لکھا تھا کہ حامل تحریر معتمد علیہ ہیں، ان کے مطالبات پورے کیے جائیں - گورنر موصوف نے یہ بھی وعدہ کیا کہ ہندوستان کو آزاد کرانے میں ہم اپنے حلیفوں یعنی جرمن اور آسٹریا وغیرہ سے بھی مدد حاصل کریں گے - مگر گورنر نے شیخ الہند سے کہا کہ ہندوستانیوں کو یک زبان اور یک قلم ہو کر مطالبہ آزادی جاری رکھنا چاہیے[2] - گورنر موصوف نے مولانا کو مشورہ دیا کہ آپ ہندوستان جا کر تمام متعلقہ جماعتوں اور آزادی پسند افراد کو مطالبہ آزادی جاری رکھنے کی ہدایت کریں - مگر مولانا نے جواباً فرمایا کہ میں حکومت کی نظر میں مشکوک ہوں ، اگر میں اس وقت ہندوستان گیا تو شاید راستے ہی میں گرفتار کر لیا جاؤں - البتہ میں اپنے رفقاء کار کو اس مہم کو جاری رکھنے کے سلسلے میں ہندوستان بھیجتا رہوں گا - اس کے برعکس میں ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر جانا چاہتا ہوں ، جہاں میرے مشن کے لوگ مصروف کار ہیں - مگر مولانا اس کے بعد مدینہ منورہ چلے گئے اور اپنے رفقاء میں سے مولانا مرتضیٰ حسین ، مولانا محمد میاں اور مولانا سہول کو ہندوستان روانہ کر دیا - مولانا محمد میاں جو بعد میں محمد منصور انصاری کے نام سے معروف ہوئے - ان کے سپرد بہت سے شعبوں کی نگرانی کی گئی تھی - غالب پاشا کی تحریر بھی مولانامنصور کے سپرد کی گئی - مولانا خلیل احمد ، شیخ الہند کے ساتھ مقیم تھے - آپ پہلے شیخ الہند کی تحریک سے متفق نہ تھے - مگر مدینہ منورہ میں قیام کے دوران ایک خصوصی مجلس کی نشست میں شیخ الہند کی تقریر کے بعد آپ اس تحریک سے متفق اور اس کے ہم نوا ہو گئے[3] - شیخ الہند نے مدینہ منورہ میں مولانا سید حسین احمد مدنی کے مکان پر قیام

---

۱ - "نقش حیات" ، ج ۲ ، ص‌ص ۲۱۴-۲۱۵؛
(نوٹ : سن عیسوی کی تاریخ کا تعین "تقویم تاریخی" کے صفحہ ۳۳۴ سے کیا گیا ہے) -
"حیات شیخ الہند" ، ص‌ص ۲۸-۲۹

۲ - "نقش حیات" ، ج ۲ ، ص‌ص ۲۱۴-۲۱۵؛

۳ - "نقش حیات" ، ج ۲ ، ص‌ص ۲۱۴-۲۱۵؛
اصغر حسین دیوبندی ، "حیات شیخ الہند ، سوانح عمری مولانا محمود حسن" ، دیوبند، س.ن ، ص‌ص ۲۸-۳۰

فرمایا ۔ دوران قیام ایک خصوصی مجلس منعقد کی جس میں مولانا سید حسین احمد مدنی اور مولانا خلیل احمد کو بھی طلب کیا ۔ مولانا مدنی اس خصوصی نشست میں شیخ الہند کے خیالات سے متاثر ہوئے اور یہیں سے مولانا مدنی کی سیاسی زندگی کی ابتدا ہوئی ہے ۔ شیخ الہند چھ ماہ تک مولانا مدنی کے مکان پر مقیم رہے اور اس درمیان میں بخاری شریف کا درس دیتے رہے[۱] ۔

انور پاشا اور جمال پاشا کی مدینہ منورہ میں آمد اور شیخ الہند سے ملاقات :

اس وقت جنگ عظیم اول جاری تھی ۔ بذریعہ تار دونوں وزیران جنگ (انور پاشا اور جمال پاشا ، جیسا کہ مولانا حسین احمد مدنی نے بیان کیا ہے) کی آمد کی اطلاع ملی ۔ شیخ الہند اس موقع کے منتظر تھے ۔ چنانچہ موصوف نے ملاقات کے لیے ایک عرضداشت تیار کی ۔ اہل مدینہ بھی وزراء کے استقبال کی تیاری میں مصروف ہوگئے ۔ یہ دونوں حضرات جب مدینہ منورہ پہنچے تو بلدیہ کی جانب سے سپاسنامہ پیش کیا گیا ۔ نیز معززین شہر اور رؤسا کا تعارف وزراء سے کرایا گیا ۔ اس درمیان میں وزراء سے ملاقات کے لیے شیخ الہند کو مغرب کے بعد کا وقت طے کیا گیا ۔ معینہ وقت پر جمال پاشا سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے آزادی ہند کی جد و جہد میں مدد و اعانت کا وعدہ فرمایا اور حسب خواہش شیخ الہند ، تحریر دینے کا بھی وعدہ کیا ۔ انور پاشا اور جمال پاشا نے حسب وعدہ "شام" جا کر دو تین دن کے اندر فارسی ، عربی اور ترکی زبانوں میں تحریر روانہ کر دی ۔ شیخ الہند نے طے کیا کہ یہ تحریریں ہندوستان روانہ کی جائیں ۔ چنانچہ ایک صندوق میں کچھ زائد کپڑوں کے ساتھ بہ حفاظت تمام یہ تحریریں مولانا ہادی حسن اور حاجی شاہ بخش کے ذریعہ ہندوستان روانہ کیں اور ہدایات دیں کہ ان تحریرات کو حاجی نورالحسن کے سپرد کر دیں اور حاجی نور الحسن ان تحریروں کا عکس احمد مرزا فوٹو گرافر سے اتروا کر فلاں فلاں جگہ پہنچا دیں[۲] ۔ یہ تحریرات حاجی نورالحسن کے پاس بہ حفاظت تمام پہنچ گئیں ۔ وہ ان تحریرات کو نکال ہی رہے تھے کہ پولیس ، مخبر کی اطلاع پر خانہ تلاشی کے لیے پہنچ گئی ۔ حسن اتفاق سے حاجی صاحب نے ان کاغذات کو نکال کر ایک صدری کی جیب میں رکھ لیا اور یہ صدری مردان خانے میں کھونٹی پر لٹکا دی ۔ پولیس چھ گھنٹے تک مکان کی تلاشی لیتی رہی مگر مطلوبہ کاغذات دستیاب نہ ہو سکے ۔ اس کے بعد

---

۱ - "نقش حیات" ، ج ۲ ، ص ص ۲۱۵-۲۱۶ ؛ "حیات شیخ الہند" ، ص ص ۲۸-۳۳

۲ - "نقش حیات" ، ج ۲ ، ص ص ۲۱۷-۲۲۳ ؛ "تذکرہ شیخ الہند" ، ص ۲۳۶

سراغ رساں نے پولیس کو حاجی احمد مرزا فوٹوگرافر دہلی کی نشان دہی کی مگر ابھی تک وہ کاغذات مرزا صاحب کے پاس نہیں پہنچے تھے۔ پولیس نے مرزا صاحب کی دوکان کی بھی تلاشی لی مگر یہاں بھی وہ کامیاب نہ ہو سکی، لیکن جب کاغذات مرزا صاحب کے پاس پہنچے تو سراغ رساں نے پھر پولیس کو مطلع کیا۔ پولیس نے دوبارہ مرزا صاحب کی دوکان کی تلاشی لی مگر اس مرتبہ بھی وہ ناکامیاب رہی۔ مرزا صاحب نے ان کاغذات کی فوٹو شدہ کاپیاں حاجی نورالحسن کو دے دیں۔ حاجی نورالحسن نے ان کاپیوں کو حسب ہدایت شیخ الہند، جہاں جہاں پہنچانا تھا، وہاں وہاں پہنچا دیا[1]۔

۱۔ "نقش حیات"، ج ۲، ص‌ص ۲۲۳-۲۲۷؛ "تذکرہ شیخ الہند"، ص ۲۴۷

(نوٹ: حکیم نصرت حسین: حکیم صاحب کا پورا نام چودھری مولوی حکیم نصرت حسین شہید مالٹا تھا۔ آپ اکوڑہ جہان آباد، ضلع فتح پور ہسوہ متصل کالپور کے مکین تھے۔ ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۵-۱۶ء میں دیوبند سے فراغت حاصل کی۔ شیخ الہند سے دورۂ حدیث پڑھا۔ شیخ الہند کے حجاز جانے کے ایک سال بعد آپ مکہ گئے۔ آپ نے شیخ الہند کے ساتھ دوسرے حج میں شرکت کی۔ شیخ الہند سے بیعت بھی تھے۔ مکہ میں شیخ الہند کے ساتھ قیام کرنے کی بناء پر گرفتار ہوئے۔ آپ کا قید مالٹا میں قیدی نمبر ۲۲۱۶ تھا۔ مالٹا میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ "حیات شیخ الہند"، ص ۵۹، (ذ) "تذکرہ شیخ الہند"، ص ۲۶۳، (ذ) "سفر نامہ اسیر مالٹا"، ص ۲۱

مولانا عزیز گل: مولانا حاجی عزیز گل، کاکا خیل، (پارت کے باشندے ہیں۔ ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء میں بغرض تعلیم وطن سے ہندوستان آئے۔ کچھ عرصے پانی پت میں قیام کے بعد دیوبند گئے اور ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء میں تکمیل علوم کی۔ آپ شیخ الہند کے خاص جان نثاروں میں سے تھے۔ مالٹا میں بھی شیخ الہند کے ساتھ تھے۔ اسیری میں دل و جان سے شیخ کی خدمت کی۔ پہلی اور دوسری بیوی کے انتقال کے بعد ایک میم سے اس کی خواہش پر رڑکی میں تیسری شادی کر لی۔ رڑکی میں آپ مدرسہ رحمانیہ کے صدر مدرس تھے۔ اس کے بعد آپ وطن چلے گئے۔ اسارت مالٹا میں آپ کا قیدی نمبر ۲۲۱۵ تھا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آپ ابھی تک حیات ہیں؟ "حیات شیخ الہند"؛ ص‌ص ۵۷-۵۸؛ (ذ) "تذکرہ شیخ الہند"، ص‌ص ۱۹۰-۱۹۱ (ذ) "سفر نامہ شیخ الہند اسیر مالٹا"، ص ۱۲۱؛ (ذ) "نقش حیات"، ج ۲، ص‌ص ۱۹۱-۱۹۲

مولوی حاجی وحید احمد مدنی: آپ مولانا سید حسین احمد مدنی کے برادر معظم مولانا محمد صدیق کے صاحب زادے تھے۔ آپ شیخ الہند کے ساتھ مالٹا میں اسیر تھے اور تقریباً ۳ برس دو مہینے قید فرنگ برداشت کی۔ رہائی کے بعد بمبئی میں شیخ الہند کے ساتھ جہاز سے اترے۔ اسارت مالٹا میں آپ کا قیدی نمبر ۲۲۱۸ تھا۔ "نقش حیات"، ج ۲، ص ۱۶۹، ص‌ص ۲۲۳-۲۲۵؛ (ذ) "حیات شیخ الہند"، ص ۵۸ (ذ) "سفر نامہ اسیر مالٹا"، ص ۱۲۱

اسی درمیان میں شریف حسین نے ترکی کے خلاف بغاوت کر دی اور سلطنت عثمانیہ کو ختم کر کے حجاز میں انگریزوں کی مدد سے اپنی حکومت قائم کر لی ۔ شیخ الہند کے رفقاء نے اس درمیان میں ہندوستان سے شیخ الہند کو زاد راہ روانہ کیا تا کہ موصوف مالی طور پر پریشان نہ ہوں ۔ جن حضرات نے مالی اعانت کی، ان میں ڈاکٹر انصاری اور مولانا محمد ابراہیم راندیر کے ایک ایک ہزار روپے قابل ذکر ہیں جو مولانا کو موصول ہوئے تھے ۔ حکومت برطانیہ شیخ الہند اور ان کے رفقاء سے پہلے ہی بدظن تھی اور ان کی گرفتاری کے لیے موقع کی منتظر تھی ۔ اب شریف حسین انگریزی حکومت کا آلۂ کار تھا ۔ شریف حسین نے حسب ہدایت برطانیہ شیخ الہند اور ان کے رفقاء کی گرفتاری کا جواز پیدا کرنے کے لیے شیخ الہند سے ایک محضر پر دستخط کرانے کے لیے کہا ، جس پر علماء عرب کے دستخط تھے اور اس محضر (فتویٰ) میں ترکوں کی تکفیر کی گئی تھی ۔ شیخ الہند نے جواباً کہا کہ میں مکہ معظمہ کا مکین نہیں ہوں اور یہ محضر علماء مکہ کی جانب سے ہے ۔ اس لیے اس محضر پر میرا دستخط کرنا درست نہیں ۔ لیکن شریف حسین نے محض شیخ الہند کی گرفتاری کے لیے دستخط نہ کرنے کا بہانہ یا جواز تلاش کیا تھا ۔ لہذا شیخ الہند کو معہ ان کے رفقاء گرفتار کرنے کا حکم صادر کر دیا ۔ موصوف کے رفقاء سفر میں حکیم نصرت حسین ، مولانا حسین احمد مدنی ، مولانا عزیز گل اور مولانا وحید احمد مدنی تھے ۔ جن کو شیخ الہند کے ہمراہ نظر بند کیا گیا ۔ یہ گرفتاری ۲۳ صفر ۱۳۳۵ھ مطابق ۲۰ دسمبر ۱۹۱۶ء عمل میں آئی اور قریباً ایک ماہ حراست میں رکھنے کے بعد ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۳ جنوری ۱۹۱۷ء کو بذریعہ خدیوی جہاز سوئیز بھیج دیا ۔ وہاں پر مصر کی سیاسی جیل میں رکھنے کے بعد شیخ الہند اور مذکورہ تمام زیر حراست ملزمان سے استفسار کیا گیا ۔ بعدہ ۲۳ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۸ فروری ۱۹۱۷ء (مصنف "نقش حیات" نے ۱۶ فروری لکھا ہے) معہ رفقاء مالٹا روانہ کر دیا گیا ۔

تحریک کا راز افشا ہونے کے بعد ہندوستان کی حالت :

شیخ الہند اور ان کے رفقاء کی گرفتاری اور مالٹا میں اسیر کر دیا جانا کوئی ایسی معمولی بات نہ تھی کہ حکومت ہند خاموش ہو کر بیٹھ جاتی یا شیخ الہند کے معتقدین خاموشی سے تماشا دیکھتے رہتے ۔ ریشمی رومال کا راز فاش ہو جانے کے بعد حکومت ہند نے مندرجہ ذیل اقدامات کیے :-

(ا) حکومت ہند نے حکومت کابل پر دباؤ ڈالا کہ تحریک ریشمی رومال کے

۱ ۔ "حیات شیخ الہند"، ص ص ۴۰-۴۳؛ "نقش حیات" ، ج ۲ ، ص ص ۲۲۹-۲۳۴

متعلق جن لوگوں پر شبہ ہو ، انھیں گرفتار کر لیا جائے ۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں افغانستان میں اس تحریک کے لیڈروں کی گرفتاری عمل میں آئی[1] ۔

(ب) ہندوستان میں تحریک سے وابستہ افراد کی نظر بندی و گرفتاری عمل میں آئی ۔

(ج) برطانیہ نے احتیاطاً برصغیر کی سرحد اور دوسرے اہم مقامات پر اپنی فوجوں میں اضافہ کیا ۔

(د) ترکی حکومت کے خلاف عربوں سے کفر کے فتوے صادر کرائے گئے ۔

مختصراً یہ کہ حکومت ہند اب پہلے سے بہت زیادہ چوکنا اور ہوشیار ہوگئی حتیٰ کہ ذرا ذرا سے شک و شبہ کی بناء پر لوگوں کو گرفتار اور نظر بند کیا گیا ۔

مسلمانان ہند کا رد عمل :

شیخ الہند کی گرفتاری کی خبر ہندوستان میں دیر سے معلوم ہوئی مگر اس خبر کے ملتے ہی مسلمانان ہند میں اضطراب و بے چینی پھیل گئی ۔ لہذا مسلمانان ہند نے آئینی حدود میں رہ کر مولانا کی رہائی کے لیے کوششیں کیں ۔ ان کوششوں میں سب سے بڑی اور اہم کوشش یہ تھی کہ ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں ایک انجمن بنام "انجمن اعانت نظر بندان اسلام" قائم کی گئی ۔ اور اخبارات کے ذریعہ مضامین اور استفسارات کے واسطے سے حکومت کی توجہ اس طرف مبذول کرائی گئی ۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل اخبارات نے بڑا اہم کردار ادا کیا ۔ "صداقت" کلکتہ ، "جمہور" کلکتہ ، "نئی روشنی" الہ آباد ، "مساوات" الہ آباد ، "مشرق" گورکھپور، "مدینہ" بجنور، "الخلیل" بجنور، "ہمدم لکھنؤ" ، "خطیب" دھلی "الصباح" لاہور ، وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ وزیر ہند اور والسرائے ہند کے پاس اسیران مالٹا کی آزادی کے لیے ہزار ہا تار بھیجے گئے۔ آنریبل سید رضا علی نے صوبہ متحدہ کی قانونی کونسل کے اجلاس میں شیخ الہند کی گرفتاری کے متعلق سوال کیا ۔ علماء دیوبند کا ایک وفد ۶ نومبر ۱۹۱۷ءکو سرجیمز میسٹن (Sir James Meston) گورنر یوپی سے ملا ۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے شیخ الہند کی رہائی کے متعلق گورنر موصوف کے سامنے عرضداشت پڑھی ، جس کی تفصیلات "القاسم" ماہ مئی ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئیں ۔ مزید برآں معززین اور حکام کے دس افراد نے بھی گورنر یوپی سے شیخ الہند کی رہائی کے لیے خاص طور پر درخواستیں کیں ۔ غرض یہ کہ شیخ الہند اور ان کے رفقاء کی رہائی کے لیے اہل ہند نے ہر ممکن کوشش کی[2] ۔

---

۱ ۔ "نقش حیات" ، ج ۲ ، ص ۱۶۹

۲ ۔ "تذکرہ شیخ الہند" ، ص‌ص ۲۷۱-۲۷۳

"القاسم" ، شعبان المعظم ۱۳۳۶ھ مطابق مئی ۱۹۱۸ء ، ص‌ص ۳-۸

رفقاء و متعلقین تحریک آزادی (تحریک ریشمی رومال) کی فہرست :

تحریک ریشمی رومال ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام کے لیے ہندوستان کو بیرونی طاقت کی غلامی سے نجات دلانے کی ایک کوشش تھی ۔ اس تحریک میں جن بزرگوں نے نمایاں حصہ لیا ، وہ حسب ذیل تھے :

(۱) شیخ الہند مولانا محمود حسن ، امیر جماعت
(۲) مولانا عبید اللہ سندھی
(۳) حاجی ترنگ زئی
(۴) مولانا سیف الرحمٰن
(۵) مولانا منصور انصاری (محمد میاں)
(۶) مولانا عزیز گل
(۷) مولانا احمد اللہ پانی پتی
(۸) شیخ عبدالرحیم سندھی
(۹) مولانا ابو السراج
(۱۰) مولانا ظہور محمد خان
(۱۱) مولانا ابوالحسن تاج محمود
(۱۲) مولانا محمد صادق ، کراچی
(۱۳) مولانا فضل ربی
(۱۴) مولانا محمد اکبر
(۱۵) مولانا فضل محمود
(۱۶) خان بادشاہ عبدالغفار خان
(۱۷) ڈاکٹر مختار احمد انصاری
(۱۸) محمد احمد چکوالی
(۱۹) شاہ عبدالرحیم رائے پوری
(۲۰) مولانا محمد جلیل کیرانوی
(۲۱) مولانا سید حسین احمد مدنی
(۲۲) مولانا محمد مبین
(۲۳) مولانا محمد ابراہیم راندیری
(۲۴) مولانا مرتضٰے حسین چاند پوری
(۲۵) مولانا محمد سہول بھاگلپوری
(۲۶) حاجی خان محمد
(۲۷) مولوی مطلوب الرحمٰن دیو بندی
(۲۸) حاجی محبوب خان سہارن پوری
(۲۹) حاجی عبدالکریم سرونجی
(۳۰) مولوی وحید احمد مدنی
(۳۱) ان حضرات کے علاوہ شیخ الہند کے ساتھ اس تحریک میں کچھ ہندو بھی شریک تھے ۔ جن کے قیام کے لیے دیو بند میں ایک علیحدہ کمرہ کا انتظام تھا[۱] ۔

---

۱ ۔ "تذکرہ شیخ الہند" ، ص‌ص ۔ ۱۸۶-۲۱۲
"نقش حیات" ، ج ۲ ، ص‌ص ۔ ۱۷۸-۲۰۳ اور ضمیمہ ص ۲۷۵
(نوٹ : اس تحریک میں شریک ہندو اراکین کی صحیح تعداد معلوم نہیں ہو سکی ۔)
(نوٹ : اس تحریک میں شریک علماء کی زندگی کے حالات بیان کرنے کے لیے ایک علیحدہ مقالہ درکار ہے ۔ ہمارے محدود مقالے میں اتنی گنجائش نہیں کہ ان کے تفصیلی حالات بیان کیے جائیں ۔ تاہم ان میں سے معروف حضرات کا بیان موقع و محل سے وقتاً فوقتاً بیان کیا گیا ہے ۔)

تحریک ریشمی رومال کی ناکام یابی کا سبب :

اس تحریک کی ناکام یابی کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ شیخ الہند حسن اعتماد میں بہت بڑھے ہوئے تھے۔ تحریک کے بعض شرکاء انگریزوں کے ملازم اور ان کے جاسوس تھے ۔ ان میں سے بعض افراد اپنی گرفتاری اور حکومت کے ظلم و تشدد کے خوف سے یا ویسے ہی ڈرکر خفیہ راز بتلا دیتے تھے ۔ مولانا محمود حسن نے حسن اعتماد کی وجہ سے اس امر پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا[1] ۔ اس کے نتیجے میں عام خفیہ کارروائی افشاء ہو جاتی تھی۔ اس امر کی تصدیق اس واقعہ سے ہو جاتی ہے کہ شیخ الہند جس وقت اسارت مالٹا سے بمبئی پہنچے تو جہاز پر ان سے ایک سی آئی ڈی کے سرکاری مولوی ملے ۔ جس نے قید مالٹا کی وہ تمام گفتگو دہرائی جو دوران قید مولانا عزیز گل ، مولوی وحید احمد مدنی ، مولانا سید حسین احمد مدنی اور شیخ الہند کے درمیان ہوئی تھی[2] ۔

مختصراً یہ کہ تحریک ریشمی رومال مولانا شاہ عبدالعزیز کی تحریک انقلاب اور سید احمد شہید کی تحریک جہاد سے مربوط و منسلک تھی ۔ اس تحریک کا نصب العین اہل ہند کو بیرونی غلامی سے نجات دلانا تھا ۔ حالانکہ وقتی طور پر یہ تحریک ناکام یاب ہو گئی مگر اس تحریک کے زعماء اپنی جد و جہد کو کانگرس کے ساتھ مل کر اس وقت تک چلاتے رہے جب تک اہل ہند نے آزادی حاصل کی ۔

---

۱ - "تحریک ریشمی رومال" ، ص ۲۳۴

۲ - ایضاً ص ص ۲۴۹-۲۵۰

ضمیمہ

فصل سوم

باب ثالث (پ)

مولانا محمد علی کے اصل خطوط جامعہ ملیہ لائبریری دہلی میں محفوظ ہیں۔ راقم الحروف نے یہ تمام خطوط جنوری ۱۹۷۱ء میں بھارت جا کر دیکھے ہیں۔ ان خطوط کی کل تعداد ایک ہزار چھ سو بارہ ہے (۱۶۱۲) جو ۱۹۰۵ء سے لے کر ۱۹۳۱ء تک کے خطوط پر مشتمل ہیں۔ اس مقالے اور فصل ھذا کی مناسبت سے حکومت ہند کا وہ خط جو ان کے پریس اور اخبار کی ضبطی سے متعلق ہے شامل ضمیمہ ہے۔ یہ خط سیکریٹری وزارت داخلہ حکومت ہند نے ۲ نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا کے ایک مضمون بنام 'ترکوں کا انتخاب' "کامریڈ" میں شائع ہونے پر لکھا تھا۔ نقل خط حسب ذیل ہے:

Copy of Notice, Home Department (Political), Dated 2-11-1914.
From Secretary to the Government of India

To

The Keeper of "The Comrade and Hamdard Press, Kucha-i-Cheelan, Delhi".

"In parsuance of Section 4(1) of the Indian Press Act, 1910, dated 26th September, 1914. The issue of Comrade and whereas, the said issue of the said newspaper contains an article entitled "The Choice of Turks" printed at page 233 to 240 of the said issue, in respect of security to the amount of Rs. 2000/- has been deposited. In accordance with the Provision of Section 3(1) of the Press Act, 1910, in pursuance of Section 4(1) of the Press Act, 1910, declares the security of Rs. 2000/- deposited in respect of "The Comrade and the Hamdard Press, Kucha-i-Cheelan, Delhi," and all copies of the issue of the newspaper called "The Comrade" bearing date the 26th September, 1914, whereever found to be forefeited to His Majesty".

By Order of the
Governor General in Council,
Sd/- Illegible
Secretary to the
Government of India.

جنگ عظیم اول ، خلافت عثمانیہ اور مسلمانان برصغیر پر داخلی اور خارجی اثرات (۱۹۱۴-۱۹۲۱ء)

فصل اول

جنگ عظیم اول اور اس کی ابتداء :

بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں سے ترکی میں اندرونی خلفشار اور خانہ جنگی یورپین ممالک کی حکمت عملی کے نتیجے میں جاری تھی ۔ ترکی میں نوجوانوں کا انقلاب (ینگ ٹرکس انقلابی تحریک) ۲۴ جولائی ۱۹۰۸ء کو رونما ہوا[1] ۔ ترکی کی اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے ترکی مقبوضات طرابلس (Tripoli) پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا ۔ ۱۹۱۲ء میں بلقان لیگ عمل میں آئی جس میں بلغاریہ ، یونان ، سربیا اور مونٹینگرو کی ریاستیں شریک تھیں ۔ ایک طے شدہ منصوبے کے تحت بلقان لیگ نے ۱۷ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو ترکی کے علاقے تھریس پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا ۔ نیز ان جنگوں میں یورپین اقوام نے ترکی کے دیگر مقبوضات کو بھی غصب کر لیا[2] ۔ یورپین اقوام نے ترکی مقبوضات پر قبضہ کرنے کے بعد اس سلسلہ میں ۳۰ مئی ۱۹۱۳ء کو ایک معاہدہ بنام "معاہدہ لندن" کیا ۔ جس پر ترکی نے بھی دستخط کیے ۔ لیکن اس معاہدہ کے فوری بعد ، فاتحین میں مسئلہ تقسیم اراضی پر جھگڑا شروع ہوگیا ۔ چنانچہ اس معاہدے پر عمل نہ ہو سکا ۔ ۲۹ جون ۱۹۱۳ء کو بلغاریہ نے بلقانی ریاستوں کے خلاف انتقاماً حملہ کر دیا ۔ اور رومانیہ نے جواباً بلغاریہ پر

---

1. E. Lipson, *Europe in the Nineteenth Century*, London, 3rd Ed., 1928, pp. 273-74.
2. Khalid bin Sayeed, *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd Ed., 1968, p. 199;
ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ، "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ، (مترجم) ہلال احمد زبیری ، کراچی ، ۱۹۶۷ء ، ص ۲۵۰ ۔

حملہ کر دیا ۔ اس درمیان میں ترکی نے اپنا علاقہ ایڈریا نوپل اور تھریس ، بلغاریہ سے واپس لے لیا اور ''معاہدہ لندن'' پر عمل کرنے سے بھی انکار کر دیا ۔ لیکن ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم سے قبل ، بلغاریہ نے اپنے علاقے کو ، ترکوں سے دوبارہ حاصل کر لیا ۔ اس کے نتیجے میں اس وقت ترکی کا علاقہ ، یورپ میں بہت تھوڑا سا رہ گیا اور اسی طرح افریقہ میں بھی سلطان ترکی کی حکومت برائے نام رہ گئی[1] ۔

دول وسطی (جرمن اور آسٹریا) پر برطانیہ کے اعلان جنگ سے جنگ عظیم اول کا آغاز ہوا تو ہندوستان کو بھی برطانیہ کے ایک رکن کی حیثیت سے جنگ میں شریک ہونا پڑا[2] ۔ دولت عثمانیہ دول یورپ کے ساتھ پے در پے جنگوں میں پہلے ہی اپنی طاقت صرف کر چکی تھی اور جنگ عظیم اول کے دوران اسے اپنے مقبوضات مثلاً عراق ، شام ، فلسطین ، حجاز اور نجد وغیرہ سے بھی عملاً دستبردار ہونا پڑا ۔ جنگ عظیم کے شروع ہوتے ہی مسلمانان ہند نے ترکی کو اس جنگ میں غیر جانب دار رہنے کا مشورہ دیا ۔ چونکہ مسلمانان ہند کے نزدیک حکومت ترکی کی بقا و حفاظت مسلمانان عالم کے لیے ضروری تھی ۔ چنانچہ مولانا عبدالباری نے بہ حیثیت خادم الخدام کعبہ ترکی کو ۳۱ اگست ۱۹۱۴ء کو بذریعہ تار برقی حسب ذیل مضمون کا خط روانہ کیا :۔

> **"Placing our faith and confidence, which we the Indian Muslims have in the Khilafat, we respectfully urge upon your Majesty either to support Britain or to keep neutral in this war"[3].**

لیکن ترکی ، چونکہ پچھلے چند سالوں میں انگریزوں اور ان کے حلیفوں کے ہاتھوں ناقابل تلافی نقصان اٹھا چکا تھا ، اس لیے ترکی کا اب انگریزوں پر سے اعتماد اور بھروسہ

---

1. B.R. Ambedkar, *Pakistan or the Partition of India*, Bombay, 1946, pp. 199-200; *Europe in the Nineteenth Century*, pp. 278-80.
2. Thompson and Garrat, *Rise and Fulfilment of British Rule in India*, Allahabad, 1958, p. 539;
سید فضل حسین ، "سیاست ہند مابعد غدر" ، لکھنؤ ۔ س ۔ ن ، ص ۸۶-۸۷
(نوٹ : مصنف "سیاست ہند مابعد غدر" نے جنگ عظیم اول کی ابتدا ۴ اگست ۱۹۱۴ء بیان کی ہے ۔ جب کہ ڈاکٹر سیتا رامیہ نے اس کی ابتداء جولائی ۱۹۱۴ء لکھی ہے ۔ مگر دیگر معتبر کتب کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جنگ ۴ اگست ۱۹۱۴ء کو ہی شروع ہوئی تھی ۔ ڈاکٹر سیتا رامیہ کا بیان غیر تحقیقی ہے ، "تواریخ کانگریس" ، ص ۱۲۶) ۔
3. Chaudhry Khaliquzzaman, *Pathway to Pakistan*, Lahore, 1961, p. 28; *Pakistan or the Partition of India*, p. 200.

اٹھ چکا تھا ۔ ترکی کے قدیم حریف روس کے انگریزوں کے ساتھ اتحاد نے ترکی کے لیے مزید مشکلات پیدا کر دی تھیں ۔ اس کے برعکس جرمنی نے جنگ طرابلس اور جنگ بلقان میں ترکوں کی مخالفت نہیں کی تھی نیز فتح ایڈریانوپل کے موقع پر قیصر جرمنی نے سلطان خامس کے نام تہنیت و تبریک کا تار بھی بھیجا تھا ۔ نیز جنگ بلقان میں جرمنی نے ترکی افواج کی نئے سرے سے تنظیم میں تعاون و مدد کی تھی ۔ ان علل و اسباب کی بناء پر حکومت ترکی ، جرمنی کی حلیف بن کر جرمنی کے ساتھ ، جنگ عظیم اول میں شریک ہونے پر آمادہ ہوئی ۔ لہٰذا سلطنت عثمانیہ نے ۴ نومبر ۱۹۱۴ء کو جرمنی کے ساتھ جنگ میں شریک ہونے کا اعلان کر دیا[1] ۔ اور سلطان ترکی نے اس جنگ کو "جہاد" قرار دے دیا ۔ چنانچہ سات سو ہندوستانی حجاج جو خدام کعبہ کے عائدین کے ساتھ تھے ، وہ اس جہاد میں حصہ لینے کے لیے حجاز میں ہی رہ گئے[2] ۔

جنگ عظیم اول اور ہندوستانیوں کا رد عمل :

جنگ شروع ہونے کے بعد ، اہل ہند نے اپنی روایتی وفاداری کے تحت اس جنگ میں ہمہ قسم کی مدد و اعانت کا اعلان کیا ۔ ''رائز اینڈ فل فلمینٹ آف برٹش رول ان انڈیا" (Thompson and Garrat) کے مصنفین نے بیان کیا ہے کہ ہندوستان کے نواب ، راجا اور رؤسا کے علاوہ عام رعایا نے بھی اپنی اپنی خدمات حکومت کے حوالے کر دیں اور ہندوستان سے غلہ ، افواج ، اسلحہ اور دیگر ضروریات جنگ کا سامان بھی محاذ جنگ پر روانہ کیا گیا[3] ۔ تاج برطانیہ نے سیاسی مصلحت کے پیش نظر جنگ کے فوراً بعد مسلمانان ہند کو یہ یقین دلایا کہ مسلمانوں کے اماکن مقدسہ ، جو عرب اور دیگر اسلامی ممالک میں ہیں ، ان کی حفاظت کی جائے گی ۔ یہ یقین دہانی وائسرائے ہند کی جانب سے بذریعہ اخبارات کی گئی ۔ اس کے بعد وزیر اعظم مسٹر اسکوئتھ (Asquith) نے ۹ نومبر ۱۹۱۴ء کو وائسرائے ہند کی مذکورہ بالا یقین دہانی کی توثیق کر دی

---

1. I.H. Qureshi, *Ulema in Politics*, Karachi, 1972, p. 244; *Europe in the Nineteenth Century*, pp. 285-86;
"زمانہ" ، فروری ۱۹۲۸ء ، ص ۶۳؛
رئیس احمد جعفری (مرتب)، "علی برادران" ، لاہور ، ۱۹۶۲ء ، ص ۶۳۲

2. *Chaudhry Khaliquzzaman*, *op. cit.*, p. 28;

3. *Ulema in Politics*, p. 244; Thompson and Garrat, *op. cit.*, p. 358; I.H. Qureshi, *op. cit.*, p. 28; *Muslim Separatism in India*, p. 107; "علی برادران" ، ص ۶۲۲

اور ساتھ کے ساتھ ان کے حلیفوں یعنی فرانس اور روس وغیرہ نے بھی اس یقین دہانی کی توثیق کر دی[1] ۔

اس کے بعد حکومت ہند نے جنگ کے سلسلے میں ایک جلسہ لکھنو میں منعقد کرایا ۔ جلسے کے انعقاد سے قبل مولانا عبدالباری سے اس جلسے میں شرکت کی رضا مندی لے لی گئی تھی ۔ لہٰذا موصوف جلسے میں شریک ہوئے ۔ یہ جلسہ ، جس کا انتظام سرکاری حلقوں نے کیا تھا ، محض حکومت کی تائید اور تاج برطانیہ سے وفاداری کے اعادے کے لیے کرایا گیا تھا ۔ مگر اس جلسے میں حکومت نے ترکی کے موقف کے بارے میں کسی طرح کا اظہار خیال کرنے کی اجازت نہیں دی[2] ۔

وزیر اعظم اسکوئتھ نے پارلیمنٹ میں ، اس جنگ کے سلسلے میں ، اہل ہند کی قربانیوں اور ان کی وفاداریوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "ہم اس امداد کا جو ہندوستان نے دی ہے ، محبت اور امتنان کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں" ۔ اسی طرح کا تشکر دیگر مدبرین برطانیہ نے بھی پارلیمنٹ میں اور اس کے باہر کیا[3] ۔

ایک طرف تو وزیر اعظم برطانیہ اور مدبرین برطانیہ ہندوستانیوں کی وفاداریوں اور ان کی قربانیوں کا شکریہ ادا کر رہے تھے تو دوسری طرف ڈیفینس آف انڈیا ایکٹ اور ڈیفنس رولز کے تحت ہندوستانی پریس اور خصوصاً مسلم پریس مثلاً "کامریڈ" ، "الہلال" ، "ہمدرد" اور "زمیندار" وغیرہ سے ترکوں کی ، اور ان کے جرمنی کے ساتھ اشتراک کی ، حمایت کی بنا پر تہدید و تنبیہہ کی جا رہی تھی ۔ مولانا محمد علی نے ۱۹۱۴ء کے آخر میں برطانیہ سے اپیل کی کہ وہ اس وقت جب کہ بلجیم کی غیر جانب داری کی خاطر جنگ میں شریک ہو چکا ہے تو اس کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ اسی اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے مصر کو خالی کر دے ۔ تاکہ ایسا کرنے سے مسلمانان عالم کی ہمدردیاں تاج برطانیہ کے ساتھ ہو جائیں ۔ علاوہ ازیں مولانا محمد علی نے ۲۶ ستمبر ۱۹۱۴ءکو "کامریڈ" میں ایک مضمون 'ترکوں کا انتخاب' (The Choice of Turks) شائع کیا ۔ جس میں ترکوں کی جرمن کے ساتھ مشارکت اور معاونت کو جائز قرار دیتے ہوئے اس کی تائید کی ۔ حکومت نے اس مضمون کو خلاف قانون قرار دیا ۔ اور نقص امن کا خدشہ ظاہر کرتے ہوئے پریس ایکٹ مجریہ ۱۹۱۰ء اور ڈیفنس آف انڈیا رولز

1. Chaudhry Khaliquzzaman, *op. cit.*, pp. 28-29; "سیاست ہند مابعد غدر"، ص ۸۲-۸۸

2. Chaudhry Khaliquzzaman, *op. cit.*, p. 29.

۳ ۔ "سیاست ہند مابعد غدر" ، ص ۸۵-۸۸

نوٹیفیکیشن نمبر ۱۱۹۶ ، مورخہ ۲ اپریل ۱۹۱۵ء کے تحت کارروائی کرنے کی دھمکی دی'۔ راقم الحروف کو مولانا محمد علی کے ذاتی ریکارڈ سے ایک خط چیف کمشنر دہلی کا موصول ہوا ہے۔ جو مولانا شوکت علی کے نام ہے اور یہ امر یقینی ہے کہ اسی طرح کا خط مولانا محمد علی کے نام بھی جاری ہوا ہوگا۔ مولانا شوکت علی کے نام کا خط جس میں انھیں متنبہ کرتے ہوئے حکم دیا تھا کہ وہ اپنی سرگرمیاں بند کر دیں۔ اس خط کا متن حسب ذیل ہے:-

"Copy of order under rule 3 of the Defence of India Ru'es 1915, vide Government of India Home Department, Notification No. 1196 dated the 2nd April 1915, whereas in the opinion of the Chief Commissioner, Delhi, there are reasonable grounds for believing that Shaukat Ali S/o Abdul Ali Khan of Delhi, had acted, is acting and is about to act in a manner prejudiced to public salety. The said Chief Commissioner, hereby directed the Shaukat Ali to abstain from writing, dictating or in any way composing or assisting whether directly or indirectly in the composition of any matter for publication in any book, newspaper or other documents of any kind intended for issue–or which he knows or has reason to believe is likely to be issued, to the public or to any section or class of the public".

Sd./- W. M. Hailey
Chief Commissioner
Delhi[2]

اس کے بعد ڈسٹرکٹ میجسٹریٹ دہلی نے ۱۵ مئی ۱۹۱۵ء کو مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کو مہرولی میں نظر بندی کے احکامات جاری کر دیئے:-

From District Magistrate of Delhi, Mr. H. C. Beadon, Dated 15th May 1915 "for Mr. Shaukat Ali and Mr. Mohammad Ali, should take up...residence in Mehrauli by 22nd May 1915 at latest.[3]"

---

۱ - "سیاست ہند مابعد غدر"، ص ۸۷-۸۸ ،
"برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ"، ص ۳۴۷
ضیاء الدین احمد برنی ، "عظمت رفتہ"، کراچی ، ۱۹۶۱ء ، ص ۵۱

2. Original papers of Mohamed Ali, January to June 1915, taken by me from Jamia Millia, Delhi.

3. *Ibid.*

غرض یہ کہ اسی طرح حکومتِ ہند نے پریس اور اخبارات کو تاکید اور تنبیہ کی کہ وہ محتاط رویہ اختیار کریں ۔ مگر مسلم پریس نے ، جس میں ''کامریڈ'' ، ''الہلال'' ، ''ہمدرد'' اور ''زمیندار'' وغیرہ قابل ذکر ہیں ، حکومت کے انتباہ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دلیرانہ طور پر ترکوں کی ، اور ان کے ''جرمنی'' کے ساتھ اشتراک کی حمایت کی ۔ جن کی پاداش میں ان کے مدیروں کو نظر بند کیا گیا اور پریس کی ضمانتیں بھی ضبط کی گئیں[1] ۔

دوران جنگ میں علماء کی گرفتاری :

علماء کرام کا ایک سیاسی گروہ دوران جنگ عظیم اول ملک سے باہر جا چکا تھا ، جن میں خاص طور پر مولانا عبیداللہ سندھی ، مولانا محمود حسن اور ان کے رفقاء کار تھے۔[2] یہ حضرات ۱۹۱۵ء میں کابل اور حجاز کو چلے گئے تھے ۔ مولانا محمود حسن کا مشن ہندوستان کو بیرونی طاقت سے نجات دلا کر آزادی حاصل کرنا تھا ۔ اس لیے انھوں نے حکومت ترکی سے امداد طلب کی تھی ۔ شیخ الہند کی تحریک آزادی حسب تفصیل سابق بہت عرصہ قبل سے خفیہ طور پر کام کر رہی تھی ۔ ادھر ۱۹۱۵ء میں مولانا شوکت علی اور محمد علی کو نظر بند کر دیا گیا تھا ۔ ۱۳ اپریل ۱۹۱۶ء کو مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی کو بھی ترکوں کی حمایت کے الزام میں گرفتار کر کے للت پور جیل بھیج دیا گیا ۔ مولانا ظفر علی خان کو بھی اسی درمیان میں نظر بند کر دیا گیا[3] ۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ''الہلال'' میں کچھ مضامین اور تصاویر جرمن کی حمایت میں شائع کیں ۔ جس کی بنا پر ، ڈیفینس آف انڈیا رول کے تحت ''الہلال'' پریس کی ضمانت ضبط کر کے دوبارہ دس ہزار روپے کی ضمانت طلب کی ۔ پھر مولانا نے ''البلاغ'' کے نام سے ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو ایک دوسرا پرچہ جاری کیا ، جو ۳۱ مارچ ۱۹۱۶ء تک جاری رہا ۔ اس کے بعد گورنمنٹ بنگال نے ۲۸ مارچ ۱۹۱۶ء زیر دفعہ ۳ ڈیفینس آف انڈیا رولز کے تحت مولانا آزاد کو چار دن کے اندر اندر صوبہ بنگال کی حدود سے نکل جانے کا حکم دے دیا ۔ صوبجات پنجاب ، یو پی اور دہلی وغیرہ نے اپنے اپنے حدود میں موصوف کے داخلے پر پہلے ہی پابندی عاید کی ہوئی تھی ۔ لہٰذا ممدوح کلکتے سے رانچی

---

۱ - ''بزم عظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ'' ، ص ۲۴۷؛ ''عظمت رفتہ'' ، ص ۵۳

2. Sedition Committee Report 1918, pp. 177-178.

3. Rajendra Prasad, *India Divided*, Bombay, 1946, p. 112; Board of Editors, *A History of the Freedom Movement*, Vol. 3, Pt. 1, Karachi, 1961, p. 127;
نیاز احمد شیخ ، (مرتب) ، ''کلیات حسرت'' ، لاہور ، ۱۹۶۸ء ، ص ص ۲۲ ، ۱۲۴-۱۲۵

چے ۔ مگر راستے میں بھی مولانا کو گرفتار کر کے نظر بند کر دیا گیا[1] ۔

مولانا محمود حسن اور ان کے رفقاء کو دسمبر ۱۹۱۶ء میں شریف حسین مکہ
، معرفت گرفتار کر کے مالٹا میں محبوس کر دیا گیا ۔ جس کی تفصیلات تحریک ریشمی
رمال کے حال میں بیان کی جا چکی ہیں[2] ۔ مولانا عبید اللہ سندھی ، شیخ الہند کے حکم
۔ کابل گئے تھے ۔ وہاں پر ممدوح نے تحریک آزادی کے غیر منظم اور غیر مربوط نظام
و درست کیا ۔ نیز تحریک آزادی کے لیڈروں کو منظم اور متحد کر کے تحریک میں
ک نئی روح پیدا کی ۔ اول اول تو امیر کابل نے مولانا سندھی کو سیاسی تحریک جاری
کھنے کی اجازت دے دی تھی ۔ حتیٰ کہ خود امیر کابل نے مولانا سندھی کو مشورہ
یا تھا کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر تحریک آزادی کو چلائیں ۔ چنانچہ مولانا سندھی
نے ڈاکٹر انصاری کی وساطت سے الذین نیشنل کانگریس کی ایک شاخ کابل میں قائم کی
ر اس کا الحاق انڈین نیشنل کانگریس سے کر دیا ۔ مولانا سندھی نے ترک اور جرمن
شن سے بھی رابطہ قائم کیا ۔ بعدہ ۹ جولائی ۱۹۱۶ء کو ریشمی رومال والے خط کا
نکشاف ہو گیا ۔ جس کے بعد امیر کابل نے مولانا عبید اللہ سندھی کو بھی گرفتار
ر لیا ۔ ۱۹۱۹ء میں امیر حبیب اللہ کے قتل کے بعد امیر امان اللہ خان تخت نشین
ہوئے ۔ تب مولانا سندھی کو قید سے رہائی ملی[3] ۔

---

1. A. H. Alberuni, ***Makers of Pakistan***, Lahore, 1950, pp. 140-141;
Ulema in Politics, p. 244;
"البلاغ" ، ۱۵ - ۱۶ اور ۱۷ مارچ ۱۹۱۶ء ، ج ۱ ، ص ۳۳۹ ، ک ۱؛
"بر عظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ، ص ۲۷۳ (مع حاشیہ)

2. Sedition Committee Report 1918, p. 179;
India Divided, p. 112 ; ***A History of the Freedom Movement***, Vol. 3, Pt. 1
p. 211;

مولانا محمد میاں : "علماء حق" ، دہلی ، ۱۹۴۷ء ، حصہ اول ، ص‌ص ۱۶۸-۶۹
(نوٹ : جسٹس رولٹ نے بیان کیا ہے کہ مولانا محمد میاں انصاری جو محمود حسن کے ساتھ
حجاز گئے اور وہاں سے ایک خط "غالب نامہ" ۱۹۱۶ء میں لے کر ہندوستان اور پھر کابل
گئے ۔ اس خط میں جہاد کے متعلق تفصیلات درج تھیں جس میں برطانیہ کو ہندوستان سے
بے دخل کر کے اسلامی حکومت قائم کرنے کا منصوبہ بھی درج تھا)
Sedition Committee Report, 1918, p. 177.

1. I. H. Qureshi, ***The Muslim Community of Indo-Pakistan Sub-continent***, Th
Hague, 1962, pp 260-261;
Aziz Ahmad, ***Islamic Modernism in India and Pakistan***. London, 1967, p 169;
Sedition Committee Report 1918, pp. 177-78;
"الجمعیۃ" ، ۲۹ اگست ۱۹۵۵ء ، ص ۳ ، ک ۳

سیڈیشن کمیٹی رپورٹ :

حکومت برطانیہ نے ہائی کورٹ کے جج مسٹر ایس اے ٹی رولٹ (S. A.T. Rowlatt) کی سربراہی میں ایک تحقیقاتی کمیٹی مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۱۷ء کو مقرر کی۔ اس کمیٹی میں مندرجہ ذیل اصحاب کو ممبر نامزد کیا گیا تھا۔ مسٹر سرباسل اسکاٹ (Sir Basil Scott) چیف جسٹس بمبئی، آنریبل مسٹر دیوان بہادر سی۔ وی کماراسوامی شاستری (Hon'ble Diwan Bahadur C. V. Kumaraswami Sastri) مدراس ہائی کورٹ کے جج اور آنریبل سر ویرونی لویٹ Hon'ble Sir Veorney) (Lovett صوبہ متحدہ ریونیو بورڈ کے ممبر اور آنریبل مسٹر پرواش چندرا مترا Hon'ble) (Mr. Provash Chandra Mitra کلکتہ ہائی کورٹ کے وکیل اور مسٹر جے۔ ڈی۔ وی۔ ہوج، آئی سی ایس (Mr. J. D. V. Hodge, I. C. S.) بنگال کو اس کمیٹی کا معتمد نامزد کیا گیا۔ اس کمیٹی کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں ۱۹۰۷ء سے لے کر ۱۹۱۷ء تک ان تمام سازشوں کا پتہ چلائے جو بالواسطہ یا بلا واسطہ حکومت برطانیہ کے خلاف ہوتی رہی ہیں۔ نیز ان افراد کا بھی پتہ چلائے جو ان سازشوں میں ظاہراً و باطناً شریک کار تھے۔ نیز ان افراد کے اعمال و افعال کا پتہ لگا کر ان کو منظر عام پر لائے، تاکہ ان کو سزا دی جا سکے۔ نیز یہ کہ ان سازشوں کے سدباب کے لیے بھی اپنی تجاویز پیش کرے۔ اس کمیٹی نے مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا محمود حسن، مولانا محمد میاں انصاری، ہردیال، برکت اللہ، ۵۱ طالب علم، شیخ عبد الرحیم سندھی حیدر آباد اور دیگر بہت سے افراد کی سرگرمیوں کا سراغ لگایا۔ "تحریک ریشمی رومال" والا خط اگست ۱۹۱۶ء حکومت برطانیہ کے قبضے میں آ چکا تھا۔ اس کے بعد اس کمیٹی کے تقرر کی ضرورت پیش آئی۔ ڈاکٹر عبدالحمید کا یہ بیان کہ یہ رپورٹ ۱۵ اگست ۱۹۱۷ء کو شائع کی گئی، صحیح نہیں کیونکہ اس وقت تک اس کمیٹی کی تشکیل بھی عمل میں نہیں آئی تھی۔ یہ کمیٹی گورنمنٹ آف انڈیا وزارت داخلہ، کے ریزولیوشن نمبری ۲۸۸۴ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۱۷ء کے تحت عمل میں آئی تھی۔ جس نے اپنی رپورٹ ۱۵ اپریل ۱۹۱۸ء کو وزارت داخلہ کے سکریٹری، بمقام دہلی کو پیش کی تھی[1]۔ چودھری خلیق الزمان کے بیان کے مطابق اس رپورٹ کی اشاعت کے بعد علی برادران پر چھندواڑہ جیل میں مزید سختیاں کی گئیں[2]۔ ادھر جنگ عظیم نے ۱۹۱۷ء میں امریکہ کی جنگ میں شرکت کے بعد عالمی جنگ کی شکل اختیار کر لی۔ اس کے بعد

---

1. Sedition Committee Report 1918, pp. 1-3;
Muslim Separatism in India : A Brief Survey, p. 127;
چودھری خلیق الزمان، "شاہ راہ پاکستان"، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۳۲۳

۲۔ ایضاً،

جرمنی اور اس کے ساتھ ترکی کی شکست ناگریز ہو گئی ۔ غرض یہ کہ ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو جنگ اختتام پذیر ہوئی ۔ اور جرمنی و ترکی کو شکست کا خمیازہ بھگتنا پڑا[1]۔

فصل دوم

مسلمانان برصغیر پر داخلی اور خارجی اثرات :

مسلمانان ہند کو بیسویں صدی کے اوائل ہی سے تلخ واقعات و حالات سے دو چار ہونا پڑا ۔ ان کی روشنی میں انھیں اپنی حیثیت کی کمزوری کا احساس ہونا لازم تھا ۔ اب انھیں مستقبل کے لیے اپنے سیاسی دفاع اور تحفظ کرنے کی فکر لاحق ہوئی ۔ جنگ عظیم سے قبل مسلمانان ہند سیاسی طور پر مسلم لیگ کے ساتھ اور دیگر سیاسی جماعتوں میں شریک ہو کر بے ربط اور غیر آہنگ طور پر کام کر رہے تھے ۔ مگر دسمبر ۱۹۱۱ء میں تنسیخ بنگال اور پھر جنگ طرابلس و بلقان ، حادثہ انہدام مسجد کان پور وغیرہ نے مسلمانان ہند کو جھنجھوڑ کر بیدار کیا[2] ۔ علاوہ ازیں ہندوستان و بیرون ہندوستان میں پیش آنے والے واقعات نے مسلمانان ہند کو اپنے سیاسی مستقبل کو محفوظ و مامون کرنے پر متوجہ کیا ۔ مولانا آزاد نے بھی اپنی تحریروں کے ذریعہ مسلمانوں کو خود اعتمادی کا سبق دیا[3] ۔

مسلم لیگ کے مسلک میں تبدیلی :

۱۹۱۰ء میں ملک میں جو حالات رونما ہوئے انھوں نے مسلم لیگ کے سیاسی موقف میں تغیر اور تبدیلی پیدا کی ۔ اس تبدیلی کے نتیجے میں مسلم لیگ اور کانگریس قریب آنے لگیں ۔ ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے قریب آنے کی ایک اہم اور خاص وجہ یہ بھی تھی کہ ۱۹۱۰ء میں مسلم لیگ نے اپنی پالیسی میں نمایاں تبدیلی کی ۔ یعنی پہلی مرتبہ ۱۹۱۳ء میں ایک ریزولیوشن کے ذریعہ "مناسب حکومت خود اختیاری" کا مطالبہ بھی کیا ۔ چوں کہ یہ قرار داد کانگریس

---

۱ ۔ "سیاست ہند ما بعد غدر" ، ص ۸۰؛ "علماء حق" ، حصہ اول ، ص ۱۲۷

2. *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd ed., p. 38;

حبیب احمد چودہدری ، "تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء" ، لاہور ، ۱۹۶۶ء ، ص ۲۲

۳ ۔ "الہلال"، ۲۹ اکتوبر ۱۹۱۲ء بحوالہ "نیشنلسٹ علماء" ، ص ۵۶

کے مقاصد سے قریب تر تھی ۔ لہٰذا اس کی روشنی میں مسلم لیگ اور کانگریس قریب تر ہوتی گئیں[1] ۔ اب مسلم لیگ نے سرکار کی ہمنوائی کی پالیسی ترک کر دی اور اپنے اغراض و مقاصد میں بھی تبدیلی کر لی ۔ علاوہ ازیں مسلم لیگ کے سربراہ سر آغا خان نے جماعت کی صدارت سے استعفٰی دے دیا اور مسلم لیگ کا آزاد گروہ جس کی قیادت مسٹر جناح کرتے تھے ، مسلم لیگ پر قابض اور حاوی ہو گیا ۔ مسٹر جناح پہلے ہی سے ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے ۔ اس کے بعد مسٹر جناح مسلم لیگ میں شرکت کرنے پر راضی ہوگئے ۔ اس کے بعد مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاس ایک ہی مقام پر ساتھ ساتھ منعقد ہوتے رہے اور مسٹر جناح نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے کام کرنا شروع کر دیا[2] ۔

ادھر مسلمانان ہند پر عالمی سیاست کے اثرات مرتب ہو رہے تھے ۔ دول مغرب کی حکمت عملی اور عیسائی سلطنتوں کی ہوس ملک گیری سے یہ خطرہ پیدا ہو گیا ، کہ کہیں یہ ممالک دولت عثمانیہ کو یکسر ختم نہ کر دیں[3] ۔ مسلمانان ہند عموماً اور علماء ملت خصوصاً اس صورت حال سے بہت فکر مند تھے ۔ کیوں کہ اب ساری دنیا میں لے دے کر صرف ترکی ہی ایک سلطنت تھی ، جس کے پیکر میں اسلامی شان و شکوہ نظر آتی تھی ۔ طرابلس اور بلقان کی جنگوں نے دنیائے اسلام میں یورپ کے خلاف پہلے ہی سے غم و غصہ پیدا کر دیا تھا ۔ مسلمانان ہند بھی اس صورت حال سے متاثر تھے اور ان میں اس وقت اسلامی جوش و خروش شباب پر تھا ۔ علماء کرام اس مسئلے میں پیش پیش تھے ۔ دوران جنگ عظیم حکومت نے کئی سرکردہ علماء کرام کو نظربند کر دیا تھا ۔ تاہم علماء سلطنت عثمانیہ کی حفاظت اور خلافت کو بچانے کے لیے اپنی بساط بھر کوشش کر رہے تھے[4] ۔ طرفہ تماشا یہ کہ ادھر اسلامیان ہند ، خلافت کے تحفظ اور ترکوں کی حمایت کے لیے جد و جہد کرنے پر آمادہ ہو رہے تھے اور ان کے لیڈروں میں کئی یکے بعد دیگرے قید فرنگ میں گرفتار ہوئے اور ادھر مسلمان سپاہی جو افواج ہند میں ملازم تھے ، ترکوں کے خلاف لڑنے کے لیے روانہ کئے گئے[5] ۔ اس جنگ کے دوران

---

1. *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd ed., p. 38.
2. Abdul Waheed Khan, *India Wins Freedom ; The Other Side*, Karachi, 1961, p. 48; *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd ed., pp. 36-39;
A History of the Freedom Movement, Vol. 3, Pt. 1, p. 123;
"سیاست ہند مابعد غدر" ۔ ص ۸۷؛ "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ؛ ص ۳۴۲

۳ ۔ "علی برادران" ، ص ۲۱۳

۴ ۔ مولانا سید سلیمان ندوی ، "حیات شبلی" ، اعظم گڑھ ، ۱۹۴۳ء ، ص ص ۶۸۶-۶۹۰

۵ ۔ "علی برادران" ، ص ص ۶۳۲-۶۳۳

جس وقت انگریزوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کیا ۔ اس وقت مسلمانان ہند نے جا بجا احتجاجی جلسے کیے ۔ ان جلسوں میں علماء کرام اور خصوصاً محرکینِ خدام کعبہ یعنی مولانا عبدالباری فرنگی محلی ، مولانا عبدالماجد بدایونی ، مولانا عبدالمقتدر بدایونی ، وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ خلافت کو محفوظ و مامون کرنے اور اس کو قائم رکھنے کے لیے مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا عبدالماجد بدایونی نے نمایاں خدمات انجام دیں[1] ۔

۱۹۱۳ء کے بعد اور دوران جنگ برطانیہ نے ہندوستانیوں سے کئے ہوئے وعدے اور وعیدوں کو نسیاً منسیاً کر دیا تھا اور دوران جنگ ہندوستانیوں کی خدمات اور ان کی وفاداریوں کا یہ صلہ دیا کہ حکومت نے عوام پر دوبارہ سختیاں شروع کر دیں اور ڈیفنس رولز اور پریس ایکٹ کو حرکت میں لاکر مدیران اخبار اور علماء کو گرفتار کیا گیا[2] ۔ مزید برآں ، برٹش کولمبیا میں مقیم ہندوستانی سکھوں کے ساتھ ایسے برے برتاؤ کئے گئے کہ وہ لوگ وہاں سے واپس آنے پر مجبور ہوگئے اور ہندوستان میں واپس آکر حکومت کے مخالفین کی تعداد میں اضافہ کا باعث بنے ۔ اس طرح برصغیر کے باشندوں میں عدم اعتماد اور اضطراب و بے چینی کی فضا بڑھتی گئی ۔ لہٰذا مسلم لیگ اور کانگریس نے مل جل کر اور باہمی مشورے کے بعد ۱۹۱۶ء میں حکومت ہند کو کچھ اصلاحی تدابیر اور منصوبے پیش کیے ۔ جن کا ذکر اگلے صفحات میں کیا جائے گا[3] ۔

فصل سوم

میثاق لکھنو یا ہندو مسلم اتحاد :

میثاق لکھنو کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں میں سیاسی تعاون کی راہ ہموار کرنا

---

۱ ۔ ”علی برادران“ ، ص ۶۴۳
(نوٹ : مولانا عبدالمقتدر کا خاندان علمی اعتبار سے مولانا فضل حق خیر آبادی سے متعلق تھا ، جنہوں نے انگریزوں کے خلاف ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں عملی جہاد کیا تھا ۔
”یادداشت مولانا عبدالحامد بدایونی“ مرتبہ راقم الحروف، ۲۲ مارچ ۱۹۷۰ء، ص ص ۷-۱۱، غیر مطبوعہ)

۲ ۔ ”سیاست ہند مابعد غدر“ ، ص ۸۸

3. G. Allana, *Pakistan Movement : Historic Documents*, Karachi, n.d., pp. 48-50; *A History of the Freedom Movement*, Vol. 3, Pt. 1, p. 130;
(نوٹ : مصنف نے سکھوں کے واپس آنے کی تاریخ بیان نہیں کی ہے ۔ راقم)
”سیاست ہند مابعد غدر“، ص ۸۸

تھا - اس اتحاد کے مختلف اسباب و علل تھے - تنسیخ بنگال سے قبل مسلم کا جلسہ جنوری ۱۹۱۰ء میں بصدارت حکیم اجمل خان دہلی میں منعقد ہوا تھا - حکیم اجمل خان اس جلسے کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر تھے - موصوف نے اپنے استقبالیہ میں فرمایا کہ مسلمانان ہند کو اپنے ہمسایوں یعنی ہندوؤں کے ساتھ مل کر سیاسی جد و جہد کرنا چاہئے تا کہ وطن کو آزاد کرانے میں متحدہ اور مشترکہ کوششوں کی وجہ سے آسانی پیدا ہو سکے[1] - اس کے بعد ملک میں یکے بعد دیگرے جو حالات (حسب تفصیل سابق) رونما ہوئے ، ان کے نتیجے میں کانگریس اور مسلم لیگ کی مغائرت ختم ہوگئی اور یہ جماعتیں ایک دوسرے کے قریب آ گئیں - حتی کہ ان کے سالانہ اجلاس بھی ایک ہی تاریخوں میں اور ایک ہی مقام پر ۱۹۱۳ء سے ساتھ ساتھ ہونے لگے - اس صورت حال کو ساز گار بنانے میں علماء اور اخبارات نے اہم رول ادا کیا - مثلاً مولانا شبلی نعمانی جو ابتدا ہی سے مسلم ہندو اتحاد کے حامی اور کانگریس کے اصول آزادی اور اس کی سیاسی جد و جہد سے متاثر تھے ، ان کی خدمات اس سلسلے میں بڑی اہمیت کی حامل ہیں - بقول ڈاکٹر شیخ محمد اکرام ، شبلی ، سرسید کی سیاسی پالیسی اور مسلک کے خلاف تھے - سرسید کے نزدیک کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت مناسب نہ تھی - جب کہ مولانا شبلی ، ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ سیاسی جد و جہد کو مستحسن اور ضروری خیال کرتے تھے - (بقول مصنف کلیات حسرت) مولانا شبلی نعمانی سب سے پہلے عالم تھے جنھوں نے کانگریس میں عملی حصہ لیا اور کانگریس کی پالیسیوں کی حمایت کی اور مولانا شبلی نے ہی سب سے پہلے آزادی کامل کا نعرہ بلند کیا[2] - نیز یہ کہ شبلی نے اقتضائے وقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے قومی کاموں میں حصہ لیا اور بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے - مثلاً تنسیخ بنگال کے بعد مولانا نے ایک مضمون بقول مصنف "حیات شبلی" 'مسلمانوں کی صحیح پولیٹکل کروٹ' کے نام سے تین نمبروں میں شائع کیا جو "مسلم گزٹ"، ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا تھا - اس مضمون کی اشاعت کے ایام میں مولانا شبلی اخبار "مسلم گزٹ" کے مضامین کی تصحیح اور مشورت میں شریک تھے - مولانا شبلی نے مسلم لیگ کے سیاسی مسلک پر اعتراضات کیے اور مسلم لیگ کو صحیح راہ عمل اختیار کرنے کی طرف نشان دہی کی - آخر میں موصوف

---

1. *A History of the Freedom Movement*, Vol. 3, Pt. 1, pp. 118-123.
2. S.M. Ikram, *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*, 2nd Rev. ed., Lahore, 1970, p. 5;
   نیاز احمد شیخ ، "کلیات حسرت" ، لاہور ، ۱۹۵۵ء، ص ص ۲۱-۲۲؛
   A History of the Freedom Movement, Vol. 3, Pt. 1, pp. 123-25;
   ڈاکٹر شیخ محمد اکرام ، "موج کوثر" ، کراچی ، ۱۹۶۶ء ، (ساتویں بار) ، ص ۲۴۲

نے ہندو مسلم اتحاد پر بہت زور دیا[1] ۔ مولانا شبلی اور مولانا آزاد نے مسلمانوں کی سیاسی تربیت میں اور ہندو مسلم اتحاد پیدا کرنے کے لیے ممکنہ سعی بلیغ کی ۔ مولانا آزاد نے "الہلال" کے ذریعہ مسلمانوں کو سیاسی طور پر بیدار کیا اور برطانیہ کے خلاف رائے عامہ کو منظم کیا[2] ۔ ان حضرات کے علاوہ مولانا ظفر علی خان نے اپنے اخبار "زمیندار" کے ذریعہ اور مولانا محمد علی نے "کامریڈ" کے ذریعہ برطانیہ کے خلاف بہت سے مضامین لکھے اور مسلمانوں میں سیاسی شعور اور سیاسی بیداری پیدا کرنے میں خاص رول ادا کیا[2] ۔

مسلم لیگ اور کانگریس میں مفاہمت ہو رہی تھی ۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاس بمبئی میں منعقد ہوئے ۔ مسٹر مظہرالحق نے مسلم لیگ اور مسٹر سنہا نے کانگریس کی صدارت کی ۔ مسٹرجناح نے آل انڈیامسلم‌لیگ کے جلسےمیں ایک قرار داد پیش کی جس کا مقصد ایک اصلاحی کمیٹی کا تقرر تھا اور اس کمیٹی کے مقصد کے تحت مشترکہ قانونی اور سیاسی تجاویز مرتب کرنا تھا ۔ اس اجلاس میں ہندو مسلم اتحاد پر بھی بڑا زور دیا گیا[3] ۔

۲۹ دسمبر ۱۹۱۶ء کو لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم لیگ اور آل انڈیا نیشنل کانگریس کا مشہور اتحاد بنام "میثاق لکھنؤ" مرتب ہوا ۔ اس معاہدے کے اصل معمار مسٹر جناح تھے ۔ اس میثاق کے تحت ہندوستان کی تاریخ میں ہندو مسلم اتحاد کے ذریعہ اہل ہند کے سیاسی مطالبات کو متفقہ طور پر پیش کرنے کے لیے ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ۔ اس معاہدے کی بدولت تمام ہندوستان کے باشندوں کی طرف سے ایک متفقہ اسکیم

---

۱ ۔ "موج کوثر"، ص ۲۴۳؛ "حیات شبلی"، ص ص ۶۰۷-۶۱۲؛
"کلیات حسرت"، ص ص ۲۱-۲۲؛

(نوٹ : مولانا شبلی کی سیاسی سرگرمیوں کے متعلق مزید تفصیلات دستیاب نہ ہو سکیں)

2. *A History of the Freedom Movement*, Vol. 3, Pt. 1, p. 123;
"حیات شبلی" ، ص ص ۶۲۱-۶۲۳

3. *A History of the Freedom Movement*, Vol. 3, Pt. 1, p. 123.

4. *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd ed., pp. 39-40;
ڈاکٹر یوسف حسین ، "تاریخ دستور ہند" ؛ دہلی ، ۱۹۳۳ء ، ۱۰۰-۱۰۱؛
A History of the Freedom Movement, Vol. 3, Pt. 1, pp. 128-29.

حکومت کو پیش کی گئی جو پانچ نکات پر مبنی تھی[1] - "کانگریس ، لیگ اسکیم نے انگلستان کے مدبرین کو مجبور کیا کہ وہ ہندوستان میں سیاسی اصلاحات نافذ کرنے کے متعلق جلد کوئی اقدام کریں - اس رائے کا اظہار ڈاکٹر یوسف حسین نے اپنی کتاب "تاریخ دستور ہند" میں کیا ہے - چنانچہ مسٹر مانٹیگو ، وزیر ہند نے ہندوستان کے سیاسی مسئلے کا ہمدردی سے مطالعہ کرنے کے بعد ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو برطانوی پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ "ہز میجسٹی ملک معظم" کی حکومت پورے طور پر متفق ہے کہ ہندوستان کے نظم و نسق میں بتدریج ہندوستانیوں کو شریک کیا جائے - نیز ہندوستان میں بتدریج ذمہ دار اور خود مختار حکومت قائم کی جائے - اس اعلان کے بعد ۱۹۱۷ء کے آخر میں مسٹر مانٹیگو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ہندوستان آئے تا کہ ہندوستان کے مختلف الخیال سیاسی طبقوں سے مل کر ہندوستان کی سیاسی صورت حال کا صحیح اندازہ لگا سکیں - مسٹر مانٹیگو ۱۹۱۸ء کی بہار تک یہاں مقیم رہے اور جولائی ۱۹۱۸ء میں اپنی رپورٹ ، "اصلاحات ہند" شائع کی - اس رپورٹ میں کانگریس لیگ اسکیم کو کلیتہً منظور نہیں کیا گیا - چونکہ اس کے منظور کرنے سے ملک کی تمام سیاسی قوت ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں چلی جاتی[2] - یہ رپورٹ جو جولائی میں مرتب کی گئی تھی ، گورنر جنرل لارڈ چیمسفورڈ (Lord Chelmsford) نے شائع کرائی تھی - اس میں ہندوستان کو دی جانے والی آئینی اصلاحات کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا - نیز اس کے تحت دو کمیٹیاں قائم کرنے کی سفارش بھی کی گئی تھی - ان دونوں کمیٹیوں نے فروری ۱۹۱۹ء میں اپنی سفارشات پارلیمنٹ کو پیش کر دیں ، جو مباحثے کے بعد ۲۳ دسمبر ۱۹۱۹ء کو منظور ہوگئیں[3] - قانون ہند ۱۹۱۹ء کے نتیجے میں صوبجاتی مقننہ کو منٹو مارلے اصلاحات کے مقابلے میں زیادہ وسعت دی گئی اور اس ایکٹ کے تحت انتخابات براہ راست ہونے لگے[4] -

---

1. A.B. Keith, *Speeches and Documents on Indian Policy*, Vol. II, pp. 124-131 (as cited by *A History of the Freedom Movement*, Vol. 3, Pt. 1, p. 131 (FN);
"تاریخ دستور ہند" ، ص ص ۹۰-۱۰۰؛
Pakistan : The Formative Phase, 2nd ed., pp. 39-41;
A History of the Freedom Movement, Vol. 3, Pt. 1, pp. 128-131.
2. *A History of the Freedom Movement*, Vol. 3, Pt. 1, pp. 178-79;
Muslim Separatism in India : A Brief Survey, pp. 123-24;
"تاریخ دستور ہند" ، ص ص ۱۰۳-۱۰۵
3. *A History of the Freedom Movement*, Vol. 3, Pt. 1, pp. 179-84;
Muslim Separatism in India : A Brief Survey, pp. 123-24;
"تاریخ دستور ہند" ، ص ص ۱۰۳-۱۰۴
۴ - "تاریخ دستور ہند" ، ص ص ۱۰۷-۱۰۸ ، ۱۲۷

فصل چہارم

تحریک خلافت ، ترک موالات اور علماء کا رول :

خلافت اور خلیفہ کے الفاظ خلف سے نکلے ہیں ، جس کے معنی ہیں بعد میں آنا ۔ اس طرح خلیفہ سے مراد ہے بعد میں آنے والا یا جانشین ۔ پیغمبر (صلعم) کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ منتخب ہوئے ۔ آپ کے بعد یکے بعد دیگرے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ خلیفہ ہوئے ۔ دز اصل مسلمانوں کے لیے خلیفہ کا وجود ایک شرعی ضرورت بن گیا ۔ مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے لیے اسلامی معاشرے کا قیام اور اسلام کی بقاء کے لیے ایک مرکز اقتدار کا ہونا ضروری تھا ۔ مسلمانوں کے عہد اولیٰ میں یہ مرکز اختیار خلیفہ کی ذات اور خلیفہ کا عہدہ تھا ۔ اسلام کے ابتدائی دور میں تمام امت مسلمہ ایک ہی مرکز کے تابع ہوتی تھی مگر بعد کے حالات میں یہ شکل قائم نہ رہ سکی ۔ سلطنت دہلی میں ، تیرھویں ، چودھویں صدی عیسوی میں خلافت کا تصور اور خلیفہ سے رابطہ قائم رہا ۔ اگرچہ یہ رابطہ برائے نام ہی تھا لیکن جب مغلوں کا دور دورہ شروع ہوا تو مرکز خلافت کا تصور ہی ختم ہو گیا ۔ اس لیے کہ اب عباسیوں کی جگہ عثمانی ترکوں نے لے لی تھی ۔ اور مغل حکمران عثمانی سلاطین کی خلافت تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے ۔ مگر مغلوں کے عہد زوال میں سلطان ٹیپو نے ۱۷۸۵ء میں سلطان عثمانیہ ، عبدالحمید اول کے پاس اپنا سفیر روانہ کیا ۔ تا کہ دربار خلافت سے اپنی نیابت کا فرمان حاصل کر لے ۔[1] برطانیہ نے باب عالی پر اپنے اثر و رسوخ کے ذریعہ خلافت عثمانی سے ۱۷۹۸ء میں اپنے سفیر مقیم قسطنطنیہ کی وساطت سے سلطان سلیم ثالث سے ایک فرمان حاصل کیا ۔ جس میں سلطان ٹیپو کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ برطانیہ کے ساتھ اپنی معاندانہ پالیسی ترک کر دے اور فرانس کو اپنا حریف خیال کرے ۔ کیونکہ فرانس اسلام کا دشمن ہے ، انگریز نہیں ہیں ۔ اسی طرح برطانیہ نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے درمیان سلطان عبدالحمید

---

1. Aziz Ahmad, *Studies in Islamic Culture in the Indian Eronment*, London, 1964, p. 53 ; *A History of the Freedom Movement*, Vol. 3, Pt. 1, pp. 205-8; "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ، ص ص ۳۵۱-۳۵۲

(نوٹ : مولانا مدنی نے خلافت کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ خلافت کے معنی رسول ؐ کے کاروبار کی قائم مقامی کے ہیں ۔ جس کی تین قسمیں ہیں ۔ سیاست ، شریعت ، اور حقیقت ۔ سیاست سے مراد قوم کی اندرونی و بیرونی حفاظت ہے ۔ شریعت سے مراد مخلوقات سے تعلقات کا نظام ہے اور حقیقت خدا اور بندے کا ضابطہ ہے ۔ "الجمعیۃ"، ۱۳ مئی ۱۹۲۶ء ، ص ۵ ، ک ۲)

سے ایک فرمان کے ذریعہ مسلمانان ہند کو مشورہ دلایا تھا کہ وہ برطانیہ کے خلاف بغاوت ترک کر دیں کیونکہ وہ ہمارا حلیف ہے۔ حالانکہ مسلمانان ہند نے اس وقت سلطان ترکی کے مشورے کو قبول نہیں کیا تھا[1]۔

ہندوستان سے سلطنت اسلامیہ ختم ہو گئی تو ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی حالت میں بھی تبدیلی ہو گئی۔ ملک میں سیاسی بیداری کے ساتھ ساتھ مسلمانان ہند میں اپنی عالمی وحدت کا احساس بھی پیدا ہوا اور فطرتاً ان کی نظریں عالم اسلام کے دارالخلافہ استانبول کی طرف مرکوز ہو گئیں۔ چنانچہ ۱۸۷۷ء میں ترک و روس کی جنگ اور بعد میں ۱۸۹۷ء میں ترک و یونان کی جنگ میں اور اس کے بعد طرابلس اور بلقان کی جنگوں میں مسلمانان ہند نے خلافت عثمانیہ سے والہانہ عقیدت اور دلی ہمدردی کا مظاہرہ کیا۔ اور آئینی حدود میں رہ کر خلافت عثمانیہ کے لیے ہر ممکن مدد و اعانت کی[2]۔ رفتہ رفتہ تمام ہندوستان میں سلطان ترکی کا نام، جمعہ و عیدین کے خطبوں میں بحیثیت خلیفہ اسلام پڑھا جانے لگا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی کے بیان کے مطابق اس بات کی کوئی تحریری شہادت دستیاب نہ ہو سکی کہ خطبوں میں یہ نام کب سے پڑھا جانے لگا اور اس تحریک کا محرک کون تھا؟ البتہ ڈاکٹر قریشی صاحب نے قیاساً بیان کیا ہے کہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی (۱۹۱۰-۲۰ء) میں ایسا ہونے لگا تھا۔ مگر ڈاکٹر رام گوپال نے بیان کیا ہے کہ ہندوستان کی مساجد میں سلطان ترکی کے نام کا خطبہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہی سے پڑھا جانے لگا تھا[3]۔ ڈاکٹر قریشی صاحب اور ڈاکٹر رام گوپال صاحب کے بیانات میں بہت بڑا تفاوت ہے۔ خلیفہ عثمانی کے نام سے خطبہ کے آغاز کی جو سنیں ان دونوں مصنفین نے بتائی ہیں، ان میں کم از کم نصف صدی کا تفاوت ہے۔ مگر گمان یہ ہے کہ مسلمانان ہند جب اسلامی سلطنت سے محروم ہو گئے تو پھر خلافت اور خلیفہ کے اسلامی تصور کی بناء پر خلیفہ عثمانیہ کی طرف رجوع ہوئے ہوں گے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کو اپنا مذہبی محور اور مرکز سلطان عثمانیہ ہی نظر آیا ہوگا۔ اور اس عقیدت و احترام کی تصدیق اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ سید جمال الدین افغانی نے

---

1. Ram Gopal, *Indian Muslims : A Political History (8518-1947)*, Bombay, 1959, pp. 124-28;
A History of the Freedom Movement, Vol. 3, Pt. 1, pp. 205-8;
"برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ص ص - ۲۵۱-۲۵۲

2. *A History of the Freedom Movement*, Vol. 3, Pt. 1, pp. 207-8;
"برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ"، ص ۲۵۶

3. Ram Gopal, *Indian Muslims : A Political History (1858-1947)*, Bombay, 1959, p. 128;
"برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ"، ص ص ۲۵۲-۲۵۳

۱۸۵۳ء سے ہندوستان میں "پان اسلام ازم" کی تبلیغ شروع کر دی تھی۔ مسلمانان ہند نے ۱۸۷۷ء میں سلطان ترکی کی اقتصادی اور اخلاقی مدد بھی کی تھی۔ اس جد و جہد میں مولانا محمد قاسم نانوتوی کا بڑا حصہ تھا۔ اس لیے یہ بات قرین قیاس ہے کہ ۱۸۵۷ء کے کچھ بعد سے ہی ائمہ مساجد، سلطان ترکی کا نام جمعہ و عیدین کے خطبوں میں بحیثیت خلیفہ اسلام پڑھنے لگے ہوں گے۔ جمال الدین افغانی کی تحریک "پان اسلام ازم" کے نتیجے میں سلطان ترکی کو عالم اسلام کے بڑے حصے نے اپنا خلیفہ تسلیم کر لیا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل سے مغربی یورپ میں ترکی کے خلاف سازشوں کی رفتار تیز ہو گئی جن کی تفصیلات پچھلے صفحات میں گذر چکی ہیں۔ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم اول کی ابتدا کے بعد ترکی نے مغربی یورپ کی مسلسل بد عہدیوں اور نا انصافیوں سے عاجز آ کر جرمنی کے ساتھ اتحاد کر لیا تھا۔ برطانیہ نے اس سلسلے میں اہل ہند کے بعض علماء سے جن میں مولانا احمد رضا بریلوی خاص طور پر شامل ہیں، ترکی کے خلاف فتاوی بھی حاصل کر لیے تھے۔ چودھری خلیق الزمان نے بیان کیا ہے کہ "مولوی احمد رضا بریلوی، ترکی کی خلافت کو تسلیم نہیں کرتے تھے اور ترکوں کی مالی امداد کے بھی خلاف تھے۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے کئی فتوے مولانا عبدالباری پر کفر کے بھی صادر کیے۔ ظاہر ہے کہ وہ کسی استفتاء پر جس میں خلافت عثمانی کو شریعت اسلامی کا ایک اہم ادارہ تسلیم کیا جائے، دستخط نہ کرتے۔ مگر ان کے علاوہ، دو فرنگی محلی علماء یعنی مولانا عبدالمجید جو مولانا قطب شہید کی اولاد میں سے تھے، اور مولانا عبدالباری کے قریب ترین عزیزوں میں بھی تھے، وہ بیماری یا عدم فرصت کے حیلے نکال کر دستخط کرنے سے گریز کرتے رہے"[1]۔ علاوہ ازیں مولانا عبدالماجد بدایونی اور مولوی ریاست علی نے بھی ترکوں کے خلاف زہر افشانی کی۔ "علی گڑھ گزٹ" کے اداریے کے مطابق، انھوں نے ترکوں کو خلیفہ تسلیم نہیں کیا اور کہا "کہ ترک ظالم اور غاصب ہیں" اور مزید کہا کہ "ترک خلیفہ نہیں ہیں، نہ صحابہ کے اجماع کی رو سے اور نہ ارشاد نبوی کی رو سے"۔ ان حضرات کا یہ بیان خادمان خلافت کی تمام جانفشانیوں اور عرق ریزیوں کو خاک میں ملانے کے مترادف تھا۔ یہ الفاظ دیگر "مسئلہ خلافت کو تیز چھری سے ذبح کرنا تھا"[2]۔ اس کے علاوہ مولانا عبدالباری نے مخالفین خلافت کے بارے میں حکیم

۱۔ "شاہ راہ پاکستان"، ص ص ۳۳۱-۳۳۲

(نوٹ: مولانا عبدالباری نے، مولوی احمد رضا خان بریلوی کے فتوی پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لیے مولوی احمد رضا خان نے مولوی عبدالباری پر کفر کے فتوے صادر کیے۔ "شاہ راہ پاکستان"، ص ۳۳۲)

۲۔ "علی گڑھ گزٹ"، ۸ جولائی ۱۹۲۱ء، ج ۱، نمبر ۳۴، ص ۴، ک ۱، (اداریہ)؛
A History of the Freedom Movement, Vol. 3, Pt. 1, p. 210.

اجمل خاں کو خط لکھا تھا کہ "صرف اس قدر معلوم ہوا ہے کہ ایک فتویٰ لکھا گیا ہے اور اس پر ان لوگوں کے دستخط لیے گئے ہیں ۔ مثلاً مولانا عبدالمجید صاحب ، اور مولانا عبدالحمید شمس العلماء اور مولانا اشرف علی صاحب ۔ مولانا عبدالباری نے مزید بیان کیا کہ "سنا ہے کہ سندھ کے لوگ کوئی فتویٰ پر دستخط کراتے ہیں [اس کے متعلق راقم مقالہ کو مزید تفصیلات نہ مل سکیں] ۔ میں نے اس فتویٰ کی نقل حاصل کرنے کی کوشش کی ہے، اس لیے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ ہم لوگوں نے جو استفتا لکھوایا ہے، اس کے معنی کچھ اور لگائے گئے ہیں ۔ حکام بھی سخت غیظ و غضب میں ہیں"[1] ۔ اس کے بعد مولانا عبدالباری نے ۱۹۲۱ء کے "علی گڑھ گزٹ" میں اپنا ایک توبہ نامہ شائع کیا ۔ جس کی بنیاد مولانا احمد رضا خان بریلوی کے اعتماد پر رکھی ۔ مولانا نے اپنے توبہ نامے میں لکھا ہے کہ "اے اللہ میں نے امور قولاً و فعلاً ، تقریراً و تحریراً جو بھی کیے ہیں جن کو میں گناہ نہیں سمجھتا تھا ۔ مولوی رضا خان صاحب نے ان کو کفر و معصیت ٹھہرایا ۔ ان سب سے اور ان کے مانند امور سے ، جن میں میرے مرشدین اور مشائخ سے کوئی حکم میرے لیے نہیں ہے ، محض مولوی صاحب موصوف پر اعتماد کر کے توبہ کرتا ہوں"[2] ۔ اس کے علاوہ برطانیہ نے کچھ مقتدر مسلمانوں سے ، جن میں ایک ڈپٹی کمشنر خان بہادر عزیز الدین قابل ذکر ہیں ، ایک پمفلٹ شائع کرایا تھا ۔ جس کا نام انھوں نے "ترکوں کی حماقت" رکھا تھا ۔ اس پمفلٹ میں یہ شر انگیز تجویز کی گئی تھی کہ مسلمانان ہند متفقہ طور پر گورنمنٹ سے درخواست کریں کہ وہ خادم حرمین شریف ہو جائے اور ارض پاک پر اپنا تسلط اور حکومت قائم کر لے[3] ۔

غرض یہ کہ حکومت برطانیہ نے مسلمانوں کی توجہ مسئلہ خلافت سے ہٹانے کے لیے ہمہ قسم کے حربے استعمال کیے ۔ مگر اس کے باوجود مسلم عوام کی غالب اکثریت اور علماء کرام کا ایک بڑا طبقہ مختلف العقائد و مکاتیب میں منسلک ہونے کے باوجود ترکی کی خلافت کو تسلیم کرتا تھا ۔ اور ترکوں کی جرمن نواز پالیسی پر بھی صاد کرتا تھا ۔ برطانیہ نے سیاسی مصلحت کے پیش نظر مجبوراً یہ اعلان کیا کہ ہم مسلمانان ہند کے مذہبی جذبات کا احترام کرتے ہیں اور ان کے اماکن مقدسہ کی حفاظت مع اپنے حلیفوں کے کریں گے اور ان کو کسی قسم کا کوئی ضرر نہیں پہنچائیں گے ۔ مگر برطانیہ کی ان یقین دہانیوں کے باوجود برصغیر کے اندر اور باہر کچھ ایسے حالات و واقعات رونما ہوتے گئے ۔ جن کی بنا پر اہل ہند کا برطانیہ پر سے اعتماد اور بھروسہ کم ہوتا گیا ۔

---

۱ ۔ "نقوش"، لاہور ۔ خطوط نمبر ۱۹۶۸ء ، ص ۳۰ ۔

۲ ۔ "علی گڑھ گزٹ" ، ۲۳ جون ۱۹۲۱ء ، ج ۱ ، نمبر ۳۰ ، ص ۳ ، ک ۲-۳

۳ ۔ "نقوش" ، خطوط نمبر محولہ بالا ، ص ۱۶-۱۸

مثلاً برطانیہ نے شریف حسین سے سازش کر کے مکہ میں ترکوں کے خلاف ۱۹۱۶ء میں بغاوت کرائی اور مولانا محمود حسن کو مع ان کے رفقاء کار ، شریف حسین کی وساطت سے گرفتار کرایا گیا اور بعدۂ جزیرہ مالٹا میں نظر بند کیا گیا ۔ جلیانوالہ باغ ، امرتسر میں ایک پر امن جلسہ پر گولیاں برسائی گئیں ۔ پنجاب ، شاہ آباد ، آرہ بلیا اور اعظم گڑھ وغیرہ میں ہندو مسلم فسادات اور بلوے کرائے گئے تاکہ اس طرح سے ہندو مسلم اتحاد قائم نہ رہ سکے ۔ مگر ان فسادات اور دیگر حالات سے فی الوقت ہندو مسلم اتحاد اور یگانگت میں کمی یا کمزوری واقع نہیں ہوئی ، بلکہ اس درمیان میں ہندو مسلم اتحاد وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا[1] ۔

عربوں نے جب ترکوں کے خلاف بغاوت کی تو برصغیر کے مسلمان ، عربوں کی اس حرکت پر حیران تھے ۔ اگرچہ سلطنت عثمانیہ اب بہت کمزور ہو چکی تھی تاہم اس سے یہ امید کی جا سکتی تھی کہ وہ مستقبل میں ایک مسلم وفاق کی شکل میں مبدل ہو کر ان مسلم قوموں کا تحفظ کر سکے گی جو ان کے زیر نگیں تھیں ۔ بہر صورت مسلمانان ہند آخری عظیم مسلم مملکت کو بچانے کے خواہش مند اور کوشاں تھے ۔ چنانچہ اس خواہش کے پیش نظر وہ ترکی کی حمایت اور مدد و تعاون میں پیش پیش تھے[2] ۔

میثاق لکھنو کے بعد ہندو مسلم اتحاد روز بروز بڑھتا گیا ۔ نیز مسلم لیگ اور کانگریس کے جلسے بھی ایک ہی مقام پر ساتھ ساتھ ہوتے رہے ۔ دسمبر ۱۹۱۸ء میں مسلم لیگ کا ایک جلسہ بمقام دہلی زیر صدارت مولوی اے ۔ کے فضل الحق منعقد ہوا ۔ اس جلسے کے صدر استقبالیہ ڈاکٹر انصاری تھے ۔ مسلم لیگ کے اس جلسے میں علماء کرام نے پہلی مرتبہ شرکت کی اور تقاریر بھی کیں ۔ نیز علماء میں مختلف العقائد اور مختلف مسلک کے حضرات شریک ہوئے ۔ ان شرکاء میں حسب ذیل علماء قابل ذکر ہیں :

"مولانا عبدالباری فرنگی محلی ، مفتی کفایت اللہ دہلوی ، مولوی عبداللطیف دہلوی ، مولانا منیر الزمان ، مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا ظفر علی خان ، مولانا عبدالماجد بدایونی ، مولانا احمد سعید دہلوی ، مولانا ثناء اللہ امرتسری ، مولانا آزاد سبحانی اور مولوی محمد ابراہیم سیالکوٹی" ۔

دارالعلوم دیو بند کے صدرالصدور شریک جلسہ نہ ہو سکے مگر انھوں نے اپنے پیغام میں کہا کہ ترکی کی سالمیت اور وقار کو بحال کرنے کے لیے جو بھی اقدامات اور

---

1. *A History of the Freedom Movement*, Vol. 3, Pt. 1, p. 208;
مولوی سید طفیل احمد منگلوری ، "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، دہلی ، ۱۹۴۵ء ، ص ۲۹۱؛
Muslim Separatism in India ; A Brief Survey, pp. 131-32.

۲ ۔ "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ، ص ۳۵۴ ۔

تدابیر مناسب اور ممکن ہوں ، وہ بروئے کار لائی جائیں ۔ اس جلسے میں دیگر تجاویز کے ساتھ ساتھ مسئلہ خلافت ، بیت المقدس اور اسلامی سلطنتوں کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے محفوظ کرنے کی تدابیر شامل تھیں ۔ صدر استقبالیہ ڈاکٹر انصاری نے علماء کرام کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ یہ مقام تشکر ہے کہ علماء نے اس سیاسی جلسے میں شرکت فرما کر مسلمانان ہند کی خصوصاً اور مسلمانان عالم کی عموماً ہمت افزائی کی ۔ اس موقعہ پر علماء کرام کے خیر مقدم میں جو تقاریر ہوئیں ، ان کا جواب دیتے ہوئے مولانا کفایت اللہ نے فرمایا :

"کہ علماء عامة الناس سے کبھی علیحدہ نہیں رہے ۔ وہ مسلمانوں کے کسی فریق سے کبھی جدا نہیں رہے اور نہ اب ہیں اور نہ آئندہ رہیں گے ۔ ان کا مطمح نظر علیحدگی نہیں ہے" ۔

انھوں نے مزید فرمایا کہ :

"اسلام میں مذہب اور سیاست دو علیحدہ چیزیں نہیں ہیں ۔ ایک زمانہ تک مذہب اور سیاست یکجا رہے ۔ مگر اب شاید نئی تعلیم یافتہ جماعت نے مذہب اور سیاست کو علیحدہ سمجھ لیا ہے ۔ مگر ان کا یہ خیال غلط ہے ۔ انھوں نے یہ سوچا کہ مذہب تو علماء کے حوالے کر دو اور سیاست کو اپنے لیے مخصوص کرو"[1] ۔

غرض یہ کہ مفتی صاحب نے دین اور سیاست کو علیحدہ رکھنے کے رجحان کی نفی کی ۔

برطانیہ نے جنگ عظیم اول کے بعد ، کئی مرتبہ اس بات کا اعادہ کیا کہ ہماری حکومت ترکوں کے ساتھ حق و انصاف سے کام لے گی اور اس طرح برصغیر کے مسلمانوں کے شک و شبہات کا ازالہ کرتی رہی ۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ترکی کو اس کے دارالحکومت تھریس اور ایشیائے کوچک کی زر خیز زمینوں سے محروم نہیں کیا جائے گا ۔

1. *A History of the Freedom Movement*, Vol. 3, Pt. 1, pp. 212-13;
"حیات اجمل خان" ، ص ۱۸۳-۸۵؛ "شاہ راہ پاکستان" ، ص ۳۲۸-۳۲۹؛
"مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۳۹۳-۹۴

(نوٹ : مولانا مفتی کفایت اللہ کی تقریر کے علاوہ کسی اور عالم کی تقریر کا حوالہ یا ذکر ، کسی مصنف نے نہیں کیا ہے ۔ اغلباً یہ بات قرین قیاس ہے کہ اگر کسی دیگر عالم نے کوئی بات اس سلسلے میں کہی بھی ہوگی تو وہ مصنفین کی نظر میں اہم اور قابل ذکر نہ ہو ، اس لیے کسی دیگر عالم کی تقریر کا کوئی پتا نہیں ملتا ۔ راقم)

نیز یہ کہ برطانیہ نے اس بات کا بھی بار بار اعلان کیا کہ ہم ترکی کے مقبوضات کو غصب کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے وغیرہ وغیرہ[1] ۔ برطانیہ نے مسلمانان ہند کو اسی طرح کے دلاسے اور تسلیاں دے دے کر جنگ میں مسلمانان ہند کو فوج میں بھرتی کیا اور مسلمانان ہند برطانوی وعدوں پر بھروسہ کرتے ہوئے جنگ عظیم اول میں اپنے دینی بھائیوں کے خلاف لڑتے رہے ۔ مگر جیسے ہی ۳ نومبر ۱۹۱۸ء کو معاہدۂ متارکہ جنگ ہوا تو انگریزوں نے اپنے تمام وعدوں اور یقین دہانیوں کو بالائے طاق رکھ کر ، شکست یافتہ ترکی کے مقبوضات کو تقسیم کرنا شروع کر دیا ۔ چنانچہ قسطنطنیہ ، تھریس ، اور دیگر زرخیز علاقوں کو اتحادیوں نے آپس میں تقسیم کر کے قبضہ کرنا شروع کر دیا[2] ۔ مسلمانان ہند کو ، اتحادیوں کی اس بے وفائی اور بد عہدیوں کا جب علم ہوا تو پشاور سے لے کر ارکاٹ تک ایک عام بے چینی اور اضطراب پھیل گیا ۔ نیز علماء دیو بند اور علماء ندوہ نے اتحادیوں کے اس عمل کے خلاف ، جو اسلام کو تباہ و برباد کرنے کے لیے اختیار کیا تھا ، سخت احتجاج کیا اور وزیر اعظم برطانیہ کو مسلمانان ہند نے ایک یادداشت ، جو سخت الفاظ پر مشتمل تھی ، پیش کی ۔ مزید برآں مسٹر تھیوڈور ماریسن (Theodore Morrison) سابق پرنسپل علی گڑھ کالج نے بھی مسلمانان ہند کی نیابت کرتے ہوئے حکومت کو مشورہ دیا کہ آپ ترکی کے مسئلے میں مسلمانوں کے جذبات کا احترام کریں ۔ مگر حکومت نے ان تمام احتجاجات اور مشوروں پر کوئی توجہ نہیں دی اور تمام اپیلیں اور یادداشتیں ردی کی ٹوکری کی زینت ہوگئیں[3] ۔

خلافت کمیٹی کا قیام :

جنگ عظیم اول کے خاتمے سے اگر ایک طرف اس خلجان کا خاتمہ ہوا جو چار سال سے نتیجہ جنگ کے متعلق مسلمانان عالم کو ایک عجیب کشمکش میں مبتلا کیے ہوئے تھا تو دوسری طرف وہ امیدیں بھی منقطع ہوگئیں جو ترکوں اور جرمنی کی فتح کے متعلق قائم ہوتی رہی تھیں ۔ اب جمہور مسلمان حرکت میں آ گئے اور حکومت کی سخت گیری کے باوجود بمبئی ، لکھنؤ اور دہلی وغیرہ میں اس غرض سے جلسے کیے گئے کہ اتحادی کوئی ایسا تصفیہ ترکی کے سر نہ تھوپیں ، جس کی بناء پر مسلمانوں کے دلیوی

---

۱ ۔ "التواریخ کانگریس" ، ص ۳۰۱-۳۰۲ ؛ "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ، ۳۵۴-۳۵۵؛
Muslim Separatism in India : A Brief Survey, pp. 133-34.
"مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۵۰۸-۵۰۹

2. *A History of the Freedom Movement*, Vol. 3, Pt. 1, pp. 214-15.

۳ ۔ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۵۰۹

اقتدار کی اس آخری یادگار کا بھی خاتمہ ہو جائے۔ ان جلسوں میں خلافت کو بچانے کے لیے ایک مرکزی خلافت کمیٹی کی بنیاد ڈالی گئی۔ جس نے آئندہ چل کر "خلافت کمیٹی" کے نام سے سارے عالم میں شہرت حاصل کی[۱]۔

جنوری ۱۹۱۹ء سے لے کر ۲۲ نومبر ۱۹۱۹ء تک مختلف مقامات سے، خلافت کمیٹی کے قیام اور تشکیل کے سلسلے میں اجلاس منعقد ہوتے رہے۔ جن میں سے چند حسب ذیل تھے[۲]:

(الف) ۱۷ جنوری ۱۹۱۹ء بمقام مدراس بصدارت یعقوب حسن،

(ب) ۲۶ جنوری ۱۹۱۹ء بمقام لکھنؤ بصدارت مولانا عبدالباری فرنگی محلی،

(ج) ۲۲ ستمبر ۱۹۱۹ء بمقام لکھنؤ (آل انڈیا مسلم کانفرنس کے نام سے)، اور

(د) ۲۲ نومبر ۱۹۱۹ء بمقام دہلی، بصدارت مولوی فضل الحق[۳]۔

ڈاکٹر سید معین الحق کے بیان کے مطابق مولانا عبدالباری، ایک مسلم جماعت کے نام سے کوئی تنظیم قائم کرنے کا خیال کر رہے تھے کہ انہیں معلوم ہوا کہ بمبئی کے کچھ پرجوش مسلم تجاروں نے ایک مقامی تنظیم بنام "مجلس خلافت کمیٹی" بمبئی میں قائم کر لی ہے۔ چنانچہ ممدوح نے کچھ رفقاء کے مشوروں سے "آل انڈیا مسلم خلافت کمیٹی" قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان رفقاء اور مشیروں میں، حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری پیش پیش تھے[۴]۔ اس کے بعد دہلی میں ۲۲/۲۳ اور ۲۴ نومبر، ۱۹۱۹ء کو ایک جلسہ بصدارت مولوی فضل الحق منعقد ہوا۔ اس جلسے میں "آل انڈیا سنٹرل خلافت کمیٹی" قائم ہو گئی۔ سیٹھ چھٹانی تجار بمبئی کی درخواست پر اس کا صدر دفتر بمبئی میں قائم ہوا اور اس کی شاخیں تمام شہروں اور قصبوں میں قائم کی گئیں[۵]۔ مولانا باری نے صوبہ اودھ میں خلافت کمیٹی کی شاخ قائم کی، مگر موصوف کو اس کے قیام میں بڑی دشواریاں پیش آئیں لیکن مولانا ظفر الملک کے تعاون و مدد سے یہ شاخ

---

۱ - رئیس احمد جعفری، "افادات محمد علی"، حیدر آباد دکن، س - ن، ص ۶۲

۲ - "مسلمانوں کا روشن مستقبل"، ص ۵۰۹

۳ - "ایضاً"، ص ۸۳

4. *A History of the Freedom Movement*, Vol. 3, Pt. 1, pp. 215-16.

5. *Ibid.*, pp. 216; *Pathway to Pakistan*, p. 148;

ادارۂ حنیفیہ، "مختصر تاریخ مدرسہ امینیہ اسلامیہ"، دہلی، س-ن، ص ۴۴؛

قاضی عبدالغفار مراد آبادی، "حیات اجمل"، علی گڑھ، ۱۹۵۰ء، ص ۲۱۰

قائم ہوگئی اور سید ممتاز حسین ایڈووکیٹ لکھنؤ نے اس کا معتمد بننا قبول کر لیا[1] - بعدہ مرکزی جماعت کا دستور مرتب ہوا - جس کے تحت سیٹھ چھٹانی بمبئی کو صدر اور حاجی محمد صدیق کھتری بمبئی والے کو سکریٹری مقرر کیا گیا - لیکن دو ماہ بعد جب علی برادران جیل سے رہا ہو کر آگئے تو مولانا شوکت علی کو سنٹرل خلافت کمیٹی کا مستقل معتمد عمومی مقرر کیا گیا[2] - علی برادران جب بیتول جیل سے رہا ہو کر آئے تو فوراً فرنگی محل ، اپنے مرشد مولانا عبدالباری کی خدمت میں گئے - اس وقت لکھنؤ میں مدرسہ نظامیہ علوم اسلامی کا قدیمی مرکز تھا - مولانا باری اس مدرسے کے رئیس تھے - ممدوح نے علی برادران کو اس مدرسے سے مولانا کو اعزازی ڈگری عطا کی اور اس کے بعد سے مسٹر محمد علی اور مسٹر شوکت علی ، عوام و خواص میں مولینا کے خطاب سے پکارے جانے لگے[3] - چوہدری خلیق الزماں نے ۲۲/۲۳ نومبر ۱۹۱۹ء کی خلافت کانفرنس منعقدہ دہلی کو خلافت کی دوسری کانفرنس قرار دیا ہے ، جس کی صدارت مولوی فضل الحق نے کی تھی اور ۱۹ ستمبر ۱۹۱۹ء کو لکھنؤ میں منعقد ہونے والی کانفرنس کو پہلی کانفرنس قرار دیا ہے - مگر خیال یہ کہتا ہے کہ یہ بیان حقائق پر مبنی نہیں ہے - چونکہ دیگر مورخین یعنی ڈاکٹر خالد بن سعید ، مولوی طفیل احمد منگلوری اور دیگر حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ ۲۲/۲۳ نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں منعقد ہونے والی کانفرنس ہی خلافت کی پہلی نشست تھی اور ۱۹ ستمبر ۱۹۱۹ء کو لکھنؤ

---

1. *A History of the Freedom Movement*, Vol. 3, Pt. 1, p. 216 fn;
حفیظ الرحمٰن واصف ، "جمعیت علماء پر ایک تاریخی تبصرہ"، دہلی، ۱۹۶۹ء ، ص ۵۲

2. *Pathway to Pakistan*, pp. 48-49; "شاہ راہ پاکستان" ، ص ۵۲ -

(نوٹ : حفیظ الرحمٰن واصف خلف مفتی کفایت اللہ نے بیان کیا ہے کہ خدام کعبہ، خلافت کمیٹی اور جمعیت علماء ہند کا سنگ بنیاد مولانا عبدالباری کی محنتوں اور کاوشوں کا ثمرہ تھا اور ان جماعتوں کے بانی اور موسس ممدوح ہی تھے - "جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ" ، ص ۵۲ - دو ماہ بعد والا حوالہ درست نہیں کیونکہ ۲۲ نومبر ۱۹۱۹ءکو خلافت کمیٹی قائم ہوئی اور ۳۱ دسمبر ۱۹۱۹ء میں مرکزی خلافت کمیٹی منعقدہ امرتسر کے اجلاس کی صدارت مولانا شوکت علی نے کی - راقم)

۳ - مصنف نامعلوم ، "روئیداد مقدمہ کراچی اسیران خلافت کمیٹی" ، س - ن ص ۱۳۶ ؛ رئیس احمد جعفری ، "علی برادران" ، لاہور ، ۱۹۶۳ء ، ص ۹۹

میں منعقد ہونے والی کانفرنس آل انڈیا مسلم کانفرنس کے نام سے منعقد ہوئی تھی[1] - دہلی کی خلافت کانفرنس میں ہندو اور مسلم زعماء نے بڑی تعداد میں شرکت کی - جس میں حسب ذیل شرکاء قابل ذکر تھے :

"مسٹر ایم - کے - گاندھی ، پنڈت موتی لال نہرو ، پنڈت مدن موہن مالویہ ، عباس علی بیگ ، حسن امام ، حکیم اجمل خان ، محمد موسیٰ خان ، مولانا سید محمد داؤد غزنوی امرتسری وغیرہ وغیرہ" -

اس جلسے میں کئی قرار دادیں پاس ہوئیں - مثلاً :

(ا) ایران اور ترکی میں مقامات مقدسہ کی بے حرمتی اور زیادتیوں کے پیش نظر مسلمانان ہند ، جشن صلح میں شریک نہ ہوں بلکہ اس کے خلاف جلسے منعقد کریں -

(ب) مسلمانان ہند حکومت سے ترک موالات کریں -

(ج) اگر برطانیہ ترکوں کے حسب منشاء فیصلہ نہ کرے تو ولایتی مال کا مقاطعہ کیا جائے - اور

(د) مہاتما گاندھی اور دیگر ہندو لیڈروں کا، جو تحریک خلافت میں شریک ہوئے، شکریہ ادا کیا جائے[2] -

خلافت کانفرنس کے ان ابتدائی جلسوں کے بعد ۳۱ دسمبر ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں مرکزی خلافت کانفرنس کا جلسہ زیر صدارت مولانا شوکت علی منعقد ہوا - علی برادران حال ہی میں جیل سے رہا ہو کر اس جلسے میں شریک ہوئے تھے - یہ جلسہ بڑی اہمیت کا حامل تھا - اس میں کانگریس ، مسلم لیگ ، جمعیۃ علماء ہند اور خلافت کانفرنس کے زعماء نے شرکت کی تھی- جمعیۃ علماء ہند حال ہی میں قائم ہوئی تھی- جس کی تفصیلات آئندہ باب میں پیش کی جائیں گی - ہندوستان کی جدید تاریخ میں یہ جلسہ سیاسی اعتبار سے کل ہند اتحاد کے مظاہرے کا آئینہ دار تھا - اس جلسے میں دیگر امور کے علاوہ یہ بھی طے ہوا کہ خلافت کانفرنس کا ایک وفد لندن بھیجا جائے جو ترکی کے متعلق مسلمانان ہند کے جذبات کو حکومت کے سامنے پیش کرے اور "خلافت" کے متعلق اپنے مذہبی جذبات و اعتقادات کا اظہار کرے - نیز یہ کہ ایک خلافت فنڈ قائم

1. *Pathway to Pakistan*, p. 49; *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd ed., p. 47.
"مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۵۰۹

2. *Pathway to Pakistan*, pp. 48-49 "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ص ص ۵۰۹-۵۱۰

کیا جائے جس میں دس لاکھ روپے جمع کیے جائیں۔ مولانا محمد علی نے جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اگر گورنمنٹ نے ہمارے مذہبی معاملات میں مداخلت کی تو ہم اپنے مذہبی احکامات کی پابندی کرنے پر مجبور ہوں گے۔ علاوہ ازیں مولانا ظفر علی خاں نے بھی سامعین سے مختصر سا خطاب کیا۔ اس کے بعد مذکورہ بالا قرار دادیں باتفاق آراء پاس ہوگئیں[1]۔

فروری ۱۹۱۹ء میں رولٹ بل کے نام سے دو بل مرکزی قانون ساز اسمبلی میں پیش کیے گئے۔ جن میں سے ایک بل کو ختم کر دیا گیا۔ مگر دوسرا بل اسمبلی میں پیش ہوا۔ گاندھی جی نے اس بل کے پیش ہونے پر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا۔ کیونکہ اس بل کے تحت مجسٹریٹوں اور ججوں کو وسیع اختیارات دے دیے گئے تھے۔ رولٹ کمیٹی ۱۹۱۸ء کی رپورٹ کی بناء پر مذکورہ رولٹ بل شائع ہوا جس کی رو سے حکومت کو اندھا دھند مقدمے چلانے اور گرفتاریاں کر کے سزائیں دینے کا اختیار دیا گیا۔ چونکہ رولٹ بل کے تحت کوئی اپیل نہیں کی جا سکتی تھی، اس لیے اس بل کے پاس ہونے پر گاندھی جی نے اوائل ۱۹۱۹ء میں ستیہ گرہ کی بنیاد ڈالی۔ اپریل ۱۹۱۹ء میں دہلی میں ستیہ گرہ کی گئی اور ہڑتال بھی کی گئی۔ ہڑتال کی وجہ سے بازاروں میں مجمع ہوا تو دہلی میں پولیس اور فوج نے عوام کو منتشر کرنے کے لیے گولیاں برسائیں۔ جس کے نتیجے میں عوام میں حکومت کے خلاف برهمی اور انتشار میں مزید اضافہ ہوا۔ اس وقت ہندو مسلم اتحاد پورے شباب پر تھا۔ سوامی شردھانند جو اس وقت دہلی میں تھے اور ان جلسوں میں نمایاں حصہ لے رہے تھے۔ مسلمانوں نے ہندو مسلم اتحاد کی خاطر انھیں دہلی کی جامع مسجد کے ممبر پر چڑھا کر ان سے تقریر کرائی[2]۔

---

۱ - "علی گڑھ گزٹ"، ۲۸ مارچ ۱۹۲۱ء، ج ۱، نمبر ٦، ص ۳، ک ۳؛

"مسلمانوں کا روشن مستقبل"، ص ۵۱۰؛ "روح روشن مستقبل"، ص ص ۸۳-۸۴؛

A History of the Freedom Movement, Vol. 3, Pt. 1, p. 52;

Muslim Separatism in India : A Brief Survey, p. 136.

1. *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd ed., pp. 45-46;
Muslim Separatism in India : A Brief Survey, p. 131;
A History of the Freedom Movement, Vol. 3, Pt. 1, p. 198;

"مسلمانوں کا روشن مستقبل"، ص ۲۹۴-۲۹۵؛

پی۔ پٹا۔ بھائی سیتا رامیہ، "تواریخ کانگریس"، لاہور، ۱۹۴۰ء، ص ۲۶۱-۲۶۶؛

"شاہ راہ پاکستان"، ص ۳۳۲-۳۳۸؛

(نوٹ: ڈاکٹر سیتا رامیہ نے بیان کیا ہے کہ ہڑتال کی تاریخ ۳۰ مارچ مقرر کی گئی مگر بعد میں اسے ٦ اپریل کر دیا گیا تھا۔ لیکن دہلی میں، تاریخ کی اس تبدیلی کا بروقت اعلان نہ ہونے کی بناء پر ہڑتال ۳۰ مارچ ۱۹۱۹ء ہی کو ہوئی۔ "تواریخ کانگریس"، ص ۲٦۵)

اس زمانے میں ہندو مسلم اتحاد کا یہ عالم تھا کہ کانگریس ، مسلم لیگ ، خلافت کانفرنس اور جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس ۱۹۲۱ء تک ساتھ ساتھ ہی منعقد ہوتے تھے ۔ مسلمانان ہند نے اس اتحاد اور ہندوؤں کے مذہبی جذبات و احساسات کا خیال کرتے ہوئے عیدالاضحیٰ کے موقعہ پر حتی الامکان بکری کی قربانی کی ۔ اس سلسلے میں مولانا محمود حسن صاحب نے ایک فتویٰ بھی صادر کیا تھا ، جس کا اقتباس درج ذیل ہے :

"مذہبی امور میں اثر و نفاق سے بالکل یکسو رہ کر صرف معاملات اور مصالح دنیوی میں اس اتفاق سے کام لیا جائے ۔ مسئلہ گاؤ کشی میں جس کے متعلق خود اہل اسلام میں کھینچ تان نظر آ رہی ہے ، اس بارے میں ناچیز کی رائے یہ ہے کہ حضرات اہل اسلام کو اس موقوفی یا تنگی یا مذلت اور تقیح (کذا تقبیح) میں حصہ لینا ہرگز نہ چاہیے" ۔

البتہ اگر کوئی گائے کے علاوہ جانور کی قربانی اپنے کسی خیال سے کرے ، تو اس میں بھی خلجان نہ کیا جائے :

"اس اتفاق سے امید بہبودی ، کامیابی ہو سکتی ہے"[1] ۔

اس سلسلے میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے بھی ایک تقریر کی جس میں منجملہ دیگر باتوں کے یہ بھی فرمایا کہ :

"مسلمانوں کا مقدس فرض ہے کہ وہ قربانی گاؤ سے احتراز کریں ۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ کروڑوں ہندو بھائیوں کے جذبات کا احترام ضروری ہے بلکہ اس وجہ سے کہ قرآن مجید کا واجب العمل فرمان یہی ہے"[2] ۔

راقم الحروف کی رائے میں مولانا باری کا یہ استدلال کہ قربانی گاؤ نہ کرنا قرآن کریم کا واجب العمل حکم ہے ، مناسب نہیں ۔ کیونکہ قرآن کریم میں بالصراحت موجود ہے کہ قربانی گاؤ جائز ہے ۔ مثلاً جب اللہ تعالی نے قوم موسیٰ سے مطالبہ کیا کہ اللہ حکم کرتا ہے تم کو ایک بیل ذبح کرو ۔ "القرآن" : و اذقال موسیٰ لقومہ ان اللہ یامرکم و ان تذبحوا بقرۃ ۔ (ترجمہ) اور جب کہا موسیٰ نے واسطے قوم اپنی کے کہ

---

۱ ۔ "علی گڑھ گزٹ" ، ۸ اگست ۱۹۲۱ء ، ج ۱ ، نمبر ۴۳ ، ص ۴ ؛
"مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۳۹۸

۲ ۔ "علی گڑھ گزٹ" ، ۱۱ اپریل ۱۹۲۱ء ، ج ۱ ، نمبر ۹۰ ، ص ۲۰ ؛
"حیات اجمل" ، ص ۲۱۲-۲۱۳

تحقیق اللہ حکم کرتا ہے تم کو یہ کہ ذبح کرو ایک بیل[1] - ایسی صورت میں یہ امر بالکل واضح ہے کہ کوئی بھی عالم اس بات کا مجاز نہیں کہ شرع مبین کے واضح احکام میں تبدیلی کر سکے - البتہ دین میں اس بات کی اجازت ہے کہ احکام شرعیہ میں ملک کے حالات اور دین کی ''شرعی رخصت'' کی بناء پر نرمی کا رویہ اختیار کیا جا سکتا ہے - اس لیے اس وقت علماء نے ملک میں ہندو مسلم اتحاد کو مزید تقویت پہنچانے کی خاطر اس بات کی رخصت دے دی تھی کہ اگر عید قربان پر ذبیحہ گاؤ نہ کیا جائے تو شرعاً اس میں کچھ قباحت نہیں ہے لیکن اگر یہی بات جبراً یا احکام الٰہی کو پامال کرنے کی خاطر کی جائے تو پھر اسلام میں ایسی کوئی گنجائش یا رخصت نظر نہیں آتی کہ اس امر شرع کو ترک کیا جائے بلکہ ایسی صورت میں قربانی نہ کرنا گناہ کے مترادف ہوگا - جیسا کہ مولانا مفتی کفایت اللہ نے فرمایا - مفتی کفایت اللہ صدر جمعیہ علماء ہند نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی آگاہی کے لیے حسب ذیل اعلان شائع کیا :

''ہمیں یہ بات معلوم ہونے پر کمال استعجاب اور تاسف ہوا ہے کہ ہمارے بعض ہم وطن بمبئی اور دیگر مقامات پر گاؤ کشی کو زور سے بند کرانے کی سرتوڑ کوشش میں سرگرم ہیں - اگر ایسے ذرائع استعمال کیے گئے تو مسلمان مذہبی طور پر گائے کی قربانی کرنے پر مجبور ہو جائیں گے - جس کے وہ خود ذمہ دار ٹھہرائے جائیں گے ، اور ہندو مسلم اتحاد پر اس کا برا اثر پڑے گا''[2] -

وفد خلافت اور سفر لندن :

۳۱ دسمبر ۱۹۱۹ء کو خلافت کمیٹی کا ایک وفد مولانا محمد علی ، مولانا سید سلیمان ندوی ، مسٹر ابو القاسم اور سید حسن پر مشتمل لندن جانے کے لیے طے پایا - اس وفد کے سکریٹری حسن محمد حیات مقرر کیے گئے - وفد کے لندن جانے سے قبل خلافت کے ممبران نے طے کیا کہ پہلے وائسرائے ہند سے ملاقات کی جائے تاکہ وائسرائے ہند ، مسلمانان ہند کے احساسات و جذبات کو ارباب بست و کشاد کے گوش گزار کر دے - چنانچہ ۱۹ جنوری ۱۹۲۰ء کو مذکورہ وفد ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں معہ دیگر افراد کے وائسرائے ہند سے ملا - اس وفد نے سلطان ترکی کی سیادت کو بحیثیت خلیفۃ المسلمین بحال رکھنے پر زور دیا اور کہا کہ اسلامی عقائد کا یہ لازمی جزو ہے - اس وفد میں مندرجہ ذیل شرکاء تھے :

''مسٹر گاندھی ، سیٹھ چھوٹانی ، مولانا ثناء اللہ امرتسری ، مولانا ابوالکلام آزاد ،

---

۱ - ''القرآن''، سورۃ بقرہ ، رکوع ۸ ، آیت ۶۷ ، ص ۱۳ (ترجمہ شاہ رفیع الدین دہلوی ، مطبوعہ تاج کمپنی ، کراچی)

۲ - ''علی گڑھ گزٹ'' ، ۳۱ جولائی ۱۹۲۲ء ، ج ۲ ، نمبر ۱۲۱ ، ص ۷ ، ک ۲

مفتی کفایت اللہ، مولانا حسرت موہانی، مسٹر سید حسن، مدیر "انڈیپنڈنٹ" الہ آباد ، مولانا عبدالباری فرنگی محلی ، حکیم اجمل خان ، ڈاکٹر سیف الدین کچلو ، مولانا محمد علی ، مولانا عبدالماجد بدایونی ، سید ظہور احمد ، مولانا فاخر الہ آبادی ، مولانا سید سلیمان ندوی ، آقا محمد اشرف قزلباش ، مہاراجہ محمود آباد ، پنڈت موتی لال نہرو اور مسٹر محمد علی جناح"۔

مسٹر موتی لال نہرو اور مسٹر جناح وقت مقررہ پر نہ پہنچ سکے تھے ، مگر انھوں نے وائسرائے ہند کو بذریعہ تار برقی ، وفد سے اتفاق رائے کا اظہار کیا[1] ۔ اس وفد نے جو خطبہ تیار کیا تھا وہ مولانا محمد علی کا مرتب کیا ہوا تھا ۔ لیکن وائسرائے ہند سے وفد کی یہ ملاقات بے سود ثابت ہوئی ۔

خلافت کانفرنس کا دوسرا جلسہ ۱۵ فروری ۱۹۲۰ء کو بمبئی میں زیر صدارت مسٹر غلام محمد بھرگری منعقد ہوا ۔ اس جلسے نے وفد خلافت کے لندن جانے کی توثیق کر دی ۔ چنانچہ مولانا محمد علی ، مولانا سید سلیمان ندوی ، مسٹر سید حسن اور مسٹر حسن محمد حیات پر مشتمل وفد لندن روانہ ہوگیا ۔ مسٹر مشیر حسین قدوائی اور مولانا ابوالقاسم مقیم لندن نے بھی اس وفد میں شرکت کی ۔ وفد نے ۲ مارچ ۱۹۲۰ء اور ۱۷ مارچ ۱۹۲۰ء کو نائب وزیر اعظم مسٹر فشر اور وزیر اعظم مسٹر لائڈ جارج سے ملاقاتیں کیں ۔ نیز معروف سیاستدان اور معزز ممبران پارلیمنٹ سے بھی ملاقاتیں کیں ۔ مگر وزیر اعظم نے وفد کے ساتھ کسی خاص ہمدردی کا اظہار نہیں کیا[2] ۔

مولانا محمد علی نے لندن ، کنگ وے ہال میں لینس بری (Lansbury) کی صدارت میں اور پھر پیرس میں جلسوں کو خطاب کیا ۔ کنگ وے ہال میں مولانا نے اپنی تقریر میں کوئین وکٹوریہ کے اس عہد نامے کو یاد دلایا جس میں مرحومہ نے اہل ہند کو

۱/۲ - "تواریخ کانگریس" ، ص ۲۹۶-۹۷-۳۰۲ ؛ "شاہ راہ پاکستان"، ۲۵۶-۵۸؛
"علی برادران" ، ص ۳۳۶ ؛ "کلیات حسرت" ، ص ۲۲ ؛

A History of the Freedom Movement, Vol. 3, Pt. 1, pp. 117-218;

2. *Ibid.*, pp. 219-20; *Pathway to Pakistan*, p. 52.

(نوٹ : ڈاکٹر سیتا رامیہ نے فروری ۱۹۲۰ء کے اجلاس خلافت کو تیسرا جلسہ قرار دیا ہے جب کہ مولانا منگلوری نے اسے دوسرا جلسہ قرار دیا ہے ۔ "تواریخ کانگریس" ، ص ۳۰۳ ؛ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۵۱۱ ؛ مولانا خورشید علی مہر ، "سیرت محمد علی"، دہلی ، ۱۹۳۱ء ، ص ۴۳)

مذہبی آزادی کی ضمانت دی تھی ۔ مولانا نے اپنی تقریر میں برطانیہ کو خبردار کرتے ہوئے کہا کہ اب ہم اوزاروں ، ہتھیاروں اور ہوائی جہازوں سے مرعوب نہیں ہو سکتے ۔ مسلمان مر سکتے ہیں مگر وہ اپنا ضمیر فروخت نہیں کر سکتے ۔ انگریزوں نے اپنی رعایا کے کسی فرد سے اس سے قبل ایسی دھمکی آمیز تقریر کبھی نہیں سنی تھی ۔ مولانا کی یہ تقریر بڑی ہی معرکۃ الاراء تھی[1] ۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے لندن سے اپنے ایک خط میں مولانا عبدالماجد دریا بادی کو لکھا تھا کہ :

”آپ مولانا محمد علی کی تمام لندن کی تمام تقاریر کو پسند کرتے ہیں ۔ یہ کیا بوالعجبی ہے ؟ اختلاف مقاصد کے ساتھ یہ اتحاد مذاق ! مگر واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف آپ بلکہ یہاں کے انگریز تک ان کا لوہا مانتے ہیں ۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ خاکسار بھی اپنے درجہ میں نیچا نہیں ہے ۔ سعد پاشا زاغلول معہ وفد مصری ، نوری سعید پاشا معہ وفد شامی و مصری و دیگر اہل تونس میری عربی دانی کا لوہا مان گئے ہیں ۔ میری عربی گفتگو پر ان کو تعجب ہوا ۔ فرمایا کہ تم ہم سے اچھی عربی بولتے ہو ولا فخر ، لوگ کہتے ہیں کہ عربی تقریر و تحریر پر تمھاری محنت ضائع نہیں ہوئی ۔ لیکن بمبئی چھوڑنے کے بعد میں دیکھتا ہوں کہ انگریزی کے بعد اس نے برے وقتوں میں کام دیا“[2] ۔

علامہ اقبال نے اس موقعہ پر مولانا ندوی کو لکھا تھا کہ :

”مراجعت معہ الخیر مبارک ، آپ نے بڑا کام کیا جس کا صلہ قوم کی طرف سے شکر گزاری کی صورت میں مل رہا ہے اور دربار نبوی ؐ سے نہ معلوم کس صورت میں عطا ہوگا“[3] ۔

تحریک عدم تعاون یا ترک موالات :

تحریک عدم تعاون یا ترک موالات کے اصول کی بنیاد ۲۳/۲۲ نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی کی خلافت کانفرنس میں پڑ چکی تھی ۔ جب کہ مفتی کفایت اللہ نے اس جلسے میں

---

1. *A History of the Freedom Movement*, Vol. 3, Pt. 1, pp. 220-23.

۲ ۔ غلام محمد ، ”تذکرہ سلیمان“ ، کراچی ، ۱۹۶۰ء ، ص ۵۹ (معہ حاشیہ)

۳ ۔ ”تذکرہ سلیمان ندوی“ ، ص ۵۹ معہ حاشیہ ، بحوالہ مکاتیب اقبال

(نوٹ : مدیر ”معارف“ نے بیان کیا ہے کہ یہ وفد ۲۶ فروری ۱۹۲۰ء کو ساحل انگلستان پر لنگر انداز ہوا ۔ سید سلیمان ندوی نے انڈیا آفس لائبریری میں اردو کا خزانہ دیکھا اور ۲۷ اپریل ۱۹۲۰ء کو ممدوح نے یہ خط لندن سے لکھا تھا ۔ ”معارف“ ، جون ۱۹۲۷ء ، ج ۵ ، شمارہ ۶ ، ص ۳۰۸)

ایک قرار داد کے ذریعہ اہل ہند کو جشن فتح میں شرکت کرنے سے منع کیا تھا ۔ اس کانفرنس میں ہر طبقے اور ہر صوبے کے نمائندوں نے شرکت کی تھی ۔ اس قرار داد کی تحریک علماء کرام کی جانب سے پیش کی گئی تھی ۔ جس کی تائید ہر طبقے اور ہر فکر کے مسلمانوں نے کی ۔ مولانا کفایت اللہ نے قرار داد پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ :

''شرعاً ایسی حالت میں جب کہ مقامات مقدسہ خلیفة المسلمین کے قبضے سے باہر ہیں اور بغداد شریف ، بیت المقدس اور نجف اشرف وغیرہ وغیرہ غیرمسلموں کے قبضے میں ہیں ۔ مسلمان کسی طرح بھی ایسی صلح کی خوشی میں شریک نہیں ہوسکتے ، جس کا نتیجہ اس وقت تک اس کے سوا کچھ نہیں نکلا کہ امیر المومنین خلیفة المسلمین کے قبضہ اقتدار سے ان کے ممالک نکال لیے گئے ہیں اور اسلام کی دنیوی طاقت اور اقتدار کو زائل کیا جا رہا ہے'' ۔

آپ نے مزید فرمایا کہ :

''میں طبقہ علماء سے ہوں اور شرعی نقطہ نظر سے کہتا ہوں کہ مسلمان کسی طرح ایسی صلح کی خوشی میں شریک نہیں ہو سکتے اور اگر ہوں گے تو گناہ گار ہوں گے''[1] ۔

ترکوں اور دول مغرب کے درمیان حسب تفصیل بالا ۳ نومبر ۱۹۱۸ء کو عارضی صلح ہوئی ۔ اس صلح کے فوراً بعد وہ وعدہ جو مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ نے دوران جنگ عظیم اول مسلمانان ہند سے کیا تھا ، فراموش کر دیا[2] ۔ چنانچہ مفتی کفایت اللہ صاحب کی قرار داد کی تائید میں مندرجہ ذیل حضرات نے پر زور تقاریر کیں :

''مولانا شاہ ولایت حسین الہ آبادی ، نواب حاجی محمد اسحاق خان شیروانی ، مولانا محمد داؤد غزنوی امرتسری ، مسٹر محمد حسین بیرسٹر میرٹھی ، مولانا سید محمد فاخر الہ آبادی ، سیٹھ میاں محمد ، حاجی جان محمد چھٹانی بمبئی ، قاری عباس حسین

---

۱ ۔ ''جمعیة علماء پر ایک تاریخی تبصرہ'' ، ص ۵۸-۵۹؛
''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' ، ص ۵۰۹-۵۱۰؛
مولانا محمد میاں ، ''جمعیة علماء کیا ہے ؟'' دہلی ، س ۔ ن ، ص ۱۲-۱۳؛
''تواریخ کانگریس'' ، ص ۳۰۱-۳۰۲؛
''حیات اجمل'' ، ص ۳۰۹-۳۱۰؛

2. *Muslim Separatism in India: A Brief Survey*, p. 134.

ایڈیٹر ''قوم'' اور گاندھی جی وغیرہ''[1] ۔

مسلمانوں نے اپنے اطمینان قلب کی خاطر اور سیاسی حالات کا صحیح رخ متعین کرنے کے لیے مندرجہ ذیل فتویٰ بھی علماء سے شائع کرایا :

سوال :

''کیا فرماتے ہیں علماء دین کہ چونکہ صلح کا مسئلہ معرض التواء میں پڑا ہوا ہے ، مقامات مقدسہ خطرے میں ہیں ، بیت المقدس اور بغداد شریف غیر مسلموں کے قبضے میں ہیں ، مسلمانوں کے قبضے سے مرکز خلافت یعنی قسطنطنیہ کو نکالنے کی پیہم تدابیر ہو رہی ہیں ۔ کیا بحالت موجودہ مسلمانوں کو جشن صلح یا فتح کی خوشی میں شریک ہونا جائز ہے ؟ خصوصاً جب کہ اقتدار خلافت اور حرمین شریف کی حرمت زائل ہونے اور ان پر غیر مسلموں کی سیادت قائم ہونے کا جانکاہ خطرہ لاحق ہے ؟ المستفتی آصف علی، سیکریٹری خلافت کمیٹی ، دہلی'' ۔

جواب :

''بحالت موجودہ مسلمانوں کو تاوقتیکہ معاملات کا فیصلہ شرعی نقطہ نظر سے ان کے جذبات کے موافق نہ ہو جائے ، جشن صلح یا جشن فتح کی خوشی اور مسرتوں میں شریک ہونا قطعاً ناجائز ہے ۔ فقط محمد کفایت اللہ غفر اللہ''[2] ۔

اس فتویٰ کی تصدیق دیگر بیس علماء کرام و مفتیان عظام نے بھی کی ۔ جن علماء نے اس فتویٰ کی تصدیق و توثیق کی، ان کے نام یہ ہیں :

''احمد سعید واعظ ، محمد الیس عفا اللہ عنہ نگرامی ، خواجہ غلام نظام الدین قادری مفتی بدایونی ، سید محمد فاخر بیخود فخری ، اجمل الہ آبادی ، سید کمال الدین احمد جعفری الہ آبادی ، محمد قدیر بخش عفا اللہ عنہ ، مولوی تاج محمد امروٹ ، محمد ابراہیم عفی عنہ انجمن اسلامیہ در بھنگہ ، خدا بخش مظفر پوری ، محمد سلامت اللہ فرنگی محلی ، محمد امام صاحب زادہ ، حضرت پیر صاحب العلم‌سندھ ، اسد اللہ حسینی

---

۱ ۔ ''جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ'' ، ص ۵۹

(نوٹ : مصنف ''حیات اجمل'' نے بیان کیا ہے کہ ۲۳ نومبر ۱۹۱۹ء کی خلافت کانفرنس میں مسلمانوں نے اعلان کیا کہ ہم جشن صلح میں شرکت نہیں کر سکتے اور اگر یہ صلح ترکی اور مسئلہ خلافت کے مسائل ، مسلمانان ہند کی عام خواہش کے خلاف طے ہوں تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ انگریزی مال کا بائیکاٹ کر دیں اور حکومت کے ساتھ اتحاد عمل ترک کر دیں ۔ ''حیات اجمل'' ، ص ۲۱۰)

۲ ۔ ''جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ'' ، ص ۵۹-۶۰

مکھڑی سندھی ، مولا بخش مدرسہ تقویۃ الاسلام امرتسری ، ابراہیم سیالکوٹی ، محمد عبدالکریم مدرس درجہ دوم مدرسہ انوار العلوم گیا ، محمد صادق عفی عنہ کراچوی ، سید محمد داؤد غزنوی امرتسری ، سید اسمٰعیل غزنوی امرتسری ، ابو الوفا ثناء اللہ امرتسری ، محمد عبداللہ عفی عنہ'' ۔

بلا شبہ علماء کی بڑی اکثریت اس نقطہ نگاہ کی حامی تھی ۔ لیکن اس سے اختلاف کرنے والے علماء بھی (گو برائے نام ہی تھے) موجود تھے ۔ چنانچہ راقم الحروف کو ایک فتویٰ کا حوالہ ملا ہے ، جو مولانا اشرف علی کی خانقاہ امدادیہ ، تھانہ بھون سے جاری ہوا تھا اور منجانب مولانا ظفر احمد عثمانی شائع ہوا تھا ۔ حوالہ حسب ذیل ہے :

''اس فتویٰ میں تفصیلاً کفار مکہ اور بعدہ کفار مدینہ کے متعلق رسول (صلعم) کا طرز عمل ظاہر کر کے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ ترک موالات اور چیز ہے اور ترک تعلقات اور چیز ہے ۔ لہٰذا یہ فتویٰ کہ انگریزوں سے ترک موالات کرو ، حقائق کی بناء پر درست نہیں ہے''[1] ۔

اس فتویٰ کی تاریخ اجراء باوجود تلاش کے نہ مل سکی البتہ اخبار کی اشاعت ۸ نومبر ۱۹۲۰ء ہے ۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ فتویٰ اس سے ماقبل کی تاریخوں میں ہی جاری ہوا ہوگا ۔

مفتی عزیز الرحمٰن نے بیان کیا ہے کہ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون والا فتویٰ مولانا اشرف علی تھانوی کے دستخطوں سے جاری نہیں ہوا تھا ۔ اس سلسلے میں مولانا تھانوی سے رجوع کیا گیا تھا ۔ مگر موصوف نے ، بقول مفتی عزیز الرحمٰن ، اس فتویٰ کے متعلق جواب نہ اثبات میں دیا اور نہ نفی میں بلکہ ابہام سے کام لیا ۔ جس کی بناء پر خاطر خواہ تحقیق نہ ہو سکی ۔ مگر قرین اغلب یہ ہے کہ یہ فتویٰ جاری ہوا تھا ۔ چونکہ عصر حاضر کے ماخذ یعنی اخبار ''علی گڑھ گزٹ'' نے اسے شائع کیا تھا[2] ۔ دوم یہ کہ مولانا تھانوی نے

---

۱ ۔ ''جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ''، ص ۶۰،
بحوالہ ''مسئلہ خلافت و جشن صلح'' مطبوعہ جے اینڈ سنز پریس ، دہلی

۲ ۔ ''علی گڑھ گزٹ'' ، ۸ نومبر ۱۹۲۰ء ، ج ۲ ، (غیر معمولی اشاعت) ، ص ۳-۸ ، ک ۱

۳ ۔ ایضاً، ص ۳-۸؛ ''تذکرہ شیخ الہند''، ص۳۴۹-۳۵۰
(نوٹ : مصنف تذکرہ شیخ الہند نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ترک موالات کو ناجائز قرار دینے والا فتویٰ مولانا تھانوی کا نہ تھا ۔ یہ بات مدیر ''مدینہ'' بجنور نے ایک مشہور عالم کے حوالہ سے ۲۱ نومبر ۱۹۲۱ء کو بیان کی تھی ۔ ''تذکرہ شیخ الہند'' ، ص ۳۵۰)

اپنے جواب میں اس بات کی تردید بھی نہیں کی ۔ مزید برآں مولوی احمد رضا خان بریلوی نے بھی ترک موالات کے فتویٰ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا ۔ مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی بذات خود مولوی احمد رضا خان بریلوی کے پاس اس فتویٰ پر دستخط کرانے کے لیے گئے تو مولوی احمد رضا خان نے کہا کہ ہماری سیاست مختلف ہے ۔ وہ یہ ہے کہ آپ ''ہندو مسلم اتحاد'' کے حامی اور موئید ہیں ، جب کہ میں اس کے خلاف ہوں ۔ مگر میں آزادی کے خلاف نہیں ہوں"[1] ۔

اسی زمانے میں مولانا عبدالباری کے کچھ بیانات پر مولوی احمد رضا خان بریلوی نے شرعی اعتراضات کیے اور کہا کہ مولانا باری کے یہ اعمال اور بیانات گناہ ہیں ۔ مولانا باری نے مولوی احمد رضا خان بریلوی کی ہدایت اور اعتراضات کی بناء پر اپنا ایک توبہ نامہ شائع کیا ، جسے اخبار "علی گڑھ گزٹ" نے حسب تفصیل بالا ۲۴ جون ۱۹۲۱ء کو شائع کیا تھا[2] ۔

غرض یہ کہ مولانا عبدالباری نے مولوی احمد رضا خان صاحب پر اعتماد اور بھروسہ کر کے اپنا توبہ نامہ جاری کرایا ۔ مولوی احمد رضا خان صاحب اور ان کے ہم خیال علماء ہندوؤں کے ساتھ موالات کرنے کے حق میں نہ تھے اور اسی لیے انھوں نے تحریک ترک موالات کے فتویٰ پر دستخط نہیں کیے[3] ۔

راقم کو کوئی ایسا مواد دستیاب نہ ہو سکا جس کی بناء پر مولانا عبدالباری کا سیاسی جد و جہد میں حصہ نہ لینا اس توبہ نامے کے بعد پایا جاتا ہو ۔ بلکہ مولانا اپنے آخری ایام تک سیاست میں حصہ لیتے رہے ۔

ترک موالات کی یہ سب سے پہلی تجویز تھی جو خلافت کانفرنس کے پہلے جلسے میں زیر بحث آئی ۔ اس کی تائید قاضی محمد عبدالغفار نے بھی کی ہے ۔ مگر قاضی عبدالغفار اس تجویز کو مسلمانوں کی طرف منسوب کرتے ہیں ۔ حالانکہ یہ تحریک مفتی محمد کفایت

---

1. *Ulema in Politics*, pp. 364;
(نوٹ : مولوی احمد رضا خان بریلوی ۱۴ جون ۱۸۵۶ء کو بریلی میں پیدا ہوئے ۔ آپ اہل سنت و الجماعت کے مقتدر علماء روز گار میں سے تھے ۔ علامہ اقبال بھی آپ کی علمی قابلیت اور فقہی معلومات کے معترف تھے ۔ علامہ اقبال نے آپ کے متعلق مزید کہا تھا کہ اگر مولانا بریلوی کی طبیعت میں تشدد اور انتہا پسندی نہ ہوتی تو آپ اپنے وقت کے امام ابوحنیفہ ہوتے ۔ *Ibid.*, pp. 363-64

۲ ۔ "علی گڑھ گزٹ" ، ۲۴ جولائی ۱۹۲۱ء ، ج ۱ ، نمبر ۳۰ ، ص ۳ ؛ ک ۲-۳

3. *Ulema in Politics*, pp. 364-65.

اللہ کی جانب سے پیش کی گئی اور اس کی تائید علماء نے کی ۔ مگر اس تجویز کا نفاذ ملک گیر تحریک کی شکل میں ۶ ستمبر ۱۹۲۰ء کو عمل میں آیا ۔ جب کہ جمیعۃ علماء ہند نے ایک قرار داد کے ذریعہ تحریک عدم تعاون منظور کی[1] ۔ خلافت کانفرنس والی تجویز پر عمل نہ کرنے کے حسب ذیل اسباب تھے :

(الف) خلافت کمیٹی کا ایک وفد مسئلہ خلافت کے متعلق ۱۹ جنوری ۱۹۲۰ء کو وائسرائے ہند سے ملا ، جو بے سود ثابت ہوا ۔ یہ وفد بعد میں ، مخصوص حضرات پر مشتمل ، انگلستان گیا ۔ وہاں سے بھی یہ وفد بے نیل و مرام واپس آیا[2] ۔

(ب) اہل ہند کو مزید مایوسی اس امر سے ہوئی کہ جلیانوالا باغ کے حادثے اور اس کے متعلق تحقیقاتی کمیٹی "بنام ہنٹر کمیٹی" نے ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو اپنی رپورٹ میں اس حادثے کے ذمہ دار فرد جنرل ڈائر (General Dyer) کی ظالمانہ حرکات پر تادیبی کارروائی کرنے کے متعلق سفارش کی ، تو برطانوی اور ہندوستانی سرکاری اخبارات کی ایک معقول تعداد نے ، نیز ممبران دارالعلوم و دار الخواص نے جنرل ڈائر سے ہمدردی اور امداد کا اظہار کیا ۔ اس سے قبل صوبائی حکومت ، جنرل ڈائر کے اس فعل قبیح کو پہلے ہی مستحسن قرار دے چکی تھی[3] ۔

مندرجہ بالا علل و اسباب کے نتیجے میں اہل ہند کو بہت صدمہ اور شاق پہنچا ، جس کی بناء پر برطانیہ سے حق و انصاف کی امید جاتی رہی ۔

مولانا محمد علی کی ہندوستان سے عدم موجودگی کے درمیان ، مولانا عبدالباری اور مولانا شوکت علی نے سندھ (جو اس وقت صوبہ بمبئی کا ایک حصہ تھا) کا دورہ کیا ان حضرات نے اپنے دوروں میں عوام کو بیدار کر کے ، رائے عامہ کو مسئلہ خلافت کی

---

1. *Ulema in Politics*, p. 268.

۲ - "تواریخ کانگریس" ، ص ۳۰۳

(نوٹ : وائسرائے ہند سے ملاقات کے لیے وفد میں ۲۳ معزز حضرات تھے جو ۱۹ جنوری ۱۹۲۰ء میں ملا تھا ۔) ؛

A History of the Freedom Movement, Vol. 3, pt. 1, pp. 217-25 FN.

3. *Rise and Fulfilment of British Rule in India*, pp. 548-49;

"حیات اجمل" ، ص ۲۱۲ ؛ "شاہ راہ پاکستان" ، ص‌ص ۳۲۹ - ۳۰

تائید میں ہموار کیا[1] ۔ غرض یہ کہ تحریک خلافت کے محرکین نے ترک موالات کو عملی جامہ پہنانے میں بڑی کوشش اور انہماک کا مظاہرہ کیا ۔ نیز ملک میں رونما ہونے والے حالات و واقعات نے ، قدرتی طور پر اہل ہند کے اتحاد و اتفاق میں بڑی مدد کی[2] ۔

مولانا آزاد جو ابھی تک نظر بند تھے ، یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو رہا کر دیئے گئے۔[3] ممدوح نے اپنی رہائی کے بعد خلافت کمیٹی کے اجلاسوں میں شرکت کی ۔ ۲۰ جنوری ۱۹۲۰ء کو خلافت کمیٹی منعقدہ دہلی کے جلسے میں عدم تعاون کا پروگرام زیر بحث آیا ۔ جلسے میں گاندھی جی نے تحریک عدم تعاون کی قرارداد پیش کی ۔ مولانا محمد علی نے اس کی تائید مولانا عبدالباری کے فیصلے پر منحصر رکھی ۔ نیز مولانا محمد علی نے خلافت کے اگلے جلسے کے انعقاد کا اعلان ، کلکتے کے لیے کیا ۔ یہ جلسہ ۲۹ فروری ۱۹۲۰ء بصدارت مولانا آزاد کلکتے میں منعقد ہوا ۔ اس جلسے میں برطانیہ کے خلاف تحریک عدم تعاون کی قرار داد متفقہ طور پر منظور کی گئی ۔ اور "یوم خلافت" کے نام سے ایک یوم ، مارچ کے مہینے میں منانے کا بھی فیصلہ کیا گیا ۔[4] ڈاکٹر سیتا رامیہ کے بیان کے مطابق ۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء کو "قومی ماتم" کا دن مقرر کیا گیا ۔ یعنی اس دن لوگوں کو ہڑتال کرنے ، برت یعنی روزہ رکھنے اور دعا کرنے کی ہدایات کی گئیں ۔ گاندھی جی نے اعلان کیا کہ اگر شرائط صلح (جو ترکی اور دول مغرب کے درمیان میں ہوں) سے مسلمانان ہند مطمئن نہ ہوں تو میں عدم تعاون کی تحریک شروع کر دوں گا ۔ مولانا شوکت علی نے ۱۹ مارچ کے جلسوں کے لیے ایک قرار داد تجویز کی کہ اگر شرائط صلح ترکی کے لیے غیر منصفانہ اور ناقابل قبول ہوں ، تو مسلمانان ہند تخت برطانیہ سے اپنے وفادارانہ تعلقات منقطع کر لیں ۔ اس کی بنا پر حکومت نے احکامات جاری کیے کہ کوئی سرکاری ملازم ۱۹ مارچ کو مظاہروں میں حصہ نہ لے ۔ گاندھی جی نے ۱۰ مارچ کو پہلی مرتبہ عدم تعاون کا واضح پروگرام پیش کیا ۔ ان کا کہنا تھا کہ فرد یا قوم یا جماعت کو جو طاقت، عدم تشدد کے اصول پر کاربند ہو کر حاصل ہو سکتی ہے اس کا مقابلہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں کر سکتی ۔ کیوں کہ تشدد قطعاً کامیاب نہیں ہو سکتا ۔ اس لیے اب ہمارے پاس اپنے جائز حقوق و مطالبات کو منوانے کے لیے واحد

---

1. *A History of the Freedom Movement*, Vol. 3, pt. 1, p. 223.
2. Ibid, p. 223.
3. *Pathway to Pakistan*, p. 25 ;
"مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۵۱۲ ؛ "شاہ راہ پاکستان" ، ۳۶۰ ۔
۴۔ "روح روشن مستقبل" ، ص ۸۶ ؛ "شاہ راہ پاکستان" ، ص ۳۶۰ ۔

چارۂ کار عدم تعاون ہے ۔ انگلستان ان حقوق کو ، جو مسلمانوں کے لیے زندگی اور موت کے مترادف ہیں ، غیر منصفانہ طریقے اختیار کر کے پامال کرنا چاہتا ہے اور بعداً ہم سے یہ توقع نہیں کر سکتا کہ ہم مسکینوں کے سر اطاعت خم کر دیں گے ۔ اس لیے اب ہمیں اوپر سے لیچے تک کام شروع کرنا چاہیے ۔ انھوں نے کہا کہ جو لوگ اعزازی یا تنخواہ دار عہدوں پر فائز ہیں ، وہ اپنے عہدے چھوڑ دیں ۔ اور ادنٰی سرکاری ملازمین بھی ایسا ہی کریں ۔ پرائیویٹ ملازمین پر اس کا اطلاق نہیں ہوگا ۔ اور جو لوگ تعاون نہ کریں ، ان کا مقاطعہ نہ کیا جائے ۔ چوں کہ عدم تعاون رضا کارانہ ہونا چاہیے ۔ فوجی ملازمتوں کو فوجی ملازمت ترک کرنے کی ترغیب دینا قبل از وقت ہے ۔[1] اداریہ "علی گڑھ گزٹ" کے بیان کے مطابق مسٹر گاندھی نے عدم تعاون کے لیے حسب ذیل چار نکات متعین کیے ، اور ۴ مارچ ۱۹۲۰ء کو اس تحریک کے نفاذ کا اعلان کر دیا :

(الف) "خطابات اور انگریزی عہدے ترک کرنا ،

(ب) سرکاری ملازمتوں سے دست بردار ہونا اور سول و جوڈیشل انتظامات کی مشینری کے چلانے میں کسی قسم کا حصہ نہ لینا ،

(ج) ٹیکس و محاصل کے ادا کرنے سے انکار کر دینا ، اور

(د) پولیس و فوج سے درخواست کرنا کہ وہ گورنمنٹ سے اشتراک عمل نہ کریں" ۔[2]

تحریک ترک مواصلات کے سلسلے میں شیخ الہند نے اسارت مالٹا سے رہائی کے بعد ہندوستان آ کر ایک بیان دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ "علماء ہند کی ایک کثیر جماعت یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ چونکہ ہندوستان کے مسلمانوں کے پاس مدافعت اعداء کے مادی اسباب نہیں ہیں یعنی توپیں ، ہوائی جہاز ، بندوقیں ، ان کے ہاتھوں میں نہیں ہیں ۔ اس لیے مادی جنگ کرنے سے قاصر ہیں ۔ لیکن انھیں یقین رکھنا چاہیئے کہ جب تک برطانیہ کے وزراء و ارباب اقتدار ، اسلامی مطالبات تسلیم نہ کریں ، اس وقت تک تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی ، ان کے ساتھ معاشرتی اور اخلاقی جنگ کی حالت ہے ۔ یعنی مسلمانوں پر حرام

---

۱ - "تواریخ کانگریس" ، ص ص ۴۰۳ - ۸ ؛

***Muslim Separatism in India* : *A Brief Survey*, pp. 141-42**

(نوٹ : ڈاکٹر عبدالحمید نے ۱۹ مارچ ۱۹۳۰ء کے ماتمی دن کو مولانا شوکت علی کی اپیل سے منسوب کیا ہے ۔ اور ڈاکٹر سیتا رامیہ اسے گاندھی جی کی طرف منسوب کرتے ہیں ۔ بہر حال ۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء کو اہل ہند نے ماتمی دن منایا ۔)

۲ - "علی گڑھ گزٹ" ، ۱۵ اپریل ۱۹۲۱ء ، ج ۱ ، نمبر ۱۱ ، ص ۳ (اداریہ)

ہے کہ وہ اسلام کے دشمنوں کے ساتھ ایسے تعلقات قائم رکھیں ، جن سے ان کی مخالفانہ اور معاندانہ طاقت کو مدد پہنچے اور ان کے نشہ غرور و تکبر کو تیز کرے ۔ مسلمانوں کا اولین فرض ہے کہ وہ دشمن اسلام کو ، دشمن کے مرتبہ میں رکھیں ۔ اور ایسے تعلقات ، جو میل جول اور دوستی و محبت پیدا کرنے والے ہیں ، کو ایک دم چھوڑ دیں ۔ اس اخلاقی جنگ کا نام ترک موالات ہے"۱ ۔

برطانیہ نے مظلومین پنجاب اور ان کے اعزا و ہمدردان کی اشک شوئی کے لیے ۲۹ اکتوبر کو جو ہنٹر کمیٹی قائم کی تھی ، اس نے مظلومین پنجاب کی ہمدردی کے بجائے ، خلاف توقع جنرل ڈائر کی وحشیانہ حرکات کی پردہ پوشی کی ۔ لیکن اس کمیٹی کے تینوں ہندوستانی ممبران یعنی پنڈت جگت نرائن ، صاحبزادہ آفتاب احمد خان ، اور سر سیتلواد نے بقیہ چار انگریز ممبران کی رائے سے اختلاف کیا ۔ ان ممبران نے صوبائی گورنر اور ڈائر پر بھی یہ الزام عائد کیا کہ اس نے واقعات کی تحقیق کے بغیر جنرل ڈائر کے طرز عمل کی تائید کی ۔۲ سب سے بڑا صدمہ اور دکھ اہل ہند کو تب ہوا جب لندن پوسٹ اور پائنیر الہ آباد اور دیگر سرکار نواز اخبارات نے "جنرل ڈائر" کی یادگار قائم کرنے کے لیے فنڈ جمع کیا ۔ اس فنڈ میں لارڈ کارسن (Lord Carsen) اور سرمیکائل او ڈائر (Sir Michael O'Dyer) نے سب سے پہلے چندہ پیش کیا ۔ اس فنڈ میں برطانیہ کے مختلف زیر نگین علاقوں سے تین ہزار پونڈ کی رقم جمع ہوئی ۔ یہ انکشافات اپریل ۱۹۲۰ء میں مسٹر گاندھی کی مرتب کردہ رپورٹ سے منظر عام پر آئے ۔۳ گاندھی جی کی رپورٹ نے ، جو غیر سرکاری تھی جلیانوالہ باغ کی صحیح تصویر پیش کی ۔ جس کی بناء پر پنجاب میں انگریزوں کے مظالم اور اصل واقعات عوام الناس کے سامنے آئے ۔ اس کی اشاعت کے بعد ملک میں ایک عام اضطراب کی کیفیت پیدا ہو گئی ۔۴ ڈاکٹر عبد الحمید

---

۱ ۔ "تذکرہ شیخ الہند" ، ص ۳۱۳ ۔

2. *Rise and Fulfilment of British Rule in India*, pp. 458-59 ;
Muslim Separatism in India : *A Brief Survey*, pp. 143-44 ;
"حیات اجمل" ، ص ۲۱۲ ۔

(نوٹ : ڈاکٹر عبد الحمید نے ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ سے انگریز ممبران کا اختلاف بھی بیان کیا ہے ۔ مگر قاضی عبد الغفار نے صرف ہندوستانی ممبران کا ہی اختلاف لکھا ہے ، بہر کیف ممبران کمیٹی ، ہنٹر رپورٹ سے مطمئن اور متفق نہ تھے ۔)

3. *Muslim Separatism in India* : *A Brief Survey*, p. 144;

۳ ۔ "علی گڑھ گزٹ" ، ۱۵ اپریل ۱۹۲۱ء ، ج ۱ ، نمبر ۱۱ ، ص ۴ ، ک ۱ ۔

۴ ۔ "حیات اجمل" ، ص ص ۱۳ - ۲۱۲ ؛
"علی گڑھ گزٹ" ۱۵ اپریل ، ۱۹۲۱ء ، ج ۱ ، نمبر ۱۱ ، ص ۴ ، ک ۱

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

صاحب کے بیان کے مطابق علی برادران اور گاندھی جی کا اتحاد و تعاون دو بنیادی امور پر مبنی تھا ۔ اولاً پنجاب کے مظالم پر اظہار ہمدردی ، ثانیاً خلافت کا تحفظ ۔ علی برادران اور ان کے رفقاء خصوصاً مولانا عبد الباری نے خلافت کمیٹی کی جانب سے آل انڈیا نیشنل کانگریس سے خلافت کے مسئلے میں تائید حاصل کرنے کی خاطر اتحاد عمل کیا تھا ۔ لہذا خلافت کمیٹی نے پنجاب کے مظالم کی مذمت کی اور کانگریس نے خلافت کے مسئلے میں خلافت کمیٹی کا ساتھ دیا ۔ اور دونوں جماعتیں پورے اعتماد اور اخلاص کے ساتھ مل کر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتی رہیں ۔[1] راقم کی رائے میں یہ اتحاد صرف دو مسائل تک ہی محدود نہ تھا ۔ جن کا ذکر ڈاکٹر عبد الحمید صاحب نے کیا ہے ۔ بلکہ اہل وطن ملک کو غیر ملکی حکمرانوں سے آزاد کرانے کے لیے عرصے سے کوشاں تھے ۔ لکھنؤ پیکٹ کے بعد سے ملک میں ہندو مسلم اتحاد کی فضا ہموار ہو گئی تھی ۔ نیز اس اتحاد کو مزید تقویت اور استحکام تحریک خلافت اور جلیانوالہ باغ کے حادثہ سے ہوئی ۔ اس درمیان میں خلافت کمیٹی کے اجلاس مختلف مقامات پر منعقد ہوتے رہے اور ۹ جون ، ۱۹۲۰ء کو ایک مجلس منتظمہ قائم کی گئی جس میں ترک موالات کے متعلق تفصیلات طے کرنے کا فیصلہ کیا گیا ۔[2] ۲۸ جون ۱۹۲۰ء کو مسلمانان ہند نے بذریعہ تار وائسرائے ہند کو متنبہ کیا کہ ترکی کے ساتھ ناانصافیوں کا ازالہ اگر یکم اگست تک نہ کیا گیا تو اہل ہند اس تاریخ کے بعد ترک موالات شروع کرنے پر مجبور ہو جائیں گے ۔ اس کے بعد یکم جولائی ۱۹۲۰ء کو گاندھی جی نے وائسرائے ہند کو ایک نوٹس دیا کہ ترک موالات اگست کے پہلے ہفتے میں شروع کر دی جائے گی ۔ لیکن حکومت نے اس نوٹس کا بھی کوئی اثر نہیں لیا ۔ گاندھی جی نے کانگریس کو مشورہ دیا کہ وہ خلافت کمیٹی کے مشورے سے تحریک ترک موالات کو ملک میں جاری کرے ۔ گاندھی جی اور مولانا شوکت علی نے ہندوستان کے طول و عرض میں رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

(نوٹ : اس رپورٹ کی اشاعت کے بعد گاندھی جی کو ۹ اپریل ۱۹۲۰ء کو پلول اسٹیشن پر گرفتار کیا گیا ۔ ہندوستان میں گاندھی جی کی یہ سب سے پہلی گرفتاری تھی ۔ خلیق الزمان نے گاندھی جی کی گرفتاری ۷ اپریل ۱۹۲۰ء کو بیان کی ہے ۔ "حیات اجمل ، ص ص ۱۹۹ - ۲۰۰ اور شاہ راہ پاکستان" ، ص ۴۳ ۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ ان دونوں بیانات میں قاضی عبد الغفار کا بیان زیادہ صحیح ہے ۔)

1. *Muslim Separatism in India : A Brief Survey*, p. 145 ; *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd ed., p. 147.

"علی برادران" ، ص ۱۳۶ ۔

2. *A History of the Freedom Movement*, vol. 3, Pt. 1, pp. 223-24 ; *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd ed., p. 47.

دورے کیے ۔ ان کی تقریروں اور بیانات نے عوام کو انتہائی قربانیاں دینے کے لیے تیار کر دیا تھا ۔ اسی درمیان یعنی اگست کے آخری ایام میں ملک میں "یوم خلافت" کے نام سے عام ہڑتال بھی کرائی گئی ۔ حکیم اجمل خان نے اپنا خطاب "حاذق الملک" اور تمغہ "قیصر ہند" بطور احتجاج حکومت کو واپس کر دیے ۔ اور اب محرکین خلافت نے باقاعدہ "تحریک عدم تعاون" کو ملک میں شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا ۔[1] تحریک عدم تعاون ، عدم تشدد پر مبنی تھی اس تحریک کا مقصد دیگر امور کے علاوہ یہ بھی تھا کہ سرکاری اسکولوں اور کالجوں سے بچوں کو علیحدہ کیا جائے ۔ اور ان کی جگہ غیر سرکاری تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں ۔ نیز عدالتوں کا مقاطعہ کر کے نجی ثالثی عدالتیں قائم کی جائیں ۔ کونسل کی نشستوں کے امیدواروں سے ترک انتخاب کرایا جائے ۔ اور میسوپوٹامیہ (عراق) کے لیے فوجی اور دفتری ملازمتوں سے انکار کر دیا جائے وغیرہ وغیرہ ۔[2] مسٹر گاندھی نے مزید کہا کہ اس وقت سودیشی مال یا اشیاء کا استعمال اہل ملک پر ایک مذہبی فریضہ ہے اور انگریزی سامان کا استعمال اب ترک کر دینا چاہیے ۔[3] ڈاکٹر سید معین الحق نے ستمبر ، ۱۹۲۰ء کے اجلاس منعقدہ کلکتہ میں کانگریس ، مسلم لیگ ، خلافت کمیٹی اور جمیعۃ علماء کے اجلاسوں کا ہونا بیان کیا ہے ۔ اور ان ہی جلسوں میں تحریک عدم تعاون کا مشہور ریزولیوشن پاس ہونا بیان کیا ہے ۔ جمیعۃ علماء ہند کا اجلاس ۹ ستمبر ۱۹۲۰ء کو دیگر جماعتوں (خلافت کمیٹی ، مسلم لیگ و کانگریس) کے ساتھ کلکتہ میں منعقد ہوا جس میں تحریک عدم تعاون کی مشہور قرارداد منظور کی گئی ۔ اس کے محرک مولانا آزاد اور موید مولانا عبد الصمد مقتدری بدایونی تھے ۔ اس پر مفتی کفایت اللہ اور دیگر علماء کے بھی دستخط ہیں ۔ اس کے برعکس ڈاکٹر خالد بن سعید اور ڈاکٹر عبد الحمید نے اس کی تردید کرتے ہوئے اس جلسہ کو صرف کانگریس کا ہی جلسہ قرار دیا ہے ۔[4]

---

۱ ۔ "حیات اجمل" ، ص ص ۲۲۰ ۔ ۲۶ ؛

Pakistan : The Fotmative Phase, 2nd ed., p. 47 ;

Muslim Separatism in India : A Brief Survey, pp. 143-44.

A History of Freedom Movement, vol. 3, Pt. 1, pp. 223-24;

2. *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd ed., p. 48.

۳ ۔ "علی گڑھ گزٹ" ، ۱۳ مارچ ، ۱۵ اپریل ، ۱۹۲۱ء ، ص ۳ ، ک ۱ اور ص ۳ ، ک ۲ ۔

4. *A History of the Freedom Movement*, vol. 3, Pt. 1, pp. 224-25 ;

Muslim Separatism in India : A Brief Servey, p. 144 ;

Pakistan : The Formative Phase, 2nd, ed, pp. 47-49.

رئیس احمد جعفری (مرتب) ، "اوراق گم گشتہ" ، لاہور ؛ ۱۹۶۸ء ، ص ص ۲۲۲ ۔ ۲۳

ہماری رائے میں ڈاکٹر خالد بن سعید اور ڈاکٹر عبدالحمید کے بیانات درست ہیں ۔ چوں کہ قاضی محمد عبدالغفاو نے بھی ستمبر ۱۹۲۰ء کے جلسے منعقدہ کلکتہ کو کانگریس ہی کا جلسہ قرار دیا ہے جس کی صدارت لالہ لاجپت رائے نے کی تھی ۔ اس جلسے میں عدم تعاون کی مخالفت خود کانگریس کے بڑے بڑے لیڈروں نے کی تھی ۔ تاہم گاندھی جی کو اپنی قرار داد "تحریک عدم تعاون" کے حق میں مسلمانوں کے ووٹوں کی اکثریت کی بناء پر کامیابی حاصل ہوئی تھی[۱] ۔ ڈاکٹر خالد بن سعید نے بیان کیا ہے کہ یہ قرار داد ۸۸۴ ووٹوں سے منظور ہوئی ۔ حفیظ الرحمٰن واصف خلف مفتی کفایت اللہ اور مولانا طفیل احمد منگلوری نے بیان کیا ہے کہ جمیعۃ علماء ہند کا دوسرا اجلاس ۱۹/۲۰اور ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء کو دہلی میں منعقد ہوا تھا ۔ اس کی صدارت شیخ الہند کو کرنا تھی ۔ جو حال ہی میں اسارت مالٹا سے رہا ہو کر ہندوستان آئے تھے ۔ مگر ممدوح ان ایام میں سخت علیل تھے ۔ اس لیے شریک جلسہ نہ ہو سکے ۔ موصوف کے حکم کے مطابق اس اجلاس کا خطبۂ صدارت ، مفتی کفایت اللہ نے پڑھا تھا ۔ لیکن مولانا سید حسین احمد مدنی نے تسامح (سہو) سے اس جلسہ کا خطبۂ صدارت پڑھنا ، مولانا شبیر احمد عثمانی کی طرف منسوب کیا ہے ۔ غالباً یہ سہو اس لیے ہوا ہے کہ مولانا شبیر احمد عثمانی نے جلسہ کے آخری دن یعنی ۲۰ نومبر کو ترک موالات پر ایک طویل مضمون پڑھا تھا ۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اس جلسے میں شرکت کی اور کہا کہ اگر برٹش گورنمنٹ نے ترکوں کے خلاف ہتھیار اٹھائے تو ہم ہندوستانی سپاہ کو میدان جنگ میں جانے سے روک دیں گے ۔ مولانا عبدالباری نے فرمایا کہ "انگلستان سے اس کے ترکی کے ساتھ سلوک کا انتقام لینے کے لیے عدم تعان کافی نہیں ہے" ۔ اس جلسے میں پانچ سو علماء نے شرکت کی[۲] ۔ جمیعۃ علماء کے جلسے میں جو تجاویز پاس ہوئیں ان میں سے خاص خاص حسب ذیل تھیں :

(الف) "مسلمانوں کو احکام شرح کی تعمیل کی طرف متوجہ کیا جائے ،

(ب) حکومت سے ترک مولات کر کے خطابات ، عہدے ، ممبری کونسل، ملازمت، فوج اور سرکاری تعلیم کو ترک کیا جائے ،

(ج) غیر مسلم بھائیوں کے تحریک خلافت میں شریک ہونے کو بہ نظر اطمینان دیکھا جائے اور ان سے خوش گوار تعلقات قائم رکھے جائیں ،

---

۲ - "جہات اجمل" ، ص‌ص ۲۳۰ - ۳۱

۱ - "جمیعۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ" ، ص‌ص ۶۰ - ۶۱ ؛ "روح روشن مستقبل" ، ص‌ص ۸۶ - ۸۷

"علی گڑھ گزٹ" ، ۶ اکتوبر ، ۱۹۲۱ء ، ص ۲ ، ک ۱

(د) قومی بیت المال اور شعبہ تبلیغ قائم کیے جائیں ، اور

(ھ) قومی درسگاہوں میں سرکاری امداد لینا ترک کر دیا جائے جیسا کہ ندوۃ العلماء نے کیا ہے" -

علماء ہند نے اس سلسلے میں ایک فتویٰ بھی جاری کیا تھا - جس پر پانچ سو علماء نے دستخط کیے تھے - اس فتویٰ کو حکومت نے ضبط کر لیا تھا[1] - ڈاکٹر خالد بن سعید نے ڈاکٹر راجندر پرشاد کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ اس "فتویٰ پر ۹۲۵ معروف علماء نے دستخط کیے تھے" - مگر "علی گڑھ گزٹ" نے اداریہ میں بیان کیا ہے کہ "پانچ سو علماء کے متفق فتویٰ کی ضبطی کا بہت چرچا ہے - گورنمنٹ نے اس فتوی کی ضبطی کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ اس میں فوج اور پولیس کو باغی بنانے کی کوشش کی گئی تھی"[2] - اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ فتوے پر دستخط کرنے والے علماء کی تعداد پانچ سو ہی تھی -

عدم تعاون کے متعلق مولانا محمود حسن نے مالٹا سے رہائی کے بعد وطن واپس آکر اپنا ایک بیان ترک موالات کے متعلق جاری کیا تھا - جو بڑی اہمیت کا حامل ہے - یہ بیان موصوف نے جولائی ۱۹۲۰ء میں دیا تھا - جو "البشیر" کے حوالے سے "علی گڑھ گزٹ" میں چھپا تھا - اس کا متن حسب ذیل ہے :

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ ۲۰ جولائی ۱۹۲۰ء کو ہندوستان کے ارباب بست و کشاد (زعماء اور قائدین) نے آخری طریقہ کار اپنے فرائض کی ادائیگی اور اپنے جذبات و حقوق کے تحفظ کا یہ قرار دیا ہے کہ وہ قرآن کریم کی ایک صریح تعلیم اور رسول (صلعم) کے ایک روشن اسوۂ حسنہ کو مضبوط تھامیں اور نفع و ضرر کا موازنہ --- پوری جانچ کر کے اس کو بے خوف و خطر انجام تک پہنچائیں - اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اعداء اسلام کے ساتھ تعاون و موالات کو اعتقاداً اور عملاً ترک کر دیں - اس مسئلے کی شرعی حیثیت ناقابل انکار ہے اور ایک صادق مسلمان کی غیرت کا اس حالت میں

---

۱ - "روح روشن مستقبل" ، ۸٦ - ۸۷

منشی مشتاق احمد - "تازہ مضامین مولانا ابوالکلام آزاد" ، دہلی ، دوسری مرتبہ ، س ن ، ص ۴۲

2. *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd ed., p. 50 (as cited by Dr. Rajendra Prasad. *India Divided*, pp. 122, 23) ;

"علی گڑھ گزٹ" ، ۱٦ ستمبر ۱۹۲۱ء ، ج ۱ ، نمبر ۵۳ ، ص ۲ ، ک ۱ (اداریہ) ؛

"روح روشن مستقبل" ، ص ۸۷

اقتضاء ہونا چاہئے کہ—

(الف) سرکاری اعزازات و خطابات کو واپس کر دے ،

(ب) ملک کی جدید کونسلوں میں شریک ہونے سے انکار کردے ،

(ج) صرف اپنی ملکی اشیاء اور مصنوعات کا استعمال کرے ،

(د) سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں اپنے بچوں کو داخل نہ کرے ، اور

(ہ) اس کے علاوہ جو تجاویز وقتاً فوقتاً شائع کی جائیں ان پر عمل کرے ، بشرطیکہ :

(اول) اتباع احکام شریعت کیا جائے اور عمل درآمد میں خلاف حکم شرع کا ارتکاب پیش نہ آئے ، اور

(دوم) جن امور میں فساد یا نقص امن کا اندیشہ ہو اس سے احتراز کیا جائے اور ہر کام میں افراط و تفریط سے بچ کر اعتدال مدنظر رہے ۔ ارشاد عثمانی : "اذا احسن الناس فاحسن معھم و اذا ساؤ واجتنب اساءتھم" "یعنی جب لوگ اچھا کام کریں تو اچھے کام میں ان کے شریک ہو اور جب برا کام کریں تو ان سے پرہیز کرو ۔ ہر ایک اس میں مفید اور ضروری سمجھا جائے" [1] ۔

تشدد کے مسئلے پر مولانا عبدالباری کا موقف بھی دلچسپی سے خالی نہیں ۔ انھوں نے فرمایا کہ : "پہلے میں تشدد کا زبردست حامی تھا اور اس کو بطور اپنے مذہبی احکام کے تصور کرتا تھا ۔ مگر اب میرے خیالات میں جو تغیر واقع ہوا ہے وہ انھی ہر سہ اصحاب ، مسٹر گاندھی و علی برادران کی وجہ سے ہے" [2] ۔

غرض یہ کہ تحریک ترک موالات کو علماء کی ایک بڑی اکثریت نے مستحسن قرار دے دیا ، سب سے پہلے یہ تجویز مفتی محمد کفایت اللہ نے پیش کی تھی (جس کی تفصیلات مندرجہ بالا سطور میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں) کانگریس نے اور خاص طور سے گاندھی جی نے بھی علماء کے فیصلے سے اتفاق کیا ۔ لیکن کانگریس کے دیگر قائدین و ہندو رہنماؤں نے

---

۱ ۔ "علی گڑھ گزٹ" ، ۲۲ اپریل ۱۹۲۱ء ، ج ۱ ، نمبر ۱۳ ، ص ۲ ۔ ۳ ، ک ۱ ۔ ۳ ؛ بحوالہ "البشیر" ، ۱۰ اگست ۱۹۲۰ء ؛ "تذکرہ شیخ الہند" ، ص ص ۳۳۱ ۔ ۳۲

۲ ۔ "علی گڑھ گزٹ" ، ۱۴ ستمبر ۱۹۲۱ء ، ج ۱ ، نمبر ۵۳ ، ص ۲ ، ک ۲

خصوصاً مدن موہن مالویہ المعروف بہ مالوی جی نے اس الدیشہ کا اظہار کیا کہ مسلمان "وحدت اسلامیہ" اور "پان اسلام ازم" کے حامی اور علمبردار ہیں اور ان سے اس بات کا پورا خدشہ ہے کہ حصول آزادی کے بعد افغانستان ہندوستان پر حملہ آور ہو اور مسلمانان ہند اپنے مذہبی جوش سے مجبور ہو کر اپنے دینی بھائیوں کا ساتھ دینے پر مجبور ہو جائیں ۔ اس کے جواب میں مولانا محمد علی اور مولانا آزاد نے ہندوؤں کے اس خدشہ اور تذبذب کا ازالہ کرتے ہوئے علیحدہ علیحدہ بیان دیا ۔ مولانا محمد علی نے کہا کہ : "جب میں کہتا ہوں کہ میں اس دیس کو آزاد کرانا چاہتا ہوں تو میرا یہ مطلب ہوتا ہے کہ میں کسی کی غلامی میں نہیں رہنا چاہتا ۔ خواہ وہ غلامی انگریزوں کی ہو یا افغانوں کی ۔ مجھے افغانستان سے محبت ہے مگر میں ان کو اپنا آقا نہیں بنا سکتا"[1] ۔ مولانا آزاد نے فرمایا کہ : "اگر ہندوستان آزاد ہو اور ایک ایسی گورنمنٹ قائم ہو جس میں دیگر قوموں کی طرح مسلمانوں کو بھی آزادی حاصل ہو تو اس صورت میں اسلام کا یہ حکم ہے کہ مسلمان اپنے وطن کو حملہ آوروں سے بچائیں ۔ اگرچہ حملہ آور مسلمان اور خلیفہ ہی کی فوج کیوں نہ ہو"[2] ۔ دوسری طرف کچھ ہندو لیڈروں نے جن میں خاص طور پر بپندرا چندرا پال (Bipendra Chandra Pal) قابل ذکر ہیں ، گاندھی جی سے یہ مطالبہ کیا کہ "خلافت" کے ساتھ لفظ سوراج "Swaraj" بھی شریک ہونا چاہئے ، مگر گاندھی جی نے اس بات سے اتفاق نہ کیا ۔ بلکہ انھوں نے کہا کہ اگر ہم مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں لازم ہے کہ بغیر کسی "معاوضے یا نعم البدل" اس کام میں مسلمانوں کی مدد و اعانت کریں[3] ۔

دسمبر ۱۹۲۰ء میں مولانا ابوالکلام آزاد ، علی برادران اور گاندھی جی نے تحریک عدم تعاون کو کامیاب بنانے کے لیے ملک کا ایک اور دورہ کیا ، جو بہت کامیاب رہا ۔ تحریک عدم تعاون کے نتیجے میں عدالتیں اہل مقدمہ سے خالی ہو گئیں ۔ جج اور منصف وغیرہ بے کار بیٹھے رہتے تھے ۔ چوں کہ لوگ اپنے معاملات کو طے کرانے کے لیے ثالثی بورڈوں (غیر سرکاری عدالتوں) کی طرف رجوع کرتے تھے ۔ لوگوں نے محاصل دینا بھی بند کر دیا تھا ۔ گاندھی جی نے لوگوں کو چرخہ کاتنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ لوگ اپنے ہاتھوں کا بنا ہوا ، اپنے ہی ملک کا لباس پہنا کریں ۔ اسی وقت سے سودیشی

---

1. *A History of the Freedom Movement*, vol. 3, Pt. 1, p. 229 ;
علی برادران ، ص ۶۲۹

2. *A History of the Freedom Movement*, vol. 3, Pt. 1, p. 229 ;
مسلمانوں کا روشن مستقبل ، ص ۵۱۲

3. *Pathway to Pakistan*, p. 55.

مال کا بنا ہوا لباس ہندوستانیوں کا قومی لباس بن گیا ۔ نیز غیر ملکی کپڑوں کا استعمال اس زمانے میں بہت کم ہو گیا ۔ لوگوں نے اس تحریک میں بڑی گرم جوشی سے حصہ لیا ۔ علی برادران ، مولانا آزاد اور گاندھی جی کا یہ دورہ خلافت فنڈ کے چندے سے عمل میں آیا تھا[1] ۔ چودھری خلیق الزمان کے بیان کے مطابق خلافت کمیٹی کے دیگر قائدین نے بھی شرکت کی تھی ۔ جن میں مولانا عبدالماجد بدایونی بھی شامل تھے[2] ۔

تحریک ہجرت اور علماء :

مسلمانان ہند سقوط ترکی سے اور دول مغرب کی بدعہدیوں ، خصوصاً انگریزوں کی مسلم کش پالیسی سے بہت بے زار تھے ۔ برصغیر میں خلافت عثمانیہ کو بچانے کے لیے ملک گیر مہم جاری تھی ۔ اس مہم میں ہندوستان کی دیگر قومیں (ہندو ، پارسی وغیرہ) بھی مسلمانوں کے ساتھ شریک تھیں ۔ ۱۹۲۰ء میں صلح نامہ سیورے نے ترکی کی قسمت کا فیصلہ کر دیا اور مسلمانان ہند کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا ۔ اس معاہدے کے تحت ترکوں سے نہ صرف غیر ترکی علاقے غصب کر لیے گئے تھے ، بلکہ بعض ایسے علاقے بھی چھین لیے گئے تھے جن میں ترکوں کی اکثریت تھی ۔ مثلاً سمرنا ، تھریس اور اناطولیہ وغیرہ ۔ جنگ عظیم کے دوران اتحادیوں نے اس قدر متضاد وعدے کیے ہوئے تھے کہ وہ جنگ کے بعد دوست یا دشمن کسی کے ساتھ بھی ایفائے عہد نہیں کر سکتے تھے[3] ۔ علاوہ ازیں جنگ عظیم میں جن ہندوستانی مسلم سپاہیوں نے اپنے ترک بھائیوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا تھا ۔ ان میں سے بیشتر اب فوجی ملازمت سے سبکدوش کیے جا رہے تھے ۔ اس لیے وہ حکومت سے برافروختہ تھے ۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ انھوں نے آڑے وقت میں حکومت کی مدد کی ، اور اب وہ ایسی حالت میں چھوڑ دیے گئے کہ ان کے لیے آبرومندانہ کسب معاش کا کوئی دیگر متبادل انتظام نہیں تھا ۔ لہذا مسلمانان ہند نے خیال کیا کہ وہ ایسی حکومت کے وفادار نہیں رہ سکتے ، جس نے ان کے ساتھ اتنی بڑی غداری یا بے وفائی کی ہے ۔ مگر مسلمانوں کے پاس اب اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ اجنبی حکمرانوں کو ملک سے باہر نکال دیتے ۔ اس لیے ان کو صرف ایک ہی راستہ نظر آیا کہ وہ عزت و آبرو کے ساتھ ایسی مملکت ہی کو خیر باد کہہ دیں ، جس سے وفاداری کی

---

1. *Pakistan The Formative Phase*, 2nd ed., p. 49 ;
Muslim Separatism in India : A Brief Survey, p. 147 ; سیرت محمد علی ، ص ۲۵
2. *Pathway to Pakistan*, p. 58 ;
"یادداشت مولانا عبدالحامد بدایونی" محررہ ۲۲ مارچ ۱۹۷۰ء ، ص ۱۵ (غیر مطبوعہ)
۳ ۔ "زمانہ" فروری ۱۹۲۸ ، ص ۶۳ ؛ "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ، ص ۳۵۳

کوئی امید نہیں[1] - مولانا محمد علی نے وائسرائے ہند کو ایک خط لکھا جس میں تحریر تھا کہ جو سرزمین اسلام کے پیروؤں کے لیے محفوظ نہ رہے تو وہاں کے مسلمانوں کے لیے دو ہی راستے باقی رہ جاتے ہیں یعنی اولاً جہاد ثانیاً ہجرت یا ترک وطن لہذا اب مسلمانان ہند ہندوستان کو دارالحرب خیال کرتے ہیں اور ان کے لیے اب ہجرت ناگزیر ہے - بعدہ ترک موالات کے سلسلہ میں ایک جلسہ ۱۸ جولائی ۱۹۲۰ء کو منعقد ہوا اور اسی نشست میں تحریک ہجرت بھی پیش کی گئی اور اس پر غور کیا گیا[2] - اس کے بعد نومبر ۱۹۲۰ء میں ایک جلسہ الہ آباد میں منعقد ہوا - جس میں مسئلے ہجرت دوبارہ پیش ہوا - مولانا محمد علی نے ہجرت کرنے کی تائید میں اپنے خیالات کا ظہار کیا - چنانچہ علماء کرام سے اس مسئلے میں فتوی حاصل کیا گیا اور علماء نے موجود حالت کے پیش نظر ہندوستان کو "دارالحرب" قرار دے دیا - پروفیسر عزیز احمد کے بیان کے مطابق اس فتوی کے "مفتی اعلی" مولانا آزاد تھے - مولانا عبدالباری نے بھی مبہم الفاظ میں ہجرت کی حمایت کی[3] - "علی گڑھ گزٹ" نے اپنے اداریے میں بیان کیا ہے کہ سنٹرل خلافت کمیٹی نے گاندھی جی کی ہدایت کے بموجب مسلمانوں کو ہجرت کرنے کے لیے زور دیا - سادہ لوح مسلمانوں نے اسے ایک دینی فریضہ اور مقدس کام سمجھ کر افغانستان کو ہجرت کی - اس ہجرت میں صوبہ سندھ اور شمالی مغربی ہند کے مسلمانوں نے خاص طور پر حصہ لیا - ان بے چارے مہاجرین نے اپنی جائدادیں ، قیمتی ظروف ، زیورات اور مال و اسباب کو اونے پونے داموں پر فروخت کیا اور اسلام اور خلافت سے عقیدت کی خاطر اپنا گھر بار اور سب کچھ ختم کرنے کے بعد اگست ۱۹۲۰ء میں افغانستان کو روانہ ہوگئے - افغانستان ایک چھوٹا اور غیر ترقی یافتہ ملک تھا - نیز اپنی اقتصادی اور صنعتی و حرفتی کمزوری کے باعث اتنے بڑے قافلے کو اپنے ملک میں مستقلاً آباد کرنے کے لائق نہ تھا - چونکہ اٹھارہ ہزار ، اور چودھری خلیق الزمان کے بیان کے مطابق بیس ہزار افراد نے ہجرت کی تھی - لہذا حکومت افغانستان نے اس جم غفیر کو دیکھ کر اپنی سرحدیں بند کر دیں اور مہاجرین کو سرحد سے ہی واپس کرنا شروع کر دیا - لہذا چند دنوں کے کے بعد مسئلہ ہجرت منسوخ ہوگیا - اس غیر دانشمندانہ اقدام نے مسلمانان ہند کو نہ صرف اقتصادی اور سماجی بدحالی سے دو چار کیا ، بلکہ مہاجرین میں سے بہت سے افراد

---

1. *Pathway to Pakistan*, pp. 56-57 ; "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ، ص ۳۵۷-۳۵۸
2. *Muslim Separatism in India : A Brief Survey*, p. 148 ;
"مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۵۱۵
3. *Islamic Modernism in India and Pakistan*, p. 136 ; *pathway to Pakistan*, p. 56 ; *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd. ed., pp. 50-51.

موت کا شکار ہوگئے[1] ۔ تحریک ہجرت کے محرکین میں مولانا آزاد اور مولانا محمد علی پیش پیش تھے ۔ مگر ان حضرات میں سے خود کسی نے بھی ہجرت نہیں کی ۔ جس کا سبب معلوم نہیں ہو سکا ۔ ہو سکتا ہے کہ بہت سے لوگ جو ہجرت کا ارادہ رکھتے تھے ، انھوں نے حکومت افغانستان کے رویے کے باعث اپنا ارادہ ترک کر دیا ہو ۔ یہ ظاہر ہے کہ جن زعماء نے ہجرت کی تائید کی انھوں نے مسئلے کو خالص جذباتی انداز میں دیکھا اور سیاسی بصیرت کا ثبوت نہیں دیا ۔

تحریک قومی یونیورسٹی یا ملی دارالعلوم :

تحریک خلافت کے دوران زعماء ملت کو اس امر کا احساس تھا کہ مسلم طلباء کو ایک آزاد اور فلاحی تعلیم سہیا کرنے کے لیے موجودہ تعلیمی مطمع نظر کو بدلنا پڑے گا اس لیے کہ موجودہ تعلیم نے سرکاری ملازمتوں کے حصول کے علاوہ تعلیم کا کوئی مفید اور قومی مقصد پورا نہیں کیا ۔ بلکہ موجودہ تعلیم کی بدولت مسلمانوں میں روحانی ، ذہنی اور مادی خرابیاں پیدا ہوگئیں ۔ نواب وقار الملک مذہبی اور ملی جذبے سے سرشار تھے ۔ آپ نے علی گڑھ کالج میں مذہبی اور دینی روایات کو عملاً جاری کیا ۔ آپ نے اپنی حکمت عملی سے علماء کا تعاون بھی حاصل کیا ، چونکہ آپ بھی بقول شیخ محمد اکرام "طبقہ علماء میں سے تھے"[2] ۔ ڈاکٹر محمد اکرام لکھتے ہیں کہ نواب وقار الملک نے ۱۹۱۲ء میں فرمایا تھا کہ : "قومی اصلاح اور ترقی کے لیے ایک ایسا تعلیمی ادارہ قائم ہونا چاہیے ، جس کا بنیادی مقصد اور دستور العمل علی گڑھ کالج سے مختلف ہو" ۔ چنانچہ خود علی گڑھ کالج کے سیکرٹری اور سر سید کے خلیفہ ثانی، نواب وقار الملک نے ۱۹۰۲ء میں ان مسلمانوں کے واسطے جو سرکاری ملازمتوں کے خواستگار نہیں ، ایک جدا گانہ جامعہ ملیہ قائم کرنے کی اسکیم پیش کی[3] ۔ نواب صاحب موصوف کی خواہش تھی کہ نئی یونیورسٹی گورنمنٹ کے اثرات سے آزاد ہو اور اس میں ذریعہ تعلیم بھی اردو میں ہو ،

---

1. *Islamic Modernism in India and Pakistan*, p. 136 ; *Pathway to Pakistan*, p. 56-57; *Muslim Separatism in India : A Brief Survey*, pp 148-49 ; *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd ed., pp. 50-51 ;
"علی گڑھ گزٹ" ۱۶ مئی ، ۱۹۲۱ء ، ج ۱ ، نمبر ۲۰ ، ص ۵ ، ک ۲ (اداریہ)

2. *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*, p. 107.
(Mohsinul Mulk had tried to win the Ulema with his suavity and tact ; Viqarul Mulk attracted them because he was really one of them).
(یہ عبارت شیخ محمد اکرام کے بیان سے نقل کی گئی ہے)

3. "موج کوثر" ، ص ۱۵۲ - ۵۳

لیکن انگریزی لازمی مضمون کے طور پر شامل رہے ۔ نیز طلباء کی تعلیم میں مذہبی تربیت اور کفایت شعاری کی تعلیم کو خاص اہمیت حاصل ہو[1] ۔ لیکن نواب صاحب اپنی اس سکیم کو عملی جامہ نہ پہنا سکے ۔ اس کے کئی وجوہات تھے ۔ اولاً تو ۱۲-۱۹۱۱ء میں جنگ طرابلس اور جنگ بلقان کے باعث مسلمانان ہند کی توجہ ہٹ گئی ۔ دوم یہ کہ اس زمانے میں آغا خان اور مولانا شوکت علی کی قیادت میں مجوزہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لیے فنڈ جمع کیے جا رہے تھے اور مسلمانوں کا اہل ثروت اور غیر طبقہ حسب استطاعت اس فنڈ میں حصہ لے رہا تھا ۔ لہذا ان لوگوں سے کسی متوازی دارالعلوم کے لیے مزید چندہ دینے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی ۔ سوم یہ کہ ترکی کے جنگی قیدیوں کے لیے بڑے پیمانے پر علیحدہ چندہ جمع کیا جا رہا تھا ۔ بلکہ آغا خان نے تو مسلم یونیورسٹی کی جمع شدہ رقم کو بھی بطور قرض حسنہ ترک بھائیوں کی مدد کے لیے دینے کا مشورہ دیا تھا ۔ چہارم یہ کہ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم کے آغاز سے تعلیمی اور اصلاحی کوششیں سست پڑ گئیں اور پھر جنگ عظیم کے دوران ہی میں یعنی ۲۷ جنوری ۱۹۱۷ء کو نواب صاحب وفات پا گئے[2] ۔

۱۹۲۰ء میں برصغیر کی جد و جہد تحریک خلافت کے ارد گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ ترک موالات کے پروگرام میں سرکاری اسکولوں ، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا مقاطعہ بھی شامل تھا ۔ جس کے نتیجے میں جامعہ ملیہ کی اسکیم عمل میں آئی[3] ۔ چنانچہ جب تعلیمی اداروں کا بائی کاٹ کرنے کے مسئلے نے زور پکڑا ، تو علی برادران نے کانگریس کے اجلاس منعقدہ ناگپور کے اختتام پر علی گڑھ کالج کے متولیوں یعنی ٹرسٹیز سے درخواست کی کہ آپ سرکاری امداد لینا بند کر دیں ۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد نے اس بات کی مخالفت کی ۔ مزید برآں ڈاکٹر صاحب نے بچوں کے والدین کو بذریعہ تار برقی متنبہ کیا کہ آپ اپنے بچوں کو ترک موالات کی تحریک میں حصہ لینے سے منع کریں ۔ مگر مولانا ابوالکلام آزاد ، مولانا محمد علی ، مولانا عبدالماجد بدایونی ، حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری ۲۳ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ پہنچے اور بعد مغرب کالج کی مسجد میں جلسہ کیا ۔ مولانا محمد علی نے تقریر کرتے ہوئے لوگوں کو تحریک خلافت کے متعلق واضح الفاظ میں سمجھایا اور کہا کہ ہمارا مقصد اس تحریک کے ذریعہ قوم کو ارزاں تعلیم مہیا

---

1. *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*, p. 107; موج کوثر ، ص ۱۵۲ - ۵۳

2. *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*, pp. 107-9.

۳ - "آج کل" ۱۵ جولائی ، ۱۹۳۳ء ، ص ۳۸ ، ک ۱

کرنا ہے ۔ جس میں طلباء کی اصلاح اور فلاح بھی ہو سکے گی[1] ۔ کالج کے ٹرسٹیوں نے ان لیڈروں کی رائے سے اتفاق نہیں کیا ۔ تو پھر مجبور ہو کر ان رہنماؤں نے ایک علیحدہ قومی درس گاہ بنانے کا فیصلہ کیا ۔ چنانچہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو یہ حضرات کالج کی مسجد میں پھر دوبارہ جمع ہوئے ۔ مولانا محمود حسن عرف شیخ الہند کو "آزاد قومی یونیورسٹی" کی بنیاد ڈالنے کی غرض سے بلایا گیا ۔ ممدوح بوجہ علالت اور پیرانہ سالی بمشکل تمام مسجد میں پہنچے ۔ حکیم اجمل خان نے شیخ الہند کا تعارف کراتے ہوئے مختصر سی تقریر کی ۔ جس میں آپ کی قومی خدمات اور سیاسی و ملی ایثار و قربانیوں کا ذکر کیا ۔ اس کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانی نے ، جو اس وقت نوجوان تھے ، شیخ الہند کے ایماء پر خطبۂ صدارت پڑھا ۔ جس میں تحریک ترک موالات پر روشنی ڈالی ۔ بعد میں ایک فتویٰ بھی پڑھا گیا ۔ جس میں نوجوان طبقے کے لیے ہدایات کی گئی تھیں کہ وہ ترک موالات کے مسئلے میں اپنے والدین کی اطاعت نہ کریں (یعنی والدین اگر مخالفت کریں تب بھی ترک موالات میں شریک ہوں) ۔ آخر میں علی گڑھ اور دیو بند کے اتحاد پر اظہار طمانیت کیا گیا ۔ جلسے کی کارروائی کے درمیان مولانا عبدالباری فرنگی محلی پہنچ گئے ۔ چنانچہ مولانا محمد علی کی تحریک اور مولانا آزاد سبحانی کی تائید سے موصوف کو صدر جلسہ منتخب کیا گیا ۔ اس کے بعد مولانا محمد علی نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا مقصد نیا تعلیمی ادارہ قائم کرنا ہے اور اس کے ذریعہ موجودہ تعلیم کی اصلاح کرنا ہے ، جو بحالت موجودہ ممکن نہیں ۔ موصوف نے مزید کہا کہ علماء کے فتویٰ کے بعد اب ہندوستان دارالحرب ہے اور مسلمانوں کے لیے اب صرف دو ہی راستے ہیں کہ یا تو وہ جہاد کریں یا ترک وطن کریں ، اور ترک وطن اب ایک مذہبی فریضہ ہے ۔ (تحریک ترک وطن یا ہجرت کے لیے پچھلے صفحات دیکھیے) مولانا محمد علی کی تقریر کے بعد مولانا آزاد سبحانی نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "مولانا محمود حسن اور مولانا عبدالباری کے فتویٰ کے بعد ترک موالات ایک شرعی مسئلہ ہے ، اور اس پر عمل ہونا چاہیے" ۔ اس کے بعد مولانا حسرت موہانی اور دیگر حضرات نے بھی تقاریر کیں ۔ بعدہٗ کچھ تار پڑھ کر سنائے گئے ۔ جو قومی یونیورسٹی کے قیام کی تائید میں موصول ہوئے تھے ۔ اس کے بعد حاضرین جلسہ میں سے حکیم اجمل خان نے اس جامعہ کے لیے ایک ہزار روپے سالانہ چندہ دینے کا اعلان کیا اور محمد نسیم صاحب لکھنوی نے یک مشت پانچ ہزار روپے دینے کا اعلان کیا[2] ۔ لہذا اس جلسے کے اختتام پر ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو ایک قومی یونیورسٹی

---

1. *Muslim Separatism in India : A Brief Survey*, p. 151 ;
"علی گڑھ گزٹ" ، ۲۳ اکتوبر ۱۹۲۰ء ، ص ۳ ، ک ۱ (غیر معمولی اشاعت)

۲ - "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" ، ۳۰ اکتوبر ۱۹۲۰ء ، ص ۱ - ۲ ، ک ۱ (غیر معمولی اشاعت)؛
"تذکرہ شیخ الہند" ، ص ۲۸۳ - ۸۵

(جامعہ ملیہ) کی بنیاد قائم ہوگئی ۔ اس جامعہ کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے لیے ایک ایسا نظام تعلیم فراہم کیا جائے ، جس کی بنیاد تو اسلامی تعلیمات پر مبنی ہو ، لیکن وہ انھیں قومی زندگی میں مناسب حصہ لینے کے قابل بنا سکے اگرچہ جامعہ ملیہ ایک اسلامی ادارہ ہے ۔ مگر اس نے ۱۹۴۰ء سے پہلے کبھی بھی حکومت کی امداد قبول نہیں کی ۔ اس لیے اس کو اپنی خواہش اور آزادی کے ساتھ نئے نئے تعلیمی تجربے کرنے کے مواقعات مہیا ہوتے رہے اور اس نے ہندوستان کی تعلیمی جد و جہد میں ایک رہنما ادارہ کی حیثیت حاصل کر لی[1] ۔

فصل - پنجم

مقدمہ بغاوت کراچی اور علماء کا رول :

خلافت کمیٹی نے اپنی سعی بلیغ سے اہل ہند میں خلافت کے مسئلے پر بڑا جوش و خروش پیدا کیا ۔ اس تحریک کی قیادت میں علماء نے بھر پور حصہ لیا ۔ مولانا محمد علی نے اس تحریک میں ہزار ہا تقریریں کیں اور سینکڑوں دورے کیے ۔ اس دوران میں لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند نے گاندھی جی سے شکایت کی کہ مولانا محمد علی نے اپنی کئی تقریروں میں تشدد آمیز فقرات استعمال کیے ہیں ۔ جن کی بنا پر اشتعال کی فضا پیدا ہوتی ہے ۔ لہذا گاندھی جی نے علی برادران سے ایک اعتذار شائع کرنے کے لیے کہا ۔ علی برادران نے ۳ جون ۱۹۲۱ء کو گاندھی جی کے حسب خواہش اعتذار شائع کیا ، باین مضمون کہ آئندہ ہم اپنی تقاریر میں محتاط رویہ اختیار کریں گے ۔ "لارڈ ریڈنگ کا مقصد اس اعتذار کے شائع کرانے سے یہ تھا کہ علی برادران اس طرح عوام میں غیر مقبول ہو جائیں گے ۔ لیکن ان کے خلوص اور نیک نیتی کی بنا پر وہ عوام میں اور بھی زیادہ ہر دلعزیز ہوتے گئے"[2] ۔ علی برادران نے تحریک خلافت کو کامیاب بنانے کے لیے جتنی قربانیاں پیش کیں ، اتنی کسی دیگر مسلمان سے نہ ہو سکیں ۔ علی برادران اور ان

---

1. *Pathway to Pakistan*, p. 57;

"علماء حق" ، حصہ اول ، ص ۲۱۵ ؛ "آج کل" ۵ جولائی ۱۹۴۰ء ، ص ۳۸ ، ک ۱

۲ - "علی گڑھ گزٹ" ، ۱۳ جون ، ۱۹۲۱ء ، ج ۱ ، نمبر ۲۵ ، ص ۱ ؛ "سیرت محمد علی" ، ص ۴۵۰-۴۶

کے رفقاء نے اس تحریک میں ایسی روح پھونک دی تھی کہ علماء اور عوام دونوں اس میں دلچسپی اور لگن کے ساتھ حصہ لیتے تھے ۔

تا ۱۰ جولائی ۱۹۲۱ء کو آل انڈیا خلافت کمیٹی کا اجلاس کراچی میں منعقد ہوا ۔ ان جلسوں میں شرکت کے لیے ہندوستان کے ہر حصے کے رہنما جمع ہوئے ۔ اندازاً پانچ ہزار افراد نے شرکت کی تھی ۔ ان جلسوں میں کئی قراردادیں پیش ہوئیں[1] ۔ جلسے میں علماء کرام کا مشہور فتویٰ جس پر پانچ سو علماء نے دستخط کیے تھے پڑھ کر سنایا گیا ۔ اس فتویٰ میں دیگر امور کے علاوہ یہ بھی تحریر تھا کہ حکومت سے ترک موالات کیا جائے ۔ مولانا محمد علی نے جلسے کی صدارت کی اور ایک قرارداد کے ذریعہ مسلمانوں سے اپیل کی گئی تھی کہ اس وقت فوج میں رہنا یا فوج میں داخل ہونا یا دوسروں کو فوج میں داخل ہونے کی تحریک کرنا سب حرام ہیں ۔ سامعین نے بالاتفاق رائے اسے منظور کیا ۔ اس میں اس بات پر بہت زور دیا گیا تھا کہ اگر حکومت برطانیہ ، انگورہ گورنمنٹ کے خلاف جنگ کرے تو مسلمانان ہند سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دیں ، اور ملک کی مکمل آزادی کا اعلان کانگریس کے ہونے والے اجلاس احمد آباد میں کر دیں ۔ مزید یہ کہ آزادی کے اعلان کے ساتھ اپنا ایک پرچم بھی انڈین ریپبلک کے نام کا لہرائیں[2] ۔ کراچی کے جلسوں کے بعد حکومت ہند نے اعلان شائع کیا کہ علی برادران اور ان کے ساتھیوں نے اپنی تقاریر میں فوج اور پولیس کو باغی بنانے کی کوشش کی ہے لہذا ۱۵ ستمبر ۱۹۲۱ء کو حکومت بمبئی نے حکومت ہند کے مشورے اور ہدایت پر گورنر بمبئی کا ایک اعلان شائع کیا ، جس میں ''میسرز مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی ساکنان رام پور'' اور دیگر اشخاص کو زیر دفعہ ۱۲۰ - ب ، ۱۳۱ اور ۵۰۵ تعزیرات ہند ، اس ریزولیوشن کی تائید کے باعث گرفتار کیا گیا جو آل انڈیا خلافت کانفرنس میں اجلاس منعقدہ کراچی بتاریخ ۸ تا ۱۰ جولائی ۱۹۲۱ء میں پاس کیا گیا تھا[3] ۔

---

1. *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd ed. p. 51 ; *Pathway to Pakistan*, p 60 ; *A History of the Freedom Movement*, vol. 3, Pt. 1, p 230.

2. Ibid. ; *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd ed., pp 51 53 ;
ابو رحمت عبدالرحمن ، ''معرکہ سیاست و خلافت'' ، امرتسر ، س ۔ ن ، ص ۱۲-۲۰

3. *Pathway to Pakistan*, p. 60 ; ''معرکہ سیاست و خلافت'' ، ص ص ۲۰ - ۲۱

لیڈروں کی گرفتاریاں اور اس کا ردِ عمل :

گورنر بمبئی کے مندرجہ بالا حکم کے بعد علماء اور دیگر افراد کی گرفتاریاں عمل میں آئیں ۔ خلافت کمیٹی کے ارکان ۱۳ ستمبر کو مدراس میں ہونے والے خلافت کے ایک جلسے میں شرکت کے لیے کلکتہ سے جا رہے تھے ۔ ان حضرات میں گاندھی جی ، مولانا محمد علی بیگم محمد علی اور مولانا آزاد سبحانی شامل تھے ۔ چنانچہ مولانا محمد علی کو ۱۴ ستمبر ۱۹۲۱ء کو والٹر (Voltair) کے اسٹیشن پر گرفتار کیا گیا ۔ مولانا شوکت علی کو ۱۶ ستمبر کو مرکزی کمیٹی کے دفتر بمبئی سے گرفتار کیا گیا ۔ مولانا حسین احمد مدنی کو بدایوں سے گرفتار کیا گیا ۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر سیف الدین کچلو ، مولانا نثار احمد اور پیر غلام مجدد سندھی کو بھی گرفتار کیا گیا ۔ اور تمام گرفتار شدگان کو کراچی لایا گیا[1] ۔ ان گرفتاریوں کے رد عمل میں ، پولیس نے خلافت کمیٹیوں کے صوبائی دفاتر کی خانہ تلاشیاں لیں اور ۱۶ ستمبر ۱۹۲۱ء کو لاہور کی خلافت کمیٹی کے دفتر سے اور اخبار "زمیندار" کے دفتر سے ان کی خانہ تلاشی کے بعد مذکورہ فتویٰ کے کئی سو نسخے برآمد کیے ۔ اور اسی طرح دیگر مقامات پر بھی پولیس نے خانہ تلاشیاں لیں[2] ۔ مندرجہ بالا رہنماؤں کی گرفتاریوں سے قبل یو ۔ پی میں مولانا فاخر الہ آبادی ، تصدق احمد خان شیروانی اور مولانا ظفر الملک وغیرہ کو بھی گرفتار کیا جا چکا تھا ۔ اور ان رہنماؤں کی گرفتاری کے خلاف ملک میں احتجاج اور مظاہرے جاری تھے ۔ دیگر اکابرین قوم جن میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی ، مولانا ابوالکلام آزاد ، ڈاکٹر محمود ، میسرز معظم علی ، خلیق الزمان ، سعید اللہ ، الطاف الرحمٰن اور زاہد وغیرہ تھے ، ۲۴ ستمبر کو کراچی پہنچے اور اسی شام کو عیدگاہ میدان کراچی میں تقاریر کیں ۔ مولانا عبدالباری کی لکھی ہوئی تقریر پڑھی گئی ، جس میں لوگوں کو ترغیب دی گئی تھی کہ اس کام کو جاری رکھیں ، جو رہنمایان قوم یعنی گرفتار شدگان نے آپ کے ذمہ چھوڑا ہے ۔ مولانا باری کی تقریر میں مزید کہا گیا تھا کہ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی ، خلافت اور سوراج کے لیے تکلیف اٹھا رہے ہیں ، ہم میں سے ہر ایک کو لازم ہے کہ ان کے کام کو اپنے ذمہ لے خواہ ہمارے راستے میں دقتیں حائل ہوں ، مگر وہ کام برابر جاری رہنا چاہئے (مولانا باری کی اس تقریر کا حال مصنف ، "معرکہ سیاست و خلافت" نے بیان کیا ہے) مولانا باری نے علی برادران سے جیل میں ملاقات

---

۱ - ایضاً ، ص ص ۲۱-۲۵ ؛ "علی گڑھ گزٹ" ، ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء ، ج ۱، نمبر ۵۴، ص ۲، ک ۱

۲ - "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" ، ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء ، ج ۱ ، نمبر ۵۵ ، ص ۱ ، ک ۱

کرنے سے انکار کر دیا ، کیونکہ ان سے ملاقات کے لیے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے پروانہ حاصل کرنے کے لیے مستدعی ہونا پڑتا تھا[1] ۔

روئیداد مقدمہ کراچی اسیران خلافت کمیٹی :

اسیران خلافت کمیٹی کا مقدمہ خالق دینا ہال میں بعدالت سٹی مجسٹریٹ مسٹر ایس ۔ ایم ۔ تلاٹی ۲۶ ستمبر کو پیش ہوا ۔ وکیل سرکار نے عدالت میں علی برادران کو بتلایا کہ آپ کے خلاف بغاوت پھیلانے کے الزام میں ایک اور مقدمہ بھی درج ہے ۔ دوران کارروائی مولانا سید حسین احمد مدنی نے عدالت سے مطالبہ کیا کہ مقدمہ کی کارروائی انگریزی کی بجائے اردو میں کی جائے تا کہ ملزمان کو کارروائی سمجھنے میں آسانی رہے ۔ اس پر عدالت نے جواب دیا کہ کارروائی کا ترجمہ سنوا دیا جائے گا ۔ اسیران مقدمہ نے متفقہ مطالبہ کیا کہ ہم سب ملزمان کو ایک ہی کمرے میں رکھا جائے تا کہ ہم لوگ تحریری بیانات قلم بند کرنے میں ایک دوسرے سے مشورہ کر سکیں ۔ نیز مولانا عبدالباری اور دیگر علماء سے ملنے کی اجازت دی جائے جو اس وقت کراچی میں موجود ہیں چونکہ وہ قانون اسلام سے اچھی طرح واقف ہیں اور ہمارے مقدمے میں اسلامی قانون کی رہنمائی از بس ضروری ہے[2] ۔ تیسرے روز کارروائی میں مولانا محمد علی ، مولانا حسین احمد مدنی اور دیگر دو ملزمان کے بیانات اور تقاریر ہوئیں ۔ مولانا محمد علی نے اپنا بیان دیتے ہوئے حالات و واقعات پر تفصیلی روشنی ڈالی ۔ وکیل سرکار نے مولانا محمد علی پر اعتراض کیا کہ آپ بیان دے رہے ہیں یا تقریر کر رہے ہیں ۔ مولانا محمد علی نے کہا کہ میرے بیان میں کوئی غیر معمولی اور غیر متعلق بات نہیں ہے ۔ مولانا سید حسین احمد مدنی کا بیان "مغلق اردو" میں ہونے کی بناء پر اگلے دن کے لیے ملتوی کیا گیا ۔ ڈاکٹر کچلو نے اردو اور پیر مجدد سندھی نے سندھی میں بیانات دیئے[3] ۔

چوتھے روز کی کارروائی میں مولانا حسین احمد مدنی کا بیان قلم بند کیا گیا ۔ مولانا ممدوح کے بیان کی رپورٹ حسب ذیل ہے :

> "مولانا نے کہا کہ ملکہ وکٹوریہ نے ہندوستان کو مذہبی آزادی دینے کا اعلان کیا تھا ۔ اور ان کا خیال تھا کہ ہندوستان میں امن و امان قائم کرنے کے لیے مذہبی آزادی بہت ضروری ہے ۔ ملکہ کے اعلان میں تحریر تھا کہ کسی شخص کی مذہبی آزادی

---

۱ ۔ "معرکہ سیاست و خلافت" ، ص ص ۳۰-۳۲

۲ ۔ "روئیداد مقدمہ کراچی اسیران خلافت کمیٹی" ، ریزولیوشن نمبر ۶ ، ۸ اور ۱۱ جولائی ۱۹۲۰ء بمقام عیدگاہ میدان کراچی ، ص ص ۲۱-۲۸؛ "معرکہ سیاست و خلافت" ، ص ص ۳۲-۳۹

۳ ۔ "روئیداد مقدمہ کراچی اسیران خلافت کمیٹی" ، ص ص ۲۸-۵۳

میں کسی قسم کی رکاوٹ یا دشواری حائل نہ کی جائے گی ۔ مولانا نے کہا کہ میں ایک مذہبی آدمی ہوں اور میرا فرض ہے کہ میں قرآن شریف کی آیات اور احادیث نبی (صلعم) کے ہر لفظ پر پورا ایمان و اعتقاد رکھوں اور یہی ہر مسلمان کا فرض ہے ۔ اس کے بعد مولانا نے بہت سی احادیث پڑھیں اور اس کے بعد ان کا اردو میں ترجمہ کیا ۔ مولانا نے کہا کہ ہر شخص اس وقت تک بادشاہ کی اطاعت کرنے پر مجبور ہے جب تک وہ اپنے اللہ کے ساتھ غیر وفادار نہ ہو"۔ مولانا نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ "ایک مسلمان ، گورنمنٹ کے ساتھ اسی حد تک وفادار ہو سکتا ہے ، جتنا اس کے مذہب کے اندر ہے ۔ اگر گورنمنٹ ملکہ کے اعلان کی تعمیل کرنا نہیں چاہتی اور اگر مذہبی فرائض و پابندیوں کا لحاظ و احترام نہ کیا گیا تو اس صورت میں کروڑوں مسلمانوں کو اس مسئلے کا تصفیہ کر لینا چاہئے کہ آیا وہ مذہبی شخص کی حیثیت سے رہنا چاہتے ہیں یا گورنمنٹ کی رعایا کی حیثیت سے ، لیکن اگر گورنمنٹ مذہبی آزادی کو چھیننے پر تیار ہے تو مسلمان اپنی جان تک قربان کر دینے کو تیار ہوں گے اور میں پہلا شخص ہوں گا جو میں اپنی جان قربان کروں گا ۔"

مولانا محمد علی نے اس بیان پر مولانا مدنی کے قدم چوم لیے ۔ مجسٹریٹ نے موصوف کے بیان کا کوئی حصہ قلم بند نہیں کیا[1] ۔ مولانا مدنی کے بیان کو قلم بند نہ کرنے کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ مجسٹریٹ مذہبی احکامات کو قانون ہند کی مروجہ دفعات کے تحت تحفظ دینا نہیں چاہتا تھا ۔ یا یہ کہ اس بیان کے درج کر لینے سے مقدمہ کی کارروائی کمزور ہو جاتی تھی ۔

علی برادران کے خلاف ایک دوسرا مقدمہ :

حکومت بمبئی نے علی برادران کے خلاف بغاوت پھیلانے کے الزام میں ایک دوسرا مقدمہ بھی درج کیا ہوا تھا ۔ مقدمہ مذکورہ اور دوسرے مقدمہ میں بھی تمام ملزمان معہ علی برادران سیشن سپرد کر دیئے گئے[2] ۔ ۲۲ اکتوبر کو مسٹر تلاٹی نے مقدمہ کی سماعت کراچی جیل میں کی ۔ ملزمان کے وکیل مسٹر معظم علی نے مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی ، سعید الرحمان ، اشفاق علی اور صادق علی خان کو مقدمہ کی کارروائی کے دوران موجود رہنے کی اجازت حاصل کر لی تھی ۔ اس وقت اخبار "یوٹائمس" کا نمائندہ بھی موجود تھا ۔ یہ کارروائی چار بجے شام ختم ہوئی[3] ۔

---

۱ ۔ "روئیداد مقدمہ کراچی اسیران خلافت کمیٹی" ، ص ص ۵۲-۵۹

۲ ۔ ایضاً ، ص ۶۲

۳ ۔ ایضاً ، ص ص ۱۱۲-۱۹۰

اسیران خلافت کا گرفتاری کے بعد قوم کے نام مشترکہ پیغام :

رئیس لاحرار مولانا محمد علی ، مولانا شوکت علی ، مولانا حسین احمد مدنی اور دیگر اسیران نے ڈاکٹر سید محمود کو ایک دستی تحریری پیغام کراچی جیل سے قوم کے نام روانہ کیا ۔ اس پیغام میں تحریر تھا کہ : ''ہم اپنے تمام مذہبی اور وطنی بھائیوں کی خدمت میں سلام مسنون پیش کرتے ہوئے ظاہر کرتے ہیں کہ ہم گورنمنٹ کی اس کارروائی پر نہایت فراخ دلی اور عالی حوصلگی سے صابر ہیں اور خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہم کو اس نے توفیق عطا فرمائی کہ مذہب ، وطن کی آزادی اور قوم کی وجہ سے ہم پر ہر قسم کے مصائب ڈھانے کی فکر کی جا رہی ہیں ۔ اور ہم اس خدائے واحدہ لاشریک لہٗ کے فضل و کرم سے نہایت اطمینان اور استقامت سے تحمل کرنے کے لیے تیار ہیں ۔ آپ سب بھائیوں اور بزرگوں سے التجا ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ حتی الوسع جس قدر جلد ممکن ہو قوم اور وطن کی آزاد حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لیں اتفاق کو بڑھائیں ، غافلوں کو چونکائیں ، سوتوں کو بیدار کریں ، مقامی اور شخصی اغراض کو پس پشت ڈالیں ، نرمی اور تلطف سے کام لیں'' ۔ الخ ۔ دستخط[1]

مولانا محمد علی نے اہل وطن کے نام ایک دوسرا پیغام علیحدہ سے روانہ کیا ۔ جس میں انہوں نے کہا کہ : ''آزادی ہند کا اعلان کر دو ۔ میں قید فرنگ کو بنظر حقارت ادر نفرت سے دیکھتا ہوں ۔ اس لیے اپنے ابنائے وطن سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ آئندہ اجلاس کانگریس کے موقع پر جو احمد آباد میں منعقد ہوگا جمہوریت کا اعلان کر کے مجھ کو اس قید سے رہا کرا لیں''[2] ۔

اسیران خلافت کمیٹی کا مقدمہ اور والسرائے ہند :

والسرائے ہند نے مقدمہ کراچی کی روئیداد کے بعد ایک بیان شائع کیا ، جس میں اس بات کی تردید کی گئی تھی کہ حکومت نے مذہب اسلام پر حملہ کیا ہے ۔ اور کہا کہ اس مقدمہ سے مذہب کا تعلق نہیں ہے ۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری نے والسرائے ہند کی اس تقریر پر بیان دیتے ہوئے کہا کہ والسرائے ہند کا یہ کہنا کہ ہم نے مذہب اسلام پر حملہ نہیں کیا ہے اور نہ ہی ملزمان خلافت کمیٹی کی گرفتاری کا یہ مقصد ہے ، درست نہیں ۔ چونکہ علماء کی گرفتاری سے والسرائے ہند کے بیان کی نفی ہوتی ہے ۔ نیز ملزمان مذکورہ نے ایک شرعی حکم مسلمانوں کو پہنچایا تھا ۔ اس حکم کے پہنچانے پر انھیں ماخوذ کرنا اور مقدمہ چلانا دراصل ہمارے مذہب کی ہتک کرنا ہے ۔ اور یہ ایک بے جا مداخلت ہے ۔ مولانا ثناء اللہ نے کہا کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے ہم پر فرض ہے

---

۱ ۔ ''روئیداد مقدمہ کراچی اسیران خلافت کمیٹی'' ، ص‌ص ۱۱۹-۲۰ ۔ ۔
۲ ۔ ایضاً ، ص ۱۲۰

نہ ہم حکم شرعی تمام مسلمانوں کو پہنچائیں ۔ اور اگر اس حکم شرعی کی تعمیل میں ہمیں گرفتار کیا جائے اور مقدمہ چلایا جائے تو اس سے مقصود اسلام پر حملہ کرنا ہی ہوتا ہے ۔ لہذا اس مقدمہ میں علماء کی شہادت معتبر اور مستند ہونی چاہئے ۔ جس طرح ایک قانونی مسئلے میں ایک بیرسٹر اور جج کی رائے بہ نسبت ایک مولوی کے زیادہ وزن رکھتی ہے[1] ۔

ملزمان خلافت کا مقدمہ عدالت سیشن میں :

۲۴ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو مسٹر کینڈی ایڈیشنل کمشنر سندھ نے پہلے روز کی کارروائی "خالق دینا ہال" میں کی ۔ یہ کارروائی اسی طرح چار روز تک جاری رہی ۔ پانچویں روز یعنی ۲۸ اکتوبر کو مولانا محمد علی اور مولانا سید حسین احمد مدنی کے بیانات ہوئے ۔ مولانا محمد علی نے اپنا بیان دیتے ہوئے کہا کہ قوانین الٰہی اور قوانین انسانی میں بڑا فرق ہے ۔ موصوف نے کہا کہ "قرآن کا قانون مسلمانوں کا قانون ہے اور اس پر عمل کرنا میرا اور تمام مسلمانوں کا فرض ہے ۔ میں نے کراچی ریزولیوشن نمبر ۲ کی تائید اور حمایت اسلام کے احکامات کی روشنی میں کی ۔ اور میرا قرآن مجھے ایسا حکم دیتا ہے" ۔ اس پر عدالت نے کہا کہ قرآن کا قانون ملک کا قانون نہیں ہے[2] ۔ اس کے بعد مولانا حسین احمد مدنی نے اپنی تقریر کی اور موصوف نے خلافت کمیٹی منعقدہ کراچی کی قرار داد کا اعادہ کرتے ہوئے کہا :

"اگر اعلانیہ یا خفیہ ، بالواسطہ یا بلاواسطہ حکومت انگورہ کے خلاف پھر جنگ شروع کی گئی تو کانگریس کے فیصلے کے مطابق ہم سول احکام کی نافرمانی شروع کر دیں گے ۔ اور جمہوریہ ہند کا اعلان کر دیں گے ۔ گورنمنٹ ہم سے کہتی ہے کہ اگر تمہارے مقابلے پر کوئی لڑنے والا نہیں تو تم کو خود ہی اس میں لڑنا ہوگا ۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر اسلام کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش ہوئی ، تو ہمارا فرض ہوگا ، بلکہ ہماری ذمہ داری ہو گی کہ کامل آزادی اور جمہوریہ ہند کا اعلان کر دیں ۔ یہ کوئی ڈینگ نہیں ہے اور نہ کوئی مذاق ہے ، ہمیں اس جرم میں خواہ پھانسی پر لٹکا دیا جائے ، خواہ گولی سے اڑا دیا جائے ، اس تمام سوانگ میں ، اس تمام ساز و سامان میں جج ، جیوری اور سرکاری وکیل کو جانے دیجئے ۔ بلکہ کرنل گالر یا کسی اور شخص کی سرکردگی میں محض ایک گولی چلانے والی جماعت کو حکم دیجئے اور اس کھیل کو ختم کیجئے ۔ یہ کوئی جرم نہیں ہے ۔

---

۱ ۔ "روئیداد مقدمہ کراچی اسیران خلافت کمیٹی" ، ص ص ۱۳۲-۳۳

۲ ۔ ایضاً ، ص ص ۱۹۶-۹۹

بلکہ اسلام کے قانون کا اعلان ہے - اگر محض مذہبی قانون کا اظہار ایک مجرمانہ سازش ہے - تو حکم دیجئے - مگر یہ حکم ہندوؤں اور عیسائیوں کے لیے بھی ایسا ہی ہوگا - تب آپ کو کہنا ہوگا کہ ایک ہندو کے لیے گائے کا ذبح ہونا ، جو ہندوؤں کے نزدیک ایک گناہ ہے ، وہ بھی ایک مجرمانہ سازش ہے . اس امر کا فیصلہ جج کر سکتا ہے ، آپ (یعنی جیوری) نہیں - ایک عربی مقولہ ہے کہ خاوند صرف اپنی بیوی سے مشورہ لیتا ہے لیکن بات اپنی مرضی کے مطابق کرتا ہے - یہاں جج کی پانچ بیویاں ہیں - وہ آپ سے صرف مشورہ کرے گا لیکن کرے گا وہی جو اس کی مرضی ہوگی - وہ آپ کے فیصلے کا پابند نہیں،، [۱] -

مولانا مدنی نے اپنے بیان میں مندرجہ ذیل نکات پر بحث کی :

(الف) ملکہ وکٹوریہ کا اعلان اور (ب) قرار داد کراچی

(الف) ملکہ وکٹوریہ کا اعلان :

ممدوح نے فرمایا کہ ''۱۸۵۷ء کے زمانہ غدر میں حکومت برطانیہ نے ہندوستانیوں کا جوش ٹھنڈا کرنے کے لیے شاہی اعلان جاری کیا تھا - جو اطمینان بخش امیدوں پر مشتمل تھا - یہ اعلان ہندوستان میں برطانوی حکومت کا سنگ بنیاد تھا - اس کے آخر میں لکھا تھا کہ حکومت ہندوستانیوں کی فلاح و بہبود کے لیے مصروف عمل ہوگی - اپنے مقبوضات کو وسعت نہیں دے گی - اور راجاؤں ، نوابوں اور عامتہ الناس کے حقوق کی حفاظت کرنے کے لیے اپنے وعدے پورے کرے گی - ہندوستانیوں کے ساتھ باشندگان نو آبادیات ایسا سلوک روا رکھا جائے گا باغیوں کو معاف دے دی گئی تھی - یہ بھی تسلیم کیا گیا تھا کہ ہندوستانیوں کو مذہبی آزادی دے دی گئی ہے - تاریخ اس امر کی مظہر ہے کہ ۱۸۵۷ء میں ان مذہبی جذبات کے باعث بغاوت رونما ہوئی - جو دنیا کے دیگر ممالک میں کالعدم ہیں - تاریخ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہندوستانی مذہب کی خاطر سب کچھ قربان کر دیتے ہیں اور ایسا ہی ہونا بھی چاہئے کیونکہ خدا کا یہی ارشاد ہے - روحانی مسرت کے سامنے دنیاوی فائدہ کوئی حقیقت نہیں - مذہب بادشاہ کا قانون ہے کیونکہ اس برطانوی مدبر نے ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے اعلان جاری کیا - یہ صرف ملکہ ہی کی طرف سے نہیں بلکہ دیوان عام اور دیوان خاص کی طرف سے بھی تھا - ایڈورڈ ہفتم اور شاہ جارج نے اس پر مہر تصدیق ثبت کی - اس کا وہ حصہ جس میں مذہبی آزادی کا ذکر ہے ، مظہر ہے کہ ہماری یہ خواہش نہیں کہ ہم اپنی رعایا کو اس بات پر مجبور کریں کہ وہ ہمارے مذہبی احکام کی پیروی کرے - کسی شخص

---

۱ - ''روئیداد مقدمہ کراچی اسیران خلافت کمیٹی'' ، ص ۱۹۹

تو اس کے مذہبی فرض کی انجام دہی سے باز نہیں رکھا جائے گا ۔ قانون کی رو سے سب کو مساوی درجہ دیا جائے گا ۔ ہم اپنے افسروں کو حکم دیتے ہیں کہ وہ عوام کی مذہبی آزادی میں مزاحم نہ ہوں ۔ ورنہ وہ ہماری ناراضی کا موجب ہوں گے ۔ اس کے بعد ہندوستانیوں کو سکون و اطمینان حاصل ہوگیا ، کیونکہ انہیں یقین تھا کہ یہ شاہی اعلان ہے اور اس پر عمل کیا جائے گا"[1] ۔

قرارداد کراچی کا تذکرہ :

مولانا مدنی نے فرمایا کہ "جو قرار داد میں نے پیش کی ، وہ قرار داد نہیں بلکہ سب کا مذہبی فریضہ ہے ۔ یہ تیرہ سو برس کا معاملہ ہے ، کوئی نئی بات نہیں ۔ اسے احتیاطاً قرار داد کہا جاتا ہے ، کیونکہ اور فقرے بھی اس کے ساتھ شامل ہیں ۔ میں اپنے مذہب اور ہندو اپنے دھرم کو جانتے ہیں ۔ یہ مذہبی معاملہ ہے اس کا فیصلہ کرنا لارڈ ریڈنگ کا نہیں بلکہ علماء کا کام ہے ۔ دو جزو (کفا) ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ یہ مذہبی اصول ہے (اول) قرار داد کے الفاظ اور (دوم) نفس مضمون یہ ہے کہ پولیس کی ملازمت کرنا حرام ہے"[2] ۔

لفظ حرام کی تشریح :

"حرام" ایک مذہبی لفظ ہے ۔ ایسے سات الفاظ ہیں ۔ "حرام" اسے کہتے ہیں جسے شریعت صاف طور پر منع کرے ۔ "حرام" وہ فعل ہے جس کے ارتکاب پر قہر الہی نازل ہوتا ہے ۔ زنا بالجبر مذہب کی رو سے حرام ہے ۔ جو شخص اس سے احتراز کرے وہ نیک کام کرتا ہے ۔ "موصوف نے اس کے بعد قرآن اور حدیث میں قتل مسلم کی ممانعت اور اس کے احکامات پر روشنی ڈالی اور حرمت شراب اور حرمت قتلِ مسلم کا فرق بیان کیا ہے ۔ بعدہ حرمت ملازمت انگریزی کی توجیہہ کی اور کہا کہ مسلمانوں کے لیے ایسی ملازمت کرنا حرام ہے ۔ جس میں مسلمانوں کو قرآنی حکم کی عدم تعمیل کے لیے کہا جائے"۔ اس کے بعد مولانا نے "متفقہ فتویٰ علماء ہند" کا تذکرہ کیا ۔ اور کہا کہ "میں نے اس فتویٰ پر دستخط کیے ہیں جس پر پانچ سو علماء کے دستخط ہیں ۔ اور عالم دین ہونے کی حیثیت سے ایسا کرنا میرا فرض تھا"[3] ۔ اپنے بیان کے آخر میں مولانا مدنی نے کہا کہ "میں ڈنکے کی چوٹ اعلان کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے لیے برطانوی فوج میں ملازمت کرنا حرام ہے"[4] ۔

---

۱ ۔ "روئیداد مقدمہ کراچی اسیران خلافت کمیٹی" ، ص ۲۰۸

۲ ۔ ایضاً ، ص ص ۲۰۸-۲۱۱

۳ ۔ ایضاً ، ص ۲۱۱

۲۹ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو مقدمہ کی کارروائی میں پیر غلام مجدد سندھی ، مولانا نثار احمد اور سب سے آخر میں مولانا شوکت علی کا بیان ہوا ۔ یکم نومبر ۱۹۲۱ء کو مسٹر بی ۔ سی کینڈی ، جوڈیشل کمشنر سندھ نے جیوری کی رائے لے کر مقدمہ کا فیصلہ سنا دیا ۔ ارکان جیوری نے متفقہ طور پر فیصلہ دیا تھا کہ تمام ملزمان بے قصور ہیں ۔ لیکن جیوری کی رائے کے باوجود کمشنر مذکور نے ان عاملین قرآن کو دو دو سال قید بامشقت کی سزا کا حکم سنا دیا ۔ اور جگت گرو شنکراچاریہ کو بری کر دیا ۔ جج مذکور نے اپنے مقصد کا اعادہ کرتے ہوئے کہا کہ مذہب کا سوال اس مقدمہ میں بالکل داخل نہیں ہوتا ۔ اگر ملزمان نے ملک کے مروجہ قانون کو توڑا ہے تو انھیں ملک کے قانون کے تحت سزا ملنی چاہئے ۔ جج نے جیوری کے روبرو اپنے ایڈریس میں کامل ایک گھنٹہ بیس منٹ لیے ۔ اس کے بعد ملزمان کو سزا کا حکم سنایا گیا ۔ اور مولانا محمد علی کو زیر دفعہ ۱۱۷ تعزیرات ہند مزید دو سال کی سزا کا حکم سنایا گیا ۔ مگر اس وضاحت کے ساتھ کہ پہلی سزا کے ساتھ ساتھ دوسری سزا کی مدت بھی شمار ہوگی ۔ اس طرح کل دو سال کی سزا بھگتنی ہوگی[1] ۔

زندانیان کراچی کے جیل سے پیغامات :

زندانیان حق نے اپنے علیحدہ علیحدہ پیغامات میں اہل وطن کو مخاطب کرتے ہوئے صبر و استقامت کی تلقین فرمائی ۔ تمثیلاً مولانا سید حسین احمد مدنی کا بیان درج ذیل ہے :

''انسان فطرتاً آزاد ہے ۔ بغیر آزادی کے کوئی انسان نہ اپنی انسانیت کا ثبوت دے سکتا ہے اور نہ وہ اپنے فرائض پورے کر سکتا ہے ، جو خدا کی طرف سے اس پر عائد کیے ہیں ۔ جو آزاد نہیں وہ اپنی زندگی بے زبان گونگے جانوروں سے اچھی نہیں گذار سکتا ہے ، جن کو ہنکارا جاتا ہے ۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے ملک اور اپنی قوم کو مذہبی فرائض کے لیے آزاد کرائے ، ورنہ اس کو اپنی قومی ہستی سے انکار کر دینا چاہئے ۔ میں تم لوگوں سے امید رکھتا ہوں کہ اس آزادی کو محفوظ رکھو گے ، اور بامن طریقہ سے اپنی آزادی کے لیے کوشش کرتے رہوگے ۔ تا کہ تمھاری قوم اور مذہب دنیا میں ترقی کرے ، تا کہ تمھارا خدا تم سے راضی ہو ، اور تا کہ تمھاری آئندہ نسل غلامی کی لعنت سے نجات پا کر آزادی کے پھل کا مزہ اٹھائے ۔ اس معاملے میں میں خدا پر بھروسہ رکھتا ہوں اور صرف اس سے

---

1. *A History of the Freedom Movement*, vol. 3, Pt. 1, pp. 32-33 ;
''معرکۂ سیاست و خلافت'' ، ص ۲۱۵ ؛
''روئیداد مقدمہ کراچی اسیران خلافت کمیٹی'' ، ص‌ص ۲۵۶-۵۹ ؛
''علی گڑھ گزٹ'' ، نومبر ۱۹۲۱ء ، ج ۱ ، شمارہ ۶۵ ، ص ۲ ، ک ۱

ڈرتا ہوں ۔ خدا ہمیں صحیح راستہ دکھائے اور حق و صداقت میں ہماری مدد کرے" ۔ (تمہارا خیر خواہ حسین احمد کراچی ، یکم نومبر ۱۹۲۱ء[1] ۔

اسی طرح کے پیغامات مولانا شوکت علی ، مولانا محمد علی ، مولانا نثار احمد ، پیر مجدد سندھی اور ڈاکٹر کچلو نے بھی دیے ۔ شری شنکر اچاریہ نے رہائی کے بعد اخبار کے نمائندے کو اپنا پیغام دیا[2] ۔

اسیران خلافت کمیٹی نے قید سے اپنے اپنے پیغامات تمام ہندوستانیوں ، یعنی مسلمان ، ہندو ، سکھ ، پارسی ، عیسائی ، یہودی اور مرد و خواتین کے نام روانہ کیے ۔ اصل میں ان کا مقصد یہ تھا کہ اہل وطن ان کی سزا و قید سے پریشان نہ ہوں ، اور ملک کو آزاد کرانے کی پر امن جد و جہد جاری رکھیں ۔

موپلوں کی بغاوت ، ایک ناخوشگوار حادثہ :

موپلے اصلاً عرب ہیں، موپلہ سے مراد ہے ماں نے پالا یعنی پروردۂ مادر ۔ یہ لوگ تیسری صدی ہجری سے ساحل مالا بار میں آباد ہیں[3] ۔ موپلوں کی بغاوت کی کئی وجوہات تھیں ۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے بیان کے مطابق اس بغاوت کی اصل وجوہات کا پتہ نہ چل سکا تاہم موصوف نے لکھا ہے کہ موپلوں نے خلافت تحریک میں بڑی دلچسپی اور سرگرمی سے حصہ لیا اور حکومت نے ان کی اس سرگرمی کو دبانے کے لیے ان کے علماء اور اماموں کو گرفتار کیا ۔ جس کی وجہ سے ان میں بے چینی پیدا ہوئی ۔ اکثر مورخین (جن میں سے خالد بن سعید بھی ہیں) کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ بغاوت اس لیے رونما ہوئی تھی کہ موپلوں نے ہندو زمینداروں ، سرمایہ داروں اور برطانیہ کے خلاف ایک منظم کوشش کی تھی ۔ علاوہ ازیں بقول علی گڑھ گزٹ ایک زمیندار کو موپلوں

---

۱ ۔ "روئیداد مقدمہ کراچی اسیران خلافت کمیٹی" ، ص ۲۶۱
"مسلم" (ہفت روزہ) ، ۱۶ نومبر ۱۹۲۱ء ، ص ۵ ، ک ۱-۳

۲ ۔ "روئیداد مقدمہ کراچی اسیران خلافت کمیٹی" ، ۲۶۲-۶۳
(نوٹ : مدیر "علی گڑھ گزٹ" نے بیان کیا تھا کہ مقدمہ کراچی جو علی برادران وغیرہ پر چلایا گیا تھا اور جس میں چار ہزار پانچ روپے کی رقم صرف ہوئی ، سمجھ میں نہیں آتا ۔ کیونکہ جس حالت میں ان صاحبوں نے عدالت کو تسلیم نہیں کیا ، اور مقدمہ نے زیادہ طول بھی نہیں کھینچا - پھر اس مقدمہ کے نامۂ اعمال میں صرف چند ہفتے کا خرچ چار ہزار کا ڈالنا سمجھ میں نہیں آتا ۔ "علی گڑھ گزٹ" ، ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۱ء ، ج ۲ ، نمبر ۱۹۳-۱۹۴ ص ۲ ، ک ۲

3. Mohammad Noman, *Muslim India*, Allahabad, 1942, pp. 206-207 ;
"علی گڑھ گزٹ" ، ۲۹ اگست ۱۹۲۱ء ، ص ۲ ، ک ۲

کے ''ایک ایجنٹ'' سے ، جو نان کوآپریٹر تھا ، کچھ شکایات تھیں ۔ جن کی بناء پر بھی فساد کا خطرہ تھا ۔ اولاً ایک میاں صاحب نے ، جو بزرگ سمجھے جاتے تھے ، اس فساد کو روک دیا ۔ لیکن ایجنٹ مذکور نے ۲۰ اگست ۱۹۲۱ء کو کئی ہزار نان کوآپریٹرز موپلے جمع کیے اور عظیم فساد برپا کر دیا ۔ ان موپلوں نے فساد کے درمیان ڈاک خانے لوٹے ، ریل کی پٹریاں اکھاڑیں ، بجلی و فون وغیرہ کے تاروں کو کاٹا ، غرض یہ کہ بڑا ہنگامہ برپا کیا[1] ۔ موپلوں کے درمیان باغیانہ لٹریچر تقسیم کیا گیا تھا ۔ اور باغیانہ تقاریر بھی کی گئیں ۔ اس تمام کارروائی میں کسی ہندو نے شرکت نہیں کی ۔ ۲۱ اگست کو ۱۴ موپلے گرفتار کیے گئے ۔ جن میں بعض مشہور خلافت لیڈر بھی شریک تھے ۔ ۲۶ اگست کو مالا بار میں مارشل لاء لگا دیا گیا ۔ اس فساد میں اندازاً پانچ سو سے سات سو تک موپلے مارے گے تھے ۔ لیکن ڈاکٹر خالد بن سعید نے مرنے والے موپلوں کی تعداد چار ہزار بتائی ہے ۔ موپلوں کے متعلق مورخین کا خیال ہے کہ وہ بڑی بہادر قوم ہے ۔ گاندھی جی نے بھی ان کو "Brave God fearing Moplas" کے الفاظ سے یاد کیا ہے ۔ علاوہ ازیں مصنف مسلم انڈیا نے لکھا ہے کہ موپلوں نے اس درمیان میں ''سوراج'' قائم کر لیا تھا ۔ اس لیے حکومت نے مارشل لاء لگایا اور گرفتاریاں کیں[2] ۔ موپلوں کی بغاوت پر خلافت کمیٹی اور کانگریس نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا ۔ تحریک خلافت کی وجہ سے جو ہندو مسلم اتحاد قائم ہوا تھا ۔ اسے مخالفین کی جانب سے ضرب لگانے کے لیے یہ بات مشہور کی گئی کہ موپلوں نے ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنایا ۔ حالانکہ موپلوں کے لیڈر ویم کناتھ کن حامد حاجی اور ایک موپلہ خاتون نے اس بات کی تردید کی ۔ موپلہ لیڈر کا بیان ۷ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو شائع ہوا اور موپلہ خاتون کے بیان کی نقل بعدہ ''علی گڑھ گزٹ'' مورخہ ۳ اکتوبر ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی ۔ ان ہر دو بیانات کی روشنی میں یہ واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوؤں نے موپلوں کا ساتھ دینے کا حلف اٹھانے کے باوجود برطانیہ کے ساتھ مل کر بے وفائی کی ۔ اس لیے موپلوں نے ہندوؤں کو ان کی بے وفائی کی سزا دی[3] ۔ ہندوؤں کی سزا کے بارے میں گزٹ مذکور نے کوئی نشاندہی نہیں کی ۔

---

1. *Ulema in Politics*, p. 279 ; *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd edition, p. 54 ;
''علی گڑھ گزٹ'' ، ۲۹ اگست ۱۹۲۱ء ، ص ص ۱-۲ ، ک ۱-۲

2. *Muslim India*, pp. 206-207 ; *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd ed., pp. 54-55;
''علی گڑھ گزٹ'' ، ۲۹ اگست ۱۹۲۱ء ، ص ص ۱-۲ ، ک ۱-۲

۰۳ ''مسلم'' ، ۱۸ نومبر ۱۹۲۱ء ، ص ۳ ، ک ۲ ؛
''علی گڑھ گزٹ'' ، ۳ اکتوبر ۱۹۲۳ء ، ج ۳ ، نمبر ۲۹۶ ، ص ن

موپلہ ٹرین کا المناک حادثہ :

حکومت مدراس نے ۲۶ اگست کو مارشل لاء نافذ کرنے کے بعد ایک مال گاڑی کے ڈبہ میں سو موپلوں کو بلاری منتقل کرنے کے لیے بند کر دیا ۔ یہ ڈبہ اتنا سخت بند تھا کہ اس میں ہوا کا بھی گزر نہ ہو سکا ۔ لہذا دم کشی کی وجہ سے ۶۶ موپلے مر گئے اور ۳۴ باقی رہے ۔ مگر وہ بھی قریب المرگ تھے ۔ اصل میں یہ ڈبہ مسافروں کے لیے موزوں ہی نہ تھا بلکہ مال بردار تھا ۔ نیز یہ کہ اس ڈبے میں سو آدمیوں کے لیے گنجائش نہ تھی ۔ لہذا تنگیٔ تنفس اور دم کشی ان کی موت کا باعث ہوئی[1] ۔

غرض یہ کہ موپلوں کی بغاوت سے ملک کے اتحاد اور یک جہتی کو بڑا نقصان پہنچا ۔ دوم یہ کہ اس وقت تک تحریک عدم تعاون بھی بڑی کامیابی کے ساتھ جا رہی تھی ۔ مگر اس بغاوت نے اس تحریک میں بھی شگاف پیدا کر دیا ۔ جس کے نتیجہ میں "سوراج" یعنی مکمل آزادی حاصل کرنے کی روح (Spirit) بھی لوگوں میں پھیکی پڑ گئی ۔ برطانیہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس بغاوت کو غیر ضروری طور پر ہوا دی اور دونوں قوموں کے درمیان نفرت ، حقارت اور عناد کی تخم ریزی کی ۔ جس کے نتیجے میں آزادی حاصل کرنے کی تحریک بہت پیچھے چلی گئی ۔ اور آئندہ چل کر ہندو مسلم فسادات نے ایک قابل نفرت شکل اختیار کر لی ۔ اس فساد کے بعد ہی ملک میں شدھی اور سنگٹھن کی تحریکوں نے جنم لیا ۔ جن کا تفصیلی ذکر اگلے اسباق میں کیا جائے گا[2] ۔

ابھی موپلوں کی بغاوت کے اثرات ملک سے پوری طرح ختم بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک اور دلدوز واقع چورا چوری کا رونما ہوا ۔ جس کی مختصر روئیداد حسب ذیل ہے :

(الف) ۳۱ مارچ ۱۹۳۱ء کو گاندھی جی نے اعلان کیا کہ سوراج ایک سال میں حاصل کر لیا جائے گا ۔ اور حصول سوراج کے لیے تلک فنڈ قائم کیا گیا ۔ اس فنڈ میں ہندو اور مسلمانوں نے خوب دل کھول کر چندہ جمع کیا ۔

(ب) دسمبر ۱۹۲۱ء میں کانگریس کا سالانہ جلسہ احمد آباد میں منعقد ہوا ۔ اس جلسے میں مولانا حسرت موہانی نے مکمل آزادی ہند یعنی "سوراج" کی ایک

---

1. *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd ed., pp. 54-55 ; *Muslim India*, p. 207.
2. *Ibid*, pp. 206-7 ; "مسلم" ، ۸ نومبر ۱۹۲۱ء ، ص ۳ ، ک ۲

قرار داد پیش کی ، جو مہاتما گاندھی کی مخالفت کی بناء پر منظور نہ ہو سکی ۔ چونکہ ہندوؤں کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ ''پان اسلام ازم'' اور اسلامی ممالک کے اتحاد سے مکمل آزادی میں خلل واقع ہو جائے گا ۔ مگر خلافت کمیٹی کی سبجیکٹ کمیٹی نے مولانا حسرت کا مکمل آزادی والا ریزولیوشن منظور کر لیا[1] ۔

(ج) اوائل جنوری ، ۱۹۲۲ء میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کی گئی ، اور گاندھی جی نے لارڈ ریڈنگ کو کچھ مطالبات پیش کیے ، جو وائسرائے نے نامنظور کر دیے ۔ سول نافرمانی کی تحریک کانگریس کے اجلاس منعقدہ احمد آباد دسمبر ۱۹۲۱ء میں بصدارت حکیم اجمل خان منظور ہو چکی تھی ، اس تحریک میں محاصل (ٹیکس) کی عدم ادائیگی بھی شامل تھی ، جس پر عمل درآمد بارد ولی سے کیا گیا[2] ۔

(د) سول نافرمانی کی تحریک جاری تھی ، ہزاروں محبان وطن ملک کی آزادی کی خاطر قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے تھے کہ ۱۲ فروری ۱۹۲۲ء کو چورا چوری کا خونی حادثہ پیش آ گیا[3] ۔

چورا چوری :

ضلع گورکھپور میں واقع ہے ۔ عدم تعاون کے رضا کار بازاروں میں جا کر لوگوں کو غیر ملکی کپڑا اور اشیاء مسکرات کی فروخت پر منع کرتے تھے ۔ نیز طرح طرح سے لوگوں کو دھمکاتے تھے ۔ ایک سب انسپکٹر پولیس نے انھیں ایسا کرنے سے منع کیا ، اور سخت سست بھی کہا ۔ ۴ فروری کو یہ رضا کار کئی ہزار دیہاتیوں کو ساتھ لے کر انتقامی کارروائی کرنے کے لیے تھانے پر حملہ آور ہوئے ۔ ان رضاکاروں میں کچھ لوگ جرائم پیشہ بھی تھے ۔ ان حملہ آوروں نے پولیس کو بے قابو کر کے تھانے کی

---

1. **Abul Kalam Azad, *India wins freedom*, Bombay, 1959, p. 56 ;**
   ***A History of the Freedom Movement*, vol. 3, Pt. 1, pp. 234-35;**
   عبدالوحید خان ، ''تقسیم ہند'' ، لاہور ، ص ص ۱۹۶۹ء ، ۱۰۰-۱۲۱ ؛ ''تواریخ کانگریس'' ، ص ۳۵۳
2. ***A History of the Freedom Movement*, vol. 3, Pt. 1, pp. 234-235 ;**
   ***Pakistan : The Formative Phase*, 2nd ed., p. 58 ;**
   ''تواریخ کانگریس'' ، ص ۳۶۳ تا ۳۶۵ (ز) ؛ ''شاہ راہ پاکستان'' ، ص ۳۰۰
3. ***Pakistan : The Formative Phase*, 2nd, ed., p. 58 ;**
   ''شاہ راہ پاکستان'' ، ص ۳۰۰

عمارت کو آگ لگا دی اور افسران پولیس معہ تمام عملے کو زندہ جلا دیا۔ ایک دوسرے گروہ نے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر دیگر افسران کو باہر جانے سے روک دیا اور مواصلات کا سلسلہ بھی درہم برہم کر دیا ۔ گاندھی جی کے لڑکے نے اس واقعہ کی اطلاع اپنے والد کو دی ، جس میں تحریر تھا کہ اب آپ پنجاب کے مظالم کو بھول جائیے[1] ۔

مزید برآں اسی طرح کے خونی حادثات بمبئی ، مدراس ، اور دیگر مقامات پر بھی رونما ہوئے ۔ ۱۲ فروری ۱۹۲۲ء کو باردولی میں کانگریس کمیٹی منعقد ہوئی ۔ اور ملک میں پیش آمدہ حالات کا جائزہ لے کر کانگریس نے آئندہ کے لیے سول نافرمانی کی تحریک بند کرنے کا اعلان کر دیا ۔ گاندی جی نے اس تحریک کو بند کرنے کے دلائل میں یہ بات کہی کہ اہل وطن نے ابھی تک ''اہنسا'' کا عقیدہ قبول نہیں کیا[2] ۔ گاندھی جی کے اس عمل پر ، موتی لال نہرو اور دیگر کانگریسی لیڈران بہت برافروختہ ہوئے ۔ اور جیل سے اپنے پیغام میں کہا : ''کہ اتنے بڑے ملک میں چند سرپھرے گاؤں کے لوگوں کے قصور پر پوری قوم کو سزا دینا مناسب نہیں'' ۔ اس کے بعد کانگریس دو ٹکڑوں میں بٹ گئی ۔ ایک قدامت پسند اور دوسرے تبدیلی پسند[3] ۔

فصل ششم

ترکی میں خلافت عثمانیہ کا خاتمہ اور ہندوستان میں تحریک خلافت کا زوال :

۱۰ اگست ۱۹۲۰ء کو دول مغرب اور ترکی کے مابین صلح نامہ سیورے ہوگیا ۔ اس معاہدے کے بعد ترکی میں ماتمی یا سوگ کا دن منایا گیا ۔ جولائی ، ۱۹۱۹ء میں

---

1. *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd. Ed., p. 58 ;
''علی گڑھ گزٹ'' ، ۳ اپریل ۱۹۲۲ء ، ج ۲ ، نمبر ۱۰۸ ، ص ۴ ، ک ۱
(لوٹ) چورا چوری کے حادثہ پر علماء کا ردِ عمل راقم کی نظر سے نہیں گذرا -)
2. *Pathway to Pakistan*, p. 63 ; ''شاہ راہ پاکستان'' ، ص ۴۰۰ ؛ ''علی برادران'' ، ص ۶۳۸
3. *Pathway to Pakistan*, pp. 63-66 ; ''شاہ راہ پاکستان'' ، ص ۴۰۰

مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت میں ایک قومی تحریک نے جنم لیا - جس نے موصوف کی زیر صدارت ایک مجلس منتظمہ منعقد کی[1] - چنانچہ مصطفیٰ کمال پاشا نے ۲۳ اپریل ۱۹۲۰ء کو انگورہ میں ایک مستقل حکومت قائم کر لی[2] - انگورہ حکومت کے قیام کے بعد ترکی میں دو حکومتیں قائم ہوگئیں - ۱۹۲۱ء کے اوائل میں قومی حکومت نے سلطان ترکی کے اختیارات ختم کر دیے اور بجز نیشنل اسمبلی ، کسی شخص یا جماعت کو ترکی کے متعلق ، معاہدہ امن و جنگ کرنے کا اختیار نہ رہا[3] - اس فیصلے کی رو سے قومی حکومت نے اپنی طاقت مضبوط کی اور "سکریا" کے مقام پر یونانیوں کو شکست فاش دی - اس کامیابی نے ترکوں کی پوزیشن مضبوط کر دی - چنانچہ اتحادیوں نے مجبور ہو کر ترکوں سے ایک دوسرا معاہدہ، معاہدہ لوازن (Treaty of Lausanne) کیا جس میں دول مغرب اور ترکی کے مابین حدود سلطنت کے معاملات طے کیے گئے - بلکہ اس کے ذریعہ ان تنازعات کا بھی فیصلہ ہو گیا جو ترکی کی مادی اور تجارتی ترقی میں حائل تھے - دوسری طرف ترکی مقبوضات ، اناطولیہ ، تھریس ، جس میں قسطنطنیہ بھی شامل تھا ، ترکی کو حاصل ہو گئے[4] - ۲۱ نومبر ۱۹۲۲ء قومی اسمبلی نے یہ طے کیا کہ خلافت اور سلطنت کو علیحدہ کر دیا جائے - اس فیصلے کے تحت آخر نومبر ۱۹۲۲ء میں نئے خلیفہ

---

۱ - "زمانہ" ، فروری ، ۱۹۲۸ء ، ص ص ۶۳-۶۶
(نوٹ : مصطفیٰ کمال پاشا ۱۸۸۰ء میں سالونیکا میں پیدا ہوئے - بائیس سال کی عمر میں فوجی تربیت مکمل کر کے شاہی فوج میں ملازم ہوئے - موصوف کا فطری حوصلہ اور ہمت آئندہ چل کر آپ کی کامیابی کا ضامن ثابت ہوا - موصوف نے جدید ترکی کی بنیاد ڈالی اور اتحادیوں کو شکست دے کر ایک قومی حکومت قائم کی - نیز ۱۹۲۴ء میں خلافت عثمانیہ کو ختم کر دیا - "زمانہ" ، فروری ۱۹۲۸ء ، ص ص ۶۳-۶۸)

۲ - "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۵۱۴
(نوٹ : سلطان ترکی نے ایک عدالت کے ذریعہ مصطفیٰ کمال پاشا اور ان کے رفقاء کو سزائے موت کا حکم کر دیا - نیز شیخ الاسلام سے ایک فتویٰ بھی جاری کرایا ، جس کے تحت ان افراد کو مارنے والے افراد کو جنت کا مستحق قرار دیا - "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۵۱۳ بحوالہ "ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش" از خالدہ ادیب - انگریزی ، ص ۱۱ ، مطبوعہ جامع اسلامیہ دہلی) ؛ "زمانہ" ، فروری ، ۱۹۲۸ء ، ص ۶۶)

۳ - "زمانہ" ، فروری ۱۹۲۸ء ، ص ۶۷

۴ - "زمانہ" ، فروری ۱۹۲۸ء ، ص ص ۶۶-۶۷ ؛
"مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ص ۵۱۶ اور ۱۷-۱۸

عبدالمجید آفندی کا تقرر عمل میں آیا[1] -

معاہدہ لوزین کے بعد ترکوں کو خلافت سے کوئی دلچسپی نہ رہی - دوسری طرف سلطان عبدالمجید آفندی خلافت کے لیے نا اہل ثابت ہوئے - بالآخر ۲ مارچ ۱۹۲۳ء میں جمہوری پارٹی کا ایک جلسہ ہوا اور ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو ایک قرارداد کے ذریعہ خلافت کے خاتمے کا اعلان کر دیا - ڈاکٹر خالد بن سعید نے خلافت کے خاتمے کی تاریخ ۳ مارچ ۱۹۲۳ء بیان کی ہے جس کی تائید مدیر ''زمانہ'' کے بیان سے ہوتی ہے[2] -

خلافت کے خاتمہ پر ہندوستان میں رد عمل :

۲۵ جولائی ۱۹۲۳ء کو برصغیر میں ترکی کا جشن صلح منایا گیا - جس میں اہل وطن (ہندو اور مسلم) نے خوشی اور مسرت کا اظہار کیا[3] - بعدہ دسمبر ۱۹۲۳ء میں خلافت کانفرنس کے دو جلسے ، ایک بصدارت ڈاکٹر مختار احمد انصاری گیا میں منعقد ہوا اور دوسرا جلسہ خلافت و کانگریس کے ذیل میں بصدارت مولانا شوکت علی کوکناڈا میں منعقد ہوا - اس جلسے میں جمیعۃ العلماء ہند بھی شریک تھی - علی برادران دو سال کی قید کے بعد رہا ہو کر اس جلسے میں شریک ہوئے تھے - ان کی عدم موجودگی میں ملک کی فضا ارتداد کی تحریکوں کی بناء پر مسموم ہو چکی تھی - تاہم مولانا محمد علی نے ملک کے اتحاد کو قائم اور برقرار رکھنے کے لیے اپنے خطبہ صدارت میں ملکی و قومی اتحاد پر بڑی خوش اسلوبی سے روشنی ڈالی - جس سے نتیجے میں قوم پرست قوتیں پھر

---

۱ - ''زمانہ'' ، فروری ، ۱۹۲۸ء ، ص ۶۸ ؛ ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' ، ص‌ص ۵۱۶-۱۷
(نوٹ : ترکی کی نیشنل اسمبلی کے اجلاس کی تاریخوں میں مدیر زمانہ اور مولوی طفیل احمد منگلوری کا اختلاف ہے - مدیر ''زمانہ'' ، یکم نومبر ۱۹۲۲ء ، اور منگلوری صاحب ، ۱۹۲۱ء بیان کرتے ہیں -)

2. *Pakistan* : *The Formative Phase*, 2nd ed., p. 59 ; *Pathway to Pakistan*, p. 73 ;
''زمانہ'' ، فروری ، ۱۹۲۸ء ، ص ۶۸ ؛ ''علی برادران'' ، ص ۶۰

۳ - ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' ، ص‌ص ۵۱۷-۱۸
(نوٹ : اس زمانہ میں مسلم لیگ ، خلافت کمیٹی سے منقطع ہوگئی نیز کانگریس اور مسلم لیگ کا سمجھوتہ بھی ختم ہوگیا - ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' ، ص ۵۱۷-۵۱۸)

منظم ہونے لگیں[1]۔

اس وقت تحریک خلافت کو پے درپے تین کاری ضربیں لگیں ۔ جس کی بناء پر قومی اتحاد کو بڑا دھکا پہنچا :

(الف) چورا چوری کے حادثے کی بناء پر گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک ختم کر دی ۔

(ب) ترکی نے خلافت سے دستبرداری کا اعلان کر کے ہندوستانی مسلمانوں کے جان و مال کی قربانیوں کو ، جو خلافت کے نام پر دی گئی تھیں ، یک لخت بے معنی اور بے سود کر دیا ۔ اور ہندوستانی مسلمانوں کے آلام و مصائب کا ، جو وہ اس اس ضمن میں دس بارہ سال سے برداشت کر رہے تھے ، یکسر نظر انداز کر دیا ۔ اور

(ج) یہ کہ ترکی میں خلافت کے خاتمہ کے بعد مسلمانانِ ہند میں خلافت کے مسئلے پر انتشار پیدا ہوگیا ۔

۱۹ مارچ ۱۹۲۴ء کلکتہ میں بصدارت مولانا محمد علی خلافت کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا ۔ جس میں خلافت کے ختم کئے جانے پر تاسف کا اظہار کیا گیا ۔ پھر ۲۴ اور ۲۵ جون ۱۹۲۶ء کو خلافت کانفرنس کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا ۔ اس میں طے پایا کہ خلافت کا انتخاب دنیا کے مسلمانوں کی کانفرنس مل جل کر طے کرے ۔ ترکی میں خلافت کے خاتمے کے بعد اب مسلمانان ہند کی توجہ حجاز یا کسی دیگر اسلامی ملک میں خلافت قائم کرنے پر مرکوز تھی ۔ چنانچہ اس ضمن میں ایک جلسہ ۲۴ دسمبر ۱۹۲۵ء بمقام کان پور ، بصدارت مولانا آزاد منعقد ہوا ۔ جس میں گاندھی جی نے بھی شرکت کی ۔ مولانا حسرت موہانی نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں فرمایا کہ اگر ترکی خلافت منظور نہ کرے تو شاہ حجاز کو خلافت دے دی جائے[2] ۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے خلافت کمیٹی کی کارکردگی کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا ۔ واضح رہے کہ مولانا آزاد کے مذہبی افکار میں ۱۹۲۰ء میں رہائی کے بعد تبدیلی پیدا ہوئی ۔ اس سے قبل مولانا مسلم قومیت اور احیاء اسلام کے حامی تھے ۔

---

۱ - "علی گڑھ گزٹ" ، جنوری ۱۹۲۳ء ، ج ۲ ، نمبر ۲۵۷ ، ص ۲ ؛
"سیرت محمد علی" ، ص ۵۳ ؛ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص‌ص ۱۷۵-۱۸

۲ - "علی برادران" ، ص ۶۳۰ ؛ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص‌ص ۱۷۵-۲۰

مگر رہائی کے بعد مولانا کا سیاسی مسلک کانگریس کے مقاصد سے ہم آہنگ ہوتا گیا حتی کہ انھوں نے زندگی کے آخری لمحات تک ایک ہی سیاسی ملک کی پابندی کی[۱] - مولانا آزاد نے خلافت کمیٹی کے بارے میں جو اظہار خیال کیا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ خلافت کمیٹی کی تشکیل سے قبل اہل ہند عمل و مساعی سے بے پروا تھے - خلافت کمیٹی نے ، ان کو اس طرف متوجہ کیا - اور مسلمانان ہند کو خلافت اسلامیہ اور جزیرۃ العرب کی حفاظت کے لیے متحد و متفق کیا - خلافت کمیٹی نے خواص سے گزر کر عوام میں آزادی کی تحریک پیدا کی - اس نے ہندو مسلم ، بلکہ ہندوستانی قوموں کے درمیان طلب حق پیدا کی اور سب کو متحد کیا - اس نے ترک موالات کے ذریعہ اہل ہند کو آزادی حاصل کرنے کا بے خطا ہتھیار دیا - اور نامساعد حالات کے باوجود کانگریس سے ترک موالات کا نظام عمل منظور کرایا - مزید برآں اس کی جد و جہد اور سعی پیہم کی بدولت عالم اسلام کے مختلف گوشوں میں ، مظلومین سمرنا کی مدد و اعادت کا جذبہ پیدا ہوا ، اور سیاسی جد و جہد کی ایک نئی لہر پیدا ہوئی[۲] -

مولانا آزاد نے خلافت کمیٹی کے عمل کا جائزہ لیتے ہوئے مندرجہ بالا نکات پر تبصرہ فرمایا ہے - مگر حالات و شواہد سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تمام نکات من و عن صحیح نہیں ہیں - بلکہ جزیرۃ العرب اور بلاد اسلامیہ کی حفاظت کا خیال مسلمانان ہند کے دلوں میں ۱۸۷۷ء ہی سے موجود تھا ، جب کہ روس و ترک کی جنگ میں مولانا محمد قاسم نانوتوی نے مظلومین ترک کے لیے چندہ جمع کر کے روانہ کیا[۳] - مزید برآں برصغیر میں سیاسی بیداری ، تشکیل کانگریس اور قیام مسلم لیگ کے بعد سے ہی پیدا ہو گئی تھی - مسلمانوں کو تنسیخ بنگال ، جنگ طرابلس اور بلقان نے سیاسی بیداری میں مزید تقویت بخشی - البتہ تحریک خلافت ایک مذہبی تحریک تھی ، جس کی بدولت مسلمانان ہند بلا لحاظ مسلک و عقائد ایک سیاسی پلیٹ فارم پر متحد ہو گئے[۴] - مسلمانوں نے اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے بے مثال قربانیاں پیش کیں - جس میں مرد و عورتوں اور بچوں نے برابر کی شرکت کی اور اسکولوں اور کالجوں سے اپنے طلباء کو

---

۱ - منشی مشتاق احمد ، "تازہ مضامین ، مولانا ابوالکلام آزاد" ، دہلی ، س - ن (دوسری مرتبہ) ص ص ۳-۸

۲ - ایضاً ، ص ص ۱۰-۱۲

۳ - عزیز الرحمٰن جامعی (مرتبہ) ، "مسلمانوں کی ڈیڑھ سو سالہ قربانیوں کا جائزہ" (بحوالہ مضامین ڈاکٹر سید محمود خلافت تحریک ، (دہلی - س ن - ص ۸)

4. K.K. Aziz, *The Making of Pakistan*, London, 1967, p. 118.

بھی باہر نکال لیا ۔ نیز سرکاری امداد بھی قبول نہ کی ۔ نیز سرکاری مدد نہ لینے والا سب سے بڑا قومی تعلیمی ادارہ "جامعہ ملیہ" قائم کیا ۔ ہندو مسلم اتحاد کی بے نظیر مثال قائم کی ۔ اور ہندوؤں سے مستقبل کے آزاد ہند میں اپنے حقوق و مراعات کا مطالبہ تک نہیں کیا ۔ اس تحریک نے دوسروں کی خاطر ایثار نفس کا جذبہ پیدا کیا ۔ جس کا مقصد اسلامی ممالک میں اپنے مسلم بھائیوں کو بیرونی غلامی سے نجات دلانا تھا ۔ مسلمانوں میں خود اعتمادی ختم ہو چکی تھی اس تحریک نے اسے پھر بحال کیا ۔ اس تحریک کی بدولت مسلمانان ہند نے سیاسی مقابلہ کے لیے ایک تیسرے فریق کی حیثیت سے دنیا کے سامنے اپنے کو پیش کیا[1] ۔ اس تحریک کی ابتداء سے قبل مسلمانان ہند ، ملک کی سیاست میں نمایاں اور اہم حصہ لیتے ہوئے کتراتے تھے ، مگر اس تحریک نے ان سے اس جھجک کو دور کیا ۔

مختصراً یہ کہ خلافت تحریک نے مسلمانان ہند کو ایک بنیادی سبق کا اعادہ عملاً یاد دلایا ۔ یعنی وہ یہ کہ "اتحاد کی قوت" تمام قوتوں پر بھاری اور کامیابی کا زینہ ہے ۔ اس تحریک کی بدولت مسلمانوں کو ان کی اپنی مسلم حیثیت کا احساس پیدا کر کے مسلم قومیت کو ہندوستان کی تاریخ میں زندہ اور متحرک کر دیا[2] ۔

عزیزالرحمٰن جامعی نے اپنی کتاب "مسلمانوں کی ڈیڑھ سو سالہ قربانیوں کا جائزہ" میں بیان کیا ہے کہ "خلافت تحریک میں گرفتار ہونے والے مسلمانوں کی تعداد تقریباً دو لاکھ تھی ۔ نیز یہ کہ اس تحریک میں انگریزوں کے خلاف ہندوستان کے مسلمانوں نے مجموعی طور پر پانچ کروڑ روپے صرف کیے ۔ اور تقریباً بیس کروڑ روپے کا مجموعی نقصان برداشت کیا ۔ جس میں جرمانے ، بدیسی کپڑے کا جلانا اور تجارتی نقصان وغیرہ سب ہی شامل تھا"[3] ۔

---

۱ ۔ "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ، ص ۲۶۱

2. K.K. Aziz, *The Making of Pakistan*, p. 115.

۳ ۔ "مسلمانوں کی ڈیڑھ سو سالہ قربانیوں کا جائزہ" ، ص ۸ (بحوالہ مضامین ڈاکٹر سید محمود ، خلافت تحریک)

باب خامس

جمعیۃ علماء ہند کا قیام اور علماء کی سیاسی سرگرمیاں

فصل اول

جمعیۃ کی تاسیس ، تنظیم ، لائحہ عمل و دستور ، پالیسی ، اثر کے علاقے ، طبقات جن میں ان کا خصوصی اثر تھا

۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب اور خونی واقعات نے مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو بالکل منتشر کر دیا تھا ۔ جنگ آزادی کے بعد ہندوستان کی سیاست ، تملق ، خوشامد اور اظہار وفاداری میں محدود و منحصر ہوگئی تھی ۔ علماء اور خصوصاً علماء حق جو طبعاً خوشامد اور بے جا چاپلوسی سے متنفر رہتے تھے اور جنھوں نے اسلام کے عہد عتیق سے لے کر عصر حاضر تک بڑے بڑے جابر و ظالم بادشاہوں کے سامنے اعلاء کلمۃ الحق کی ادائیگی میں پس و پیش نہیں کیا ، وہ بھی ناکام جنگ آزادی کے بعد ، سیاست سے کم و بیش علیحدہ ہو کر عزلت نشین ہوگئے تھے[1] - ۱۸۵۷ء میں علماء حق کے ساتھ فرنگیوں نے جو بہیمانہ سلوک کیا تھا اور جس بے دردی اور بے رحمی کے ساتھ علماء کو پھانسی اور جلاوطنی کی وحشیانہ اور بہیمانہ سزائیں دی گئی تھیں، ان کا قدرتی اور منطقی نتیجہ یہ تھا کہ علماء مجبور ہوکر عزلت نشینی کی زندگی بسر کرنے لگے ۔ عزیز الرحمٰن جامعی خلف مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے ۱۸۵۷ء میں پھانسی پانے والے اور جلا وطن کیے جانے والے افراد کے متعلق اعداد و شمار بیان کرتے ہوئے لکھا ہے : "کہ پانچ لاکھ مسلمانوں کو موت کی سزا دی گئی اور تین ہزار مسلمانوں کو جزیرہ انڈمان لے جا کر نظر بند کیا گیا"[2] ۔ اگرچہ اس بیان میں یہ تعین نہیں کیا گیا ہے کہ سزا پانے والے

۱- مولوی طفیل احمد منگلوری ، "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، دہلی ، ۱۹۴۵ء ، ص ۵۲۷؛
مولانا محمد میاں ، "جمعیۃ علماء کیا ہے" ، دہلی ، س - ن ، ص ۹ مع حاورق

۲- عزیز الرحمن جامعی (مرتبہ) ، "مسلمانوں کی ڈیڑھ سو سالہ قربانیوں کا جائزہ" ، دہلی ، س - ن ، ص ۹ ؛ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۵۲۷

افراد میں علماء کتنے تھے - لیکن قیاس یہی کہتا ہے کہ ان میں علماء کی بھی ایک معتدبہ تعداد ہوگی -

وقت گزرنے کے ساتھ پھر فضا بدلی اور آہستہ آہستہ سیاسی بیداری پیدا ہوئی - علماء کرام نے بھی مختلف شکلوں اور نوعیتوں میں ملکی حالات اور وقت کے تقاضوں کے تحت ، سیاست میں عملی دلچسپی لینا شروع کی - لیکن اس دور میں ان کی کوئی مرکزی تنظیم نہ تھی - اس لیے یا تو وہ دیگر سیاسی جماعتوں کے ساتھ منسلک ہو جاتے تھے یا پھر اپنی ہی مخصوص اور محدود تنظیموں مثلاً "ثمرة التربیت" اور "نظارة المعارف" وغیرہ میں کام کرتے رہے تھے - جس کے باعث ان کا دائرہ عمل محدود رہتا تھا - ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی سیاسی بیداری کی رفتار تیز کر دی - دونوں قوموں نے پیش آمدہ حالات کے تحت یہ محسوس کیا کہ ہم اپنا سیاسی مطالبہ آزادی متحد ہو کر ہی حاصل کر سکیں گے - چنانچہ ہندوستان کی سیاست نے اب کروٹ بدلی ، جس کے نتیجے میں اب خفیہ سازشوں اور باغیانہ تحریکوں کی بجائے آئینی سرگرمیوں کا دور دورہ شروع ہوا اور رائے عامہ کے اندر عام سیاسی شعور اور سیاسی بیداری پیدا ہونے لگی - اس کے علاوہ جنگ عظیم اول کے بعد انگریزوں کی بدعہدیوں اور ترکوں کی شکست نے مسلمانان ہند کو سخت بے چین اور مضطرب کر دیا تھا اور حکومت کے خلاف جگہ جگہ احتجاجی جلسے ، جلوس اور مظاہرے ہو رہے تھے - علماء کرام بھی ایک طرف اس سیاسی حرکت میں پوری دلچسپی اور انہماک کے ساتھ حصہ لے رہے تھے اور دوسری طرف انھیں اپنی ایک علیحدہ سیاسی تنظیم قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی[1] -

جنگ عظیم اول کے اختتام پر ، ترکوں کی خود مختاری اور سالمیت کا خاتمہ ہوگیا - مسلمانان ہند نے خلافت کو بچانے کے لیے بھرپور جد و جہد کی اور ۲۲/ ۲۳ نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں خلافت کانفرنس کا ایک جلسہ طلب کیا گیا - اس اجلاس میں خلافت کمیٹی کا قیام عمل میں آیا - مفتی کفایت اللہ نے اس اجلاس میں ایک قرار داد کے ذریعہ جشن صلح کا مقاطعہ کرنے کی تجویز پیش کی اور اس کی تائید ہر ایک خیال اور طبقے کے مسلمانوں نے کی - اور بعدہ ایک فتویٰ کے ذریعہ ، جشن صلح میں شرکت نہ کرنے

۱- حفیظ الرحمٰن واصف، "جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ"، دہلی، ۱۹۶۹ء ، ص ۲۲؛ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۵۲۷ -

والی قرار داد کی تائید دیگر مقتدر علماء سے بھی کرا دی گئی¹ (اس کی مزید تفصیلات تحریک عدم تعاون والے باب میں دیکھیے) - ۲۲ / ۲۳ نومبر ۱۹۱۹ء کو خلافت کانفرنس کے موقع پر تمام "اقطار" یعنی ہندوستان کے چاروں طرف سے علماء کی ایک بڑی تعداد دہلی میں جمع ہوئی - خلافت کانفرنس سے فارغ ہونے کے بعد علماء موجودین نے ایک جلسہ منعقد کیا - اس جلسہ میں صرف علماء کرام ہی شریک تھے - نیز اس جلسے میں مولانا ثناء اللہ امرتسری کی تحریک اور مولانا سلامت اللہ، مولانا منیر الزمان اور دیگر حاضرین جلسہ کی تائید سے بالاتفاق آراء ایک تنظیم قائم کی گئی، جس کا نام "جمعیۃ سیاسیہ علماء ہند" رکھا گیا - اس جلسے کی صدارت مولانا قیام الدین محمد عبدالباری فرنگی محلی نے کی² - اسی جلسے میں مولانا ابو الوفا محمد ثناء اللہ امرتسری کی تحریک اور مولانا سلامت اللہ و دیگر حاضرین کی تائید سے بالاتفاق رائے، مولانا مفتی محمد کفایت اللہ کو اس جماعت کا عارضی صدر اور مولانا احمد سعید دہلوی کو عارضی ناظم منتخب کیا گیا - مزید طے پایا کہ جمعیۃ کے مقاصد کے تعین اور دستور و ضوابط کے مسودے کی تیاری کا کام مفتی محمد کفایت اللہ اور مولانا محمد اکرم خان، ایڈیٹر اخبار "محمدی" کلکتہ کے سپرد کیا جائے اور وہ اس دستور کے مسودے کو آئندہ ہونے والے اجلاس بمقام امرتسر میں پیش کریں³ -

اس سلسلے میں یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ ۱۹۱۸ء میں یعنی (جمعیۃ علماء کی تاسیس سے ایک سال قبل) شیخ الہند کی رہائی کے سلسلے میں مفتی کفایت اللہ کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ علماء متفقہ طور پر ان کی رہائی کے لیے مطالبہ کریں اور اس طرح مفتی صاحب کے دل میں یہ جذبہ بھی پیدا ہوا کہ علماء کرام کی ایک علیحدہ سیاسی تنظیم ہونی چاہیے - مفتی صاحب کی اس خواہش کو بروئے کار لانے میں ۱۹۱۹ء کی خلافت کانفرنس، بڑی ممد و معاون ثابت ہوئی - کیونکہ اس وقت مفتی صاحب یہ بھی محسوس کر رہے تھے کہ مسلمانان برصغیر کی سیاسی باگ ڈور ایسے افراد کے ہاتھوں میں تھی جو اصول شرعیہ اور امور دینیہ سے کما حقہ، واقف نہ تھے - دوسری جانب اگرچہ علماء دیگر سیاسی و نیم سیاسی جماعتوں میں شریک تھے، لیکن ان جماعتوں میں علماء کی حیثیت عام

۱- "جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ"، ص ۵۸-۶۰؛
مولوی سید طفیل احمد منگلوری، "روح روشن مستقبل"، بدایوں، ۱۹۴۶ء، ص ۸۳؛
چودہری خلیق الزمان، "شاہ راہ پاکستان"، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۳۵۲
۲- "الجمعیۃ"، دہلی، یکم فروری ۱۹۳۱ء، ص ۲، ک ۱؛ "جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ"، ص ۴۴؛ "علی گڑھ گزٹ"، ۱۰ اپریل ۱۹۲۵ء، ص ۲، ک ۲
۳- "الجمعیۃ"، دہلی، یکم فروری ۱۹۳۱ء، ص ۲، ک ۱

ممبروں جیسی تھی ۔ علماء کی آواز میں وزن اور ان کے عمل میں امتیاز پیدا کرنے کے لیے مفتی صاحب نے علماء کی ایک سیاسی تنظیم کا قائم ہونا ضروری خیال کیا[1] ۔

علماء کے بارے میں حکومت ہند کی معاندانہ پالیسی کے پیش نظر اور حفظ ماتقدم کے طور پر علماء ابھی تک اپنی علیحدہ سیاسی تنظیم قائم کرنے کے سلسلے میں تمام کارروائی کو خفیہ رکھنا چاہتے تھے ۔ ان احتیاطی تدابیر کے پیش نظر اور امکانی خطرات سے بچنے کے لیے مفتی کفایت اللہ نے پہلے صرف مولانا عبدالباری اور مولانا ثناء اللہ امرتسری سے گفتگو کی اور ان کو اپنا ہم خیال بنایا ۔ پھر راز دارانہ گفت و شنید کے بعد، مفتی کفایت اللہ نے، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا عبدالباری اور مولانا آزاد سبحانی کو حکم دیا کہ خلافت کمیٹی میں آئے ہوئے تمام علماء سے مل کر ایک خفیہ مشاورتی جلسہ منعقد کرنے کی دعوت دیں ۔ چنانچہ مولانا احمد سعید اور مولانا آزاد سبحانی نے علماء کرام سے خفیہ اور راز دارانہ گفتگو کی ۔ اور علماء موجودین سے علیحدہ علیحدہ اور مشترکہ صورتوں میں یہ ابتدائی گفت و شنید ہوئی ۔ یہ تمام کارروائی پرائیویٹ اور زبانی تھی ۔ کوئی تحریری دعوت نامہ یا جلسہ کا ایجنڈا جاری نہیں کیا گیا تھا[2] ۔ ابتدائی گفت و شنید کے نتیجے میں مولانا عبدالباری نے چند علماء کو دہلی کی ایک مشہور درگاہ، سید حسن رسول نما میں جمع کیا اور وہاں پر سب حاضرین نے یہ عہد کیا کہ "ہم سب دہلی کے مشہور و مقدس بزرگ کے مزار کے سامنے اللہ رب العزت کو حاضر و ناظر جان کر یہ عہد کرتے ہیں کہ مشترکہ قومی و ملی مسائل میں ہم سب آپس میں متحد و متفق رہیں گے اور فروعی اختلافی مسائل کی وجہ سے اپنے درمیان کوئی اختلاف پیدا نہ ہونے دیں گے ۔ نیز قومی و ملکی جد و جہد کے سلسلے میں گورنمنٹ کی جانب سے ہم پر جو سختی اور تشدد ہوگا، اس کو صبر و رضا کے ساتھ برداشت کریں گے اور ثابت قدم رہیں گے ۔ نیز جماعت کے معاملات میں پوری راز داری اور امانت سے کام لیں گے[3] ۔" مولانا احمد سعید نے جو ان حالات و واقعات کے عینی شاہد تھے، بعداً بیان کیا کہ درگاہ رسول نما پر حاضرین کی پوری تعداد تو میرے ذہن میں محفوظ نہیں ہے،

۱۔ "جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ"، ص ۵۱-۵۲؛
حفیظ الرحمن واصف (مرتب)، "مفتی اعظم کی یاد نمبر"، دہلی، ۱۳۸۶ھ/۱۹۶۶ء، ص ۸۸

۲۔ "جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ"، ص ۵۱-۵۲

۳۔ "ادارۂ حفیظیہ"، "مختصر تاریخ مدرسہ امینیہ"، دہلی، س - ن، ص ۳۵-۳۶؛
"جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ"، ص ۵۱-۵۲؛
عبدالرشید ارشد (مرتب)، "بیس بڑے مسلمان"، لاہور، س - ن، ص‌ص ۲۹-۳۰

البتہ مولانا عبدالباری ، مولانا منیر الزمان اور مولانا آزاد سبحانی کی موجودگی میرے ذہن میں ہے ۔ مولانا احمد سعید نے جب اس خفیہ کارروائی کی مفصل روداد، مفتی صاحب کے گوش گذار کی تو مفتی صاحب نہ صرف مطمئن ہوئے بلکہ اس خبر سے انھیں مسرت بھی ہوئی ۔

ایک دوسرا امر لائق توجہ یہ ہے کہ جمعیۃ علماء کی تاسیس کی شان ورود کے بارے میں تین مختلف بیانات ملتے ہیں ۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا بیان مولانا احمد سعید دہلوی کا ہے ، جس میں حسب تفصیل بالا یہ بات بیان کی گئی ہے کہ مفتی کفایت اللہ نے ١٩١٨ء میں علماء کی ایک سیاسی انجمن قائم کرنے کی خواہش کی تھی ، مگر اس وقت ملک کے حالات اس جمعیۃ کے قیام کے لیے سازگار نہ تھے ۔ نومبر ١٩١٩ء میں خلافت کانفرنس کے اختتام پر مفتی صاحب موصوف نے اپنی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے علماء موجودین سے مشورہ کیا ۔ مگر حکومت کے خوف اور تشدد کی بنا پر اس کی تشکیل کے لیے راز دارانہ طریقہ اختیار کیا گیا تاکہ اس کے قیام سے قبل یا اس کے قیام میں حکومت کوئی آئینی قیود عائد نہ کر سکے ۔ مخصوص علماء کرام ، مثلاً مولانا عبدالباری ، مولانا احمد سعید اور مولانا آزاد سبحانی وغیرہ سے مشورہ کرنے کے لیے علماء کو خفیہ دعوت دی گئی اور ایک بزرگ کی درگاہ پر علماء نے آپس میں عہد و پیمان کی تکمیل کی[1] ۔

اس سلسلے میں دوسرا بیان مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی کا ہے ۔ آپ نے بیان کیا ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کا قیام مولانا عبدالباری کی کوششوں سے عمل میں آیا اور مولانا باری ہی جمعیۃ علماء ہند کے موسس تھے[2] ۔ مولانا عنایت اللہ نے مزید بیان کیا کہ خلافت کمیٹی کے جلسے کے وقت امرتسر میں تمام ہندوستان کے علماء جمع ہوئے تھے ۔ مولانا باری نے ان علماء موجودین سے مشورہ کیا اور مشورہ کے بعد پہلے پہلے علماء ہند کی ایک سیاسی انجمن بنام ''انجمن جمیعۃ علماء ہند'' قائم کی گئی[3] ۔

ایک تیسرا بیان مولانا ثناء اللہ امرتسری کا ہے ۔ موصوف کے بیان کے مطابق ''دہلی میں ایک تبلیغی جلسہ ہوا ۔ جس میں ، میں بھی شریک تھا ۔ بعد فراغت خاص احباب کی مجلس میں ، میں نے تحریک کی کہ ہمیشہ کے لیے علماء کی ایک جماعت منظم ہونی چاہیے ۔ اس جلسے میں مولانا ابراہیم سیالکوٹی کے علاوہ اور کئی اصحاب میرے ہم رائے

١- ''جمیعۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ'' ، ص‌ص ٥٠-٥٢

٢ - ''جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ''، ص‌ص ٥٢-٥٣ (بحوالہ ''تذکرہ علماء فرنگی محل''، ص ١١١)

٣ - ''جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ'' ، ص ٥٣ (بحوالہ ''حسرۃ الآفاق'' ، ص ٢٦)

شریک تھے ۔ انھوں نے میری تائید کی ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جمعیۃ علماء کا ایک خام سا ڈھانچا تیار ہوگیا ۔ جس کے صدر مولانا مفتی کفایت اللہ اور ناظم مولانا احمد سعید مقرر ہوئے"[۱] ۔

حفیظ الرحمٰن واصف خلف مفتی کفایت اللہ نے ، مولانا احمد سعید ، مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی ، نیز مولانا ابو الوفا ثناء اللہ امرتسری کے بیانات کا حوالہ درج کیا ہے ۔ ان سب میں مولانا احمد سعید کا بیان زیادہ اہم اور قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ بیان ہم تک براہ راست نہیں بلکہ واصف صاحب کے واسطے سے پہنچا ہے ۔ مولانا احمد سعید ، جمعیۃ کی تاسیس اور تشکیل میں نہ صرف پیش پیش تھے بلکہ موصوف، مفتی کفایت اللہ کے معتمد خاص بھی تھے ، اور ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۳۹ء تک مفتی صاحب جمعیۃ کے صدر اور مولانا احمد سعید ناظم رہے ۔ مولانا عبدالرشید ارشد ، (مرتب "بیس بڑے مسلمان") نے بھی اس کی تائید کی ہے کہ مفتی کفایت اللہ کے حکم سے علماء میں خفیہ اور راز دارانہ صلاح مشورہ ہوا ۔ اس صلاح مشورے کی تفصیلات واصف صاحب نے مفتی کفایت اللہ (اپنے والد) کی وفات کے بعد ، مولانا احمد سعید سے معلوم کیں ۔ جن سے معلوم ہوا کہ ان بزرگوں نے درگاہ رسول نما پر عہد و پیمان بھی کیا تھا[۲]۔ "علی گڑھ گزٹ" کے بیان کے مطابق ۲۴ نومبر ۱۹۱۹ء کو علماء کی ایک سیاسی جماعت قائم ہوئی ۔ جب کہ خلافت کانفرنس (کمیٹی) ۲۲، ۲۳ نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں منعقد ہوئی تھی ۔ اس بات سے اس امر کی نشاندھی ہوتی ہے کہ علماء کرام نے اس موقع پر جمعیۃ کے قیام کے سلسلے میں آپس میں صلاح مشورہ ضرور کیا ہوگا ، اور اس کے بعد ۲۴ نومبر ۱۹۱۹ء کو جمعیۃ کی تاسیس اور اس کا قیام عمل میں آیا[۳] ۔ یہ ایک علیحدہ بحث ہے کہ اس کے قیام کے سلسلے میں کوئی خفیہ اور راز دارانہ مشورہ ہوا تھا یا نہیں ۔ البتہ مولانا احمد سعید کے صدری بیان سے (جس کی سند واصف صاحب کی تحریر کے علاوہ کوئی نہیں) یہ بات واضح ہوتی ہے کہ علماء نے مفتی کفایت اللہ کے حکم اور ایماء پر راز دارانہ گفتگو کی اور اس گفتگو میں کسی نتیجہ پر پہنچنے کے بعد جمیعۃ علماء ہند دہلی کا قیام عمل میں آیا ۔ اگرچہ ایک بات مشتبہ معلوم ہوتی ہے کہ مولانا احمد سعید نے ۱۹۱۹ء

۱۔ "جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ"، ص ۵۳ (بحوالہ اخبار "اہل حدیث" امرتسر، ۱۳ فروری ۱۹۴۲ء ، یہ حوالہ واصف صاحب کا بیان کردہ ہے)

۲ ۔ "جمیعۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ" ، ص : ۵۰-۵۳ "بیس بڑے مسلمان" ، ص ۳۲۹-۳۳۰ "مفتی اعظم کی یاد نمبر" ، ص ۴۲ ، ۱۱۹ ، ۱۲۸ اور ۱۹۳

۳ ۔ "علی گڑھ گزٹ" ، ۱۰ اپریل ۱۹۲۵ء ، ج ۴ ، نمبر ۳۲۲ ، ص ۲ ، ک ۲

کے اس راز کا انکشاف ۱۹۴۷ء کے بھی بہت بعد کیا اور نہ ہی کسی دیگر مورخ نے واصف صاحب کے اس انکشاف سے پہلے یہ بات قلم بند کی ۔ اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ اس رازکو برطانیہ کے خوف سے، اس وقت ظاہر نہیں کیا گیا تھا تو آزادی ہند کے بعد تو اسے پوشیدہ رکھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی ۔ مگر ایسا بھی نہیں ہوا ۔ واصف صاحب نے خود اس راز کا اظہار اس وقت کیا جب کہ ۱۹۶۶ء میں مولانا سید اسعد مدنی نے اخبار "الجمعیة" میں ، جمعیة علماء ہند کے قیام اور اس کی تشکیل کے بارے میں کچھ اغلاط یا تسامح سے کام لیا ۔ یعنی اس کے موسسین میں شیخ الهند اور مولانا حسین احمد مدنی نیز دیگر اصحاب کو بھی شامل کیا ۔ واصف صاحب کی نظر میں (اور واقعتاً بھی) مولانا اسعد مدنی کے بیانات حقائق کے خلاف تھے ۔ جن میں جمعیة کی تاسیس ، قیام اور موسسین کے بارے میں ، واقعات و حقائق کو مسخ کر کے بیان کیا گیا ہے ۔ لہٰذا واصف صاحب نے ، مولانا اسعد مدنی سے اس سلسلے میں ، ۲۱ فروری ۱۹۲۹ء کو ذاتی طور پر خط و کتابت بھی کی ۔ مگر مولانا مدنی نے ، ان کے عریضہ کا کوئی جواب (بقول واصف صاحب) نہ دیا تب واصف صاحب نے یہ ضروری سمجھا کہ جمعیة کی تاریخ تاسیس اور قیام نیز موسسین کے بارے میں اصل واقعات اور حقائق قلم بند کر دیے جائیں۔ اس سلسلے میں واصف صاحب نے مولانا احمد سعید کے صدری بیان کا ذکر بھی کیا جو مولانا احمد سعید نے واصف کو دیا تھا[1] ۔ واصف صاحب نے یہ بات ظاہر نہیں کی کہ مولانا احمد سعید نے یہ بیان کب دیا تھا ؟ البتہ تفصیل پڑھنے سے یہ انکشاف ضرور ہوتا ہے کہ واصف صاحب نے ، مفتی صاحب کی وفات کے بعد یہ "راز" مولانا احمد سعید سے معلوم کیا تھا ۔

اس سلسلے کا دوسرا بیان مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی کا ہے ۔ موصوف نے کہا ہے کہ امرتسر کے جلسہ میں مولانا عبدالباری نے علماء سے مشورہ کرنے کے بعد "جمعیة علماء" قائم کی ۔ یہ بیان غیر تاریخی اور خلاف واقعہ ہے کیونکہ جمعیة کا قیام ۲۴ نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں عمل میں آ چکا تھا اور امرتسر کا اجلاس دسمبر ۱۹۱۹ء میں منعقد ہوا ۔ یہی نہیں بلکہ نومبر ہی میں اس کے عارضی صدر اور ناظم کا انتخاب بھی عمل میں آ چکا تھا ۔ نیز جمعیة کے "قواعد و ضوابط" مرتب کرنے کے لیے ایک سب کمیٹی مفتی کفایت اللہ اور مولانا محمد اکرم خان پر مشتمل قائم بھی کر دی گئی تھی ۔ جس نے اپنا مرتب کردہ مسودہ ، امرتسر کے اجلاس میں پیش کیا ۔ البتہ مولانا عنایت اللہ

---

۱ ۔ "جمعیة علماء پر ایک تاریخی تبصرہ" ، ص ۵-۵۲ اور ۱۲۴-۱۲۷ ؛
"جمعیة علماء کیا ہے" ، ص ۲۸

کی یہ بات ضرور صحیح معلوم ہوتی ہے کہ مولانا عبدالباری نے "خدام کعبہ" اور "جمعیۃ علماء ہند" کی تاسیس میں پہل کی تھی ۔

تیسرا بیان مولانا ثناء اللہ امرتسری کا ہے ۔ موصوف کے بیان میں تنقیح طلب امر یہ ہے کہ آیا تبلیغی جماعت کا جلسہ ہوا تھا ؟ اگر جواب نفی میں ہے (اور یقیناً ہے) چونکہ وہ جلسہ خلافت کانفرنس کا تھا تو اس کی بنیاد ہی غلط قائم ہو جاتی ہے ۔ اس سلسلے میں مہینوں اور سنوں سے تو یہ بات ثابت ہے کہ جو جلسہ منعقد ہوا تھا ، وہ خلافت کانفرنس کا تھا ۔ تبلیغی جماعت کا نہ تھا اس لیے یہ بیان بھی غیر تاریخی اور خلاف واقعہ ہے ۔

مندرجہ بالا بیانات اور حقائق و شواھد سے ایک بات صاف اور واضح ہوگئی کہ جمعیۃ علماء کے قیام اور اس کی تشکیل میں مفتی کفایت اللہ اور مولانا عبدلباری کا حصہ دیگر علماء کی بہ نسبت زیادہ اور اہم ہے ، اور ان حضرات کی مساعی جمیلہ کے نتیجے میں اس جماعت کا قیام عمل میں آیا[1] ۔

جمعیۃ علماء کی ضرورت :

برصغیر میں کم و بیش اٹھارویں صدی کے اختتام سے غیر ملکی حکمران مسلط تھے ۔ انیسویں صدی کے اختتام سے قبل ملک میں سیاسی بیداری پیدا ہونا شروع ہوگئی تھی ۔ جس کے نتیجے میں ہندو اور مسلمان سب ہی ، حقوق خود اختیاری کے طالب تھے ۔ مسلمان ایک طرف اغیار کی غلامی سے نجات پانے کے خواہش مند تھے تو دوسری طرف اس بات کے بھی طالب تھے کہ غلامی سے نجات حاصل کرنے کے بعد جو نیا نظام آئے تو وہ ان کے مذہبی تقاضوں سے ہم آہنگ ہو ۔ ملت کے مذہبی رہنما (علماء) اس بات کو بخوبی جانتے تھے کہ اسلامی نظام حیات کو اپنائے بغیر "مسلمان نہ تو خدا کی خوشنودی حاصل کرسکتے ہیں اور نہ ہی خدا کی نعمتوں سے خواہ وہ مادی ہوں یا معنوی، مستفید ہو سکتے ہیں ۔ وہ جس قدر بھی اس سے دور ہوں گے اسی قدر ان کو فلاکت و ذلت کا سامنا ہوگا۔ اور دنیا و آخرت میں اجر و ثواب سے محروم ہوں گے"[2] ۔

---

۱ ۔ "جمعیۃ علماء کیا ہے" ، ص ۲۸؛ "جمعیۃ علما" پر ایک تاریخی تبصرہ" ، ص ۵-۱۰

۲ ۔ "خطبۂ صدارت مولانا حسین احمد مدنی" ، مارچ ۱۹۴۲ء ، ص ۲۰-۲۱

(نوٹ : مولانا حسین احمد مدنی نے مسلمانان ہند کو خصوصاً اور مسلمانان عالم کو عموماً اس طرف متوجہ کیا کہ اسلامی نظام حیات کو اپنائے بغیر دین و دنیا کی فلاح ممکن نہیں ہے ۔ مزید یہ کہ اگرچہ یہ بیان ۱۹۴۲ء کا ہے لیکن اس کی صداقت دائمی ہے ۔)

علماء ان رجحانات سے یکسر ہم آہنگ تھے ، اس لیے کہ ایک طرف تو وہ آزادی کے دلدادہ تھے ۔ تو دوسری طرف اسلامی نظام کے شیفتہ تھے ۔ ان متذکرہ بالا مقاصد کو پیش نظر رکھ کر جمعیۃ علماء ہند کی تشکیل عمل میں آئی[1] ۔

جمعیۃ علماء ہند کی تشکیل اور علماء کی سعی :

برصغیر میں فرنگیوں کی حکومت کے قیام کے ساتھ ساتھ ، مسلمانوں کا نظام شرعی بھی درہم برہم ہوگیا ۔ اس نظام کے ختم ہونے کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ علماء نے اپنے اپنے مسلک اور عقائد کی بنیاد پر ، وہابیت ، دیوبندیت ، اور بریلویت کی جنگ شروع کر دی ۔ یہ فروعی اختلافات زیادہ تر انگریزوں کے دور کا تحفہ تھے اور قادیانیت تو انگریزوں کے سہارے اور ان کے بل بوتے پر ہی منظم ہوئی ۔ مسلمانان ہند ، ان فروعی مسائل میں الجھ کر لایعنی خانہ جنگی میں مبتلا ہوگئے ۔ جس کی بناء پر ان کی اجتماعی قوت کمزور ہوتی گئی[2] ۔ یہ سہرا جمعیۃ علماء کے سر ہے کہ اس نے ملت اسلامیہ کے مشترکہ ملی مفاد کی بنیاد پر مختلف مسالک کے علماء کو (علاوہ شیعہ صاحبان اور قادیالیوں کے) پہلی مرتبہ اتحاد و اتفاق کی دعوت دی ، اور وہ اپنی اس دعوت میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئی[3] ۔ جمعیۃ کے قیام سے مسلمانان ہند کو منجملہ دیگر امور کے ایک سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علماء کرام کے سو ، ڈیڑھ سو سال قبل کے پرانے اختلافات ، جن کی بناء پر وہ ایک دوسرے سے نبرد آزما رہتے تھے ، ایک دوسرے کی تحقیر و تکفیر کرتے تھے یہاں تک کہ خون خرابہ کی نوبت تک پہنچ جاتی تھی ، وہ دب گئے ۔ ان تمام مختلف الخیال علماء کا ایک پلیٹ فارم پر متحد و متفق ہو کر جمع ہونا اور پھر ایک جماعت میں منسلک ہوکر متحدہ اور متفقہ طور پر سیاسی جد و جہد میں شریک ہونا ، اہل ہند کے لیے عموماً اور مسلمانوں کے لیے خصوصاً بہت مفید ثابت ہوا[4] ۔

---

۱ - "خطبہ صدارت مولانا حسین احمد مدنی" ، مارچ ۱۹۴۲ء ، ص ۲۰-۲۱

۲ - "جمعیۃ علماء کیا ہے ؟" ، ص ۲۳

3. Ziaul Hasan Farooqi, *Deoband School and the Demand for Pakistan.* Bombay, 1963, p. 67 : جمعیۃ علماء کیا ہے ؟ ، ص ۲۳

۴ - "جمعیۃ علماء کیا ہے" ، ص ۲۳ (ذ) "جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ" ، ص ۵۳

(نوٹ : علماء کرام ایک دوسرے کے خلاف مناظروں اور مباحثوں کے اکھاڑے جاتے تھے ، جس کے نتیجے میں جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر قتل و خون تک کی نوبت پہنچتی تھی ۔ "جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ" ، ص ۵۳ (ذ)

Deoband School and the Demand for Pakistan, p. 67.

جمعیۃ کے موسسین اولٰی :

یکم فروری ۱۹۳۱ء کو "الجمعیۃ" نے موسسین اولٰی کے متعلق ایک فہرست شائع کرتے ہوئے مندرجہ ذیل پچیس حضرات کو جمعیۃ علماء ہند کا بانی بیان کیا ہے :

"مولانا عبدالباری فرنگی محلی ، مولانا مفتی کفایت اللہ ، مولانا تاج محمود سندھی ، مولانا سلامت اللہ ، مولانا احمد سعید ، پیر امام صاحب سندھی ، مولانا اسد اللہ سندھی ، مولانا ابو الوفا ثناء اللہ امرتسری ، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی ، مولانا سید محمد فاخر الہ آبادی ، مولانا عبدالحکیم "تلمیذ رشید" (مولانا سید محمد سجاد بہاری) ، مولانا محمد ابراہیم دربھنگوی ، مولانا محمد اکرم خان بنگالی ، مولانا منیرالزمان خان بنگالی ، مولانا خدا بخش مظفر پوری ، مولانا محمد صادق کراچوی ، مولانا سید محمد داؤد غزنوی ، مولانا سید محمد اسمٰعیل ، مولانا عبداللہ ، مولانا آزاد سبحانی ، مولانا بخش (مولٰی بخش) امرتسری ، مولانا خواجہ نظام الدین ، مولانا محمد الیس ، مولانا قدیر بخش ، مولانا سید کمال الدین"[1] ۔

ان حضرات کے حالات زندگی اس باب کے تعلیقہ نمبر ۱ میں پیش کیے جائیں گے ۔

جمعیۃ علماء کا دستور اساسی اور پہلی مجلس منتظمہ کے ارکان :

جمعیۃ علماء ہند ، برصغیر میں علماء ہند کی پہلی سیاسی تنظیم تھی ، جو ہندوستان کی جدید تاریخ میں ایک نظم و ضبط کے ساتھ ، عصر جدید کے تقاضوں اور نئے رحجانات کے مطابق قائم ہوئی تھی ۔ اس جمعیۃ کے قیام کے وقت ، پہلی نشست یعنی ۲۳ نومبر ۱۹۱۹ء کو حاضرین جلسہ نے متفقہ طور پر مفتی کفایت اللہ اور مولانا محمد اکرم خان کلکتوی کو اس جماعت کا دستور اساسی و قواعد و ضوابط کا مسودہ مرتب کرنے کے لیے مامور کیا تھا ۔ ان حضرات نے حسب ہدایت ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کے اجلاس منعقدہ امرتسر میں ، جمعیۃ کے دستور کا مسودہ پیش کیا ۔ اس کے بعد طے پایا کہ یہ مسودہ طبع کرایا جائے اور طبع شدہ مسودہ کو علماء میں تقسیم کیا جائے (افسوس ہے کہ نہ اس طبع شدہ مسودہ کا کوئی نسخہ مل سکا اور نہ ہی اس کے مندرجات کے بارے میں کوئی شافی حوالہ مل سکا) ۔ تاکہ اس مسودے کے بارے میں علماء کی آراء معلوم کی جائیں اور علماء کی آراء اور مشوروں کے حصول کے بعد اس مسودے کو جمعیۃ کے آئندہ ہونے والے اجلاس میں برائے منظوری پیش کیا جائے[2] ۔

---

۱ ۔ "الجمعیۃ" ، یکم فروری ۱۹۳۱ء ، ص ۲ ، ک ۱

۲ ۔ "علی گڑھ گزٹ" ، ۱۴ مارچ ۱۹۲۱ء ، ص ۴ ، ک ۲-۳؛
"جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ" ، ص ۵۶

جمعیۃ کے اصول اساسی اور اغراض و مقاصد :

جمعیۃ کے اصول اساسی اور اغراض و مقاصد بیان کرنے میں بعض لکھنے والوں نے حسب ذیل دفعات پر اکتفا کیا ہے :

(الف) "اس جمعیۃ کا نام جمعیۃ علماء ہند ہوگا ۔

(ب) اس انجمن کا صدر دفتر دہلی میں رہے گا"[1] ۔

جمعیۃ کے اغراض و مقاصد لکھنے والوں نے زیادہ تر مولانا محمد میاں کی کتاب "جمعیۃ علماء کیا ہے" پر اکتفا کیا ہے ۔ راقم الحروف کو اس سلسلے میں واصف صاحب کی کتاب سے مزید مواد بھی حاصل ہوا ہے ۔ جس کی روشنی میں جمعیۃ کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہیں :

(الف) "ہر قسم کے خارجی اثرات کی (جن سے مذہب اسلام یا مشترکہ اسلامی قومیت کی توہین یا تضعیف ہوتی ہو) شرعی احکامات کے مطابق مدافعت کرنا" ۔

(ب) "مشترکہ مذہبی حقوق کی نگہداشت اور مشترکہ مذہبی و ملکی ضروریات کی تحصیل میں کوشش کرنا" ۔

(ج) "عامۂ اسلام کی مذہبی نقطہ نظر سے سیاسی رہنمائی کرنا" ۔

(د) "مشترکہ مذہبی و قومی اغراض میں مسلمانوں کے متفق رہنے کی کوشش کرنا" ۔

(ہ) "دیگر غیر مسلم برادران وطن کے ساتھ بتقضائے فطرت و اتباع احکام شریعت ہمدردی و اتفاق کو ترقی دینا" ۔

---

۱ ۔ "ایضاً" ، ص ۵٦

(نوٹ : حفیظ الرحمان واصف نے دفعہ ۳ کے تحت ایک اصول اساسی یہ بھی بیان کیا ہے کہ "جمعیۃ کی ایک مہر ہوگی جس پر "الجمعیۃ المرکزیۃ العلماء" کندہ ہوگا" ۔
"جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ" ، ص ۵٦)

(و) "شرعی ضرورتوں کے لحاظ سے فصل خصومات کے لیے محکمہ دارالقضاء قائم کرنا"[1] ۔

مولانا محمد میاں نے ، اجلاس مرکزیہ جمعیۃ علماء ہند، ۷ تا ۹ ربیع الثانی ۱۳۵۸ھ مطابق ۲۷ تا ۲۹ مئی ۱۹۳۹ء بمقام مراد آباد ، دفعہ ۳ (الف) کے مطابق جمعیۃ کے منظور شدہ اغراض و مقاصد ، حسب ذیل بیان کیے ہیں :

اسلامی نقطہ نگاہ سے ملت اسلامیہ کی حسب ذیل امور میں رہنمائی کرنا :

(الف) "اسلام ، مرکز اسلام (جزیرۃ العرب و مستقر خلافت)، شعائر اسلام، اسلامی قومیت کو ضرر پہنچانے والے اثرات کی شرعی حیثیت سے مدافعت کرنا ۔

(ب) مشترکہ مذہبی حقوق کی تحصیل و حفاظت اور مشترکہ مذہبی و وطنی ضروریات کو حاصل کرنا ۔

(ج) علماء کو ایک مرکز پر جمع کرنا ۔

(د) مسلمانوں کی تنظیم اور اخلاق و معاشرتی اصلاح (ملت اسلامیہ کی شرعی تنظیم اور محاکمہ شرعیہ کا قیام) ۔

(ھ) غیر مسلم برادران وطن کے ساتھ ہمدردی اور اتفاق کے تعلقات اس حد تک قائم کرنا ، جہاں تک شریعت اسلامیہ نے اجازت دی ہو ۔

(و) شرعی نصب العین کے موافق مذہب و وطن کی آزادی ۔

(ذ) شرعی ضرورتوں کے لحاظ سے محاکمہ شرعیہ کا قیام ۔

(ح) اندرون ہندوستان اور بیرون ممالک میں تبلیغ اسلام کرنا ۔

(ط) بیرون ممالک کے مسلمانوں سے اسلامی اخوت و اتحاد کے روابط قائم کرنا اور مستحکم کرنا"[2] ۔

---

۱ ۔ "جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ" ، ص ۵۶-۵۷
(نوٹ: واصف صاحب نے جمعیۃ کے اغراض و مقاصد ، جمعیۃ علماء ہند کے اصول اساسی و آئین و ضوابط ، مطبوعہ شنی المطابع ، دہلی ، ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۱ء سے نقل کیے ہیں) ۔
K. K. Aziz, *The Making of Pakistan*, London, 1967. p. 179.

۲ ۔ "جمعیۃ علماء کیا ہے ؟" ، ص ۱۰-۱۱ مع حاورق ؛
مولانا محمد میاں ، "جمعیۃ علماء کی شرعی حیثیت" ، دہلی ، س ۔ ن ، ص ۴ ؛
"مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۵۲۷-۵۲۸ ؛
Deoband School and the Demand for Pakistan, pp. 69-70.

ضیاء الحسن فاروقی نے جمعیۃ کے جو اغراض و مقاصد بیان کیے ہیں ، وہ تمام کے تمام مولانا محمد میاں کی کتاب "جمعیۃ کیا ہے" کے صفحات ۱۰ - ۱۱ معہ حاورق اور "جمعیۃ علماء کی شرعی حیثیت" کے صفحات ۱۰ - ۱۱ سے نقل کیے گئے ہیں - فاروقی صاحب نے ، جمعیۃ کا سارا پروگرام ایک مرکزی نقطہ نظر کے تحت مرکوز ہونا بیان کیا ہے - وہ یہ کہ علماء شریعت اسلامی کے محافظ اور نگہبان ہیں اور انبیاء علیہ السلام کے وارث ہونے کی بناء پر مسلمانوں کی قیادت ان کا حصہ ہے - لہٰذا علماء کرام بجا طور پر امت مسلمہ کی امامت اور شرعی امور میں ان کی (مسلمانوں کی) رہبری کرنے کا حق رکھتے ہیں اور اس حق کو استعمال کرنے کے وہ جائز حقدار اور مستحق بھی ہیں[1] -

مولانا انور شاہ کشمیری نے جمعیۃ علما ہند کے اجلاس ہشتم منعقدہ پشاور ۱۹۲۷ء کی صدارت کرتے ہوئے ، جمعیۃ کے مقاصد کی سب سے جامع توضیح کی - مولانا نے فرمایا ہے کہ :

"ہندوستان کے علماء کرام نے چند سال سے اپنے دائرہ میں ایک نظام قائم کیا ہے جس کا نام "جمعیۃ علماء ہند" رکھا ہے - تاکہ موجودہ دور کے ہنگامی حالات میں جو مسائل و واقعات و حالات پیش آئیں ، خواہ وہ سیاست سے تعلق رکھتے ہوں خواہ مذہب و اخلاق سے اور خواہ معاشرت و تمدن سے یا اقتصادیات سے ، ان کے متعلق باہمی بحث و تمحیص ، تدقیق و تحقیق کے بعد جمہور اسلام کے لیے ، وہ راہ عمل نکالیں اور ان کو صحیح راستہ پر چلائیں - شریعت غرا کی یہی تعلیم اور سلف صالحین کی سیرت صالحہ یہی تھی"[2] -

جمعیۃ کے اغراض و مقاصد کی توضیح اور تشریح کے سلسلے میں مندرجہ بالا بیانات مولانا انور شاہ کشمیری ، مولانا محمد میاں ، ضیاء الحسن فاروقی اور حفیظ الرحمان صاحب واصف کے ہیں ، ان بیانات میں مولانا محمد میاں صاحب اور واصف صاحب کے بیانات میں کچھ اشتراک اور کچھ اختلاف ہے - مثلاً یہ کہ مولانا محمد میاں نے ، جزیرۃ العرب اور مستقر خلافت کی حفاظت ، نیز علماء کو ایک مرکز پر جمع کرنا ، شرعی نصب العین کے مطابق مذہب و وطن کی آزادی - اندرون ہندوستان و بیرون ممالک میں تبلیغ اسلام کرنا اور بیرون ممالک میں مسلمانوں کے ساتھ اسلامی اخوت اور اتحاد کے روابط

---

۱ - "جمعیۃ علماء کی شرعی حیثیت"، ص ص ۱۰-۱۱ ؛ "جمعیۃ علماء کیا ہے"، ص ۴ ؛ *Deoband School and the Demand for Pakistan*, pp. 69-70.

۲ - "جمعیۃ علماء کی شرعی حیثیت"، ص ۲

قائم و مستحکم کرنا وغیرہ بھی جمعیۃ کے مقاصد میں بیان کیے ہیں - لیکن واصف صاحب ان نکات کو صرف نظر کرتے ہیں - مولانا انور شاہ صاحب کشمیری کے خطبۂ صدارت میں بھی ان امور کی کوئی نشاندھی نہیں کی گئی ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جمعیۃ نے ان اغراض و مقاصد کو اپنے منشور میں بعد کو شامل کیا ہوگا - کیوں کہ واصف صاحب کے بیان کردہ اغراض و مقاصد ۱۹۲۱ء کے آئین کے مطابق ہیں اور مولانا کشمیری کا بیان ۱۹۲۷ء کا ہے - جب کہ مولانا محمد میاں نے ۱۹۲۹ء کے منظور شدہ اغراض و مقاصد بیان کیے ہیں - مندرجہ بالا ہر سہ بیانات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جمعیۃ العلماء ہند کی تشکیل کی غرض و غایت یہ تھی کہ مسلمانانِ ہند کی ، سیاسی ، مذہبی ، اقتصادی ، معاشی ، تمدنی ، اخلاقی اور آئینی رہبری شریعت اور اسلامی روایات کی روشنی میں کی جائے - جمعیۃ کے لٹریچر سے علماء کا یہ ادعاء بھی مترشح ہوتا ہے کہ نظام شرع کی حفاظت اور نگہبانی کا حق بہ حیثیت وارث انبیاء علیہ السلام صرف علماء کو ہی حاصل ہے -

جمعیۃ علماء کا مرکزی دفتر :

۱۹۱۹ء میں جمعیۃ کے قیام کے بعد جمعیۃ کے دستور اساسی کے تحت اس کا مرکزی دفتر دہلی میں قائم ہونا تھا - اس فیصلے کے تحت جمعیۃ علماء ہند کا سب سے پہلا دفتر ''مدرسہ امینیہ'' دہلی میں مفتی کفایت اللہ کے کمرے میں ہی قائم ہوا - اس وقت جمعیۃ کے پاس کوئی محرر اور چپڑاسی نہ تھا ، بلکہ مفتی صاحب ، صدر اور مولانا احمد سعید ، ناظم اپنے ہاتھوں سے ہی دفتر کا تمام کام خود ہی انجام دیتے تھے[۱] - مینیجنگ پروپرائیٹر روزنامہ ''جدت'' مراد آباد کے بیان کے مطابق جمعیۃ علماء ہند کا قیام جب عمل میں آیا تو اس وقت اس کا دفتر بلی ماراں دہلی میں ایک چھوٹے سے مکان کی بالائی منزل پر تھا - یہ مکان موجودہ دفتر ''الجمعیۃ'' بلی ماراں دہلی کے بالکل مقابل میں واقع ہے - ''الجمعیۃ'' کے ''مفتی اعظم کی یاد نمبر'' میں پاورق میں واصف صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ جمعیۃ کے قیام کے بعد ، کافی عرصے تک اس کا دفتر مدرسہ امینیہ میں مفتی اعظم کے کمرے میں ہی رہا -[۲] واصف صاحب کے بیان سے اس امر کی نشاندھی ہوتی ہے کہ شروع شروع میں جمعیۃ کا دفتر مفتی صاحب کے کمرے ''مدرسہ امینیہ'' میں

---

۱ - حفیظ الرحمان واصف (مرتب)، ''مفتی اعظم کی یاد نمبر'' ، دہلی ، ۱۳۸۶ھ/۱۹۶۶ء ، ص ۸۹

۲ - ''مفتی اعظم کی یاد نمبر''، ص ۱۶۰ (از مولانا عمر دراز بیگ ، مینیجنگ پروپرائیٹر ڈیلی ''جدت'' مراد آباد)

رہا ہوگا اور مولانا عمر دراز بیگ کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدا سے ہی جمعیۃ" کا دفتر محلہ بلی ماران میں تھا۔ مگر قیاس یہ کہتا ہے کہ شروع شروع میں جمعیۃ" کا دفتر مفتی صاحب کے کمرے میں رہا ہوگا۔ مگر جیسے جیسے جمعیۃ" کا کام بڑھتا گیا ہوگا، ویسے ہی اسے ایک علیحدہ دفتر کی ضرورت پیش آئی ہوگی۔ چنانچہ اسے مذکورہ مکان بلی ماران میں منتقل کر دیا ہوگا۔

جمعیۃ" کی سب سے پہلی مجلس منتظمہ :

حسب بیان واصف صاحب ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو جمعیۃ" علماء ہند کے اجلاس منعقدہ امرتسر میں اس کی سب سے پہلی مجلس منتظمہ بنی۔ جس کے مندرجہ ذیل ۲۳ ارکان تھے[1] :

"**صوبہ دہلی :** مولانا مفتی کفایت اللہ ، مولانا احمد سعید ، حکیم اجمل خان۔

صوبہ یو پی : مولانا عبد الماجد بدایونی ، مولانا سید محمد فاخر الہ آبادی ، مولانا سلامت اللہ ، مولانا حسرت موہانی اور مولوی مظہر الدین۔

صوبہ بنگال : مولانا محمد اکرم خان اور مولانا منیر الزمان۔

صوبہ بہار : مولانا سید محمد سجاد نائب امیر شریعت بہار ، مولانا رکن الدین اور مولوی خدا بخش۔

صوبہ سندھ : مولوی پیر تراب علی ، مولوی عبد اللہ ، مولوی محمد صادق کراچی۔

صوبہ پنجاب : مولوی ثناء اللہ امرتسری ، مولوی سید محمد داؤد غزنوی ، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی۔

صوبہ بمبئی : مولوی عبد اللہ ، مولوی عبد المنعم بلکظہ ، مولوی سیف الدین ، حکیم ابو یوسف اصفہانی (شاگرد رشید مولانا عبد الباری فرنگی محلی)؟[2]

۱۔ "جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ"، ص ۵۷-۵۸؛ "مسلمانوں کا روشن مستقبل"، ص ۵۲۷ (نوٹ : مجلس منتظمہ کا کام کسی انجمن یا جماعت کے جملہ امور کی نگرانی اور اس کے اصول و ضوابط کا نفاذ ہوتا ہے۔ امرتسر کے جلسے میں جمعیۃ کے اغراض و مقاصد منظور نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے گمان اغلب یہ ہے کہ یہ ارکان بہ حیثیت مشیر یا بہ حیثیت کنوینر ہوں گے۔ چونکہ اس کی پہلی مجلس عاملہ ۹، ۱۰ فروری ۱۹۲۲ء کو دہلی میں بنائی گئی۔)

۲۔ "جمعیۃ" علماء پر ایک تاریخی تبصرہ"، ص ص ۵۷ - ۵۸ ؛ "مسلمانوں کا روشن مستقبل"، ص ۵۲۷

مندرجہ بالا حضرات کی صوبہ واری فہرست واصف صاحب نے قلم بند کی ہے۔ اس بات کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ یہ مجلس منتظمہ منتخب ہوئی یا نامزد کی گئی، کیوں کہ اجلاس امرتسر میں شرکاء جلسہ کی تعداد کا بھی کوئی علم نہیں ہو سکا۔ دوم یہ کہ جمعیۃ کے قواعد و ضوابط میں کوئی ایسی شق بھی نہیں ملتی، جس میں منتظمہ کا انتخاب صوبہ واری بنیاد پر ہونا طے پایا ہو۔ بہر حال مندرجہ بالا اسماء میں تین نام ایسے بھی ہیں جو مستند عالم تو نہ تھے مگر انھیں جمعیۃ نے اپنی مجلس منتظمہ میں شریک کیا تھا۔ یعنی صوبہ دہلی سے حکیم اجمل خان، صوبہ یو پی سے مولانا حسرت موہانی اور صوبہ بمبئی سے حکیم ابو یوسف اصفہانی۔ ان حضرات کو علماء کے ساتھ منتظمہ میں شریک کرنے سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ غالباً ان لوگوں کا عمل، عالموں جیسا ہوگا۔ دوسری بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ علماء نے ان کو اپنی مجلس منتظمہ میں شاید اس لیے شریک کیا ہوگا کہ یہ لوگ معاشرے میں اپنی سیرت و کردار کی بنا پر عوام میں مقبول و معتبر ہوں اور اس نوزائیدہ جماعت کو اپنے استحکام اور شہرت کے حصول کے لیے ایسے صالح، نیک اور معروف افراد کی ضرورت تھی۔ بہر کیف یہ تینوں حضرات جمعیۃ علماء ہند کی مجلسِ منتظمہ کے رکن تھے۔ مندرجہ بالا صوبوں کے علاوہ ہندوستان میں شمال مغربی سرحدی علاقہ، صوبہ سی۔ پی و برار، صوبہ مدراس، راجپوتانہ اور دیگر اسلامی دیسی ریاستیں بھی تھیں۔ مگر ان مقامات کے علماء نے یا تو کوئی عملی حصہ لینا پسند نہ کیا ہو یا پھر ان مقامات پر ایسے علماء موجود نہ ہوں جو اس پایہ کے ہوں کہ جمعیۃ علماء کی منتظمہ میں جگہ پا سکیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ علماء بہ نظر احتیاط براہ راست جمعیۃ علماء میں شامل نہ ہوئے ہوں۔ لیکن جمعیۃ کو ان کی اخلاقی تائید حاصل ہو۔

جمعیۃ علماء ہند اور اعزازی مناصب :

۸ جنوری ۱۹۷۱ء کو راقم الحروف نے، بہ ہمراہ جناب رفیق احمد صاحب، نائب مدیر اخبار "الجمعیۃ"، جناب مخدوم محمد سلیم صاحب خلف حاجی محمد صالح بن حاجی علی جان، ایجرٹن روڈ، نئی سڑک، دہلی، موصوف کے مکان پر ملاقات کی۔ محمد سلیم صاحب نے دوران ملاقات بیان کیا کہ میرے والد حاجی محمد صالح ۱۹۳۹ء سے لے کر ابھی تک "جمعیتہ علماء ہند" کے اعزازی خازن ہیں اور حاجی صاحب تحریک آزادی میں بھی بھرپور عملی حصہ لیتے رہے ہیں۔ نیز یہ کہ حاجی صاحب کی، تحریک ریشمی رومال کے سلسلے میں نواب ضمیر الدین احمد خان آف لوہارو کے ساتھ بھی نشست رہتی تھی۔ صالح صاحب بسبب ضعف سماعت و بصارت، خود ہم کلام ہونے سے قاصر رہتے ہیں۔

اس لیے ان کے لڑکے مخدوم محمد سلیم ان کی نیابت کے فرائض انجام دیتے ہیں - سلیم صاحب نے بیان کیا کہ حاجی عبد الغفار صاحب ۱۹۳۹ء تک جمعیۃ کے اعزازی خازن رہے اور ان کے بعد اسے ابھی تک حاجی محمد صالح جمعیۃ کے اعزازی خازن کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں - سلیم صاحب نے مزید انکشاف کیا کہ مولانا احمد سعید کی وفات کے بعد حاجی محمد صالح، ۱۹۶۸ء تک جمعیۃ کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہے -[1]

شیخ الہند کی معہ دیگر علماء اسارت مالٹا سے رہائی ، اور جمعیۃ کی صدارت :

مولانا محمود حسن المعروف شیخ الہند اور ان کے رفقاء کے تفصیلی حالات "تحریک ریشمی رومال" والے باب میں بیان کیے جا چکے ہیں - یہاں پر موضوع کی مناسبت سے یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ ۱۹۱۸ء میں ، مفتی کفایت اللہ ، شیخ الہند کے حالات پر ایک کتابچہ لکھ رہے تھے - اس کتاب کے لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ حکومت کے سامنے شیخ الہند کی بے گناہی ثابت کی جائے اور ان کے رفقاء کار کی بھی - نیز یہ کہ مسلمانان ہند کی جانب سے اس بات کا اظہار کرنا بھی ضروری تھا کہ مسلمانوں کے دلوں میں شیخ الہند کی بڑی قدر و منزلت ہے اور موصوف کی نظر بندی اور دیر تک ملک سے باہر رہنے کی وجہ سے مسلمانانِ ہند نہ صرف ممدوح کی خدمات سے محروم ہیں ، بلکہ ان کی عدم موجودگی کی وجہ سے بہت بے چین اور مضطرب بھی ہیں - لہٰذا حکومت کا یہ فرض ہے کہ مسلمانانِ ہند کے جذبات اور احساسات کا خیال کرتے ہوئے ، شیخ الہند اور ان کے رفقاء کار کو رہا کرے - اس وقت مفتی کفایت اللہ کے دل میں اس بات کا خیال اور احساس پیدا ہوا کہ علماء کی جانب سے شیخ الہند کی رہائی کے لیے ایک متفقہ اور متحدہ مطالبہ کا ہونا بھی ضروری تھا - تا کہ حکومت ، علماء اور عوام کے متفقہ فیصلے کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جاتی اور اس طرح مسلم جمہور کے عوامی مطالبے کے سامنے حکومت ، شیخ الہند اور دیگر نظر بندوں کو رہا کرنے پر آمادہ ہوتی اور انھیں قید و بند کی صعوبتوں سے جلد نجات مل جاتی -[2] مگر ملک میں اس وقت علماء کی کوئی سیاسی تنظیم نہ تھی - تاہم علماء دیو بند نے مشترکہ اور دیگر علماء و عوام نے فرداً فرداً اور اجتماعاً شیخ الہند کی رہائی کے لیے کوششیں کیں -

---

۱ - صدری یادداشت مخدوم محمد سلیم صاحب خلف حاجی محمد صالح صاحب ، دہلی محررہ ، راقم الحروف ، ۸ جنوری ۱۹۷۱ء ، بوقت ۱۱ بجے دن - (غیر مطبوعہ)

(نوٹ : مخدوم محمد سلیم صاحب کے بیان کی کسی دیگر ذریعہ سے تصدیق یا تکذیب نہ ہو سکی .)

۲ - "جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ" ص ۵۰ - ۵۱

اس درمیان میں جنگ عظیم اول ختم ہو چکی تھی - جس میں اتحادی کامیاب ہوئے تھے - اب حکومت کو اس بات کا خدشہ نہیں رہا تھا کہ علماء یا دیگر افراد ، بغاوت یا دیگر تخریبی کاروائیاں کر سکیں گے - اسی نظریہ کے تحت اب انھوں نے ملک اور بیرون ملک میں سیاسی قیدیوں کو رہا کرنا شروع کیا چنانچہ مولانا شوکت علی ، مولانا محمد علی ، مولانا محمد صادق کراچوی ، مولانا حسرت موہانی اور آخر میں مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کو رہا کیا گیا - ہندوستانی علماء بیرون ملک میں بھی نظر بند تھے - جن میں اسیران مالٹا خاص طور پر قابل ذکر تھے - حکومت نے جو کمیٹی سازشوں کی تحقیقات کے لیے مقرر کی تھی (یعنی رولٹ کمیٹی) جس کی تفصیلات پچھلے صفحات میں گزر چکی ہیں ، اس کمیٹی نے ۵ اپریل ۱۹۱۸ء کو اپنی رپورٹ مکمل کرکے حکومت کو پیش کر دی تھی - جس میں تحریک ریشمی رومال کا محرک مولانا عبیداللہ سندھی کو بیان کیا گیا تھا - حالانکہ اس تحریک کے اصل بانی و محرک شیخ الہند تھے - رولٹ رپورٹ میں علماء کو باغیانہ تحریک میں حصہ لینے کا ذمہ دار بھی ٹھہرایا گیا ہے - لہٰذا یہ کہ شیخ الہند اور ان کی پارٹی پر ، اسلامی ممالک سے فوجی ، اقتصادی اور اخلاقی امداد حاصل کرنے کا الزام بھی عائد کیا گیا تھا -[1] لیکن ترکی کی شکست کے بعد مسلم ممالک کی جانب سے اس قسم کا اب کوئی خدشہ نہیں رہا تھا - لہٰذا ، اسیران مالٹا ، جن میں شیخ الہند اور ان کے رفقاء کار شریک تھے ، رہا کر دیے گئے - یہ تمام افراد مالٹا سے رہا ہونے کے بعد ۸ جون ۱۹۲۰ء کو بمبئی پہنچے -[2]

شیخ الہند کا بمبئی اور دوسرے مقامات پر استقبال :

۸ جون ۱۹۲۰ء کو شیخ الہند معہ اپنے رفقاء کار بمبئی پہنچے - آپ کی آمد سے ، مسلمانانِ ہند خصوصاً اور اہل ہند عموماً بہت مسرور ہوئے - خلافت کمیٹی نے موصوف

---

1. *Sedition Committee Report*, 1918. pp. 111-177, 79.

2. *Ibid.* pp. 1-3; Abdul Hamid, *Muslim Separatism in India : A Brief Survey (1858-1947)*, O. U. P, 1971, p. 127;

مولانا سید حسین احمد مدنی ، "نقش حیات" ، دیو بند، ۱۹۵۳ء ، ج ۲ ، ص ص ۲۳۱ - ۲۳۵؛
مولانا عزیز الرحمٰن مفتی ، "تذکرہ شیخ الہند" ، بجنور ، ۱۹۶۵ء ، ص ص ۸۱ - ۲۸۰؛
(نوٹ : ڈاکٹر عبدالحمید نے رولٹ کمیٹی کی رپورٹ کی تاریخ اشاعت ۱۵ اگست ۱۹۱۷ء بیان کی ہے ، جو خلاف تحقیق ہے - اس کمیٹی کی تشکیل ۱۰ دسمبر ۱۹۱۷ء کو وزارت داخلہ ، حکومت ہند کے ریزولیوشن نمبر ۲۸۸۳ کے تحت عمل میں آئی تھی - لہٰذا ۱۵ اگست ۱۹۱۷ء کو رپورٹ شائع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - راقم)

(*Muslim Separatism in India : A Brief Survey*, p. 122).

کی آمد پر استقبال کی شایان شان تیاری کی ۔ حکومت ہند یہ چاہتی تھی کہ شیخ الہند ، بمبئی میں خلافت کمیٹی کے رہنماؤں اور دیگر سیاسی لیڈروں سے نہ ملیں ۔ اور بالا ہی بالا دیو بند چلے جائیں ۔ حکومت نے اپنی اس اسکیم کو روبہ کار لانے کے لیے ، سی آئی ڈی افسران اور سرکاری مولوی رحیم بخش کو مقرر کیا ۔ مگر حکومت اپنی اس اسکیم میں کامیاب نہ ہو سکی اور استقبال کرنے والے افراد نے ، جن میں ممبران خلافت کمیٹی ، نیز دہلی ، دیو بند اور لکھنؤ سے آئے ہوئے علماء اور دیگر معزز افراد شامل تھے ، موصوف کا بڑا شان دار استقبال کیا ۔ دیو بند اور لکھنؤ سے آنے والے افراد کی فہرست بہت طویل ہے ۔ مگر ان میں سے خاص خاص اور قابل ذکر حضرات حسب ذیل تھے :

"مولانا حافظ محمد احمد مہتمم دارالعلوم دیو بند ، مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری ، حکیم محمد حسن ، مولانا محمد حنیف ، حکیم عبدالرزاق غازی پوری ، نواب محی الدین مراد آبادی ، قاضی بھوپالی ، مولانا مفتی کفایت اللہ ، ڈاکٹر مختار احمد انصاری ، اور حاجی مرزا احمد فوٹوگرافر (تحریک ریشمی رومال) وغیر وغیرہ"۔[1]

شیخ الہند کا بمبئی میں قیام اور دیگر مقامات کا دورہ اور شیخ الہند کا خطاب :

شیخ الہند کی آمد سے ، مسلمانان ہند بے حد مسرور و شاداں تھے ۔ وہ چاہتے تھے کہ آپ کا قیام اور اس سلسلے میں سپاسنامہ وغیرہ پیش کرنے کے جملہ انتظامات یادگاری ہونے چاہئیں ۔ چنانچہ بمبئی کی خلافت کمیٹی نے اور خصوصاً مولانا شوکت علی نے ، بمبئی میں آپ کے قیام کا انتظام کیا اور اہل شہر کی جانب سے ممدوح کی خدمت میں سپاسنامہ کی تیاری کا انتظام کیا ۔ چنانچہ اہل بمبئی کی جانب سے ، خلافت کمیٹی نے کھتری مسجد میں ایک جلسہ عام کا انتظام کیا ۔ اور اہل شہر کی جانب سے آپ کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا گیا ۔ موصوف بمبئی میں دو روز مقیم رہے ۔ اس قیام کے دوران ، مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور گاندھی جی نے ، آپ کی قیام گاہ پر تنہائی میں ملاقات کی اور دوران گفتگو ملک کی سیاست حاضرہ پر دیر تک تبادلۂ خیالات ہوتا رہا ۔ لیکن افسوس ہے کہ ان مذاکرات کی تفصیلات نہیں مل سکیں ۔[2]

شیخ الہند بمبئی میں دو روزہ قیام کے بعد دہلی روانہ ہو گئے اور وہاں سے حکیم نصرت حسین مرحوم جو اسارت مالٹا میں فوت ہو گئے تھے کے مکان (واقع قصبہ

---

۱ - "نقش حیات" ، ج ۲ ، ص ص ۲۳۵ - ۲۳۶؛ "تذکرہ شیخ الہند" ، ص ص ۲۸۰ - ۲۸۱

۲ - "نقش حیات" ، ج ۲ ، ص ۲۳۶؛ "تذکرہ شیخ الہند" ، ص ۲۸۲

اکوڑہ جہاں آباد) پر ان کے اہل خانہ اور لواحقین کی دلداری اور تعزیت کرنے کے لیے گئے ۔ اس کے بعد شیخ الہند الہ آباد ، غازی پور اور لکھنؤ وغیرہ گئے ۔ مولانا شبیر احمد عثمانی ، موصوف کے ہم راہ تھے ۔ اس وقت تحریک خلافت شباب پر تھی اور لوگ شیخ الہند سے تقاریر سننے کے متمنی تھے ۔ موصوف تقریر کرنے کے عادی نہ تھے ۔ (یا بوجہ خرابیٔ صحت تقریر نہ کر سکتے تھے) اس لیے مولانا شبیر احمد عثمانی سے تقاریر کراتے تھے ۔ تا کہ لوگوں کی خواہشات کی تکمیل ہو جائے اور تحریک خلافت کو بھی تقویت پہنچے ۔ موصوف نے لکھنؤ میں مولانا عبدالباری کی قیام گاہ پر قیام کیا ۔ خلافت کمیٹی کے علماء نے آپ کی خدمات اور علمی استعداد کے پیش نظر "شیخ الہند" کا لقب تجویز کیا ۔ جو خواص و عوام میں بہت مقبول ہوا ۔ حتیٰ کہ آپ کے اصل نام سے زیادہ آپ کا خطاب "شیخ الہند" بہت مقبول و معروف ہوگیا ۔ ہندوستان میں آپ کی آمد اور اس کے فوری بعد مختلف مقامات کے دوروں کی وجہ سے ، نیز جگہ جگہ خلافت کی تائید میں تقاریر کرانے اور انھیں تیار کرکے مولانا شبیر احمد عثمانی کے ذریعہ عوام کے سامنے پیش کرانے کی بناء پر خلافت کمیٹی اور تحریک آزادی کو بڑی تقویت ہوئی ۔[1]

جمعیۃ کا دوسرا اجلاس اور شیخ الہند کی صدارت :

شیخ الہند علی گڑھ میں جامعہ ملیہ یعنی ایک قومی یونیورسٹی کے افتتاح اور قیام کے بعد دہلی تشریف لائے ۔ چونکہ آپ کی طبیعت ناساز تھی اس لیے ڈاکٹر انصاری صاحب کے اصرار پر ، ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر ہی قیام کیا ۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت توجہ اور انہماک و خلوص کے ساتھ آپ کا علاج کیا ۔ جمعیۃ کا پہلا اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں منعقد ہوا تھا ۔ جس میں طے پایا تھا کہ دوسرے اجلاس میں جمعیۃ کے اغراض و مقاصد منظور کیے جائیں ۔ اس وقت تک شیخ الہند اسارت مالٹا سے رہا ہو کر نہیں آئے تھے ۔ نومبر ۱۹۲۰ء میں جمعیۃ کا دوسرا اجلاس ہونے والا تھا ۔ آپ کی موجودگی سے اہل الرائے اصحاب نے مستفید ہونے کے لیے یہ طے کیا کہ جمعیۃ کے دوسرے سالانہ اجلاس کی صدارت شیخ الہند سے کرائی جائے ۔ تا کہ موصوف کی موجودگی سے علماء کرام میں سیاسی خدمات کا جوش و ولولہ پیدا ہو ۔ اور اس طرح سے علماء کا آپس میں اتحاد و اتفاق بھی بڑھے ۔ کیونکہ عوام و خواص میں شیخ الہند کو اپنے غیر معمولی کردار اور سیاسی خدمات کی بناء پر بڑی مقبولیت حاصل تھی ۔ اور علماء کو آپ کے ساتھ

---

۱ ۔ "تذکرہ شیخ الہند" ، ص ص ۲۵۸ - ۲۸۳ ؛ "نقش حیات" ، ج ۲ ، ص ص ۲۳۷ - ۲۳۸

حسن اعتقاد تھا اور آپ کی شخصیت پر پورا بھروسہ بھی تھا۔[1] جمعیۃ کے ابتدائی جلسے (دہلی) اور پہلے اجلاس (امرتسر) کی صدارت مولانا عبدالباری نے کی تھی اور امرتسر کے اجلاس سے قبل یعنی ابتدائی جلسے میں مفتی کفایت اللہ کو جمعیۃ کا عارضی صدر اور مولانا احمد سعید کو عارضی ناظم مقرر کیا تھا۔ ۱۹ تا ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء کو جمعیۃ کا دوسرا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔ اس جلسے کی صدارت کے لیے شیخ الہند سے درخواست کی گئی جو موصوف نے بطیب خاطر منظور کر لی[2]۔ شیخ الہند نے مفتی کفایت اللہ کو اس جلسے کا خطبۂ صدارت منضبط کرنے کے لیے مامور کیا اور مضامین ضروریہ کی طرف نشاندھی فرما دی۔ حسب الحکم، مفتی صاحب نے خطبہ کا مسودہ تیار کیا۔ اور بغرض اصلاح و ترمیمات شیخ الہند کو سنایا۔ موصوف نے ضروری اصلاحات اور ترامیم کے بعد اسے چھپوانے کا حکم صادر فرمایا۔ موصوف کو بوجہ علالت اور مسلسل اسفار، ضعف و نقاہت لاحق تھی۔ اس لیے دہلی میں مقیم ہونے کے باوجود، جلسہ گاہ نہ جا سکے۔ حکیم اجمل خان، جلسے کے صدر استقبالیہ تھے۔ حکیم صاحب نے خطبۂ استقبالیہ پڑھنے کے بعد، شیخ الہند کا نام برائے صدر جلسہ پیش کیا اور تمام حاضرین جلسہ نے، اسے بالاتفاق رائے منظور کیا۔ آپ کی عدم موجودگی کی بناء پر آپ کا مطبوعہ خطبۂ صدارت، مفتی کفایت اللہ نے پڑھ کر سنایا[3]۔ مزید یہ کہ مفتی صاحب نے ہی اس جلسے کی صدارت کے فرائض انجام دیے۔ پھر جلسہ کے اختتام پر شیخ الہند کی اختتامی تقریر مولانا مرتضیٰ حسن مراد آبادی نے پڑھ کر سنائی۔[4] شیخ الہند نے خطبۂ صدارت میں مندرجہ ذیل نظریاتی اصولوں کی طرف رہنمائی فرمائی :-

---

۱ - ''نقش حیات''، ج ۲، ص ۲۵۸

۲ - ''جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ''، ص ۶۰ ؛ ''نقش حیات''، ج ۲، ص ص ۲۵۸-۲۵۹

۳ - ''جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ''، ص ص ۴۴-۴۵ اور ۶۰-۶۱

(نوٹ : مولانا شبیر احمد عثمانی کو اس جلسے کا خطبہ صدارت پڑھنا، تسامح کی وجہ سے مولانا سید حسین احمد مدنی نے بیان فرمایا ہے۔ ''نقش حیات''، ج ۲، ص ۲۵۹)

۴ - ''جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ''، ص ۶۱

(نوٹ : مولانا واصف نے اختتامی تقریر کو سہواً افتتاحی تقریر لکھ دیا ہے۔ جو اصل میں اختتامی تقریر تھی۔ ''نقش حیات''، ج ۲، ص ۲۶۰ (ذ) ''جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ''، ص ۶۱)

(اول) اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا حریف انگریز ہے ، جس سے ترک موالات فرض ہے ۔

(دوم) تحفظ ملت اور تحفظ خلافت کے مطالبے خالص اسلامی ہیں ۔ اگر غیر مسلم ، اس سلسلے میں ہمدردی اور اعانت کریں تو جائز اور مستحق شکریہ ہیں ۔

(سوم) استخلاص وطن کے لیے ، غیر مسلموں سے اشتراک عمل جائز ہے ۔ اس طرح سے کہ مذہبی حقوق میں رخنہ واقع نہ ہو ۔

(چہارم) اگر موجودہ زمانے میں توپ ، بندوق ، ہوائی جہاز ، کا استعمال مدافعت اعداء کے لیے جائز ہو سکتا ہے ۔ باوجودیکہ قرون اولیٰ میں یہ چیزیں نہ تھیں تو مظاہروں اور قومی اتحادوں (کذا ، صحیح اتحاد) اور متفقہ مطالبوں کے جواز میں تامل نہ ہوگا ۔ کیوں کہ موجودہ زمانے میں ایسے لوگوں کے لیے ، جن کے ہاتھ میں توپ یا بندوق یا ہوائی جہاز نہیں ہیں ، یہی چیز ہتھیار ہیں "[1]

شیخ الہند کی اختتامی تقریر کے چند خاص اقتباسات حسب ذیل ہیں : ۔

(الف) اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے اہل ملک ، غیر مسلم (ہندو) جو کثیر تعداد میں ہیں ، مسلمانوں کے ساتھ پاک مقصد کے حصول میں موئد ہوگئے ہیں ۔ دونوں قوموں کا یہ اتحاد و اتفاق بہت مفید اور نتیجہ خیز ثابت ہوگا ۔

(ب) اگر صورت حال مندرجہ بالا کے مخالف ہو گی تو ہندوستان کی آزادی ناممکن ہو جائے گی ۔

(ج) اگر مسلمانوں نے بد اعمالیاں ترک نہ کیں تو اسلامی اقتدار کی رہی سہی دھندلی سی امید بھی ختم ہو جائے گی ۔

(د) ہر دو قوموں ، بلکہ سکھوں کو بھی متحد اور متفق ہونا چاہیے ، تا کہ اس اتحاد کی بدولت بڑی اور طاقت ور قوم بھی ہم سے شکست کھا جائے ۔

---

۱ ۔ "نقش حیات" ، ج ۲ ، ص ص ۲۵۹-۲۶۰

(٥) ہر فریق کو لازم ہے کہ دنیاوی معاملات میں کسی فریق کی دلآزاری اور ایذا رسانی ہر گز نہ کرے[1] ۔

شیخ الہند نے اس بات کی طرف بھی اشارہ فرمایا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنے اپنے نجی معاملات اور سرکاری ملازمتوں میں بھی تعصب اور رقابتوں سے گریز کرنا چاہیے اور تلاش معاش میں ایک دوسرے کو ایذا رسانی کے درپے نہ ہونا چاہیے[2] ۔

جمعیۃ کا مذکورہ بالا اجلاس ختم ہونے کے بعد ، مفتی کفایت اللہ نے ، شیخ الہند کو ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر اجلاس کی تمام کارروائی اور روداد کا حال سنایا تو موصوف نے فرمایا کہ میری خواہش تھی کہ جلسہ کامیاب ہو اور تمام علماء کرام مل جل کر امت محمدیہ کی کشتی کو پار لگائیں اور مسلمانوں کو غلامی کی ذلت آمیز زندگی سے نجات دلانے کا باعث بنیں[3] ۔

جمعیۃ کے اجلاس بالا (نومبر ۱۹۲۰ء) میں شیخ الہند کو جمعیۃ کا صدر اور مفتی کفایت اللہ کو نائب صدر اور مولانا احمد سعید کو ناظم منتخب کیا گیا ۔ مگر ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء شیخ الہند کی رحلت ہوگئی ۔ موصوف کی وفات کے بعد مفتی کفایت اللہ بحیثیت صدر جمعیۃ اپنے فرائض انجام دیتے رہے[4] ۔ شیخ الہند کی وفات کے نتیجے میں صدر کا عہدہ خالی ہوا ۔ اس خالی عہدے پر جمعیۃ کے دستور کے مطابق صدر کا انتخاب ہونا ضروری تھا ۔ لٰہذا جمعیۃ کے تیسرے سالانہ جلسے کے انعقاد تک مجلس منتظمہ نے ٦ ستمبر ۱۹۲۱ء کو مفتی کفایت اللہ نائب صدر جمعیۃ کو صدارت کے امور کی انجام دہی کے لیے مامور کر دیا ۔ مجلس منتظمہ کے فیصلے کی توثیق جمعیۃ کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۸ تا ۲۰ نومبر ۱۹۲۱ء بمقام لکھنو کر دی گئی اور مفتی کفایت اللہ جمعیۃ کے مستقلاً صدر منتخب ہوگئے ۔ موصوف اس عہدۂ جلیلہ پر تقریباً بیس سال کی طویل مدت تک فائز رہے[5] ۔

---

۱ ۔ ''نقش حیات'' ، ج ۲ ، ص ص ۲۵۹-۲٦۰

۲ ۔ ایضاً ، ص ۲٦۱

۳ ۔ ''جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ'' ، ص ٦۱

۴ ۔ ایضاً ، ص ۷۴

۵ ۔ ایضاً، ص ۷۴-۷۵ (ذ)''مفتی اعظم کی یاد نمبر''، ص ص ۱۱۷-۱۱۹ (از مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی)

علماء اور ترک موالات

باب چہارم میں تحریک ترک موالات کے متعلق بیان کیا جا چکا ہے ۔ مگر یہاں پر مضمون کی مناسبت سے یہ بات بیان کرنا ضروری ہے کہ تحریک ترک موالات کا اصل سبب کیا تھا اور وہ کس نے شروع کی تھی ؟

ڈاکٹر سیتارامیہ نے بیان کیا ہے کہ کانگرس ، اپنے اجلاس امرتسر میں اس مسئلے سے دو چار تھی کہ حکومت کے ساتھ کیا موقف اختیار کیا جائے ۔ تعاون کا یا مزاحمت کا [۱] ۔ اس مسئلے میں مزید پیچیدگی اس لیے پیدا ہوگئی تھی کہ خود کانگرس کے اندر نظریاتی اختلافات پیدا ہوگئے تھے ۔ جس کے شاخسانے میں پارٹی کے اندر پھوٹ پڑ گئی اور انجام کار لبرل گروہ کے لوگ جو ترک موالات کے خلاف تھے، کانگریس سے علیحدہ ہوگئے۔ گاندھی جی اور کانگریسی قیادت کا بڑا حصہ عدم تعاون کی پالیسی کی طرف مائل تھا ۔ لیکن جو چیز گاندھی جی اور کانگرس کو ترک موالات کی طرف بہا کر لے گئی ، وہ تحریک خلافت کا طوفان تھا[۲] ۔ بقول ڈاکٹر سیتارامیہ ۱۹۲۰ء کی سیاست، خلافت کے گرد گھومتی تھی ۔ خلافت ترکی کو بچانے کے لیے ۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء کو قومی دن منانے کا اعلان کیا گیا ۔ یہ اعلان خلافت کمیٹی کی جانب سے تھا اور لوگوں سے ہڑتال کرنے کی اپیل کی گئی اور گاندھی جی نے اعلان کیا کہ "اگر شرائط صلح سے مسلمانان ہند مطمئن نہ ہوئے تو میں عدم تعاون کی تحریک جاری کر دوں گا"[۳] ۔ مئی ۱۹۲۰ء میں ترکی کے ساتھ جو شرائط صلح ہوئیں ، وہ بے حد غیر اطمینان بخش تھیں ۔ "ان کے شائع ہونے پر خلافت ایجی ٹیشن اور بھی زیادہ گرم ہوگیا ۔ فوراً ہی بعد گاندھی جی نے ان شرائط میں ترمیم کرانے کے لیے عدم تعاون کی تحریک جاری کرنے کا اعلان کر دیا"[۴] ۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ گاندھی جی کے اعلان سے کئی ماہ پہلے مسلم زعماء ترک موالات کے حق میں فیصلہ کر چکے تھے ۔ نومبر ۱۹۱۹ء میں حکومت نے جب یہ اعلان کیا کہ اہل ہند ، جشن صلح یعنی اتحادیوں کی کامیابی پر مسرت اور خوشی منائیں ، تو نومبر ۱۹۱۹ء میں خلافت کانفرنس منعقدہ دہلی نے حسب ذیل تجاویز پاس کیں :-

---

۱ ۔ بی پٹابھائی سیتا رامیہ ، "تواریخ کانگرس" ، لاہور ، ۱۹۳۰ء ، ص ۲۰۱

۲ ۔ ایضاً ، ص ۲۰۱

۳ ۔ ایضاً ، ص ۲۰۴

۴ ۔ ایضاً ، ص ۲۰۷

"(الف) بوجہ اس کے کہ ایران اور ترکی کے مقدس مقامات میں زیادتیاں کی گئی ہیں۔ مسلمانان ہند جشن صلح میں شریک نہ ہوں اور اس کے خلاف جلسے کریں۔

(ب) مسلمانان حکومت سے ترک موالات کریں۔

(ج) اگر حسب منشاء فیصلہ نہ ہو تو ولایتی مال کا مقاطعہ کیا جائے۔

(د) مہاتما گاندھی اور دوسرے ہندوؤں کا جو تحریک خلافت میں شریک ہوئے، شکریہ ادا کیا جائے"۔[1]

خلافت کانفرنس کے اس جلسہ میں علماء اور دیگر زعماء بھی شریک تھے۔ علماء میں دیگر حضرات کے علاوہ مفتی کفایت اللہ بھی شریک تھے۔ جشن صلح کے مقاطعہ کی تحریک مفتی کفایت اللہ نے پیش کی اور پھر اسی جلسے میں یہ تحریک بذریعہ قرار داد منظور ہوگئی۔ اس کی تائید میں دیگر حضرات کے علاوہ مولانا شاہ ولایت حسین الہ آبادی، مولانا داؤد امرتسری، مولانا سید محمد فخر الہ آبادی اور گاندھی جی نے پرجوش تقریریں کیں[2]۔ یہی نہیں بلکہ اس کے بعد مفتی کفایت اللہ نے ایک فتویٰ لکھا۔ جس پر مقتدر علماء نے دستخط کیے اور تحریک ترک موالات کو شرعاً جائز قرار دے دیا۔ جس کی تفصیلات تحریک ترک موالات کے باب میں گزر چکی ہیں[3]۔ اس کے دس ماہ بعد ۴ ستمبر تا ۹ ستمبر ۱۹۲۰ء کے اجلاس منعقدہ کلکتہ میں گاندھی جی نے عدم تعاون کی قرار داد پیش کی۔ جسے کانگریس نے منظور کر لیا[4]۔ اصل میں گاندھی جی ذاتی طور پر تحریک عدم تعاون کے حامی تھے اور انہوں نے نومبر ۱۹۱۹ء سے ہی جب کہ خلافت کمیٹی کے اجلاس منعقدہ دہلی میں تحریک عدم تعاون کی قرار داد منظور کی تھی، اپنی حمایت اور تائید کا اظہار کر دیا تھا۔ پھر مارچ ۱۹۲۰ء میں قومی دن کے موقع پر گاندھی جی نے اپنے خیالات کا اعادہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر اتحادیوں نے شرائط صلح، ترکی کے ساتھ ناقابل قبول رکھیں تو میں عدم تعاون کی تحریک جاری کر دوں گا۔ مگر یہ سب کچھ ان کی ذاتی رائے تھی۔ ستمبر ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی نے اس تحریک کو

۱۔ "مسلمانوں کا روشن مستقبل"، ص ص ۵۰۹-۵۱۰؛ "جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ"، ص ص ۵۸-۵۹

۲۔ ایضاً، ص ۵۹

۳۔ ایضاً، ص ص ۵۹-۶۰

۴۔ "تواریخ کانگریس"، ص ص ۳۱۹-۳۲۳؛

Muslim Separatism in India: A Brief Survey, pp. 144,45.

باقاعدہ کانگریس کے اجلاس سے منظور کرایا - تا کہ بہ حیثیت جماعت اس کی تائید و حمایت کی جائے - بہر کیف خلافت کمیٹی کے جلسہ میں (حسب تفصیل سابق) عدم تعاون کی قرار داد ۲۲ نومبر ۱۹۱۹ء کو ہی منظور ہو چکی تھی - نیز پہلے مفتی کفایت اللہ نے ۱۹۱۹ء کے اواخر میں جشن صلح کا بائیکاٹ کرنے والا فتویٰ علماء سے منظور کرا دیا تھا - (حفیظ الرحمٰن واصف نے اس فتویٰ کا سن تحریر نہیں کیا) اور بعدہٗ شیخ الہند نے بھی ۲۸ ذیقعدہ ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۵ اگست ۱۹۲۰ء کو بذریعہ فتویٰ ترک موالات کو جائز قرار دے دیا تھا -

مفتی عزیزالرحمٰن نے اس سلسلے میں بیان کیا ہے کہ ترک موالات اسلام کا قدیم حربہ ہے اور اپنی اس دلیل کو ثابت کرنے کے لیے قرآن کریم کی بہت سی آیات اور احادیث شریف پیش کی ہیں - جن کو یہاں بخوف طوالت پیش نہیں کیا جا رہا - ان آیات اور احادیث میں ترک موالات کی اہمیت اور افادیت کو ثابت کرتے ہوئے ، مسلمانان ہند کو اس پر عمل کرنے کا مشورہ ، شیخ الہند ہی نے دیا تھا - جسے مفتی عزیز الرحمٰن نے ''تذکرہ شیخ الہند'' میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے[1] - بعض مورخین جن میں ڈاکٹر شیخ محمد اکرام اور ڈاکٹر خالد بن سعید وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں ، اس بات کا تاثر دیتے ہیں کہ تحریک عدم تعاون کے بانی گاندھی جی ہیں - حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس کے اصل بانی علماء کرام خصوصاً مفتی کفایت اللہ اور شیخ الہند ہیں - ڈاکٹر اکرام کے اصل الفاظ یہ ہیں :-

> "Gandhi suggested a scheme of non-violent non-co-operation, which included surrender of British titles, boycott of councils, courts and Government aided educational institutions, and resignation from Government services".[2]

ڈاکٹر خالد بن سعید کے الفاظ حسب ذیل ہیں :-

> "The First Khilafat conference was held at Delhi on 23 November 1919, Gandhi was present and took upon him-

---

۱ - ''تذکرہ شیخ الہند'' ، ص ص ۳۲۸-۳۴۹؛ ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' ، ص ص ۵۰۹-۵۱۰؛
Khalid Bin Sayeed, *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd, ed., Karachi, 1968, p. 47.

2. S.M. Ikram, *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan 1858-1951*, 2nd ed., Lahore, 1970, p. 154.

حسب تفصیل سابق مولانا طفیل احمد منگلوری کے بیان کے مطابق ۲۲-۲۳ نومبر ۱۹۱۹ء کو خلافت کانفرنس کے اجلاس دہلی میں چار قراردادیں منظور ہوئیں - جن میں قرارداد (ب) تحریک ترک موالات کے متعلق تھی - واصف صاحب کا بیان یہ ہے کہ دہلی کے جلسے خلافت میں مفتی کفایت اللہ نے عدم تعاون اور مقاطعہ جشن صلح کی قرار دادیں پاس کرا لی - اور پھر اسے فتویٰ کی شکل میں شائع کرا کر علماء کرام سے اس کی توثیق بھی کرائیں

مندرجہ بالا شواہد (دوم) سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ۱۹۱۹ء میں گاندھی جی نے تحریک ترک موالات کو منظور نہیں کیا تھا - اس کے برعکس خلافت کمیٹی کی پہلی نشست میں مفتی کفایت اللہ کی تحریک اور دیگر علماء و زعما کی تائید سے تحریک ترک موالات کی قرار داد منظور ہو چکی تھی - نیز یہ کہ ڈاکٹر سیتارامیہ کے بیان کے مطابق مئی ۱۹۲۰ء تک گاندھی جی نے اس تحریک کو عملاً جاری نہیں کیا تھا - جب کہ علماء نے ۲۲/۲۳ نومبر ۱۹۱۹ء کو جشن صلح کا بائی کاٹ اور تحریک ترک موالات کی قرار دادیں منظور کر لی تھیں - نہ صرف یہ بلکہ جشن صلح کا بائی کاٹ کرکے اسے عملاً بھی صحیح ثابت کیا - ان تمام تفصیلات سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ ترک موالات کے اس "قدیم اسلامی حربہ" کو علماء اور جمعیۃ کے صدر مولانا مفتی کفایت اللہ نیز دیگر مسلم رہنماؤں نے اپنی سیاسی بصیرت سے بہت پہلے ہی یعنی کانگریس کی قرار داد ستمبر ۱۹۲۰ء سے دس ماہ قبل جائز قرار دے دیا تھا -

البتہ یہ بات حقیقتاً صحیح ہے کہ گاندھی جی و کانگریس نے تحریک ترک موالات کی بہ دل و جان حمایت و تائید کی اور اپنا دلی تعاون بھی پیش کیا - چودھری خلیق الزمان نے تو یہ بھی کہا ہے کہ مفتی کفایت اللہ نے خلافت کمیٹی کے جلسے میں جب جشن صلح کے بائی کاٹ کی تجویز پیش کی تو گاندھی جی نے اس تجویز کی مخالفت کی اور کہا کہ بائیکاٹ صحیح مداوا نہیں ہے[1] -

---

1 - ***Muslim Separatism in India : A Brief Survey*** **p. 145 ;**
Pakistan : The Formative Phase, **2nd ed., pp., 49-59;**
"شاہ راہ پاکستان"، ص ۲۵۲؛ "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ"، ص ۳۵۷
"جمعیۃ علماء کیا ہے" ؟ ص ۱۳
(نوٹ : ضیاء الحسن فاروقی نے بیان کیا ہے کہ جمعیۃ علماء ہند نے ایک فتویٰ تحریک عدم تعاون اور عدم تشدد کا جاری کیا جس پر ۹۲۵ مقتدر علماء نے دستخط کیے تھے) :
Deoband School and the Demand for Pakistan, **pp. 63-64**
(نوٹ : مولانا آزاد نے ترک موالات کے فتوے پر پانچ سو علماء کے دستخط ہونے کی تصدیق کی ہے - "تازہ مضامین ابوالکلام آزاد"، ص ۳۲)

علماء نے ترک موالات کا حربہ مجبوراً استعمال کیا ۔ کیوں کہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد اماکن مقدسہ اور خلافت ، اغیار کی گرفت سے محفوظ نظر نہیں آتے تھے اور نہ ہی مسلمانوں کی باقی ماندہ ریاستیں اغیار کی دستبرد سے محفوظ تھیں ۔ لیکن مسلمانان ہند عرصے سے اس بارے میں سخت متردد تھے ۔ لیکن اس کا کوئی مداوا بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا ۔ علماء جو اماکن مقدسہ کی حفاظت اور نظام اسلام کی بحالی کی جد و جہد میں پیش پیش تھے ، اس امر سے بخوبی آگاہ تھے کہ عامۃ المسلمین انگریزوں کی مادی طاقت کی مزاحمت کی تاب نہیں رکھتے اور وہ جدید آلات سے بھی محروم تھے ۔ اس لیے علماء نے ترک موالات اور عدم تعاون کا سیاسی اور موثر حربہ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ۔ کیوں کہ اس دور کے حالات میں اس سے زیادہ موثر اور کوئی دوسرا طریقہ مزاحمت کا نہیں ہو سکتا تھا ۔[1]

جمعیۃ کا تیسرا اجلاس منعقدہ ۱۸ تا ۲۰ نومبر ۱۹۲۱ء بڑی اہمیت کا حامل تھا ۔ چونکہ اس وقت خلافت کمیٹی اور جمعیۃ کے ارکان ، نیز دیگر حریت پسند رہنماؤں کو گرفتار کیا جا چکا تھا ۔ نیز علماء کا منظور شدہ ترک موالات کا فتویٰ بھی ضبط کیا جا چکا تھا ۔ ان گرفتار شدگان میں مولانا شوکت علی ، مولانا محمد علی ، مولانا حسین احمد مدنی ، مولانا نثار احمد کانپوری اور دیگر حضرات شامل تھے ۔ مولانا احمد سعید دہلوی کو مسٹر جی ۔ ایم ینگ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ دہلی نے زیر دفعہ ۱۰۷ و ۱۰۸ تعزیرات ہند گرفتار کرایا تھا ، چونکہ مولانا احمد سعید نے ۴ مارچ ۱۹۲۱ء ، ۲۰ و ۳۰ مئی ، اور ۲۳ و ۲۹ اگست ۱۹۲۱ء کو جلسہ عام میں جمعیۃ علماء ہند کے فتویٰ کی ضبطی کے خلاف احتجاج کیا تھا ۔ موصوف نے اپنی گرفتاری کے وقت ایک تحریری بیان دیتے ہوئے کہا کہ "اگر گورنمنٹ کے نزدیک قرآن و حدیث کی تبلیغ کرنا کوئی جرم ہے تو میں بہت خوش قسمت مجرم ہوں ۔ جب حضرت مسیح علیہ السلام کو گرفتار کرنے والا شیطان ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ علماء کو گرفتار کرنے والے شیطان کے بھائی نہ ہوں" اور "دفعات ۱۰۷ اور ۱۰۸ کے متعلق میرے ساتھ ایسی ہی مضحکہ خیز نسبت ہے ، جیسے میرے متعلق یہ کہنا کہ میں نے تلوار تیز کرنے کی ترغیب دی" ۔ مجسٹریٹ مذکور نے مولانا احمد سعید کو ایک سال قید بامشقت کی سزا کا حکم سنا دیا ۔[2]

ان ہنگامی حالات میں جمعیۃ کا تیسرا اجلاس بصدارت مولانا آزاد لاہور میں منعقد ہوا ۔ مولانا آزاد نے اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ "حضرات علماء کرام

---

۱ ۔ "تذکرہ شیخ الہند" ، ص ص ۳۱۲-۳۱۳

۲ ۔ "مسلم" (ہفت روزہ ، جمعیۃ کا پہلا اخبار) ، یکم نومبر ۱۹۲۱ء ، ج ۱ ، نمبر ۱ ، ص ص ۳۰۱ ، کـ ۳۰۲

و ارکان جمعیۃ ! اس وقت ایک بڑی آزمائش ہمارے طریق عمل کے لیے در پیش ہے - ہم نے مدتوں کی غفلت کے بعد قومی و اجتماعی اعمال کی کشمکش میں قدم رکھا ہے - اس لیے سب سے پہلے ہماری نظر آج کل کے مجلسی اور اجتماعی کاموں کے طریق و اسلوب پر پڑتی ہے اور تقلید و محاکات کا جذبہ ہمیں بے اختیار ان کی جانب کھینچنے لگتا ہے - لیکن میں آپ کو یاد دلاؤں کہ آپ کی راہ ان راہوں سے بالکل الگ ہے اور کتاب اللہ کی ہدایت اور حکمت نبوت کی سنت نے آپ کو دنیا اور دنیا والوں کے عام گھڑے ہوئے طریقوں اور قاعدوں سے مستغنی کر دیا ہے - دنیا میں علم و یقین صرف حی الٰہی و اعمال نبوت ہی ہے" - "اس کے سوا علم و یقین اس اسمائے دنیا کے نیچے موجود نہیں ہے "[1]

جمعیۃ کے اس تیسرے اجلاس میں طے پایا کہ ولایتی پارچہ جات کا مقاطعہ کیا جائے - علماء کے فتویٰ کی ضبطی پر احتجاج کیا جائے اور فتویٰ کو دہرایا جائے اور مسلمانوں کو فوج اور پولیس کی ملازمت کرنے سے منع کیا جائے -[2]

جمعیۃ علماء کی پہلی مجلس عاملہ

جمعیۃ علماء کی تاسیس و تنظیم ۲۳ نومبر ۱۹۱۹ء کو عمل میں آ چکی تھی اور ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو اس کی مجلس منتظمہ کا قیام بھی عمل میں آ گیا تھا - (حالانکہ ابھی جمعیۃ کے قواعد و ضوابط منظور نہ ہوئے تھے) لغوی اصطلاحات سے مجلس منتظمہ اور مجلس عاملہ کا کام ایک ہی ہوتا ہے - وہ یہ کہ کسی انجمن یا جماعت کے تمام انتظامی امور کی دیکھ بھال اس کے آئین و دستور کے مطابق عمل میں لانا - مگر اس جگہ مجلس منتظمہ سے اغلباً مراد یہ ہے کہ وہ آرگنائزنگ کمیٹی کی حیثیت سے کام کرتی رہی - اور ۹ ، ۱۰ فروری ۱۹۲۲ء کو بمقام دہلی ، مجلس منتظمہ کے اجلاس میں اس کی سب سے پہلی مجلس عاملہ بنائی گئی ، اور بقول واصف صاحب مندرجہ ذیل ۹ حضرات اس کے ارکان منتخب کیے گئے :-

> "مولانا مفتی کفایت اللہ ، مولانا عبدالحلیم صدیقی ، حکیم اجمل خاں ، مولانا شبیر احمد عثمانی ، مولانا عبدالماجد بدایونی ، مولانا مظہر الدین (مدیر "الامان") ، مولانا عبدالقادر قصوری ، مولانا فضل الحسن حسرت موہانی ، اور مولانا احمد اللہ پانی پتی"-

---

۱ - حبیب احمد چودھری ، "تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء" ، لاہور ، ۱۹۶۶ء ، ص ص ۳۵۱-۳۵۲

۲ - "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۵۲۹

بعدۂ جمعیة کے اجلاس منتظمہ ، منعقدہ ۳ تا ۵ مارچ ۱۹۲۲ء بمقام اجمیر مجلس عاملہ میں حسب ذیل تین ارکان کا اضافہ کیا گیا :

"مولانا آزاد سبحانی ، مولانا عبدالقدیر بدایونی اور مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی"۔ اس طرح اب جملہ ممبران کی تعداد بارہ ہوگئی۔[۱]

جمعیة کی شاخیں اور قادری برادران :

جمعیة کی تشکیل اور قیام کے بعد برصغیر کے مختلف اضلاع میں اس کی شاخیں قائم ہوگئی تھیں۔ بقول "علی گڑھ گزٹ" صوبہ یو۔پی کی شاخ کے ناظم مولانا عبدالماجد بدایونی تھے اور نائب ناظم ان کے چھوٹے بھائی مولانا عبدالحامد بدایونی تھے۔ "علی گڑھ گزٹ" نے اپنے اداریے میں ان دونوں بھائیوں کے کلیدی عہدے حاصل کرنے پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ "گویا نظامت جمعیة بھی ایک میراث کی حیثیت رکھتی ہے جسے دو حقیقی بھائیوں نے تقسیم کر لیا"[۲]۔ (اخبار مذکور نے اس بیان کے متعلق کوئی ماہ و سن بیان نہیں کیا مگر یہ اخبار ستمبر ۱۹۲۲ء کا ہے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اسی سال کا ہوگا۔) ادھر خود مولانا عبدالماجد بدایونی جمعیة کی جانب سے عام عدم توجہی اور بدنظمی کے شاکی تھے۔ چنانچہ انھوں نے کہا کہ :

"میری جانب سے پیہم اور مسلسل درخواستوں کے باوجود ، علماء نے جمعیة کے مقاصد کو کامیاب بنانے کے لیے سعی و عمل نہیں کیا ، اور نہ ہی میری درخواستوں پر غور کیا گیا۔ مزید برآں جمعیة کی ضلع وار تنظیموں کے متعلق بھی کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی۔ اب جب کہ (یعنی چورا چوری کے واقعہ کے بعد) کانگریس کی بنیادیں خود متزلزل ہو رہی ہیں اور جمعیة علماء کے بانی کانگریس کے بانیوں کے "پسرو" ہیں تو ایسی صورت میں اب جمعیة کی کیا ضرورت باقی رہ گئی"[۳] ؟۔

۱۔ "جمعیة علماء پر ایک تاریخی تبصرہ" ، ص ٦۵ (بحوالہ "مسلم" ، ج ۱ ، ش ۵ ، ص ۱۸) ؛ "علی گڑھ گزٹ" ، ۱۴ مارچ ۱۹۲۱ء ، ص ن ، ک ن

(نوٹ : واصف صاحب نے مجلس منتظمہ اور مجلس عاملہ میں فرق بیان کیا ہے۔ عموماً ؛ مجلس منتظمہ اور مجلس عاملہ ایک ہی چیز ہوتی ہے۔ جو جملہ امور انتظامی کو حسب ہدایت مجلس عام انجام دیتی ہے۔ مگر واصف صاحب کے بیان سے یہ ترشح ہوتا ہے کہ مجلس منتظمہ اور چیز ہے اور مجلس عاملہ دیگر چیز ہے)۔

۲۔ "علی گڑھ گزٹ" ، یکم ستمبر ، ۱۹۲۲ء ، ج ۲ ، نمبر ۱۵ ، ص ۲ ، ک ۲

۳۔ ایضاً

مندرجہ بالا عبارت سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قادری برادران کو جمعیۃ کی انتظامیہ سے یہ شکایت تھی کہ وہ ان کی درخواستوں پر مناسب توجہ نہیں دیتے تھے اور نہ ہی جمعیۃ کی شاخوں پر باقاعدگی کے ساتھ نگرانی اور محاسبہ کرتے تھے ۔ اغلب گمان یہ ہے کہ مولانا عبدالماجد بدایونی کو جمیعۃ علماء سے ذاتی عناد تھا ۔ جس کے باعث انھوں نے یہ الزامات عائد کیے ۔ اس گمان کو تقویت اس سے بھی ہوتی ہے کہ ان دونوں بھائیوں نے باغیانہ طور پر جمعیۃ کے خلاف ایک ''جمعیۃ علماء کان پور'' قائم کی ۔ حالانکہ یہ باغی جماعت اپنی بے عملی کی بناء پر انجام کار خود بخود ختم ہوگئی ۔ مگر اس کے قیام نے ان لوگوں کی نیک نیتی اور خلوص کا پردہ چاک کر دیا ۔ اب رہا مولانا کا یہ الزام کہ جمعیۃ کانگریس کی ''پسرو'' ہے ، تو جمعیۃ کے آئندہ کے لائحہ عمل اور اس کی سیاسی جد و جہد نے یہ بات واضح کر دی کہ اس میں اپنی جداگانہ بقا اور بالیدگی کی تمام تڑپ اور حس موجود تھی ۔ چنانچہ وہ کانگریس کے اتحاد و اتفاق کے بغیر ۱۹۲۶ء سے لے کر ۱۹۳۰ء تک ملک کی سیاسی جد و جہد میں تن تنہا اپنا نمایاں کردار پیش کرتی رہی اور اسی دوران اس نے ملک کو آزاد کرانے کی قرار داد بھی منظور کی ۔ ایسی صورت میں قادری برادران کا یہ الزام کہ جمعیۃ علماء ہند کانگریس کی ''ہم رو'' ہے خود بخود بے وزن ہو جاتا ہے ۔

جمعیۃ علماء کان پور

۲۳-۱۹۲۲ء میں جمعیۃ علماء ہند دہلی سے کچھ علماء کا اختلاف رونما ہوا ۔ اس اختلاف میں مولانا عبدالماجد بدایونی پیش پیش تھے ۔ مولانا بدایونی کو جمعیۃ سے یہ شکایت تھی کہ جمعیۃ نے اسی ہزار روپے کا حساب کتاب پیش نہیں کیا ۔ چنانچہ مولانا ماجد بدایونی ایک مرتبہ کان پور گئے اور وہاں پر اپنے ہم خیال علماء اور احباب سے اس بات کا گلہ شکوہ کیا ۔ پھر کچھ عرصے بعد کان پور میں ایک جلسہ منعقد کیا ۔ اس جلسے کے سلسلے میں مولانا عبدالحامد مرحوم بدایونی نے اپنی صدری یادداشت میں راقم الحروف کو یہ بات قلم بند کرائی ہے کہ مولانا عبدالماجد بدایونی نے کان پور میں علماء و مشائخ کا ایک مرکزی جلسہ طلب کیا (مرحوم نے اس جلسے کی تاریخ انعقاد قلم بند نہیں کرائی کیونکہ وہ انھیں صحیح یاد نہیں تھی) جس میں برصغیر کے صوبہ جات سے تقریباً آٹھ سو علماء و مشائخ مدعو تھے ۔ جو مذکورہ جلسے میں شریک ہوئے ۔ جلسے کی صدارت مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے کی اور مولانا محمد علی بھی شریک جلسہ تھے ۔ مولانا حسرت موہانی نے خطبہ استقبالیہ پڑھا اور اس جلسے میں بہت سی تجاویز پیش ہوئیں[1] ۔

---

۱ ۔ ''صدری یاداشت مولانا عبدالحامد بدایونی'' ، مرتبہ راقم الحروف ، ۲۲ مارچ ۱۹۷۰ء ، ص ص ۱۸-۱۹ (غیر مطبوعہ)؛ ''علی برادران'' ، ص ۳۸

اس طرح علماء کی صف میں پھوٹ پڑ گئی اور کان پور میں ایک متوازی جمعیة علماء قائم ہو گئی ۔

مولانا محمد علی اور موتمر اسلامی (کان پور)

صالح الدین خان ، مرتب ''حیات جوہر،، نے بیان کیا ہے کہ مولانا محمد علی جمعیة علماء ہند کے رکن اعلیٰ کی حیثیت سے عرصے تک ایک سرگرم کارکن تھے ۔ مگر وہ جمعیة کے سیاسی مسلک اور ان کی تحریک سے کلیتاً متفق نہ تھے[1] ۔ ۱۹۲۹ء میں شاردا ایکٹ کے خلاف ، دہلی میں جمعیة علماء ہند کا ایک جلسہ ہو رہا تھا ۔ بقول مولانا عبدالحامد بدایونی اس جلسے کی صدارت پر ، مولانا محمد علی ، قادری برادران اور جمعیة علماء ہند میں نزاع پیدا ہوا ۔ کچھ لوگ مولانا محمد علی کی صدارت کے خواہاں تھے ۔ جب کہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے مفتی کفایت اللہ کا نام صدارت کے لیے پیش کر دیا ۔ اس کی بناء پر مولانا محمد علی معہ اپنے رفقاء جلسہ گاہ سے چلے گئے ، اور جمعیة علماء ہند سے روابط منقطع کر لیے ۔ مولانا حامد بدایونی نے مزید بیان کیا کہ اس کے بعد کان پور کی قائم شدہ جمعیة کو مستحکم کیا گیا[2] ۔

مرتب ''حیات جوہر'' نے بیان کیا ہے کہ :

''مولانا محمد علی نے شاردا ایکٹ کی مخالفت میں ، جمعیة علماء ہند کے ساتھ برابر کام کیا ۔ لیکن مولانا محمد علی یہ چاہتے تھے کہ علماء کو سیاسی معاملات میں مجھ سے مشورہ لینا چاہیے اور اگر کوئی مذہبی مسئلہ ہو تو مجھے علماء کی طرف رجوع کرنا چاہیے'' ۔

ایک دوسری وجہ مرتب ''حیات جوہر'' نے یہ بیان کی ہے کہ :

''موجودہ تحریک میں ، برادران وطن (یعنی غیر مسلموں) کے ساتھ غیر مشروط طور پر علماء کا شریک ہونا بھی مولانا محمد علی کو پسند نہ تھا چنانچہ مولانا محمد علی نے ایک دوسری کمیٹی بنام 'موتمر اسلامی' قائم کی''[3] ۔

---

۱ ۔ صالح الدین خان لشتر بلرامی ، ''سوانح عمری مولانا محمد علی جوہر'' ، علی گڑھ ، ۱۹۳۱ء ، ص ۶۹

۲ ۔ ''صدری یادداشت مولانا عبدالحامد بدایونی'' ، (مرتبہ) راقم الحروف ، ۲۲ مارچ ۱۹۷۰ء ، ص‌ص ۱۸-۱۹ (غیر مطبوعہ)

۳ ۔ ''حیات جوہر'' ، ص‌ص ۲۲-۲۳

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب نے اپنی کتاب "علماء ان پالیٹکس" میں یہ بات تحریر کی ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کی قیادت ایک آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ فرد (یعنی مولانا محمد علی) نے ۱۹۲۹ء تک کی ۔ سوائے شدھی اور سنگھٹن کے مسئلے میں ، جس میں مولانا محمد علی نے جمعیۃ کی پالیسی سے اختلاف کیا تھا ۔ ڈاکٹر صاحب نے آگے چل کر یہ بات بھی کہی ہے کہ ۱۹۲۹ء تک مولانا محمد علی کانگریس کے ساتھ تھے ۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ فرمانا نہ صرف تعجب خیز ہے بلکہ نفس الامر کے بھی خلاف ہے ۔ چونکہ ۱۹۱۹ء میں جب کہ ۲۳ نومبر کو جمعیۃ قائم ہوئی تو مولانا محمد علی نظر بند تھے ۔ یکم نومبر ۱۹۲۱ء کو (حسب تفصیل صفحہ ۲۰۲) دو سال کے لیے نظر بند ہوگئے ۔ ۱۹۲۲-۲۳ء میں قادری (بدایونی) برادران نے (حسب تفصیل سابق) جب جمعیۃ علماء کان پور قائم کی تو مولانا محمد علی اس میں شریک تھے ۔ پھر ۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۶ء شدھی و تحریک سنگھٹن کے ایام میں بقول خود ڈاکٹر قریشی صاحب مولانا نے جمعیۃ کی پالیسی سے اختلاف کیا ۔ پھر ۱۹۲۹ء میں ایک علیحدہ "موتمر اسلام" قائم کی ۔ مزید برآں مولانا محمد علی کبھی کسی وقت بھی جمعیۃ کے صدر یا معتمد نہیں رہے ۔ علاوہ ازیں ۱۹۲۶ء تا ۱۹۳۰ء تک جمعیۃ کے تعلقات کانگریس کے ساتھ کشیدہ تھے ۔ جب کہ مولانا محمد علی کانگریس کے ہمنوا تھے ۔ ان تمام وجوہات کے پیش نظر یہ بات صحیح نہیں کہ مولانا محمد علی نے جمعیۃ کی قیادت یا رہبری کی[1] ۔

مختصر یہ کہ مولانا محمد علی کو جمعیۃ علماء ہند سے ذاتی شکایات پیدا ہوئیں ۔ جن کی بناء پر انہوں نے ۲۲ دسمبر ۱۹۲۹ء کو کان پور میں "موتمر اسلامی" کے نام سے ایک جلسہ طلب کیا ۔ اس جلسے میں دیگر علماء اور حضرات مشائخ کے علاوہ مولانا عبدالماجد بدایونی نے بھی شرکت کی ۔ اس کا دوسرا اجلاس ۲۳ دسمبر کو منعقد ہوا ، جس کی صدارت مولانا محمد علی نے کی اور اس جلسے میں دس تجاویز منظور ہوئیں ۔ جن میں سے ایک تجویز کے محرک مولانا عبدالماجد بدایونی تھے ۔ ان تجاویز میں ، نہرو رپورٹ کی مخالفت ، شاردا ایکٹ سے مسلمانوں کا استثنٰی ، گول میز کانفرنس میں معتمد رہنماؤں کی شرکت کی حمایت اور دیگر تجاویز شامل تھیں ۔ بقول مولانا عبدالحامد بدایونی ، اس جماعت نے بعد کو کان پور کی قائم شدہ جمعیۃ کو مستحکم اور مضبوط کیا ، اور جمعیۃ علماء ہند اور جمعیۃ علماء کان پور کا یہ افتراق و علیحدگی ۱۹۳۷ء تک

---

1. I.H. Qureshi, *Ulema in Politics*, Karachi, 1972, p. 300;

رئیس احمد جعفری (ترتیب و تہذیب)، "اوراق گم گشتہ"، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ص ۵۷۷-۵۹۷

باقی رہی[1] -

جمعیۃ علماء کان پور کے قیام کے سلسلے میں ایک دوسرا بیان مولانا خواجہ نظام الدین نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں قلم بند کیا ہے - آپ لکھتے ہیں :

"ایک طبقے (کذا) کی تنگ نظری اور تعصب کی بناء پر بہت سے اکابر نہ صرف کانگریس سے بد دل ہونے لگے ، بلکہ جمعیۃ علماء سے بھی دور ہونے گئے - چنانچہ علی برادران ، مولانا عبدالماجد بدایونی اور مولانا حسرت موہانی اور دیگر حضرات نے جمعیۃ علماء ہند سے علیحدہ ہوکر ایک دوسری جماعت بنام جمعیۃ علماء کان پور قائم کی - اس جمعیۃ کی حمایت علی برادران و سر محمد یعقوب و سر ظفر اللہ خان و ڈاکٹر شفاعت احمد اور اکثر سنی علماء کر رہے تھے - مولوی مظہر الدین خان اس کے سیکرٹری تھے - اس جماعت نے شہید گنج ایجی ٹیشن کے سلسلے میں ، بدایوں میں ایک اجلاس منعقد کیا جس میں مقتدر علماء نے شرکت کی"[1] -

مندرجہ بالا تینوں شواھد سے یہ بات متعین کی جا سکتی ہے کہ ۱۹۲۲-۱۹۲۳ء میں جمعیۃ علماء کان پور قائم ہوئی ، جس کی صدارت مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے کی - ۱۹۲۹ء میں مولانا محمد علی نے بہ حیثیت "موتمر اسلامی" ایک علیحدہ کمیٹی قائم کر کے اس کو جمعیۃ علماء کان پور سے منسلک کر دیا ، اور مولانا خواجہ نظام الدین کے بیان سے اس بات کی مزید تصدیق ہو جاتی ہے کہ یہ جماعت ایک ہی تھی جو جمعیۃ علماء کان پور کے نام سے شروع سے ہی کام کر رہی تھی - مگر اس امر میں مندرجہ ذیل نکات، تاہم غور طلب ہیں :

---

۱ - "حیات جوہر" ، ص‌ص ۳۲-۳۹ ؛
"صدری یادداشت مولانا عبدالحامد بدایونی" (مرتبہ) راقم الحروف، ص‌ص ۲۰۱-۲۰۲ (غیر مطبوعہ) ؛
"اوراق گم گشتہ" ، ص‌ص ۵۷۷-۵۹۲
(نوٹ : مولانا حامد بدایونی مرحوم نے اپنی یادداشت میں قلم بند کرایا ہے کہ قادری (بدایونی) برادران اور مولانا محمد علی جوہر کو ، جمعیۃ علماء ہند کے اکابروں سے ذاتی مخاصمت پیدا ہوئی - جس کی بناء پر "موتمر اسلامی" قائم ہوئی اور کان پور کی قائم شدہ جمعیۃ علماء کو مستحکم کیا گیا - اس بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ "موتمر اسلام" کا رابطہ ، جمعیۃ علماء کان پور سے منسلک کیا گیا - "صدری یادداشت حامد بدایونی" ، ص‌ص ۲۰-۲۱)
۲ - "جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ" ، ص‌ص ۹۳-۹۶
(نوٹ : سر ظفر اللہ خان کی حمایت کی تائید یا تردید کسی دوسرے حوالہ سے نہ ہو سکی - راقم)

(الف) جمعیۃ علماء کان پور کا قیام ۲۳-۱۹۲۲ء میں مولانا عبدالباری کی صدارت میں عمل میں آیا ۔

(ب) مؤتمر اسلامی کا قیام ۱۹۲۹ء میں مولانا محمد علی کی صدارت میں عمل میں آیا ۔

(ج) مولانا نظام الدین کے بیان کے مطابق شہید گنج ایجی ٹیشن میں اس جمعیۃ نے اپنا احتجاجی اجلاس بدایوں میں منعقد کیا ۔ مسجد شہید گنج کا واقعہ ۱۹۳۵ء میں رونما ہوا تھا ۔

مولانا عبدالباری کا انتقال ۲۰ جنوری ۱۹۲۶ء کو ہوا اور مولانا باری کی وفات سے قبل اور بعد ، یعنی دسمبر ۱۹۲۹ء تک اس جمعیۃ کی کسی قسم کی کارکردگی کے متعلق عصر حاضر کے تذکروں میں کوئی مواد دستیاب نہ ہو سکا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علی برادران کو جمعیۃ علماء ہند سے (حسب تفصیل سابق) کوئی ذاتی مخاصمت اس نوعیت کی ہوئی ہوگی ، جس کی بناء پر مولانا محمد علی نے ۱۹۲۹ء میں ایک دوسری جمعیۃ بنام "مؤتمر اسلامی" قائم کی اور یہ بھی گمان اغلب ہے کہ جمعیۃ علماء کان پور کے روح رواں مولانا عبدالماجد بدایونی بھی مولانا محمد علی کے ہم خیال اور ہم شریک ہوگئے ہوں گے ۔ للہذا انھوں نے اس نوزائیدہ کمیٹی کی بقاء اور استحکام کو اس بات میں مضمر سمجھا ہوگا کہ اس کا تعلق جمعیۃ علماء کان پور (جس کا برائے نام وجود کان پور تک ہی محدود تھا) سے قائم کر دیا جائے ، تا کہ اس کے سہارے پر یہ جماعت قائم رہ سکے ۔ وگرنہ طبقۂ علماء میں سے اس جماعت کی حمایت اور تائید کون کرتا ۔ جب کہ جمعیۃ علما ءھند سے مولانا محمد علی نے اپنے تعلقات پہلے ہی کشیدہ کر لیے تھے ۔

تیسری بات مولانا خواجہ نظام الدین نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں یہ بیان کی ہے کہ جمعیۃ کان پور نے "مسجد شہید گنج لاہور" کے حادثہ پر ایک احتجاجی جلسہ منعقد کیا ۔ مسجد کا یہ واقعہ ۱۹۳۵ء میں رونما ہوا تھا ۔

اول و دوم (متذکرہ بالا) بیانات سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ جمعیۃ علماء کان پور کا اپنا کوئی انفرادی وجود نہ تھا ۔ نیز یہ کہ مصنف "حیات جوہر" نے بھی "موتمر اسلام" کے دو اجلاس یعنی ایک "کان پور" اور دوسرا "امروھہ" میں منعقد ہونا بیان کیا ہے اور اس کے بعد اس جماعت کی کوئی کارکردگی یا سرگرمی کسی مصنف نے بیان نہیں کی ۔ مولانا نظام الدین نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ یہ جماعت وہ ہی تھی ، جسے قادری (بدایونی) برادران نے ۲۳ - ۱۹۲۲ء میں قائم کیا تھا اور اس کی حمایت علی برادران

بھی کرتے رہے تھے۔ تو پھر یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مولانا محمد علی ۱۹۲۹ء تک جمعیۃ علماء ہند کے رکن بھی رہے اور جمعیۃ علماء کان پور کی حمایت بھی کرتے رہے (یہ ایک بوالعجبی ہے) ۔ پھر مولانا نظام الدین نے آگے چل کر یہ بیان کیا ہے کہ مسجد شہید گنج لاہور کی حمایت میں ایک جلسہ منعقد ہوا ۔ جس کی سرپرستی اکابر جمعیۃ علماء کان پور نے کی ۔ یہ واقعہ ۱۹۳۵ء کا ہے ۔ مقام حیرت یہ ہے کہ یہ جماعت ۲۳-۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۵ء تک ، بقول مولانا نظام الدین قائم رہی ۔ مگر کسی مؤرخ نے اس کے متعلق یہ بات بیان نہیں کی کہ اس جماعت کا صدر دفتر کہاں تھا ؟ اس کے عہدیداران کون کون تھے ؟ اس کا منشور کیا تھا ؟ اس کے قواعد و ضوابط کیا تھے ؟ بہرحال یہ عقدہ ابھی تک حل نہ ہو سکا ۔ تحقیق سے اتنی بات تو ضرور واضح ہوگئی کہ جمعیۃ علماء کان پور نے کوئی ٹھوس اور تعمیری کام انجام نہیں دیا ۔ نیز جماعت کی تاسیس ، تنظیم ، اغراض و مقاصد وغیرہ بھی مرتب نہیں ہو سکے تھے ۔ لہٰذا اس جماعت کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ یہ تھوڑے عرصے تک یا دیر تک زندہ و قائم رہی، اب بھی تحقیق طلب ہے[1]۔ بہ ظاہر یہ جماعت علی برادران اور قادری برادران کی ساختہ پرداختہ تھی اور اس کے قیام کے پیچھے کوئی اعلیٰ مقاصد کارفرما نظر نہیں آتے ، نہ ہی اس نے ہم عصر سیاست میں کوئی نشان چھوڑا ۔

جمعیۃ علماء اور سیاست ملکی :

جمعیۃ علماء ہند ، اصل میں مسلمانان ہند کی مذہبی اور سیاسی رہنمائی کے لیے قائم ہوئی تھی ۔ ''مذہبی رہنمائی'' کی ترکیب تو بہت مختصر ہے مگر بقول مولانا محمد میاں اس کے اندر ''اسلام کے احکام ، عبادات ، معاملات ، تنظیم بلاد و حراست ممالک اسلامیہ'' وغیرہ سب ہی داخل ہیں[2] ۔ شارع علیہ السلام نے ہر موقع کے لیے احکامات صادر فرمائے ہیں اور فقہائے اسلام نے کلیات سے جزئیات استنباط کرکے ان کو مدون کیا ہے تاکہ

---

۱ - ''علی برادران''، ص ۳۸؛ ''حیات جوہر'' (سوانح عمری مولانا محمد علی جوہر)، ص‌ص ۳۲-۳۹؛ ''یاد داشت مولانا عبدالحامد بدایونی'' مرتب ڈاکٹر ایچ - بی خان ، ص‌ص ۱۸-۱۹ (غیر مطبوعہ)؛ ''اوراق گم گشتہ'' ، ص ۵۷۷ -

۲ - ''جمعیۃ علماء کی شرعی حیثیت'' ، ص ۳

(نوٹ : مولانا محمد میاں نے اپنی کتاب ''جمعیۃ علماء کی شرعی حیثیت'' کے صفحہ ۵ پر ''کتاب السید'' لکھا ہے ۔ جس کے تحت جہاد ، اسر و غنیمت ، بدلہ وغیرہ کا بیان ہے ۔ غالباً یہ کتابت کا سہو ہے ۔ چوں کہ ''کتاب السید'' کتب فقہ میں کہیں موجود نہیں ہے ۔ بلکہ اصل لفظ ''کتاب السیر'' ہے اور ''بدلہ'' بھی کوئی لفظ نہیں بلکہ اصل لفظ ''فدیہ'' ہے - ''جمعیۃ علماء کی شرعی حیثیت''، ص‌ص ۳-۵)

اہل ایمان اس پر عمل پیرا ہو کر فلاح دین و دنیا سے ہم کنار ہوں[1] - ان احکامات کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ :

"کتب فقہ میں جہاں صلوٰۃ ، صوم ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ عبادات کا ذکر ہے ، وہاں "بیع و شرا ، شفعہ و رہن ، ودیعت و کفالت و ضمانت" وغیرہ معاملات کے احکامات بھی بیان کیے گئے ہیں - اسی کے ساتھ ساتھ "جہاد ، اسر و غنیمت ، ھدنہ (کذا صحیح فدیہ)، صلح ، معاہدہ ، ذمی و مستامن اور حربی" وغیرہ کے احکامات مذکور ہیں - جن کا براہِ راست ، سیاسیات عالم اور نظام ممالک سے تعلق ہے اور اگر مسلمانوں پر کوئی غیر مسلم طاقت مسلط ہو جائے تو اس کے متعلق بھی احکامات کتب فقہ میں کماحقہ درج ہیں[2] -"

مندرجہ بالا تشریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کی زندگی کا کوئی شعبہ مذہب سے مستغنی نہیں ہو سکتا - برصغیر میں غیر مسلم اور مسلم ، سب ہی آباد ہیں - للہذا غیر مسلموں سے معاملات کرنے کےلیے ہمیں شرعی ہدایت اور رہنمائی کی ضرورت ہے - چناں چہ برصغیر کے مسلمانوں کو شرع کی حدود میں رہ کر غیر مسلموں سے معاملات کرنے ہیں اور یہ بھی دیکھنا ہے کہ شرع نے ہمیں غیر مسلموں اور حکومت موقتہ سے معاملات کرنے کا کس حد تک مجاز کیا ہے - دوسری جانب عالم اسلام کے ساتھ تعلقات قائم کرنے اور ان کے ساتھ ہمدردی یا تعاون و تناصر کے احکامات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے[3] - واقعہ یہ ہے کہ اگر سیاست کو مذہب سے کوئی تعلق یا لگاؤ نہیں ہے تو پھر کتب فقہ میں سے ابواب جہاد ، اسر و غنیمت وغیرہ کو یکسر خارج کر دینا چاہیے اور اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو پھر یہ بات بھی واضح ہے کہ معاملات سیاست کے اس حصہ میں جس کا تعلق مذہب سے ہے ، مسلمانوں کو علماء کی اتنی ہی ضرورت ہے ، جس قدر کہ مسائل عبادات و معاملات میں ہے[4] - بایں ہمہ ایک بڑی اہم بات یہ ہے کہ مسائل عبادات و معاملات میں علماء کے انفرادی فتویٰ بھی کافی ہو سکتے ہیں - مگر معاملات کلی و اساسی میں علماء کی انفرادی آراء یا فتاویٰ ہرگز مفید و موثر نہیں ہو سکتے - ملکی مسائل کو حل کرنے کے لیے علماء کی کوئی تنظیم یا اجتماع ہونا بہت ضروری ہے تاکہ ملک کو پیش آمدہ سیاسی مسائل کے حل کرنے میں علماء کی رہنمائی اور مشورہ حاصل

---

۱ - "جمعیۃ علماء کی شرعی حیثیت" ، ص‌ص ۴-۵
۲ - ایضاً ،
۳ - ایضاً ، ص ۵
۴ - ایضاً ، ص‌ص ۵-۶

کرنے میں آسانی اور سہولت پیدا ہو ۔ ان وجوہات کی بناء پر جمعیۃ علماء ہند نے اپنی تنظیم قائم کی تاکہ ہندوستان اور بیرون ہندوستان ، مسلمانان عالم کی عموماً اور مسلمانان ہند کی خصوصاً سیاسی رہنمائی کر سکیں ۔ نیز ان کے پیش نظر یہ بات بھی بہت ضروری تھی کہ وہ اسلامی ممالک میں مقامات مقدسہ کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ، شعائر اسلام کی حفاظت اور دین کے احیاء و بقاء کے لیے بھرپور کوشش کریں ۔

اب سے تقریباً ایک صدی پہلے جب برصغیر میں رفتہ رفتہ سیاسی بیداری کا آغاز ہوا تو اسی زمانے میں بعض مسلمان ایسے بھی تھے ، جو سیاسی جد و جہد میں برصغیر کی دیگر قوموں کے ساتھ اتحاد و تعاون پر زور دیتے تھے اور بعض افراد ایسے تھے ، جو مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم کے حامی تھے ۔ علماء دیوبند اور علماء لدھیانہ نے کانگریس کی تاسیس کے وقت سے ہی مسلمانان ہند کو یہ مشورہ دیا تھا کہ ملک کو آزاد کرانے میں غیر مسلم برادران کے ساتھ مل کر متحدہ کوشش کرنی چاہیے ۔ جمعیۃ علماء کی تاسیس سے پہلے بھی بیشتر علماء کا یہی موقف تھا اور اس کی روشن مثال شیخ الہند مولانا محمود حسن ، مولانا عبیداللہ سندھی ، اور ان کے متبعین کی ہے[1] ۔ جنگ عظیم اول کے بعد کی بدلی ہوئی فضا میں ہندو اور مسلم رہنماؤں میں اس بات کا احساس مزید قوی ہوگیا کہ برصغیر کی تمام قوموں کو مل جل کر آزادی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے ۔ جمعیۃ نے شروع سے ہی یہ پالیسی اختیار کی کہ دیگر سیاسی جماعتوں کے ساتھ مل کر اسلامی حقوق اور قومی مفاد اور قومی بقاء و حفاظت کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے تاکہ حصول آزادی میں دیگر سیاسی جماعتوں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے جمعیۃ کی طاقت مضبوط ہو اور اس کی آواز میں ایک وزن اور اس کی بات میں اثر پیدا ہو سکے ۔ اس خیال کے پیش نظر جمعیۃ نے ملک کے سیاسی مسائل کو طے کرنے میں کانگریس ، مسلم لیگ اور ہوم رول لیگ وغیرہ کے ساتھ اشتراک و تعاون کی پالیسی اختیار کی[2] ۔

جمعیۃ علماء کا دائرہ اثر ، طبقے اور علاقے :

جمعیۃ علماء ہند ، علماء کے مختلف الخیال افراد ، مشائخ و اکابر اور مدبرین پر مشتمل تھی ۔ نیز اس جماعت کے ساتھ علماء دیوبند ، علماء بریلی ، علماء لکھنؤ ، علماء پنجاب و لدھیانہ ، نیز مشائخ حضرات ممد و معاون رہے ۔ اکابر و سیاسی مدبرین میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور حکیم اجمل خان اور حکیم ابو یوسف اصفہانی وغیرہ شامل تھے ۔

---

1. *Muslim Separatism in India : A Brief Survey*, p. 117;
Sedition Committee Report, 1918, pp. 177-78.

۲ ۔ "علی گڑھ گزٹ" ، ۱۰ اپریل ۱۹۲۵ء ، ج ۴ ، نمبر ۳۲۲ ، ص ۲ ، ک ۲

مشائخ میں پیر محمد امام شاہ سندھی جیسے بزرگ بھی شریک کار تھے ۔ غرض یہ کہ ملک کے مفتیان ، مولویان ، مشائخ اور اکابر و مدبرین سب ہی اس جماعت کے کاموں میں شریک و مددگار تھے[۱] ۔ "علی گڑھ گزٹ" نے ۱۹۲۵ء میں تحریر کیا تھا کہ عام طبقہ قوم پر علماء کا اثر علیٰ وجہ الکمال ثابت ہے ۔ کیونکہ کسی دینی یا شرعی مسئلے میں "سر آغا خان یا سید امیر علی یا محمد علی جناح کی بات کا وہ اثر نہیں ہو سکتا جو ایک مولوی صاحب کسی بات کو مذہبی رنگ میں سمجھا دیں تو ہزارہا خلائق اس کی گرویدہ ہوکر اس بات پر عمل پیرا ہوگی[۲] ۔"

جمعیۃ علماء اور خاص خاص ادارے :

جمعیۃ علماء ہند کی تاسیس سے ماقبل زمانے میں بھی مسلمانوں کے مختلف طبقے اور ادارے حسب استعداد و استطاعت، تعلیمی ، اصلاحی، سیاسی اور نیم سیاسی تحریکات میں حصہ لیتے رہے تھے ۔ اس سبیل میں خاص طور سے دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ کالج کے ادارے پیش پیش تھے ۔ دارالعلوم دیوبند ، چونکہ شاہ ولی اللہ کی اصلاحی اور سیاسی تحریک سے روحانی اور جسمانی واسطہ رکھتا تھا ۔ اس لیے اس ادارۂ نے مسلمانان ہند کی اسلامی نظام حیات اور تعلیمی میدان میں رہنمائی کی ۔ ان اداروں کے ساتھ زیادہ تر متوسط اور ادنیٰ متوسط طبقے کے لوگ شریک تھے ۔ اعلیٰ طبقہ کے کچھ افراد بھی جمعیۃ کے ساتھ شروع سے ہی وابستہ رہے ۔ ان حضرات میں حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری وغیرہ شامل تھے ۔ انہوں نے جمعیۃ کی کارکردگی اور خلوص کو سراہتے ہوئے بھرپور تعاون و مدد کی ۔ راقم الحروف کو کوئی تحریری مواد تو حاصل نہ ہو سکا ، جس سے یہ پتا چل سکے کہ طبقہ اعلیٰ کے افراد کس حد تک جمعیۃ سے متفق تھے ۔ مگر قیاس کہتا ہے کہ اس طبقے کے کچھ افراد جمعیۃ کے ساتھ تعاون کرتے رہے ۔

ایک دوسرا ادارہ علی گڑھ کالج کا تھا ۔ اس کے بانی سرسید احمد خان شروع ہی سے ایجی ٹیشنل سیاست میں حصہ لینے کے مخالف تھے اور کانگریس کی تشکیل کے بعد موصوف نے مسلمانان ہند کو کانگریس میں شریک ہونے سے منع کیا تھا ۔ سرسید کے ساتھ خاص طور پر ملک کا پڑھا لکھا اور متوسط طبقہ تھا ۔ سرسید کی وفات کے بعد ان کی پالیسی کو نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک نے آگے بڑھایا اور ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم کی ۔ اس لیگ کا مقصد مسلمانوں کی جداگانہ نیابت کو تسلیم کرانا تھا اور حق رائے

---

۱ ۔ "جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ" ، ص ۶۵-۸۷؛ "جمعیۃ علماء کیا ہے ؟" ، ص ۲۳

۲ ۔ "علی گڑھ گزٹ" ، ۱۰ اپریل ۱۹۲۵ء ، ج ۳ ، نمبر ۲۲۲ ، ص ۲ ، ک ۱

دھی بھی جداگانہ انتخاب کی بنیاد پر طلب کیا گیا تھا ۔ غرض یہ کہ یہ دو جداگانہ اور مختلف مکتب فکر علیحدہ علیحدہ مسلم جمہور پر اپنا اپنا اثر رکھتے تھے ۔

جمعیۃ کے خاص اثر کے علاقے :

جیسا کہ سطور بالا میں بیان کیا جا چکا ہے کہ جمعیۃ علماء ہند میں زیادہ تر دیو بندی مسلک کے علماء تھے اور مجموعی طور پر مسلک و عقائد کے علماء شریک تھے ۔ دارالعلوم دیوبند کے قیام کے بعد ، اس ادارے نے شہروں ، قصبوں اور مواضعات تک میں اپنے ذیلی مدارس قائم کیے تھے ۔ ان مقامات میں خاص طور پر یوپی میں بجنور ، مظفر نگر ، سہارن پور ، میرٹھ ، آگرہ اور دیگر اضلاعات شامل تھے ۔ مشرقی بنگال میں خصوصاً ڈھاکہ اور آسام میں دیوبندی حضرات کا کافی اثر تھا ۔ کراچی میں مولانا محمد صادق ، شیخ الہند کے خصوصی تربیت یافتہ اور جمعیۃ علماء ہند کی صوبہ سندھ کی شاخ کے امیر اور روح رواں تھے ۔ مولانا محمد صادق اپنی سیرت اور کردار کی بناء پر عوام و خواص میں مقبول تھے ۔ جس کے نتیجے میں بہت سے مشرکین آپ کے دست حق پر مشرف بہ اسلام ہوئے ۔ جن میں سندھ کے مشہور بزرگ عبدالمجید سندھی بھی شامل ہیں ۔ سرحد اور پنجاب میں بھی جمعیۃ کے کافی اثرات تھے ۔ دیوبند اسکول کی تعلیمی ترقی اور اس کے ذیلی اداروں نے جمعیۃ کے کاموں میں کافی مدد اور سہولت پیدا کی ۔ جس کے نتیجے میں جمعیۃ علماء ہند ان علاقوں میں خاص طور پر مقبول و معروف ہوگئی ۔ جہاں جہاں جمعیۃ کے اکابر اور ان کے تلامذہ درس و تدریس میں مشغول و مصروف تھے ۔

جمعیۃ کے مؤسسین اولی حسب ذیل مقامات سے تعلق رکھتے تھے :

مقام	مؤسس اولی کا نام
لکھنؤ (یوپی)	مولانا قیام الدین عبدالباری ، فرنگی محلی
دہلی	مفتی کفایت اللہ
دہلی	مولانا احمد سعید
سندھ	مولانا تاج محمود
سندھ	مولوی پیر تراب علی
امرتسر (پنجاب)	مولانا ابو الوفا ثناء اللہ

مقام	مؤسس اولی کا نام
امرتسر (پنجاب)	مولانا بخش (کذا ، صحیح مولا بخش)
سیالکوٹ (پنجاب)	مولانا محمد ابراہیم
بہار	مولانا سید محمد سجاد
بہار	مولانا عبدالحلیم (تلمیذ رشید مولانا سجاد)
بہار	مولانا رکن الدین
الہ آباد (یوپی)	مولانا محمد فاخر
در بھنگہ (بہار)	مولانا محمد ابراہیم
کلکتہ (بنگال)	مولانا محمد اکرم خاں
چٹا گانگ (بنگال)	مولانا منیر الزمان خان اسلام آبادی
مظفر پور (بہار)	مولانا خدا بخش
کراچی (سندھ)	مولانا محمد صادق
لاہور (پنجاب)	مولانا سید محمد داؤد غزنوی
کان پور (یوپی)	مولانا عبدالقادر آزاد سبحانی
بدایوں (یوپی)	مولانا عبدالماجد بدایونی } قادری برادران
بدایوں (یوپی)	مولانا عبدالحامد بدایونی } قادری برادران
بدایوں (یوپی)	مولانا عبدالقدیر
بمبئی	مولوی عبداللہ
بمبئی	مولوی سیف الدین
پانی پت (پنجاب)	مولانا احمد اللہ
دیوبند (یوپی)	مولانا شبیر احمد عثمانی اور بعدہ مولانا حسین احمد مدنی[۱]

۱ - "جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ" ، ص‌ص ۵۶-۶۵؛

"الجمعیۃ"، یکم فروری ۱۹۳۱ء ، ص ۲، ک ۱

("الجمعیۃ" نے صفحہ بالا پر ساتویں عالم کا نام مولانا بخش لکھا ہے - جو سہو کتابت معلوم ہوتا ہے - غالباً اصل نام مولی بخش ہے -)

مندرجہ بالا تمام حضرات جمعیۃ کے مؤسسین اولی اور مجلس عاملہ کے رکن تھے۔ ان علماء کرام کا حلقہ ہائے اثر صرف اپنے مکاتیب اور مدارس تک ہی محدود نہ تھا ، بلکہ عوام و خواص میں بھی وہ اپنے حسن کردار اور پاکیزہ عمل کی بناء پر معتبر اور مقبول سمجھے جاتے تھے۔

مندرجہ بالا نقشے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان کے تقریباً ہر حصے میں جمعیۃ کے اراکین اور زعماء موجود تھے۔ مزید برآں علماء کرام کا دائرہ عمل و اثر نہ صرف ہندوستان تک محدود تھا بلکہ بیرون ہندوستان میں بھی ان حضرات کا حلقۂ اثر موجود تھا۔ اصل میں اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی (جسے مختصراً سطور بالا میں بیان کیا جا چکا ہے کہ برصغیر میں عرصہ دراز سے ایک اسلامی یونیورسٹی یعنی دارالعلوم دیو بند معہ اپنے ملحقہ اداروں کے ، دینی و علمی خدمات انجام دے رہا تھا۔ یعنی ۱۸۶٦ء سے برصغیر میں اور اسلامی ممالک اور دیگر ممالک مثلاً افغانستان ، برما ، سیلون ، انڈونیشیا ، بغداد ، حجاز اور مصر وغیرہ میں دارالعلوم کی خدمات کو بڑی عقیدت اور وقار کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ ان ممالک کے طلباء اسلامی علوم کی تحصیل کے لیے جوق در جوق دیو بند آتے تھے اور تکمیل علوم کے بعد اپنے اپنے اوطان واپس چلے جاتے تھے۔ وہاں پہنچ کر درس و تدریس کا سلسلہ جاری کرتے تھے اور ان فارغ التحصیل طلباء کی بدولت غیر ممالک میں ، علماء کی خدمات کا اور ان کے علمی ، دینی اور سیاسی کارناموں کا خود بخود تعارف ہو جاتا تھا۔ تحریک ریشمی رومال سے وابستہ افراد کا غیر ممالک میں استقبال اور ان کی سیاسی و اقتصادی امداد ، ان بزرگوں کی خدمات اور عقیدت کا اندازہ لگانے کے لیے واضح اور کھلا ہوا ثبوت ہے۔ یعنی یہ کہ شیخ الہند اور مولانا عبیداللہ سندھی کو کابل ، حجاز اور ترکی کی حکومتوں نے نہ صرف اخلاقی امداد دینے کا یقین دلایا تھا بلکہ سیاسی اور فنی امداد دینے کا بھی وعدہ کیا تھا۔ بہرحال اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سر براہ علماء کا اثر طبقہ علماء پر تو تھا ہی ، مگر عوام و خواص بھی ان کے دائرہ اثر سے باہر نہ تھے۔ نیز برصغیر کے علاوہ دیگر اسلامی ممالک بھی علماء ہند کی سیاسی کارکردگی سے متاثر تھے[1]۔

۱۔ ''ایک مقدس بزرگ'' ، ص ص ۲-۵

(نوٹ : اس کتاب کے مصنف کا نام ، جائے طباعت اور سن طباعت کا پتا معلوم نہ ہو سکا۔ یہ کتاب میرے پاس موجود ہے۔ راقم)

فصل دوم

جمعیۃ علماء کی قیادت کا کردار اور اس کی نوعیت

جمعیۃ علماء ہند ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے تو ۲۳ نومبر ۱۹۱۹ء کو قائم ہوئی تھی ۔ مگر علماء کرام ، شریعت کے تحفظ اور شریعت کی ترجمانی اور مسلمانوں کے اخلاقی اور معاشی بہبود کا کام ایک مدت مدید سے کرتے آئے تھے ۔ ہندوستان میں جب تک اسلامی حکومت قائم تھی، اس وقت تک علماء کبھی بلاواسطہ اور کبھی بالواسطہ ، سیاست پر اثر انداز رہے اور محکمہ قضاء تو یکسر انھیں کی نگرانی میں رہا ۔ مگر ۱۸۶۳ء میں جب کہ برطانیہ نے عہدہ قضاء کو حکماً ختم کر دیا تو علماء کی پبلک حیثیت ، سرکاری طور پر ختم ہو گئی ۔ غالباً حکومت کا منشا بھی یہی تھا کہ علماء کی مقبولیت کو عوام میں ختم کیا جائے ۔ مگر مسلم عوام میں علماء کا اثر و وقار پھر بھی قائم رہا ۔ کیونکہ مسلم عوام اپنے معاملات اور دینی مسائل کے حل کے لیے علماء سے ہی رجوع ہوتے تھے ۔ مثلاً نکاح ، طلاق ، ختنہ ، عقیقہ ، بیع و شرا کے تمام معاملات علماء کے صلاح و مشورے کے بغیر انجام نہیں پاتے تھے ۔ سلطنت مغلیہ کے خاتمے کے بعد ، علماء نے مختلف نوعیتوں اور شکلوں میں سیاست پر اثر انداز ہونے کی کوششیں جاری رکھیں ۔ مثلاً اصلاحی تحریکات ، انقلابی تحریکات ، سماجی اصلاحات اور پھر سیاسی تحریکات وغیرہ میں ان حضرات نے فرداً فرداً اور اجتماعاً مقدور بھر حصہ لیا ۔ اس کی سب سے پہلی نمایاں مثال ، شاہ ولی اللہ کی زندگی میں اور اس دبستان فکر میں ملتی ہے ، جس کی انھوں نے بنیاد ڈالی ۔

جنگ عظیم اول کے اختتام پر ، ترکی میں سلطنت عثمانیہ کا چراغ بجھتا نظر آ رہا تھا ۔ مسلمانان ہند ، ''خلافت'' کو باقی اور قائم رکھنے کے خواہش مند تھے ۔ لہٰذا ۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت کے قیام کے فوری بعد ''جمعیۃ علماء ہند'' قائم کی گئی ۔ نیز علماء نے مصلحت وقت کے پیش نظر برصغیر کی ، دوسری آزادی پسند جماعتوں کے ساتھ مل کر سیاسی امور میں حصہ لینا شروع کیا ۔ ان جماعتوں میں سر فہرست کانگریس ، مسلم لیگ اور ہوم رول لیگ وغیرہ تھیں ۔ جمعیۃ کے اکابرین نے ان تینوں جماعتوں کے اغراض و مقاصد کا مطالعہ کیا اور پھر ملک کے بہتر مفاد کی خاطر اپنی جماعت کا سیاسی نصب العین بھی ان جماعتوں کے نصب العین سے ملتا جلتا تیار کیا[1] ۔ جمعیۃ کے قیام کا خاص مقصد یہ تھا کہ وہ جمہور مسلم کی سیاسی رہنمائی شریعت حقہ کی روشنی میں کرے ۔ نہ کہ محض دنیاوی ضروریات کے لحاظ سے کرے ۔ شریعت کے تحت جو مقاصد آتے ہیں ، ان میں ملی ،

---

۱ ۔ ''علی گڑھ گزٹ'' ، ۱۰ اپریل ۱۹۲۵ء ، ج ۳ ، نمبر ۳۲۲ ، ص ۲ ، ک ۲

اقتصادی ، مذہبی ، سیاسی اور جملہ امور شامل ہیں ۔ اس لیے کہ اسلام میں دین اور سیاست کبھی علیحدہ نہ رہے اور نہ ہی آئندہ ان کو کبھی علیحدہ کیا جا سکتا ہے[1] ۔ برصغیر کے بعض حلقوں میں علماء کے متعلق یہ سوء ظن تھا کہ دیگر اسلامی ممالک کے علماء کی طرح علماء ہند بھی مسلمانوں کی دنیاوی ترقی میں مزاحم و سنگ راہ ہوں گے ۔ مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس ظاہر ہوئی ۔ کیونکہ علماء ہند دور جدید کے تقاضوں کے حصول میں شروع ہی سے، مسلمانوں کی ترقی اور ان کی فلاح و بہبود کےلیے کوشاں رہے ۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا قدم شاہ عبدالعزیز نے اٹھایا ۔ جب کہ دنیاوی علوم حاصل کرنے کی خاطر ''انگریزی تعلیم کا حصول'' بذریعہ فتویٰ جائز قرار دے دیا[2] ۔ (جس کی تفصیلات ماسبق میں گزر چکی ہیں) نیز اس فتویٰ کی مزید تائید مولانا محمد قاسم نانوتوی اور دیگر اکابرین نے بھی کی ۔ برصغیر میں سیاسی بیداری پیدا ہونے کے بعد علماء کرام نے برصغیر کی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا ۔ ملک میں دو بڑی سیاسی جماعتیں ، کانگریس اور مسلم لیگ آگے پیچھے قائم ہو چکی تھیں ۔ مگر مسلم لیگ کی پالیسی شروع شروع میں ، حکومت سے وفاداری اور حصول خوشنودی پر مبنی تھی اور وہ راست سیاسی جد و جہد سے کتراتی تھی ۔ علماء کرام کو مسلم لیگ کی اس سیاسی پالیسی سے اتفاق نہ تھا ۔ کیونکہ علماء فرقہ وارانہ سیاست سے علیحدہ ہو کر ملک کی عام سیاست میں ایک فعال کردار ادا کرنے کے خواہاں تھے ۔ اس لیے بقول مولوی طفیل احمد منگلوری : ''مولانا شبلی ، مولانا آزاد اور مولوی وحیدالدین سلیم وغیرہ نے ۱۹۱۱ء کے بعد سے ہی مسلم لیگ کو بھی فرقہ وارانہ سیاست کے دائرہ سے نکال کر ملک کی عام سیاست میں حصہ لینے کے لیے کوشش کی'' ۔[3] (شیخ الہند ۱۸۷۹ء سے ہی ملک کی سیاست میں خفیہ اور خاموش طریقے پر کام کر رہے تھے ۔ جس کی تفصیلات ماسبق میں گزر چکی ہیں ۔ مسلم لیگ کا قیام ۱۹۰۶ء میں عمل میں آیا تھا ۔ مگر علماء کی بڑی تعداد شروع سے ہی کانگریس کی سیاسی پالیسی کی حامی تھی اور خصوصاً علماء دیو بند تو اس میں پیش پیش تھے ۔ ۱۹۲۰ء میں شیخ الہند اسارت مالٹا سے رہائی کے بعد ہندوستان واپس آئے ۔ اس وقت ملک میں دو اور نئی سیاسی جماعتیں ، خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علماء ہند جنم لے چکی تھیں ۔ ملک کے موجودہ مسائل کو حل کرنے میں اس وقت کانگریس ، مسلم لیگ ،

---

۱ ۔ ''خطبہ صدارت مولانا حسین احمد مدنی'' ، مارچ ۱۹۴۲ء ، ص ص ۲۰-۲۱ ؛ ''جمعیۃ علماء کی شرعی حیثیت'' ، ص ۲

2. Syed Moinul Haq, *The Great Revolution of 1857*, Karachi, 1968, p. 28.

۳ ۔ ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' ، ص ص ۵۴۰-۵۴۱
(نوٹ : مولوی طفیل احمد منگلوری صاحب نے اس سلسلہ کی مزید تفصیلات بیان نہیں کیں)

خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علماء ہند ، سب ہی ساتھ مل کر کام کر رہی تھیں ۔ کیونکہ میثاق لکھنؤ کے بعد ، ہندو مسلم اتحاد کے تحت سیاسی جماعتیں متحد اور متفق تھیں ۔ شیخ الہند کی سیاسی پالیسی اپنے بزرگوں یعنی مسلک ولی اللہ کے نقش قدم پر ہی تھی ۔ یعنی ملک کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے تمام قوموں کے ساتھ مل کر کام کرنا ملک کے مفاد اور عوام کی بھلائی کے لیے ضروری ہے ۔ جب تک مسلم لیگ کانگریس کے ساتھ مل کر کام کرتی رہی، اس وقت تک علماء اور شیخ الہند مسلم‌لیگ کی اس پالیسی کی حمایت کرتے رہے ۔ ۱۹۲۰ء میں جب ملک میں تحریک عدم تعاون اور عدم تشدد شروع کی گئی تو اس وقت مسلم‌لیگ کی تنظیم بقول ڈاکٹر عبدالحمید کسی خاص اہمیت کی حامل نہ تھی ۔ وہ لکھتے ہیں :

> **"The popular mind, thoroughly aroused and prepared for action, needed only the normal signal from Congress and the Khilafat (The League was not as important) (sic) organizations."[1]**

مزید برآں ، جنگ طرابلس و بلقان سے لے کر جنگ عظیم اول کے اختتام تک جو افتاد و مصائب علماء پر گزرے ، وہ انھوں نے بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کیے[۲] ۔ نیز علماء نے انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے ان مصائب کے سدباب کے لیے بھی بھرپور کوششیں کیں[۳] ۔ اس کے بعد برصغیر میں ایک ہمہ‌گیر تحریک ترک موالات اور سول نافرمانی بروئے کار آئی تو علماء نے ، اتحاد مقصد اور اتحاد ابنائے وطن کی بناء پر کانگریس کے ساتھ بھرپور اتحاد عمل کا مظاہرہ کیا ۔ مسلم لیگ نے تحریک ترک موالات میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا ۔ اس کے ساتھ ساتھ علماء نے اپنے اصل فریضۂ دین یعنی تبلیغ و اشاعت اور مذہبی تعلیم کو عام کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں برتی ۔ یہی نہیں بلکہ جمعیۃ نے نہ شدھی اور سنگھٹن کی تحریکات کو ناکام یاب بنانے کے لیے (جن کی مزید تفصیلات آئندہ باب میں پیش کی جائیں گی) تبلیغ و اشاعت و حفاظت اسلام کا ایک مستقل شعبہ قائم کیا[۴] ۔ ۲۳-۱۹۲۲ء میں جب شدھی اور سنگھٹن کی تحریکات شروع ہوئیں تو ، جاہل نو مسلموں کو مرتد بنانے کے لیے سوامی شردھا نند نے ، متعلقہ علاقوں میں اپنے

---

1. ***Muslim Separatism in India : A Brief Survey,*** p. 144.

۲ ۔ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۵۲۱

۳ ۔ ایضاً

۴ ۔ "جمعیۃ علماء کیا ہے" ؟ ص ۴۱ ؛

"مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۵۲۱

کارکن روانہ کیے ۔ جنھوں نے ارتداد کا کام کیا ۔ یہ تحریک چند سالوں تک جاری رہی ۔ جس کے نتیجے میں ، دین و شریعت کے احکامات سے لا علم مسلمانوں کو مرتد بنایا گیا ۔ جمعیۃ علماء ہند نے اس وبا کا سدباب کرنے کے لیے ایک شعبہ تبلیغ و حفاظت اسلام قائم کیا اور شدھی کے حملوں کو ناکام بنانے کے لیے بھر پور کوشش کی اور اپنی ان کوششوں میں مسلمانوں کی معاونت اور دیگر اسلامی تنظیموں کی مدد و شرکت کی بناء پر اپنے اس مشن میں کامیاب بھی ہوئی ۔ جمعیۃ کے شعبہ تبلیغ کی کوششوں سے گیارہ ہزار سے زائد مرتدین راجع بہ اسلام ہوئے اور دو ہزار سے زائد غیر مسلم ، مسلمان ہوئے ۔ علاوہ بریں جمعیۃ نے شعبہ تبلیغ کی شاخیں جا بجا قائم کیں اور ڈیڑھ سو سے زائد مدارس و مکاتیب بھی جاری کیے ۔ جن میں مذہبی اور دنیاوی علوم کی تعلیم کا بندوبست لائق مدرسین و معلمین کی نگرانی میں کیا گیا[1] ۔

شدھی ، سنگھٹن کی تحریکات اور ہندو مسلم فسادات کے نتیجے میں ، ہندو مسلم اتحاد کی تعمیر شدہ عمارت متزلزل ہوگئی ۔ اس وقت مسلمانوں کی تمام سیاسی جماعتوں میں ، جمعیۃ علماء ہی ایک ایسی مضبوط اور مستحکم جماعت تھی ، جس نے ان افتراق انگیز تحریکات کا بڑی دانشمندی اور پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا اور ان فسادات کے ستم زدہ مظلوموں کو ممکنہ اخلاقی اور اقتصادی امداد بھی فراہم کی ۔ نیز اسلامی معابد کا انتظام اور ان کی حفاظت بھی کی اور فریضہ قربانی کے مخصوص اسلامی شعائر کی حفاظت کرنے میں عملی سرگرمی کا دلیرانہ مظاہرہ کیا[2] ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ جمعیۃ نے ، اکالی سکھوں کے اس مطالبہ کی بھی تائید و حمایت کی جس کے تحت وہ اپنے مذہب کی حفاظت کے لیے کوشاں تھے ۔ جس طرح جمعیۃ نے ایسے نازک وقت میں مذہب و سیاست کو اپنے اپنے حدود کے اندر رکھ کر ان دونوں کے لیے یکساں ، مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ خدمات سرانجام دیں ، وہ کوئی آسان کام نہ تھا ۔ جمعیۃ کا یہ کارنامہ ہے کہ ایک طرف تو اس نے شریعت حقہ کو اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے تھاما ، اور دوسری طرف سیاست کے ہنگامہ خیز اور صبر آزما میدان میں، استقلال، استقامت ، جرات و ہمت اور صبر و رضا کے ساتھ قائم رہی ، اور اس نے نازک سے نازک تر واقعات پر بھی اپنے پائے استقامت میں لغزش نہ آنے دی[3] ۔ یہی نہیں بلکہ ۱۹۲۳ء میں جمعیۃ نے کونسلوں میں

---

1. *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd. ed., p. 58;

"جمعیۃ علماء کیا ہے ؟" ، ص‌ص ۳۱-۳۲

۲ ۔ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص‌ص ۵۴۱-۵۴۲

۳ ۔ ایضاً (مولوی طفیل احمد منگلوری نے سکھوں کے مطالبہ کی وضاحت نہیں کی ۔ راقم)

داخلہ کے خلاف اپنا فیصلہ صادر کرنے میں کانگریس اور خلافت کمیٹی جیسی جماعتوں پر سبقت کا اظہار کیا کیونکہ کونسلوں کے داخلہ کے سلسلے میں کانگریس میں دو گروہ بن گئے تھے ۔ ان میں سے ایک گروہ داخلہ کا مقاطعہ کرنے کے حق میں تھا جب کہ دوسرا گروہ داخلہ کے لیے کوشاں تھا ۔ مسلم لیگ کے رہنما اس وقت یا تو گوشہ نشین تھے یا پھر اس کے ممبران کونسلوں میں داخل ہو کر حکومت سے موالات کر رہے تھے ۔ لیکن جمعیۃ نے کونسلوں میں داخلہ کا کلیتاً مقاطعہ کیا[1] ۔ پھر اس جماعت نے ، ستم رسیدہ اور مظلوم موپلوں کی مالی مدد کے لیے پچاس ہزار روپے کی خطیر رقم جمع کر کے روانہ کی ۔ تاکہ وہ اپنے آلام و مصائب میں، اس رقم سے کچھ سہولت مہیا کرسکیں ، اور ان مظلوموں کی ضروریات زندگی ، آرام و آسائش سے مہیا ہو سکیں[2] ۔ ۲۳-۱۹۲۲ء میں جمعیۃ اور کانگریس کا اشتراک کمزور ہوگیا تھا ۔ ملک میں سیاسی انتشار روز بروز بڑھتا جا رہا تھا ۔ جمعیۃ نے ملک کی موجودہ سیاسی حالت کا اندازہ کر کے اپنے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۴ مارچ ۱۹۲۶ء بمقام کلکتہ زیر صدارت سید سلیمان ندوی حسب ذیل اہم تجاویز منظور کیں :

"چونکہ برادران وطن (اہلِ ہنود) کے مخالفانہ طرز عمل سے منافرت کی خلیج وسیع ہو رہی ہے ۔ اس لیے مسلمان اپنی تنظیم کر کے ، اپنے بل بوتے پر ملک کو آزاد کرائیں ، البتہ جو غیر مسلم حضرات اس بارے میں اتحاد عمل کرنا چاہیں تو ان کے ساتھ اتحاد عمل کیا جائے" ۔

اس کے لیے عملی کام یہ ہیں کہ :

(ا) "مسلم قوم عموماً اور علماء بالخصوص سیاسی امور میں غور و خوض کیا کریں اور تبلیغ کیا کریں ۔

(ب) آزادی ہند کے فریضہ ہونے (کے) مذہبی، مالی، ملکی وجوہ و اسباب کو نہایت غور و خوض سے دریافت کریں ، اور لوگوں کو سمجھائیں ۔ دیگر مذہبی امور کی اشاعت کی طرح اس کو بھی ضروری سمجھیں ۔ آزادی اور دیگر حقوق کے سلب ہونے کی مضرتوں اور مفاسد کی اشاعت نہایت پر امن طریقہ سے کر کے ہر مسلمان کو زندہ کریں ۔

۱ ۔ "تواریخ کانگریس" ، ص‌ص ۴۰۵-۴۱۲؛
"مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص‌ص ۵۳۰-۵۳۱

۲ ۔ ایضاً ، ص‌ص ۵۳۰-۵۳۱
"جمعیۃ علماء کی شرعی حیثیت"، ص ۱۰

(ج) قومی اخبارات اور رسائل کو جو آزادی پر روشنی ڈالتے ہیں ، مطالعہ کیا کریں ؛ اور

(د) مسلمانوں سے افلاس دور کرنے کی کوشش کریں"[۱] ۔

جمعیۃ نے اپنے قیام کے دن سے ہی مسلمانان ہند میں سیاسی شعور بیدار کرنے کی مہم شروع کر دی تھی ۔ جمعیۃ کا مطمح نظر یہ تھا کہ برصغیر کو آزاد کرانے کے لیے ملک کی تمام سیاسی قوتیں یکجا جمع ہوکر متحدہ کوشش کریں مگر یہ کوششیں بروئے کار نہ آ سکیں اور کانگریس و مسلم لیگ نے اپنا اتحاد ختم کر دیا ، اور ملک میں ہندو مسلم فسادات کی بناء پر، ہندو مسلم اتحاد بھی قائم نہ رہ سکا اور کونسلوں کے مقاطعہ کے سوال پر کانگریس بھی دوگروہوں میں تقسیم ہوگئی تو پھر جمعیۃ نے تن‌تنہا ملک‌کو آزاد کرانے کی قرار داد پاس کی اور کسی دیگر سیاسی جماعت کے تعاون کے بغیر ، اپنے مشن کو آگے بڑھانے اور اسے کامیاب کرانے کے لیے برابر کوشاں رہی ۔ جمعیہ" نے سخت سے سخت نامساعد حالات میں بھی اپنی کوشش اور جد و جہد میں لچک پیدا نہیں کی اور نہ ہی نامساعد حالات کی بناء پر ، دل برداشتہ ہوکر عزلت نشین ہوئی ۔ بلکہ استقلال و جرأت کے ساتھ ملک کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے برابر کوششیں کرتی رہی ۔

ایک قابلِ غور امر یہ بھی ہے کہ جمعیۃ علماء کو ، کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کی بناء پر مخالفین ، جمعیہ" اور اس کے صدر و ناظم اور دیگر کارکنان کو کانگریس کا تنخواہ دار ایجنٹ کہتے تھے ، اور ساتھ ہی یہ بھی بہتان و الزام تھا کہ جمعیہ" کی تمام تحریک کانگریس فنڈ سے چلتی ہے ۔ اس الزام کے جواب میں مولانا ابوالغیاث شیخ کریم الدین میرٹھی نے ، جو جنوبی ہند میں بطور نمائندہ جمعیۃ علماء ہند ، پندرہ سولہ سال تک کام کرتے رہے، کہا ہے کہ :

"۱۹۳۰ء میں برصغیر میں سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی تھی ۔ اس وقت جمعیۃ پر ایسا تنگی کا وقت تھا کہ فنڈ میں بالکل روپیہ نہ رہا ۔ کئی ماہ تک ملازمین کی تنخواہیں چڑھ گئیں ۔ یہ وقت جمعیۃ پر بڑی کڑی آزمائش کا تھا ۔ موتی لال نہرو نے جمعیۃ کو مالی امداد کی پیش کش کرتے ہوئے ، کانگریس فنڈ سے مدد دینا چاہا ، مگر کانگریس کی اس پیش کش کے بارے میں جمعیۃ کے صدر مفتی کفایت اللہ سے جب مشورہ کیا گیا تو موصوف نے فرمایا، جنگ آزادی کے میدان میں ہم کسی

---

۱ - "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص‌ص ۵۲۰-۵۲۱؛
"جمعیۃ علماء کی شرعی حیثیت" ، ص ۱۰

دوسری جماعت کے سہارے پر کھڑے نہیں ہوئے ہیں ۔ استخلاص وطن کی جد و جہد ہمارا مذہبی فریضہ ہے ۔ اگر ہم جماعت کو نہیں چلا سکتے تو دفتر بند کر دیں گے"[1]۔

جمعیۃ نے سیاسی اعتبار سے ملک کے ہر حصے اور گوشے میں اپنی جد و جہد کی ، اور جہاں کہیں بھی حکومت نے ظلم و جور کیا ، جمعیۃ نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ، مثلاً ۱۹۳۰ء میں ، برطانیہ نے خدائی خدمت گاروں پر قصہ خوانی بازار پشاور میں اس وقت گولیاں برسائیں ، جب وہ لوگ بدیشی کپڑے کے سلسلے میں بائیکاٹ کرنے کا پرامن جلوس نکال رہے تھے ۔ اس فائرنگ میں بہت سی جانیں بھی تلف ہو گئیں ۔ جمعیۃ نے اس فائرنگ کی سخت مذمت کی ۔ اس واقعہ کی تحقیق کے لیے ایک غیر سرکاری تحقیقاتی کمیٹی کانگریس نے مقرر کی ۔ جس میں مفتی کفایت اللہ ، صدر جمعیۃ بھی ایک رکن تھے ۔ حالانکہ حکومت نے اس کمیٹی کو پشاور میں تحقیق کرنے سے باز رکھا ۔ تاہم اس کمیٹی نے راولپنڈی میں اپنی تحقیقات مکمل کیں ۔ غرض یہ کہ جمعیۃ ، ملک کے سیاسی حالات اور ان کو حل کرنے میں ہمیشہ مستقل مزاج اور پیش پیش رہی[2] ۔

برطانیہ نے اپنی شاطرانہ چالوں سے ، جب فلسطین کو تقسیم کرنے کے بعد ۱۹۳۸ء میں یہودیوں کا "قومی وطن" قائم کیا ۔ تو فلسطینی عربوں میں سخت بے چینی اور اضطراب پیدا ہوا ، اور انھوں نے برطانیہ کے خلاف سخت تحریک جاری کی ۔ مفتی صاحب نے جمعیۃ علماء ہند کے زیر نگرانی "مجلس تحفظ فلسطین" قائم کی ، نیز فلسطین کے مظلوموں کے لیے چندہ بھی جمع کیا ۔ اس کے بعد مصر میں ، عالم اسلام کی ایک نمائندہ کانفرنس اکتوبر ۱۹۳۸ء میں منعقد ہوئی جمعیۃ نے ایک سہ رکنی وفد ، مفتی صاحب کی قیادت میں ۲۶ ستمبر ۱۹۳۸ء کو قاہرہ روانہ کیا ۔ اس وفد میں مولانا عبدالحق مدنی اور مولانا محمد یوسف بنوری (موجودہ مہتمم مدرسہ عربیہ، نیو ٹاؤن ، کراچی) بہ حیثیت رکن شریک تھے ۔ قاہرہ میں مفتی صاحب کا بہت پرجوش استقبال کیا گیا ، اور اس اجلاس کی سبجیکٹ کمیٹی میں آپ کا نام شامل کیا گیا[3] ۔

فصل سوم

جمعیۃ کے اخبار "مسلم" اور "الجمعیۃ"

مفتی کفایت اللہ جو جمعیۃ علماء کی تاسیس کے ساتھ ہی اس کے عارضی صدر منتخب

---

۱ ۔ "بیس بڑے مسلمان" ، ص ص ۴۳۵-۴۳۶

۲ ۔ ایضاً ، ص ۴۳۷ ؛
"مفتی اعظم کی یاد نمبر" ، ص ص ۴۳-۴۹

۳ ۔ "بیس بڑے مسلمان" ، ص ص ۴۳۸-۴۳۹

ہوئے تھے ، ہندوستان کے سیاسی حالات پر عمیق نظر رکھتے تھے اور ممدوح نے جمعیۃ کی تنظیم میں شروع سے ہی بڑے انہاک اور خلوص کا مظاہرہ کیا تھا ۔ جس کے نتیجے میں جمعیۃ کے تیسرے اجلاس منعقدہ ۱۸ تا ۲۰ نومبر ۱۹۲۱ء بمقام لاہور آپ کو جمعیۃ کا مستقل صدر منتخب کر لیا گیا[1] ۔ اب موصوف پر بہ حیثیت صدر ، جمعیۃ کی بھاری ذمہ داریاں عائد ہوگئیں ۔ اس وقت کے ہنگامہ پرور حالات میں اہل ملت متفکر تھے کہ ملت کی فلاح و بہبود کے لیے کونْ سی راہ اختیار کی جائے ۔ مفتی صاحب نے حالات کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے محسوس کیا کہ جمعیۃ کے مقاصد کو مسلم جمہور تک پہنچانے کے لیے ابلاغ کا کوئی موثر ذریعہ ہونا ضروری ہے ۔ اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے دو طریقے ممکن تھے ۔ اولاً جمعیۃ کا کوئی اپنا اخبار قائم کرکے اپنے مقاصد کو خوالدہ حضرات تک پہنچانا ۔ ثانیاً جمعیۃ کے کارکنوں کو برصغیر کی وسیع و عریض سر زمین کے اطراف میں بھیجنا ، تاکہ اس طرح سے عوام جمعیۃ کے مقاصد سے آشنا ہو سکیں ۔ جمعیۃ ایک نوزائیدہ جماعت تھی ۔ اس کے مالی وسائل محدود تھے اور تنظیم بھی ابھی ابتدائی منازل میں تھی ۔ اس لیے مفتی صاحب نے یہی طے کیا کہ نشر و اشاعت کا شعبہ کھولا جائے ۔ لیکن وہ تجارتی اصولوں پر کام کرے ۔ یعنی جمعیۃ کو اس مد پر زر کثیر صرف نہ کرنا پڑے[2] ۔ مقاصد جمعیۃ کی تشریح اور نظریات جمعیۃ کی توضیح کرنا اس شعبے کے سپرد کیا گیا ۔ اہم امور کے لیے رسالے (ٹریکٹ) چھپوا کر فروخت کرنے کا بندوبست کیا گیا اور بہی خواہان جمعیۃ سے یہ توقع وابستہ کی گئی کہ وہ ان رسالوں کی فروخت اور اشاعت میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی اور توجہ فرما کر ان رسائل کے ذریعہ جمعیۃ کی آواز ، ہر سمجھنے والے اور سننے والے تک پہنچائیں گے ۔[3] لیکن نشر و اشاعت کے یہ طریقے ایک مستقل اخبار کی کمی کو پورا نہیں کر سکتے تھے ۔ رسائل سے محدود افراد ہی مستفید ہو سکتے تھے ۔ جب کہ اخبار کے ذریعہ عوام و خواص تک مقاصد جمعیۃ پہنچائے جا سکتے تھے ۔ چنانچہ مفتی کفایت اللہ نے فیصلہ کیا کہ جمعیۃ کا اخبار نکالا جائے ، خواہ وہ روز نامہ نہ ہو ۔ انھوں نے اپنی جد و جہد سے اس دوران میں جو کارنامے انجام دیے ، ان میں سب سے زیادہ ٹھوس اور تعمیری کارنامہ ہفت روزہ "مسلم" کا اجراء تھا ۔ کے ۔ کے ۔ عزیز کے بیان کے مطابق مسلم پریس کی عدم موجودگی میں ، سیاسی پروپیگنڈہ پر کانگریس کی اجارہ داری تھی ۔ اس لیے جمعیۃ کی قیادت نے اس بات کا شدت سے احساس کیا اور اس احساس کے پیش نظر نیز مسلمانوں کی سیاسی بقا اور سیاسی ارتقا کی خاطر مفتی صاحب

---

۱ ۔ "جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ" ، ص ص ۴۴-۴۵ ، اور ۴۷

۲ ۔ "جمعیۃ علماء کیا ہے ؟" ، ص ۲

۳ ۔ ایضاً

نے بہت جلد اس کمی کا احساس کرتے ہوئے جمعیۃ کا ایک اخبار ہفت روزہ "مسلم" جاری کیا[1] ۔

یہ اخبار پہلی دفعہ یکم نومبر ۱۹۲۱ء کو ، کوچہ چیلان دہلی سے ، زیر سرپرستی مفتی کفایت اللہ ، صدر جمعیۃ علماء ہند جاری ہوا ۔ چنانچہ اس اخبار نے اپنی پہلی ہی اشاعت میں مولانا احمد سعید ، ناظم جمعیۃ کی گرفتاری کی خبر شائع کی[2] ۔ اخبار "مسلم" نے ہندوستان کی سیاسی جد و جہد میں بھر پور اور نمایاں حصہ لیا اور علماء کے سیاسی موقف کی موثر ترجمانی کی ۔

اخبارات جمعیۃ کی ادارت اور مولانا ابوالاعلی مودودی :

شروع شروع میں "مسلم" اخبار کی دیکھ بھال مفتی کفایت اللہ بہ نفس نفیس خود ہی کیا کرتے تھے ۔ مگر کسی اخبار کی کامیابی کے لیے ، کوئی ہمہ وقتی ، باہنر اور باعلم مدیر کا ہونا بھی ناگزیر ہے ۔ مفتی صاحب کی نظر انتخاب مولانا ابوالاعلی مودودی پر پڑی ۔ بقول حفیظ الرحمٰن احسن : "مولانا مودودی اس سے پہلے چار سال تک اخبار "تاج" جبلپور کے مدیر کی حیثیت سے کام کر چکے تھے ۔ (ملاحظہ ہو "اسلام کا سرچشمہ قوت" میں حفیظ الرحمن احسن کا دیباچہ)[3] (ایک عجیب اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ لیونارڈ بنڈر نے مولانا کی حیثیت کو کم کرکے انھیں "تاج" کا مراسلہ نگار (Correspondent) بتایا ہے)۔ بقول احسن صاحب "مولانا مودودی "تاج" کی ادارت سے ۱۹۲۰ء تک منسلک رہے" ۔ مولانا کی محولہ بالا کتاب کا تعارف کراتے ہوئے احسن صاحب نے مولانا مودودی کی خدمات اخبار "مسلم" میں بہ حیثیت مدیر ۲۱-۱۹۲۳ء بیان کی ہیں ، جب کہ راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق مولانا مودودی نے ۲۶جولائی ۱۹۲۲ء کو اخبار "مسلم" میں بہ حیثیت مدیر کام شروع کیا تھا ۔ (جو صرف آٹھ ماہ

---

1. K.K. Aziz, *The Making of Pakistan*, pp. 182-83

۲ ۔ "مسلم" یکم نومبر ، ۱۹۲۱ء ، ج ۱ ، نمبر ۱ ، ص ص ۱-۳ ، ک ۲-۳

۳ ۔ مولانا سید ابوالاعلی مودودی ، "اسلام کا سرچشمہ قوت" ، (مرتب) شہیر نیازی ، لاہور ، ۱۹۷۱ء ، طبع دوم ، ص ے

(نوٹ : یہ کتاب مولانا مودودی کی تصنیف ہے جسے شہیر نیازی نے مرتب کیا ہے اور یہ کتاب ۴۴ سال قبل قلم بند ہوئی تھی جسے مولانا نے ۱۹۲۵ء میں شذرات کی شکل میں "الجمعیۃ" میں بہ حیثیت مدیر مسلسل اشاعتوں میں شائع کیا تھا ۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۶۹ء میں مرتب کی گئی ہے)

نوٹ : مولانا کا چار سال تک "تاج" جبلپور میں کام کرنا غیر تحقیقی ہے ۔ راقم

پندرہ یوم تک رہا چونکہ "مسلم" ۸ اپریل ۱۹۲۳ءکو بند ہوگیا تھا[۱] ۔) مولانا مودودی کی صحافتی زندگی کے بارے میں ، محققین اور مؤرخین نے بغیر حتمی تحقیق کے اپنی اپنی رائے ظاہر کی ہے ۔ مثلاً لیونارڈ بنڈر نے بیان کیا ہے کہ "مولانا مودودی نے جمعیۃ علماء ہند کے اخبار کی سب ایڈیٹری کی تھی اور یہ فرائض ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۷ء تک انجام دیئے[۲] ۔ لیونارڈ بنڈر کا بیان حیرت انگیز حد تک غیر تحقیقی ہے ۔ اس لیے کہ ۱۹۲۰ء میں جمعیۃ کا کوئی اخبار ہی نہ تھا ۔ مزید برآں جمعیۃ کا سب سے پہلا اخبار ہفت روزہ "مسلم" یکم نومبر ۱۹۲۱ء کو جاری ہوکر ۸ اپریل ۱۹۲۳ء میں بند ہوگیا ۔ اس کے بعد جمعیۃ کا دوسرا اخبار سہ روزہ "الجمعیۃ" ۲ فروری ۱۹۲۵ء کو دہلی سے جاری ہوا ۔ اس اخبار کے پہلے مدیر مولانا محمد عرفان تھے ۔ یہ اخبار ۹/جون ، ۱۹۳۹ء تک جاری رہا ۔ اس سلسلے میں ایک دوسرے مؤرخ رئیس احمد جعفری مرتب "علی برادران" نے مولانا مودودی کا اپنا ایک بیان نقل کیا ہے جس کی رو سے بقول مولانا ، "الجمعیۃ" کی ادارت ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۸ء تک کی ۔ یہ بیان بھی خلاف واقعہ اور غیر تحقیقی ہے ۔ کیونکہ "الجمعیۃ" ۱۹۲۵ء میں جاری ہوا تھا ۔ اس لیے ۱۹۲۳ء میں پرچہ کی ادارت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ اس امر میں یہ بھی طرفگی ہے کہ مولانا نے خود اپنی صحافتی زندگی کے بارے میں سنین کی غلطی کی ہے ۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے بھی مولانا کی ادارت ۱۹۲۳ء میں بیان کی ہے ۔ جو حسب تفصیل بالا خلاف واقعہ ہے ۔[۳] ڈاکٹر صاحب موصوف نے دوسری بات یہ بیان کی ہے کہ "الجمعیۃ" کی پہلی ادارت بھی مولانا مودودی نے سنبھالی ۔ حالانکہ اس اخبار کے پہلے مدیر مولانا محمد عرفان تھے ۔ جس کی تصدیق راقم نے "الجمعیۃ" کی فائل سے کی ہے ۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک مزید حیرانی کی بات یہ کہی ہے کہ یہ اخبار ہفت روزہ تھا ۔[۴] موصوف کا یہ بیان بھی خلاف واقعہ ہے کیونکہ کہ "الجمعیۃ" اس زمانے میں سہ روزہ تھا اور بعدہ روز نامہ ہوا ۔

---

۱ ۔ "مسلم" ، ۲٦ جولائی ۱۹۲۲ء ، ج ۱ ، نمبر ۳٦ ؛
"اسلام کا سرچشمہ قوت" ، ص ۔ ۷

2. Leonard Binder, *Religion and Politics in Pakistan*, California, 1963. p, 78.

۳ ۔ "علی برادران" ، ص ۲۳

بحوالہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ۔ مولانا کا یہ بیان بہ حیثیت امیر جماعت اسلامی پاکستان شائع ہوا ہے ۔ جس میں مولانا نے خود یہ فرمایا ہے کہ میں نے ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۸ء تک "الجمعیۃ" میں ایڈیٹر کے فرائض انجام دیے ۔ مقام حیرت ہے کہ موصوف نے خود ایسا غیر تحقیقی بیان کیسے دیا ؟ جب کہ یہ اخبار ۱۹۲۳ء میں جاری بھی نہیں ہوا تھا ۔

4. *Ulema in Politics*, p. 331.

ایک تیسرے محقق پروفیسر عزیز احمد نے بھی اس وادی میں ٹھوکر کھائی ہے - ان کے بیان مطابق مولانا کی ''الجمعیۃ'' میں ادارتی زندگی کا آغاز ہی ۱۹۲۹ء میں بہ حیثیت مدیر کے ہوتا ہے اور بقول عزیز احمد صاحب ''الجمعیۃ'' سے مولانا کا یہ تعلق ۱۹۳۲ء تک قائم رہا[1] - حفیظ الرحمان احسن ، جنھوں نے مولانا مودودی کی کتاب ''اسلام کا سرچشمہ قوت'' کا دیباچہ لکھا ہے ، کے بیان سے مندرجہ بالا بیان کی تردید ہوتی ہے - در اصل مولانا مودودی نے ''الجمعیۃ'' کی ادارت ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۸ء تک انجام دی -

خود احسن صاحب نے بھی اس بارے میں ایک مقام پر ٹھوکر کھائی ہے - یعنی وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ مولانا نے اخبار ''مسلم'' میں ۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۳ء ادارت کے فرائض انجام دیے[2] - حالانکہ راقم کی تحقیق کے مطابق مولانا مودودی نے اخبار ''مسلم'' میں ۲۶ جولائی ۱۹۲۲ء سے ادارت کے فرائض سنبھالے -

مزید برآں شیخ نیازی صاحب، مرتب ''اسلام کا سرچشمہ قوت'' نے ایک فاش غلطی یہ کی ہے کہ ''الجمعیۃ'' کو روز نامہ بتایا ہے - حالانکہ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ ''الجمعیۃ'' اس زمانے میں سہ روزہ اخبار تھا[3] -

راقم الحروف نے اس سلسلے میں جو تحقیق کی ہے، وہ یہ ہے کہ یکم جنوری ۱۹۷۱ء کو میں دہلی گیا اور وہاں جا کر اخبار ''مسلم'' اور ''الجمعیۃ'' کی تمام فائلیں مطالعہ کیں - یہ فائلیں جناب حفیظ الرحمان واصف خلف مفتی کفایت اللہ نے مجلد کرائی ہوئی ہیں - جو ان کے اپنے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہیں - ان کے مطالعے سے یہ بات مسلمہ ہے کہ مولانا مودودی نے ۲۶ جولائی ۱۹۲۲ء کو ہفت روزہ ''مسلم'' کی ادارت شروع کی - جو ۸ اپریل ۱۹۲۳ء تک جاری رہی - پھر یہ اخبار بند ہوگیا - ایسی صورت میں ۱۹۲۱ء میں ''مسلم'' کی ادارت مولانا سے منسوب کرنا غیر تحقیقی اور خلاف واقعہ ہے - پھر کچھ عرصے کے بعد جمعیۃ علماء ہند نے اخبار کی عدم موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے

---

1. Aziz Ahmad, *Islamic Moderniam in India and Pakistan,* London, 1967, p. 208.

۲ - ''اسلام کا سرچشمہ قوت'' ، ص ۱۱

۳ - ایضاً

(نوٹ : راقم الحروف نے ۱۹ مارچ ۱۹۷۲ء کو مولانا مودودی صاحب کو ایک عریضہ لکھا تھا - جس میں مولانا سے ان کی صحافتی زندگی کے متعلق استفسار طلب کیے تھے - مگر افسوس ہے کہ تاہنوز احقر کے عریضے کا کوئی جواب نہ ملا - حالانکہ مولانا جیسے بااصول شخص سے ایسی توقع نہیں کی جا سکتی - راقم ۲۷ جنوری ۱۹۷۳ء)

فروری ۱۹۲۵ء میں ایک دوسرا اخبار سہ روزہ بنام "الجمعیة" جاری کیا ۔ جس کے پہلے ایڈیٹر مولانا محمد عرفان تھے ۔ مولانا مودودی نے ۱۴ تا ۱۸ جون ۱۹۲۵ء سے اس اخبار کی ادارت کے فرائض سنبھالے اور ۱۵ مئی ۱۹۲۸ء تک بحیثیت مدیر اپنے فرائض انجام دیے[۱] ۔ مولانا مودودی کے بعد اس اخبار کی ادارت کے فرائض ابوالبیان اویسی المعروف بہ فارقلیط نے کی اور ان کے بعد حلال احمد زبیری نے اور پھر دوبارہ ابوالبیان اویسی نے کی[۲]۔ ابولبیان اویسی معروف بہ محمدعثمان کار قلیط کی مدت ادارت پہلی بار ۱۸ مئی ۱۹۲۸ء تا ۲۴ جولائی ۱۹۲۹ء تھی ۔ اس کے بعد ہلال احمد زبیری نے ۲۵ جولائی ۱۹۲۹ء تا ۴ جولائی ۱۹۳۶ء تک ادارت کی ۔ پھر دوبارہ فارقلیط نے ۵ جولائی ۱۹۳۶ء تا ۹ جون ۱۹۳۹ء تک ادارت کی اور پھر یہ اخبار بند ہوگیا[۳] ۔

سہ روزہ اخبار "الجمعیة" ۱۹۲۵ء میں جاری ہوا ۔ جس وقت یہ اخبار جاری ہوا ملک کی سیاسی فضا ہندو مسلم فسادات اور شدھی ، سنگھٹن کی تحریکات کے نتیجے میں مسموم تھی ۔ ان تحریکات کے نتیجے میں جمعیة علماء ہند اور دیگر اسلام پسند جماعتوں نے تبلیغ اور تنظیم کی تحریکات جاری کیں ۔ اس وقت برصغیر میں مسلمانوں کے اخبارات زیادہ نہ تھے ۔ ان حالات میں "الجمعیة" نے مسلم جمہور اور خصوصاً علماء کرام کو ملک کی صحیح سیاسی صورت حال سے باخبر رکھا ۔ مزید برآں اس اخبار نے اندرون ملک اور بیرون ملک میں پیش آمدہ حالات سے بھی حتی الامکان مسلم جمہور کو باخبر رکھا ۔ جس کی بناء پر علماء ہند کی یہ تنظیم سیاسی اعتبار سے زیادہ مؤثر اور نمایاں کردار ادا کر سکی ۔ یہ اخبار "الجمعیة" جون ۱۹۳۹ء تک برصغیر کی سیاسی صحافت میں نمایاں حصہ لیتا رہا

---

۱ ۔ "الجمعیة" ، دہلی ، ۱۴ تا ۱۸ جون ۱۹۲۵ء ، ج ۱ ، نمبر ۳۱-۳۲ ، ص ک؛
"الجمعیة"، دہلی : ۱۵ مئی ۱۹۲۸ء ، ج ۷ ، نمبر ۲ اور نمبر ۳۲، ص ک ۔
(نوٹ : مولانا مودودی نے اپنی کتاب "تصوف اور تعمیر سیرت" کے ص ۲۴ (فٹ نوٹ ۱) میں لکھا ہے کہ ابتداء میں اخبار "الجمعیة" میں کچھ عرصے تک مولانا محمد عرفان کا نام بہ حیثیت ایڈیٹر لکھا گیا ۔ بعد میں میرا نام لکھا جانے لگا ۔ مگر دونوں زمانوں میں اصل ایڈیٹر میں ہی تھا ۔ ابوالاعلی مودودی ۔ "تصوف اور تعمیر سیرت" مرتبہ عاصم نعمانی، لاہور ، ۱۹۷۲ء ، ص ۲۴)

۲ ۔ "الجمعیة" ، دہلی ، ۲۹ جولائی ۱۹۲۸ء ، ج ۷ ، نمبر ۳۳-۳۴ اور ج ۲۲ ، نمبر ۱ ؛ یکم جولائی ۱۹۳۵ء اور ج ۱ ، نمبر ۳۱-۳۲ ؛ ۱۴ تا ۱۸ جون ، ۱۹۲۵ء

۳ ۔ "الجمعیة" ، دہلی ، ۱۸ مئی ۱۹۲۸ء ، ج ۷ ، نمبر ۳۳ اور ج ۱ ، نمبر ۹ تا ۲۲ جولائی ۱۹۲۹ء اور ۲۵ جولائی ۱۹۲۵ء ج ۱ ، نمبر ۱ اور ۳۰ جون ، ۱۹۲۹ء ، نمبر ۲۵ ج ۲۳ اور ۵ جولائی ۱۹۳۶ء ، ج ۲۴ ، نمبر ۱ تا ۹ جون ۱۹۳۹ء ، ج ۲۹ ، نمبر ۲۸ ۔

اور اپنی پندرہ سالہ زندگی میں مسلم جمہور میں سیاسی شعور اور سیاسی سوجھ بوجھ بھی پیدا کی ۔ مگر افسوس ہے کہ اس بات کی آج تک کوئی تحریری یا زبانی شہادت دستیاب نہ ہو سکی کہ یہ اخبار ۱۹۳۹ء میں کیوں بند ہوگیا ؟ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی اور کانگریس وزارتیں مستعفی ہوگئیں ۔ جس کی بناء پر بین الاقوامی سیاسی معاملات میں تیزی سے تبدیلی رونما ہوئی ۔ نیز کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلافات جو ۱۹۳۰ء سے شروع ہونے تھے ۔ اب مزید شدید ہوگئے ۔ ان حالات نے ملک کی سیاست میں ایک نئے دور کا آغاز کیا ۔ ان حالات کے تحت علماء کے اخبار کا قائم و باقی رہنا ، جمہور مسلم علماء اور ملک کے لیے یکساں سود مند ہوتا ۔ لیکن قیاس یہ کہتا ہے کہ جمعیۃ کی اقتصادی حالت اتنی مضبوط و مستحکم نہ تھی کہ وہ اس اخبار کے اخراجات بہ آسانی برداشت کرتی ۔ ہو سکتا ہے کہ جمعیۃ کو اخبار سے خسارہ بھی ہوتا ہو ۔ اس لیے گمان اغلب یہ ہے نہ اقتصادی کمزوری نے اس اخبار کو جاری رکھنا ناممکن بنا دیا ۔ اس امر کا اندازہ اس حقیقت سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ (حسب تفصیل سابق) ۱۹۳۰ء میں جمعیۃ کی اقتصادی حالت بہت کمزور ہوگئی تھی ۔ حتیٰ کہ ملازمین کو تنخواہ دینے کو بھی فنڈ نہ تھا[۱] ۔ اس اخبار کے بند ہونے کی ایک دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید بترتیب صدر اور ناظم کے عہدوں سے بیک وقت مستعفی ہوئے یا معزول کیے گئے (اس کی مزید تفصیلات آئندہ باب میں بیان کی جائیں گی)۔ ہو سکتا ہے کہ ان حضرات کے بعد تنظیمی اور مالی امور کی نگرانی میں کوئی خلا پیدا ہوگیا ہو ۔ جس کو آسانی سے پر نہ کیا جا سکا ہو اور اس طرح اخبار کا جاری رہنا ممکن نہ رہا ہو ۔ اس بحث سے یہ نتیجہ بہ آسانی نکالا جا سکتا ہے کہ جمعیۃ نے اپنی خود داری اور اسلامی وقار کے پیش نظر کسی دیگر سیاسی یا نیم سیاسی جماعت سے امداد لینا گوارا نہ کیا ہو ۔ ہو سکتا ہے کہ یہی حالات ۱۹۳۹ء میں بھی پیش آئے ہوں ۔ جو ۱۹۳۰ء میں موجود تھے اور اس کے نتیجے میں اخبار مذکور کا جاری رہنا ممکن نہ رہا

---

۱ - "بیس بڑے مسلمان" ، ص ۴۳۶

(نوٹ : اس اخبار کی مزید معلومات کے سلسلے میں پاکستان میں مقیم "الجمعیۃ" کے سابق مدیر ، ہلال احمد زبیری سے ۱۰ اگست ۱۹۷۰ء کو رجسٹرار یونیورسٹی کراچی کے دفتر میں راقم نے ملاقات کی اور مولانا مودودی سے بذریعہ مراسلات استفسار کیا ۔ ہلال احمد زبیری نے بالمشافہ گفتگو پر اپنی یادداشت کی کمی کی بناء پر تفصیلات بیان کرنے سے معذوری ظاہر کی اور مولانا مودودی نے خط کا کوئی جواب ہی نہ دیا ۔ اس لیے اس سلسلے میں مزید مفید معلومات فراہم نہ ہو سکیں) ۔

ہو۔ ورنہ جمعیۃ کے اکابر ملک کے سیاسی اور بین الاقوامی حالات سے باخبر تھے اور ایسے اہم وقت میں ایک سیاسی اخبار کا بند کرنا، جو علماء کا واحد ترجمان تھا، کسی سخت مجبوری کی بناء پر ہی عمل میں آیا ہوگا۔ بہرحال دسمبر ۱۹۴۷ء میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی کوششوں سے یہ اخبار دوبارہ جاری ہوا اور اب یہ بجائے سہ روزہ کے روز نامہ کی شکل میں بھارت میں جاری ہے[1]۔

---

۱ - محمد عثمان، فارقلیط، "مجاہد ملت نمبر" دہلی، ۱۹۶۲ء، ص ۱۱۸ ب

باب خامس

تعلیقہ ۱

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا مختصر تعارف

ولادت ۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء - حفیظ الرحمٰن احسن ، مہتمم ایوان ادب کے بیان کے مطابق ۱۳ یا ۱۴ سال کی عمر میں مولانا نے اسکول چھوڑ دیا تھا اور جبلپور کے اخبار "تاج" میں ۱۹۲۰ء تک مدیر کے فرائض انجام دیئے - جس کی مدت احسن صاحب نے چار سال بیان کی ہے[1] -

مولانا مودودی نے بیان کیا ہے کہ ۱۹۱۸ء میں اخبار "مدینہ" بجنور کی ایڈیٹری میرے بڑے بھائی سید ابوالخیر مودودی نے کی اور میں بھی ان کے ساتھ رہا - لیکن صرف ڈیڑھ دو ماہ تک کام کیا - پھر ۱۹۱۹ء میں ہفتہ وار "تاج" جبلپور میں دونوں بھائیوں نے ایڈیٹری کی جو چند مہینے تک رہی - ۱۹۲۰ء میں پھر "تاج" میں ایڈیٹری کی اور صرف مولانا مودودی ہی نے ادارت کی - اس کے بعد ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۳ء تک اخبار ہفت روزہ "مسلم" دہلی کی ادارت کی اور پھر ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۸ء تک سہ روزہ "الجمعیۃ" کی ادارت کی[2] -

راقم کی تحقیق کے مطابق مولانا کی اخبار "مسلم" میں ادارت ۲۶ جولائی ۱۹۲۲ء ہے جس کی تفصیل صفحات بالا میں گزر چکی ہے -

---

۱ - "اسلام کا سرچشمہ قوت"، ص ۷ ؛

***Islamic Modernism in India and Pakistan*, p. 208.**

(نوٹ : لیونارڈ بنڈر نے بیان کیا ہے کہ مودودی صاحب نے اپنے والد کی وفات کے بعد ۱۶ سال کی عمر میں تعلیم ترک کر دی تھی چونکہ اپنے خاندان کا بار کفالت مولانا کے ذمہ تھا اور اس صورت میں تعلیم کا مزید جاری رکھنا ممکن نہ تھا - اس کے بعد مولانا نے ایک مقامی اخبار "تاج" جبلپور میں بہ حیثیت ایک مراسلہ نگار کچھ عرصے تک کام کیا -

(*Religion and Politics in Pakistan*, p. 79)

۲ - ابوالاعلیٰ مودودی ، "تصوف اور تعمیر سیرت" (مرتبہ) عاصم نعمانی ، لاہور ، ۱۹۷۲ء ، ص ص ۲۰-۲۵

مگر لیونارڈ بنڈر کے بیان کے مطابق مولانا نے ۱۶ سال کی عمر میں اسکول چھوڑا اور اس کے بعد اخبار "تاج" میں بہ حیثیت ایک "مراسلہ نگار" کچھ عرصے تک کام کیا[1] ۔ احسن صاحب کے بیان کے مطابق مولانا کا ۱۳ یا ۱۴ سال کی عمر میں بہ حیثیت مدیر کام کرنا پایا جاتا ہے ۔ اس عہدہ پر کام کرنے کے لیے ، تعلیمی قابلیت ، تجربہ اور صحافت کے متعلق معلومات اور مہارت کا ہونا بھی ناگزیر ہے ۔ نیز یہ کہ ایک نو عمر طالب علم کو براہ راست اتنے بڑے منصب کا سونپا جانا کچھ عجیب سی بات ہے ۔ اگر یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ مولانا نے اتنی کم عمری میں ادارت کے فرائض انجام دئیے تو پھر ایک دوسری بات قابل لحاظ یہ ہے کہ آیا ! مولانا نے اسکول چھوڑنے کے بعد پھر کبھی اپنی نامکمل تعلیم باضابطہ مکمل کی یا نہیں ؟ مگر اس بارے میں بھی کوئی مواد یا شواہد نہ مل سکے کہ مولانا نے بعدۂ اپنی تعلیم کسی ادارے میں مکمل کی ۔ بہر حال احسن صاحب نے "اسلام کا سرچشمۂ قوت" کے دیباچہ میں مزید بیان کیا ہے کہ مولانا نے اخبار "مسلم" میں ۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۳ء بہ حیثیت مدیر کام کیا اور پھر ۱۹۲۵ء سے "الجمعیۃ" میں ادارت کے فرائض انجام دیے ۔ نیز یہ کہ بقول احسن صاحب مولانا نے ۱۸ ، ۲۲ اور ۲۹ جولائی اور ۱۰ ، ۱۴ اور ۱۸ اگست ۱۹۲۵ء کو "الجمعیۃ" کے اداریوں میں "اسلامی قوت کا اصلی سرچشمہ" کے عنوان سے مسلسل مضامین شائع کیے ۔ جنھیں شہیر نیازی نے پہلی مرتبہ اگست ۱۹۶۹ء میں مرتب کیا اور ان مضامین کو ایک کتابی شکل میں شائع کیا جس کا نام "اسلام کا سرچشمۂ قوت" ہے ۔ اس کتاب یعنی "اسلام کا سر چشمۂ قوت" کے شائع ہونے سے قبل مولانا کی کتاب "الجہاد فی الاسلام" کو ہی موصوف کی پہلی باقاعدہ تصنیف خیال کیا جاتا ہے ۔ جو ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی تھی ۔ مگر اب "اسلام کا سرچشمہ قوت" مولانا کی سب سے پہلی تصنیف ہے جو ۴۴ سال تک اخبارات کے فائلوں کی زینت بنی رہی[2] ۔ مولانا کی سن ولادت کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ مضامین ۲۲ سال کی عمر میں لکھے گئے ۔ جنھیں اب ایک کتابی شکل میں مرتب کیا گیا ہے ۔ مولانا نے "الجہاد فی الاسلام" کی طبع اول کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "دسمبر ۱۹۲۶ء میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا یعنی سوامی شردھانند کا قتل ، جس نے مجھے اس بات کی طرف راغب کیا کہ جہلا اور کم نظر افراد کو اسلامی جہاد کے متعلق ، اسلام کا واضح اور روشن نظریہ پیش کروں اور اس طرح جہلا کو جہاد کے متعلق غلط خیالات کی اشاعت

---

1. *Religion and Politics in Pakistan*, p. 79.

۲۔ "اسلام کا سرچشمۂ قوت"، ص ۵

کا جو ایک نیا موقع مل گیا تھا ، اس کا سدباب کروں[1] ۔ کچھ عرصے بعد مولانا ، بوجہ علالت دہلی سے اورنگ آباد چلے گئے ۔ جہاں بقول بنڈر دو سال تک مقیم رہنے کے بعد دہلی واپس آ گئے اور ۱۹۳۲ء تک دہلی میں مقیم رہے اور پھر حیدر آباد دکن چلے گئے[2] ۔ مولانا نے حیدرآباد سے ۱۹۳۲ء (م ۱۳۵۲ھ) میں ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' جاری کیا ۔ اس ماہنامے کے جاری کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کے مجموعی اور تفصیلی نظام کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی دعوت دی جائے[3] ۔ مولانا نے اس ماہنامہ کے ذریعہ دین اسلام کا ایک واضح تصور پیش کرنے کی کوشش کی ۔ گو کہ اس سلسلے میں ابتدائی چند سال بڑی الجھنوں میں صرف ہوئے ۔ مولانا کا مطمح نظر یہ تھا کہ اسلامی نظام کو سمجھانے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے ، اس کو ایک تحریک کی شکل میں جاری کیا جائے ۔ تاکہ دور حاضر میں ہماری زندگیوں کے اندر ، دین داری محض ایک رسمی اور انفرادی رویہ کی صورت میں جامد و ساکن ہوکر نہ رہ جائے ۔ بلکہ دین مبین کو ایک اجتماعی صورت میں نافذ و قائم کرنے میں جو طاقتیں مانع و مزاحم ہیں ، ان کا سدباب کرنے کی کوشش کی جائے ۔ اس سلسلے میں مولانا نے جو مضامین ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۸ء ''ترجمان القرآن'' میں لکھے، ان میں ہندوستان کی نئی تھیوری یا متحدہ قومیت کی نفی کی اور مسلمانوں میں ''حزب اللہ'' یا اللہ کی پارٹی ہونے کا احساس پیدا کر کے ، ایک سیاسی نصب العین کی شکل میں ، مسلم عوام کے سامنے ، احسن طریقے پر حزب اللہ کا

---

۱ - ''اسلام کا سرچشمۂ قوت''، ص ۸

2. *Religion and Politics in Pakistan*, p. 79.

(نوٹ : بنڈر نے مولانا کا بہ سبب علالت دہلی سے اورنگ آباد جانا ۱۹۲۷ء میں بتایا ہے ۔ لیکن حسب تفصیل سابق مولانا کا ۱۹۲۸ء تک دہلی میں رہنا ثابت ہے (مندرجہ بالا ۲۴۴ صفحہ دیکھیے) ۔ گمان اغلب یہ ہے کہ مولانا ۱۹۲۸ء میں یا اس کے بعد دہلی سے گئے ہوں گے) ۔

3. *Religion and Politics in Pakistan*, p. 79;

''روداد جماعت اسلامی'' ، حصہ اول ، ص ۴ ؛

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ، ''تحریک آزادی ہند اور مسلمان'' ، لاہور ، ۱۹۶۴ء، ص ۱۶

(نوٹ : ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب نے ''ترجمان القرآن'' کے اجراء کا سن ۱۹۳۱ء بیان کیا ہے ، اور لکھا ہے کہ یہ رسالہ مولانا ابو محمد مصلح ، حیدر آباد دکن سے کچھ مہینوں سے نکال رہے تھے ۔ مولانا مودودی نے ۱۹۳۱ء میں مولانا مصلح سے اس رسالے کو حاصل کر لیا - راقم کی تحقیق یہ ہے کہ مولانا مودودی نے یہ رسالہ ۱۳۵۲ھ مطابق مارچ ۱۹۳۳ء میں مولانا ابو محمد مصلح صاحب سے خرید کر جاری کیا ۔

Ulema in Politics, p. 332.) - -

تصور پیش کیا[1] - مولانا نے اپنے اس منصوبے کو روبہ کار لانے کے لیے جنوری ۱۹۳۸ء میں ڈاکٹر اقبال کی دعوت پر گورداسپور کا سفر اختیار کیا - گورداسپور میں ادارہ "تعلیم الاسلام" کے لیے اسی ایکٹر زمین مولانا کے مجوزہ مقاصد کی تکمیل کے لیے وقف کی گئی - جہاں پر آپ نے ایک اسلامی اکیڈمی قائم کی - مولانا اپریل ۱۹۳۸ء میں ڈاکٹر اقبال سے ملاقات کرنے کے لیے لاہور گئے - مگر اس وقت ڈاکٹر اقبال فوت ہو چکے تھے - بعدۂ مولانا نے "اسلامیہ کالج" لاہور میں بہ حیثیت اعزازی صدر الصدور "شعبہ مذہبی امور" ایک سال تک خدمات انجام دیں - مذکورہ کالج کی انتظامیہ نے ایک سال کے بعد مولانا پر دباؤ ڈالا کہ مشاہرہ لیں - جس کا مقصد یہ تھا کہ انتظامیہ مولانا پر اپنا اثر و رسوخ مسلط کر سکے - لیکن مولانا ، انتظامیہ کے فیصلے کے مطابق مشاہرہ لینے پر آمادہ نہ ہوئے اور اپنے اعزازی عہدے سے مستعفی ہوکر کالج سے علیحدگی اختیار کرلی[2] -

مولانا مودودی نے اپنا ایک مضمون "اسلامی قومیت کا حقیقی مفہوم" ۱۰ اپریل ۱۹۳۹ء کو یوم اقبال کے موقع پر پڑھا جو مئی ۱۹۳۹ء کے "طلوع اسلام" میں شائع ہوا - مولانا نے اپنے مضمون میں مسلمانان ہند کو ایک جدا گانہ قوم (ملت) کی حیثیت سے ثابت کیا ہے اور اسلامی نقطۂ نظر کو مد نظر رکھتے ہوئے اس بارے میں روشنی ڈالی ہے کہ بہ حیثیت مسلمان ہونے کے عالم اسلام کے تمام مسلمان ، ایک جماعت یا ملت یا حزب اللہ ، یعنی اللہ کی پارٹی ہیں - مولانا نے اپنے اس مضمون میں اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ اسلامی قومیت کا تصور ، خاک و خون کی حدود و قیود سے بالاتر ہوکر ، بلند اصول و مسلک کے اشتراک کی بنیاد پر قائم ہے - مولانا نے مزید بیان کیا ہے کہ قرآنی احکام کے مطابق مسلمانان عالم "حزب اللہ" یعنی اللہ کی ایک پارٹی یا جماعت ہیں اور اسلام میں بقول مولانا لفظ "قوم" اور اس کا ہم معنی لفظ نیشن (Nation) وغیرہ کا کوئی تصور نہیں ہے - بلکہ یہ لفظ دور جاہلیت کی اصطلاح ہے - غرض یہ کہ مولانا نے ہندوستانی رہناؤں کی نئی تخلیق یعنی "متحدہ قومیت" سے

---

۱ - "روداد جماعت اسلامی" ، حصہ اول ، ص ۴ ؛
"ماہنامہ طلوع اسلام" مئی ۱۹۳۹ء ، ج ۲ ، ش ۱ ، ص ۵۷ ؛
"تحریک آزادی ہند اور مسلمان" ، ص ۱۶

(نوٹ : ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب نے ابوالآفاق کی کتاب "مولانا ابوالاعلی مودودی" پر انحصار کیا ہے اور آفاق صاحب نے بغیر تحقیق یا تو دیگر کتب پر انحصار کیا ہے یا پھر سطحی معلومات سے اپنی کتاب مدون کی ہے - اس لیے اغلاط سہواً یا قصداً رہ گئیں - راقم)

2. *Religion and Politics in Pakistan*, p. 97.

مسلمانوں کی براٴت بیان کرتے ہوئے کہا ہے اس ''متحدہ قومیت'' سے مسلمانان ہند کا سیاسی اقتصادی ، تعلیمی اور تاریخی غرض کسی قسم کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے ۔ بلکہ مسلمانوں کی اپنی ایک پارٹی یعنی ''حزب اللہ'' یا ''امت محمدیہ'' یا ''اسلامی جماعت'' ہے ۔ قرآن سے امت مسلمہ کے لیے صرف تین باتیں ، مثلاً حزب اللہ ، امت اور جماعت ثابت ہیں اور اس کی روشنی میں مسلمانوں کی اپنی ایک علیحدہ اور جداگانہ حیثیت ہے[1] ۔

مولانا مودودی نے صفر ۱۳۶۰ھ مطابق فروری ۱۹۴۱ء میں اپنے مجوزہ خاکہ ''اسلامی تحریک'' کی وضاحت کی اور اس تحریک میں کام کرنے والوں اور اس منصوبے پر عمل پیرا ہونے والوں کی ایک صالح جماعت کے قیام کی ضرورت کو ''ترجمان القرآن'' کے ذریعہ جمہور اسلام کے سامنے پیش کیا اور مطلوبہ جماعت کی تشکیل کےلیے شعبان ۱۳۶۰ھ مطابق ۲۵ اگست ۱۹۴۱ء کو ایک اجتماع طلب کیا ۔ اس تحریک سے ہمدردی رکھنے والے اور اس سے اتفاق کرنے والے حضرات کو اس اجتماع میں شرکت کرنے کے لیے مدعو کیا گیا ۔ اس اجتماع میں صرف پچھتر افراد نے شرکت کی ۔ ۲ شعبان ۱۳۶۰ھ مطابق ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو ایک جماعت بنام ''جماعت اسلامی'' کی تاسیس اور تشکیل عمل میں آ گئی ۔ مولانا مودودی نے ''جماعت اسلامی'' کے داعی کی حیثیت سے اس کے منشاء و مقاصد اور اس کے نصب العین پر تفصیلی روشنی ڈالی اور تمام حاضرین کو اس جماعت کے نصب العین اور مقاصد سے آگاہ کیا ۔ چنانچہ ۳ شعبان ۱۳۶۰ھ مطابق ۲۷ اگست ۱۹۴۱ء کو حاضرین جلسہ نے مولانا کو بہ اتفاق آراء اس جماعت کا امیر یا صدر منتخب کر لیا ۔ یہ جماعت ۱۹۴۱ء سے لے کر آج تک حسب قواعد و ضوابط ، جماعت اسلامی ، مولانا کو اپنا امیر منتخب کرتی آ رہی ہے[2] ۔ اس جماعت نے ، ملک کی سیاسی جد و جہد میں اپنے یوم تاسیس سے ہی ، بڑی سرگرمی سے حصہ لیا اور اپنے قیام سے لے

---

1. K.K. Aziz, *The Making of Pakistan*, pp. 105-6 ;
ماہنامہ ''طلوع اسلام'' ، ۱۹۳۹ء ، ج ۲ ، نمبر ۱ ، ص ص ۵۰-۶۰ ۔

نوٹ : ماہنامہ طلوع اسلام نے اس بات کی ہدایت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مسلمان ایک قوم نہیں بلکہ ایک پارٹی (حزب اللہ) ہیں ۔ اس لیے مولانا کا مقصود یہ نہیں کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم (Nation) نہیں ۔ بلکہ ایک فرقہ ہیں مولانا سیاست حاضرہ کی متحدہ قومیت کے خلاف جہاد کرنے والوں میں پیش پیش ہیں اور مسلمانوں کی جداگانہ اور مستقل قومیت کے سب سے بڑے حامی ہیں ۔ ''طلوع اسلام'' ، مئی ۱۹۳۹ ، ص ۵۰)

۲ ۔ ''روداد جماعت اسلامی'' حصہ اول ، ص ص ۳-۱۶ ۔

نوٹ : جماعت اسلامی نے پہلی مرتبہ مولانا کی اپیل و ضعیفی اور علالت کی بنا ۱۹۷۲ء میں میاں طفیل محمد کو اپنا امیر منتخب کیا ۔ راقم)

کر آج تک اسلامی نظام کے قیام اور احیاء دین متین کے لیے ، سعی و عمل پیہم کرتی چلی آ رہی ہے ۔ حالانکہ حکومتوں نے اس جماعت کو منتشر کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً سختیاں اور قانونی رکاوٹیں و مشکلات پیدا کیں ۔ نیز اس کے امیر اور مجلس شوریٰ کے اراکین کو متعدد بار جائز و ناجائز طور پر قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں ۔ تاہم اس جماعت کے افراد بڑے با حوصلہ اور مستقل مزاج ہیں ۔ حکومت کی سختیوں اور پابندیوں کے باوجود یہ جماعت ، اسلامی نظام کو قائم کرانے کے لیے ، اپنے منصوبے اور مشن میں بڑے انہماک ، سرگرمی اور خلوص نیتی کے ساتھ سرگرم عمل ہے ۔

مولانا سید ابو الا علیٰ مودودی صاحب کو فیصل ایوارڈ کے موقع پر ایک صاحب نے روزنامہ "جسارت" کراچی میں ایک مضمون شائع کیا ، جس کا عنوان تھا ۔ "مولانا مودودی کے حالات زندگی ایک نظر میں ۔" لیکن اس مضمون میں تاریخی واقعات اور حقائق ، خلاف واقعہ اور غیر تحقیقی تھے ۔ جس کی تصحیح کے لیے راقم کو جوابی مضمون لکھنا پڑا ۔ جو ۲۸ اپریل ۱۹۷۹ء کو روزنامہ "جسارت" کے صفحہ ۳ پر شائع ہوا ۔ مولانا موصوف نے ۶ مئی ۱۹۷۹ء کو اپنے قلم سے میرے مضمون کے جواب میں ایک مضمون لکھا ۔ جس میں راقم کے مضمون کی تائید و توثیق اور مزید اصلاح فرمائی ۔ مولانا کا مضمون صفحہ ۳ کالم نمبر ۶ تا ۸ پر محفوظ ہے ۔ اس لیے میں ان نکات کی اصلاح اور صحیح تاریخی معلومات کو رقم کر رہا ہوں ۔ جو آئندہ کے محقق ، مؤرخ اور فضلاء کے لیے نشان راہ ہو سکیں ۔

مضمون نگار نے لکھا ہے کہ مولانا نے ۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت میں سرگرم حصہ لیا اور مجلس اعانت نظربندان کے روح رواں رہے ۔ مولانا نے اس سلسلہ میں جو وضاحت کی ہے ۔ وہ ہمارے نکات کے ضمن میں ہے ۔ وہ یہ ہے کہ خلافت کمیٹی کا قیام اور تشکیل ۲۲ نومبر ۱۹۱۹ء بمقام دہلی ، بصدارت مولوی فضل حق صاحب عمل میں آئی ۔ مولانا مودودی ان ایام میں یا مابعد دہلی میں موجود نہ تھے ۔ بلکہ حقائق و شواہد سے مولانا کا قیام بجنور یا جبلپور میں تھا ۔ مجلس خلافت کمیٹی کی تاسیس و تشکیل کے وقت یا اس کے بعد مولانا مودودی کا خلافت کمیٹی سے کسی قسم کا تعلق کسی مؤرخ یا مصنف نے بیان نہیں کیا ۔ نہ ہی راقم کی نظر سے کوئی مستند مواد گذرا ، جس کی روشنی میں مولانا کا خلافت کمیٹی میں سرگرم عمل ہونا بیان کیا جا سکے ۔

مولانا موصوف نے راقم کی تحقیق کا یہ جواب دیا کہ "میرے متعلق ڈاکٹر ایچ ،

ہیں ، خاں صاحب نے جس تحقیق و کاوش کے ساتھ بعض غلطیوں کی اصلاح کی ہے ، وہ قابل قدر ہے ۔ لیکن اس میں بھی کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں ، جن کی نشاندہی ریکارڈ درست رکھنے کے لیے ضروری ہے ۔ مولانا نے لکھا ہے کہ :

"تحریک خلافت شروع ہونے سے پہلے دہلی میں ایک انجمن اعانت نظربندان اسلام قائم تھی ۔ میں اس کا باقاعدہ رکن تو نہ تھا مگر ایک رضاکار کے طور پر اس میں کام کرتا تھا ۔ اس حقیر سی خدمت کے لیے "روح رواں" کا لفظ مبالغہ آمیز ہے ۔"...
"تحریک خلافت سے مجھے دلچسپی ضرور تھی ۔ مگر کسی خلافت کمیٹی کا رکن میں نہیں بنا ۔ اس لیے کسی مرکزی یا صوبائی اجلاس میں میری شرکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ اُس وقت بہت سے لوگ تحریک کے حامی تھے مگر اس کی تنظیم میں شامل نہ تھے ۔"

راقم کا تیسرا نکتہ یہ تھا کہ مولانا مودودی نے اخبار "مسلم" دہلی کی ادارت ۱۹۲۲ء سے کی ۔ اس ضمن میں یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ اخبار 'ہفت روزہ' مسلم، یکم نومبر ۱۹۲۱ء سے جاری ہوا ۔ جس کا اہتمام مفتی کفایت اللہ صاحب مرحوم ، صدر جمعیۃ علماء ہند دہلی نے کیا تھا اور ۸ اپریل ۱۹۲۳ء کو بند ہوگیا تھا ۔ مولانا موصوف نے ۲۶ جنوری ۱۹۲۲ء کو اس اخبار کی ادارت سنبھالی اور اخبار ہذا کے بند ہونے تک مدیر رہے ۔ مولانا کا اس ضمن میں جواب درج ذیل ہے :

"جمعیۃ علمائے ہند کے اخبار "مسلم" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے میں نے ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۳ء میں کام کیا تھا ۔ مگر اس پر میرا نام بحیثیت ایڈیٹر درج نہیں ہوتا تھا ۔ اس پرچے کے مالک منشی عبدالحمید صاحب تھے اور ان ہی کا نام اس پر لکھا جاتا تھا ۔ جمعیت اس کی مالک نہ تھی ۔"

راقم نے مولانا کا نام اخبار ہذا پر لکھا دیکھا ہے اور بحیثیت ایڈیٹر درج ہے ۔ اسی بنیاد پر مولانا کی ادارت کے وقت کا تعین بھی کیا جا سکا ہے ۔

راقم کا چوتھا نکتہ یہ تھا کہ مضمون نگار نے ۱۹۲۴ء کے اوائل میں مولانا کی دہلی میں واپسی اور مولانا محمد علی جوہر اور مولانا احمد سعید کی طرف سے بیک وقت "ہمدرد" اور "الجمعیۃ" کی ادارت کی پیش کش ، بیان کی ہے ۔

محترم مضمون نگار نے سیاق و سباق کا لحاظ کیے بغیر یہ تحریر فرمایا ہے کہ اوائل ۱۹۲۴ء میں مولانا دہلی آئے اور ساتھ ہی ساتھ "ہمدرد" اور "الجمعیۃ" کی ادارت کی پیش کش بھی بیان فرمائی ہے ۔ اس سلسلہ میں یہ بات واضح ہے کہ سہ روزہ "الجمعیۃ" ۲۰ فروری ۱۹۲۵ء کو دہلی سے جاری ہوا تھا ۔ لہٰذا اوائل ۱۹۲۴ء میں مولانا کو اس اخبار کی ادارت کی پیش کش غیر تحقیقی اور خلاف واقعہ ہے ۔ چونکہ اس وقت اخبار جاری ہی نہیں ہوا تھا ۔ علاوہ ازیں ، اس اخبار کے پہلے مدیر مولا محمد عرفان تھے۔ جنہوں نے ۲۰ فروری ۱۹۲۵ء تا ۴ جون ۱۹۲۵ء ادارت کے فرائض انجام دیے ۔ بعدہٗ ۱۴ جون ۱۹۲۰ء تا ۱۵ مئی ۱۹۲۸ء مولانا نے ادارت کی ۔

اس ضمن میں مولانا کا جواب حسب ذیل ہے :

"اخبار "الجمعیۃ" جب جاری ہوا تو اس کی تاریخ اجراء سے ہی میں اس کا ایڈیٹر تھا ۔ لیکن ابتداءً کچھ مدت تک ایڈیٹر کی حیثیت سے مولانا محمد عرفان کا نام شائع ہوتا رہا ۔ بعد میں مولانا دہلی سے بمبئی منتقل ہوگئے تو میرا نام شائع ہونے لگا ۔"

مضمون نگار نے اس ضمن میں دوسری غلطی یہ بیان کی ہے کہ مولانا نے ۱۹۲۵ء میں "الجمعیۃ" کی ادارت سنبھالی جو چار سال جاری رہی ۔ چار سالہ مدت غیر تحقیقی اور بے بنیاد ہے ۔ کیونکہ ۱۴ جون ۱۹۲۵ء تا ۱۵ مئی ۱۹۲۸ء کا کل عرصہ ۲ سال گیارہ ماہ ہوتا ہے ۔ مولانا نے اس سوال کے جواب میں خاموشی اختیار کی ہے ۔ جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ راقم کی تحقیق درست اور صحیح ہے ۔

مضمون نگار نے لکھا تھا کہ ۱۹۲۷ء میں ۲۴ سال کی عمر میں مولانا کی قانون صلح و جنگ پر بہترین کتاب "الجہاد فی الاسلام" کی تصنیف ۔ اس ضمن میں راقم نے یہ بات واضح کرنا ضروری خیال کی کہ یہ بات صاف کی جائے کہ مولانا نے ۱۸ تا ۲۲ اور ۲۹ جولائی ۱۹۲۵ء نیز ۱۰ تا ۱۴ اور ۱۸ اگست ۱۹۲۵ء کو "الجمعیۃ" کے اداریوں میں اسلام کی قوت کا اصل سرچشمہ کے عنوان سے مسلسل مضامین شائع کیے ۔ یہ مضامین ۱۹۶۹ء میں مرتب ہوئے اور اس طرح یہ مولانا کی سب سے پہلی تصنیف ہے ۔ اس امر میں طرفگی یہ ہے کہ "اسلام کا سرچشمۂ قوت" شائع ہونے سے پہلے مولانا کی سب سے پہلی تصنیف "الجہاد فی الاسلام" کو ہی سمجھا جاتا تھا ۔ مولانا کی سن ولادت (۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء) کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہے کہ مولانا کی سب سے پہلی تصنیف ۲۱ سال کچھ ماہ کے بعد صفحہ قرطاس پر نمودار ہوئی ۔ لیکن اس کی تدوین و ترتیب ۱۹۶۹ء میں عمل میں آئی ۔ مولانا نے اس توضیح پر بھی سکوت اختیار کیا ہے ۔ جس کا

صاف مطلب راقم کے بیان کی تصدیق و توثیق ہے - مزید تحقیق سے یہ بات مصدقہ ہے کہ مولانا کی سب سے پہلی ایک اور کتاب "اخلاقیات اجتماعیہ" ہے ، جو اب شائع ہوچکی ہے - یہ مضامین ماہنامہ "ہمایوں" دہلی میں فروری ۱۹۲۴ء تا نومبر ۱۹۲۴ء تک غیر مسلسل اقساط میں شائع ہوئے تھے جنھیں محمد خالد فاروقی نے کتابی شکل میں مدون کیا ہے -

مضمون نگار کا لکھنا کہ نمبر ۷، ۱۹۳۲ء میں حیدر آباد دکن سے ماہنامہ "ترجمان القرآن" کا اجراء تھا - اس ضمن میں بھی مضمون نگار نے ٹھوکر کھائی ہے - اس امر میں طرفگی یہ ہے کہ یہ رسالہ رجب المرجب ۱۳۵۱ھ/ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں ابو محمد مصلح صاحب نے ، اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد دکن سے جلد نمبر ۱ اور شمارہ نمبر ایک شائع کیا اور جلد نمبر ۱ - نمبر ۱ تا ۶ یعنی کل چھ شمارے ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ تک خود شائع کیے - علاوہ ازیں جلد نمبر ۱، نمبر ۶ کے صفحہ ۳۶ پر موصوف نے یہ اعلان شائع کیا کہ "ترجمان القرآن" کا نیا انتظام - الحمدللہ "ترجمان القرآن" کی تصنیف اول ششماہی ختم ہوئی - اگر خدا کو منظور ہے تو آئندہ اس کا انتظام مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سابق ایڈیٹر "الجمعیۃ" کے سپرد کیا جائے گا - جس میں قرآنی مقاصد کے بہترین مضامین فراہم ہوں گے - سائز بھی بدلا جائے گا - رائل سائز کے ۶۴ صفحات پیش کیے جائیں گے - ٹائیٹل اور کاغذ بھی اعلیٰ ہوگا اور کتابت و طباعت میں بھی مزید ترقی ہوگی - اس سلسلہ میں ناظرین کرام پر بھی فرض عائد ہوتا ہے - اس کے کہنے کی ضرورت نہیں - کیونکہ جو بات خود اپنی طرف سے ہوتی ہے ، اس کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے - دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے ! آمین - فقیر محمد مصلح- مولانا کا اس سلسلہ میں جواب حسب ذیل ہے:

"ترجمان القرآن" ابتداء میں جناب ابومحمد مصلح صاحب نے جاری کیا تھا - مگر چھ مہینے بعد انھوں نے اسے بند کرنے کا ارادہ ظاہر کیا کیونکہ وہ اس کو نہیں چلا سکتے تھے - انھوں نے مجھ سے کہا کہ آپ اسے لے لیں - چنانچہ میں نے قیمت ادا کرکے یہ رسالہ ان سے خرید لیا - اپنی ادارت میں شائع ہونے والے آخری پرچہ میں ابو محمد مصلح صاحب کے یہ الفاظ کہ آئندہ اس کا انتظام مودودی کے سپرد کیا جائے گا ، یہ غلط فہمی پیدا کرتے ہیں کہ رسالہ انھی کی ملکیت میں رہے گا اور صرف اس کا انتظام میں کروں گا - لیکن چونکہ مجھے چھوٹی چھوٹی باتوں کو اہمیت دینے کی عادت نہیں ہے ، اس لیے میں نے ان کی اس بے جا بات کو نظر انداز کر دیا - صحیح بات یہی ہے کہ ان کا انتظام ختم ہونے کے بعد جب میری ملکیت میں اس کا انتظام شروع ہوا تو حقیقت میں یہ رسالہ میں نے از سر نو جاری کیا

تھا - اس میں شک نہیں کہ میری ملکیت میں آنے کے بعد بھی کچھ مدت تک ان کا نام ہی طابع و ناشر کی حیثیت سے درج ہوتا رہا - کیونکہ میں نے ان پر اعتماد کرتے ہوئے ڈکلریشن تبدیل کرانے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی - مگر یہ تجربہ میرے لیے تلخ ثابت ہوا - آخرکار مجھے محکمہ متعلقہ میں اپنی ملکیت کا ثبوت بہم پہنچا کر اپنے نام کا ڈکلریشن منظور کرانا پڑا،،۔

مضمون نگار کا آٹھواں نکتہ یہ تھا کہ ۱۹۳۷ء میں مولانا کی علامہ اقبال سے ملاقات اور علامہ کا مولانا کو پنجاب منتقل ہونے کا مشورہ ، راقم نے اس نکتہ کی مزید صراحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ مضمون نگار نے اس مرحلہ پر بھی تاریخ اور تحقیق کے معیار کو نظر انداز کرکے سطحی اور سرسری مطالعہ کے تحت ایسا تحریر فرمایا ہے - وگرنہ اصل واقعہ یہ ہے کہ چودھری نیاز علی خاں ، جمال پور متصل پٹھان کوٹ میں ایک ادارہ بنام ''دارالاسلام'' قائم کرنا چاہتے تھے - اس سلسلہ میں چودھری صاحب نے بہ ہمراہ حاجی محمد اسد (سابق لیو پولڈ ویئس) ۱۹۳۷ء میں علامہ اقبال سے ملاقات کی - اس سلسلہ میں مزید تفصیلات راقم کی کتاب ''شاہ راہ مکہ'' کے مقدمہ میں دیکھی جا سکتی ہیں - اس ملاقات میں دارالاسلام کے قیام اور انصرام کے متعلق علامہ اقبال کی رائے اور تعاون طلب کیا تھا - علامہ اقبال کی دور رس نگاہوں نے اس عظیم منصوبہ کی کامیابی کے لیے مولانا مودودی کو منتخب کیا اور چودھری صاحب نے مولانا کو پٹھان کوٹ آنے کی دعوت دی - جسے موصوف نے قبول کر لیا - چودھری نیاز علی خاں کے بیان کے مطابق مولانا ۲۳/۲۲ جنوری ۱۹۳۸ء کو پٹھان کوٹ پہنچے - لیکن یہ تاریخ صحیح نہیں ہے - کیونکہ ''ترجمان القرآن'' ، جلد ۱۱ ، عدد ۶ ، صفحہ ۴۵۶ پر یہ عبارت درج ہے - ''مگر صاحب دفتر کو حیدر آباد دکن کی زمین پکڑ کر بیٹھ گئی اور ۱۰ محرم الحرام ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۰-۱۱ مارچ ۱۹۳۸ء تک مولانا جمال پور نہیں آئے تھے - لہٰذا ایسی صورت میں مولانا کا ۱۹۳۸ء میں علامہ اقبال سے ملاقات کرنا غیر تحقیقی اور خلاف واقعہ ہے -

دوسری بات یہ ہے کہ علامہ اقبال کی وفات ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء میں ہوئی - مولانا موصوف حسب تفصیل بالا جمال پور میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد علامہ اقبال سے ملاقات کرنے لاہور گئے ، مگر مولانا کی لاہور میں آمد سے پہلے علامہ اقبال فوت ہو چکے تھے - لہٰذا مضمون نگار کا نظریہ یعنی علامہ اقبال نے مولانا کو حیدر آباد سے منتقل ہونے کا مشورہ دیا ، حقائق کی روشنی میں خود بخود بے وزن ہو جاتا ہے - مولانا نے جواباً تحریر فرمایا ہے کہ :

''علامہ اقبال سے ملاقات کے معاملہ میں بھی ڈاکٹر صاحب کی تحقیق اصلاح طلب ہے ۔ میں جب حیدر آباد دکن میں تھا ، اس زمانہ میں علامہ مرحوم سے میری مراسلت کسی اور سلسلہ میں ہوئی تھی ۔ جس کا پٹھان کوٹ کے دارالاسلام کی اسکیم سے کوئی تعلق نہ تھا ۔ اسی زمانہ میں چودھری نیاز علی خاں صاحب مرحوم نے مجھ سے مراسلت اپنے اس موقف کے بارے میں شروع کی تھی، جس کی عمارت وہ تعمیر کر رہے تھے ۔ اس میں اس بات کا کوئی ذکر نہ تھا کہ علامہ اقبال سے بھی وہ گفتگو کر رہے ہیں ۔ یہ مراسلت جاری تھی کہ ۱۹۳۷ء میں مجھے ایک کام کے سلسلہ میں دہلی جانے کا اتفاق ہوا ۔ وہاں چودھری نیاز علی صاحب بھی تشریف لے آئے اور انھوں نے اصرار کیا کہ میں ایک دفعہ ان کی اس وقف جائداد کو دیکھ لوں ۔ چنانچہ میں ان کے ساتھ وہاں گیا اور واپسی پر علامہ اقبال مرحوم سے ملا ۔ انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں چودھری صاحب کی پیش کش قبول کر لوں اور وعدہ فرمایا کہ جب تم وہاں آ جاؤ گے تو میں بھی ہر سال کچھ دن وہاں گزاروں گا ۔ اس پر میں نے پٹھان کوٹ منتقل ہو جانے کا فیصلہ کر لیا اور حیدر آباد واپس جا کر ہجرت کی تیاری شروع کر دی ۔ ۱۸ اپریل ۱۹۳۸ء کو پٹھان کوٹ پہنچا ہی تھا کہ تین روز بعد علامہ مرحوم کی وفات کی اطلاع ملی''۔

راقم کا نواں نکتہ یہ کہ ۱۹۳۸ء میں ایک اہم اور تاریخ ساز واقعہ پیش آیا کہ مولانا نے ''اشارات'' ''ترجمان القرآن'' جلد ۱۲، عدد ۵، جمادی الاول ۱۳۵۷ھ مطابق جولائی ۱۹۳۸ء صفحہ ۲ تا ۳۲۲/۲ پر مرقوم کیا ہے کہ : ''ادارہ دارالاسلام کے کتب خانہ کو کتابوں کا سب سے پہلا عطیہ ملک عبدالعزیز ابن سعود ، سلطان نجد و حجاز کی طرف سے وصول ہوا ہے ۔ جو مذہب حنبلی کی بہترین کتابوں پر مشتمل ہے''۔

کسی سربراہ خصوصاً عرب ممالک کی جانب سے مولانا کی یہ سب سے پہلی ہمت افزائی تھی ۔ جو ادارہ ''ترجمان القرآن'' کے لیے کی گئی۔ یہ وہ دور تھا جب مولانا ذہنی اور معاشی طور پر غیر مطمئن اور غیر مستحکم تھے۔ اس زمانہ میں سرکاری طور پر مولانا کی ہمت افزائی اور قدر شناسی بہت بڑی بات تھی ۔ چونکہ ان ایام میں اہل وطن بھی مولانا کے علمی کارناموں و کد در خور اعتنا نہیں سمجھتے تھے ۔

راقم کا نکتہ نمبر دس یہ ہے کہ ۱۹۳۹ء میں ''تجدید احیائے دین''، ''اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر اور دیگر بنیادی کتب منظر عام پر آئیں ۔ موصوف مضمون نگار نے اس مقام

پر بھی ایک اہم تاریخی واقعہ کو نظر انداز کیا ہے - جو پاکستان قائم ہونے کی بنیاد و اساس ہے اور یہ وہ نظریاتی لگاؤ ہے جو پاکستان کے قائم ہونے میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے - وہ یہ ہے کہ یوم اقبال کے موقعہ پر ۱۰ اپریل ۱۹۳۹ء کو مولانا نے ایک تحقیقی اور پرمغز مقالہ پڑھا جو مئی ۱۹۳۹ء کے "طلوع اسلام"(ماہنامہ رسالہ) میں دہلی سے شائع ہوا - اس تفصیلی مقالہ میں مولانا نے نہایت واضح اور صاف الفاظ میں مسلمانوں کو ایک جداگانہ ملت کی حیثیت سے ثابت کیا ہے اور اسلامی تصورِ حیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حزب اللہ اور حزب الشیطان کی تشریح کی ہے - آپ نے فرمایا ہے کہ مسلمان بہ حیثیت مسلمان ایک ملت یا اللہ کی پارٹی ہیں اور عالم اسلام کے تمام مسلمان ایک جماعت یا اللہ کی پارٹی میں منسلک ہیں - یہ بات کسی ذی عقل سے پوشیدہ نہیں کہ دور مذکور میں برِ صغیر پاک و ہند میں دو قومی نظریہ اور ایک قومی نظریہ کی جنگ بڑی شد و مد سے جاری تھی - مسلم لیگ نے ایک قومی نظریہ کی نفی کی اور دو قومی نظریہ کا پرچار کیا - جب کہ کانگریس اور دیگر قوم پرور جماعتیں ایک قومی نظریہ کی حمایت و تبلیغ کر رہی تھیں - چنانچہ ان نازک ایام میں مولانا موصوف نے "اسلامی قومیت کا حقیقی مفہوم" کے نام سے ایک معرکۃ الارا مقالہ پیش کیا اور اپنے ٹھوس دلائل اور اسلامی نقطۂ نظر سے نہ صرف ایک قومی نظریہ کی نفی کی بلکہ اپنے وزنی دلائل سے یہ بات بھی ثابت کی کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک جماعت یا اللہ کی پارٹی ہیں اور دوسری قوموں یا کسی قوم سے بالکل علیحدہ ایک ملت واحدہ ہیں - چونکہ مسلمانوں کا نظامِ حیات ، مسلک ، عقائد ، عبادات، معاشرت اور معیشت سب ایک الہامی فلسفہ یعنی قرآن و سنت پر مبنی ہیں - موصوف نے اس طرح پاکستان کے نظریہ اور اس کی تعمیر میں ایک اہم اور مؤثر کردار ادا کیا اور آگے چل کر یہی دو قومی نظریہ' پاکستان کی تخلیق کا باعث بنا - حالانکہ اس وقت یعنی اپریل ۱۹۳۹ء میں قراردادِ پاکستان کا کوئی تصور بھی کسی کے وہم و گمان میں نہ تھا - آخرکار ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ لاہور میں یہی نظریہ قرار دادِ پاکستان کی شکل میں بہ اتفاق آراء منظور ہوا -

باب ششم

۱۹۲۲ء - ۱۹۳۵ء : علماء کا کردار

فصل اول

شدھی ، سنگھٹن اور اس کے رد عمل میں تبلیغی اور تنظیمی تحریکات اور علماء کی سرگرمیاں

شدھی کا مسئلہ اور ہندو دھرم :

شدھی کے لغوی معنی "پاک کرنا یا پوتر کرنا" ہیں ۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے بیان کے مطابق شدھی تحریک کا مقصد یہ تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں کو مرتد (ہندو) کر لیا جائے۔[1] شدھی کا تصور ہندو دھرم میں بہت پرانا ہے اور اس کی جڑیں ہندو دھرم میں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں ۔ جو ہندوؤں کے 'دھرم' شاستر "منوسمرتی" میں ملتی ہیں ۔ "منوسمرتی" ہندوؤں کا بہت مقدس دھرم شاستر سمجھا جاتا ہے ۔ اس کے اوراق ایسے مختلف اشلوکوں سے بھرے پڑے ہیں ، جن میں انسانی حالتوں کے لحاظ سے "شدھی کے مختلف طریقے منضبط کیے گئے ہیں ۔ شدھی کے ان طریقوں میں جبر و تشدد سے کام لینا ، انسانیت کے خلاف اور قابل نفرین فعل قرار دیا گیا ہے"۔[2] لیکن بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ، سوامی شردھانند نے شدھی کی جو تحریک شروع کی تھی ، وہ "منوسمرتی" کے بیان کردہ اصولوں پر پوری نہیں اترتی ۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ ایسے مسلمانوں کو بجبر مرتد کیا جائے ، جو ہندو مت سے اسلام میں داخل ہوئے تھے ۔ اس تحریک کا نشانہ خاص طور سے وہ مسلمان تھے ، جو اسلام قبول کرنے کے باوجود ، اسلامی رسم و رواج اور اسلامی طرز زندگی سے بے بہرہ تھے ۔ اسی نظریہ کو روبہ کار لانے کے لیے سوامی شردھانند نے ملکانہ راجپوتوں کو مرتد کرنا شروع کیا تھا ۔ اس کی مزید

---

1. I.H.L Qureshi, *The Muslim Community of Indo-Pakistan Sub-continent*, The Hague, 1962, pp. 279-81;

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ، "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ، کراچی : ۱۹۶۷ء ، ص ص ۳۶۳-۳۶۵ ۔

۲ ۔ "زمانہ" کانپور : جولائی ۱۹۲۳ء ، ج ۱ ، نمبر ۱ ، ص ۳۵

تفصیلات حسب ذیل ہیں :

برصغیر میں فرنگیوں کا قبضہ اور تسلط قائم ہونے کے بعد مسلمانوں کا سیاسی اقتدار اور مذہبی و دینی دبدبہ ختم ہوگیا ۔ عہد اسلامی میں ہندو ، مسلم اور دیگر قومیں آپس میں شیر و شکر ہو کر رہتی تھیں ۔ جس کا اعتراف گاندھی جی نے دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر لندن میں کیا تھا ۔ بقول چودھری خلیق الزمان ”گاندھی جی نے کہا تھا کہ عہد اسلامی میں ہندوستان میں فرقہ وارانہ ، مذہبی اور نسلی فسادات نہیں ہوتے تھے“۔[1] اس کے برعکس ، ملک میں ابھی پوری طرح برطانیہ کا قبضہ و تسلط قائم بھی نہیں ہوا تھا کہ ملک میں ہندو مسلم فسادات شروع ہونے لگے ۔ چودھری صاحب موصوف نے سب سے پہلا ہندو مسلم فساد ۱۸۰۴ء بمقام بنارس بیان کیا ہے ۔ لیکن ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے بیان کے مطابق ”برصغیر میں سب سے پہلا ہندو مسلم فساد ۱۸۰۹ء میں بنارس میں رونما ہوا“۔[2] برصغیر میں برطانیہ کے عمل دخل کے بعد ، ہندوؤں نے انیسویں صدی کے درمیان سے ہی اپنی رفاہی اور اصلاحی جماعتیں قائم کرنا شروع کر دی تھیں ۔ ان جماعتوں نے مختلف حالات اور مختلف عوامل کے تحت اپنی تنظیمیں قائم کیں ۔ ان کی مزید تفصیلات ماسبق میں گزر چکی ہیں ۔ ہندوؤں کے نزدیک ان تنظیموں کا مقصد، اپنے دھرم کا احیاء اور تحفظ تھا ۔ لیکن عملاً ان کی زد براہ راست مسلمانوں پر پڑتی تھی ۔ بیسویں صدی کے اوائل میں ، انھوں نے ویدک مذہب کی حفاظت اور اشاعت کے لیے سات بڑی انجمنیں قائم کیں ۔ یہ انجمنیں ۱۹۰۸ء میں مختلف مقامات پر قائم تھیں ۔ ”علی گڑھ گزٹ“ کے اداریہ کے مطابق وہ سات انجمنیں حسب ذیل تھیں :

۱۔ ”پنجاب آریہ پرتی ندی“، اس کا صدر مقام لاہور تھا ۔

۲۔ صوبہ متحدہ کی ”آریہ پرتی ندی“ ، اس کا صدر مقام آگرہ تھا ۔

۳۔ راجپوتانہ کی ”آریہ پرتی ندی“، جس کا صدر مقام بھرت پور تھا ۔

۴۔ صوبہ متوسط اور برار کی ”آریہ پرتی ندی“، جس کا صدر مقام نرسنگھ پور تھا ۔

۵۔ صوبہ بمبئی کی ” آریہ پرتی ندی“، جس کا صدر مقام بمبئی تھا ۔

---

1. Khaliquzzaman, Choudhry, *Pathway to Pakistan*, Lahore, 1961, p, 69; Board of Editors, *A History of the Freedom Movement*; vol. 3, pt. 1, Karachi, 1963, pp. 254-55;
Muslim Community of Indo-Pakistan Sub-continent, pp. 279-80;
”برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ“ ، ص ۳۲۵

2. *Pathway to Pakistan*, p. 69;
The Muslim Community of Indo-Pakistan Sub-continent, pp. 279-80.

۶۔ صوبہ بنگال اور بہار کی "آریہ پرتی ندی"، جس کا صدر مقام بانکی پور تھا ۔ اور
۷۔ برما کی "آریہ پرتی ندی"، جس کا صدر مقام مالڈلیے تھا"۔[۱]

قیاس کہتا ہے کہ یہ انجمن ایک ہی نام سے مختلف مقامات پر قائم تھی ۔ ہر انجمن ایک جداگانہ حیثیت رکھتی تھی اور یہ ہم نام انجمنیں کسی مرکزی ادارے سے منسلک نہ تھیں ۔ البتہ مدیر موصوف نے اتنی بات اور بیان کی ہے کہ سوامی دیانند سرسوتی کی ہدایت کے مطابق ایک آریہ درسگاہ "گروکل" کے نام سے ہردوار میں قائم تھی ۔ ممکن ہے یہ "گروکل" تمام انجمنوں اور آریاؤں کی تنظیم کا مرکزی مقام ہو ۔[۲] یہ تنظیمیں تو آریا سماج کے زیر اثر تھیں ۔ مگر ہندوؤں نے ان تحریکات کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے اور ان کی مالی حالت مستحکم بنانے کے لیے بڑی گرم جوشی سے حصہ لیا اور خوب دل کھول کر چندہ دیا ۔ ان انجمنوں کی مالی امداد کے سلسلے میں ہندوؤں کے دلی تعاون کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۰۸ء میں پنجاب کی انجمن "آریہ پرتی ندی" کے پاس مبلغ تین لاکھ ایک ہزار دو سو انتالیس (-/۳۰۱۲۳۹) روپے کا خطیر سرمایہ تھا ۔ اس طرح ہندوؤں نے ویدک مذہب کے پرچار اور اپنے دھرم کے احیاء و تحفظ کے لیے بڑے جوش و خروش کا عملی ثبوت دیا ۔[۳]

۱۹۰۷ء میں آل انڈیا مہاسبھا قائم ہوئی ۔ ہندوؤں کی یہ تنظیم تعصب اور منافرت پھیلانے کی بنیادوں پر عمل میں آئی تھی ۔ اس کے مقاصد کے تحت ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان ایک متبرک اور پاک بھومی (Holy Land) ہے ۔ ہندو اس کے قدیم باشندے اور جائز حکمران ہیں ۔ اس سر زمین میں دیگر اقوام مثلاً مسلمان ، عیسائی اور پارسی وغیرہ کا ملکیت ، سلطنت اور حکومت میں کوئی حصہ نہیں ہے ، چونکہ اصلاً یہ لوگ غیر ملکی ہیں ۔ مہاسبھا کا بنیادی مقصد ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنا تھا ۔[۴] ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور ڈاکٹر عبدالحمید کے بیانات کے مطابق "ہردیال" نے ۱۹۲۵ء میں اس بات پر بہت زور دیا کہ ہندو جب تک مندرجہ ذیل چار چیزوں پر عمل نہیں کریں گے ۔ اس وقت تک ان کی اور ان کی آئندہ نسلوں کی سلامتی خطرے میں رہے گی ۔ وہ چار چیزیں یہ ہیں :

---

۱ - "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ"، ۳۰ جون ۱۹۰۹ء، ج ۹ ، ش ۲۶، (اداریہ) ، ص ۷، ک ۱-۲
۲ - ایضاً

3. M. Mujeeb, ***The Indian Muslims***, London, 1967, p. 184;
"علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ"، محولہ بالا

4. Rajendra Prasad, ***India Divided***, Bombay, 1964, p. 18;
"برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ، ص ۳۶۴ (حاشیہ)

"(۱) ہندو سنگھٹن ' (۲) ہندو راج ، (۳) مسلمانوں کی شدھی ، اور (۴) افغانستان اور سرحدی علاقوں کی فتح اور وہاں کے باشندوں کی شدھی"۔

ہندو مہاسبھا کی بنیادیں ، زیادہ تر ان ہی چار نکات پر قائم تھیں ۔ کیونکہ ان کے خیال میں ہندوؤں کی بقا اور ان کے دھرم کا تحفظ ان چار چیزوں کی عدم موجودگی میں غیر ممکن تھا ۔[1] ہردیال نے اپنے بیان میں ان امور کو چار ستون قرار دیا ہے اور مزید بیان کیا ہے کہ ہندوستان کی ہندو نسل اور پنجاب کا مستقبل بھی ان چار اصولوں پر ہی منحصر ہے ۔

۱۹۱۵ء میں آل انڈیا مہاسبھا کو دوبارہ منظم کیا گیا اور اس مرتبہ اس کے فرائض میں ، اولین فرض یہ طے کیا گیا ، کہ ہندوستان میں ہندوؤں کا سیاسی غلبہ قائم کیا جائے تا کہ مستقبل میں ہندو راج قائم کرنے میں آسانی اور سہولت پیدا ہو اور جب یہاں ہندو راج قائم ہو جائے تو پھر ہندو مت کے پرچار اور اس کے مفادات کی نگرانی و حفاظت میں کوئی امر مانع و مزاحم نہ ہوگا ۔[2]

۱۹۱۶ء میں برصغیر کی سیاسی پارٹیوں یعنی مسلم لیگ اور کانگریس نے ، ملک کے بہتر مفاد اور اہل ملک کو بیرونی طاقت سے نجات دلانے کے لیے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت کو بڑی شدت سے محسوس کیا ۔ حالانکہ یہ دونوں جماعتیں ہندو مسلم اتحاد کے منافع کو ۱۹۱۳ء سے محسوس کر رہی تھیں ۔ نیز اس وقت سے ایک دوسرے کے قریب آنے کی کوشش بھی کر رہی تھیں ۔ مگر جنگ عظیم اول نے ، اہل ملک میں اس بات کا مزید احساس اور شعور بیدار کیا کہ ان کے سیاسی مفادات ، اسی صورت میں محفوظ ہو سکتے ہیں ، جب کہ دونوں قومیں آپس میں متحد اور متفق ہوکر آزادی کا مشترکہ مطالبہ کریں ۔ اس نظریہ کے تحت دسمبر ۱۹۱۶ء میں میثاق لکھنؤ عمل میں آیا ۔ (جس کی تفصیلات ماسبق میں بیان کی جا چکی ہیں) ۔ اس میثاق کے تحت ایک مشترکہ مطالبہ اور دستوری فارمولا تیار کرکے حکومت کے سامنے پیش کیا گیا ۔ طرفہ یہ کہ ایک طرف تو "ہندو مسلم یکجہتی" پیدا کرنے کے لیے دونوں قوموں کے سنجیدہ افراد کوشاں تھے ۔ تو دوسری طرف ستمبر ۱۹۱۷ء میں متعصب قسم کے ہندوؤں نے ملک کے مختلف مقامات پر فرقہ وارانہ فسادات برپا کرنا شروع کر دیے تھے ۔ یہ فسادات ان مقامات پر خاص طور سے برپا کیے گئے جہاں پر مسلمانوں کی آبادی ۴ اور ۷ فیصد کے درمیان تھی ۔ جن میں

---

1. Abdul Hamid, *Muslim Separatism in India : A Brief Survey* (1858-1947), O.U.P., 1971, p. 114;

"برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ"، ص‌ص ۳۶۴-۳۶۵ (حاشیہ)

2. *India Divided*, p. 18.

خاص طور سے یو پی کے مشرقی حصے اور آراہ ، شاہ باد اور بہار وغیرہ شامل تھے ۔[1] مزید برآں ستمبر ۱۹۱۸ء میں کٹار پور متصل ہردوار صوبہ یو پی میں الیس مسلمانوں کو زندہ نذر آتش کر دیا گیا اور اسی طرح سے دیگر مسلمانوں کو ہراساں اور پریشان کیا جاتا رہا ۔[2]

۱۹۱۹ء میں ترکی کی ناکام یابی کے بعد ، برصغیر میں تحریک خلافت شروع ہوئی ۔ اس تحریک نے ابتداء ہی سے ، ہندو مسلم اتحاد اور یکجہتی پر زور دیا ۔ برصغیر کے باشندوں کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ تحریک خلافت نے ، دونوں قوموں بلکہ جملہ ہندوستانی اقوام کو ایک دوسرے کے قریب تر کر دیا تھا ۔ اس اتحاد کے نتیجے میں دونوں قومیں آپس کے اختلافات کو فراموش کرنے کے بعد ، ملک کو آزاد کرانے کے لیے ، متحد اور متفق ہوگئی تھیں ۔ مگر شو مئی قسمت کہ یہ اتحاد دیر پا ثابت نہ ہوا ۔ اس کی منجملہ دیگر وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ اگست ۱۹۲۱ء میں موپلوں نے مالا بار میں بلوہ کیا ۔ جس کی بناء پر ہندو مسلم اتحاد کو کاری ضرب لگی ۔[3] موپلہ بلوہ کے سلسلے میں مورخین میں اختلاف پایا جاتا ہے ۔ بعض مورخ اس کو شدھی اور سنگھٹن کا پیش خیمہ قرار دیتے ہیں اور بعض مورخ اس بلوے کو برطانیہ کی پرانی پالیسی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کا کرشمہ تصور کرتے ہیں ۔ چودھری خلیق الزماں نے گمان ظاہر کیا ہے کہ موپلہ فساد کے بعد ، سوامی شردھانند نے ، جو حال ہی میں رہا ہوئے تھے ، جب وائسرائے ہند سے ملاقات کی تو بوقت ملاقات وائسرائے نے شردھانند کی ہمت افزائی کی ۔ چودھری صاحب کے اصل الفاظ یہ ہیں :

"It has been said that Swami Shardhanand had been propped up by the Viceroy who had met him after the Mopla riots".[4]

1. *The Muslim Community of Indo-Pakistan Sub-continent*, pp. 279-80: *Pathway to Pakistan*, p. 70.
2. *The Muslim Community of Indo-Pakistan Sub-continent*, p. 280;
3. *Muslim Separatism in India : A Brief Survey*, p. 158; *A History of the Freedom Movement*, vol. 3, pt. 1, pp. 270-71.
4. *Pathway to Pakistan*, p. 70.

نوٹ : سوامی شرد ھانند وہ ہی شخص ہے جسے مسلمانان ہند نے ، ہندو مسلم اتحاد کی خاطر ایک جلوس کی شکل میں جامع مسجد دہلی میں لے جا کر مسجد کے منبر پر چڑھا کر حاضرین کو خطاب کرنے کا غیر معمولی اعزاز بخشا تھا ۔ لیکن تھوڑے عرصے کے بعد شردھانند نے شدھی کی تحریک شروع کر دی ۔ "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ، ص ۳٦۵ (ذ)؛

S.M. Ikram, *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*, Lahore, 1970, 2nd ed., pp. 153-68.

نوٹ نمبر ۲ : سوامی شردھانند کا اصل نام لالہ منشی رام تھا اور جالندھر (مشرقی پنجاب) کا مکین تھا ۔ سردار علی صابری ۔ روز نامہ "جنگ"، ۱۰ اگست ۱۹۷۳ء ج ۳۷ ۔ نمبر ۲۱۵ ۔ ص ۲ ک ۴

ایک دوسرے مصنف اللہ بخش یوسفی نے اپنی کتاب "سرحد اور جد و جہد آزادی" میں لکھا ہے کہ "انگریزوں نے سوامی شردھانند" کو غیر مشروط طور پر رہا کیا تھا اور اس نے رہائی کے بعد اپنے ہم خیال متعصب ہندو لیڈروں سے مشورہ کرکے شدھی تحریک کی تجدید کی ۔ کیونکہ یہ تحریک ۱۹۰۷ء کے بعد سے ہی مہاسبھائیوں نے کسی نہ کسی شکل میں چلا رکھی تھی اور ۱۸-۱۹۱۷ء میں تو اس کی بناء پر متعدد مقامات پر ، ہندو مسلم فسادات بھی رونما ہوئے (دیکھیے ماسبق) ۔

ان ہر دو بیانات سے یہ گمان ہوتا ہے کہ حکومت نے در پردہ اس تحریک کی حمایت کی یا پھر اس تحریک کے مفاسد اور مضمرات ظاہر ہوتے ہوئے بھی اس پر کوئی قانونی پابندی عائد نہ کی ۔ جس کے نتیجے میں محرکین تحریکات بغیر کسی خوف و ہراس اس تحریک کو چلاتے رہے ۔ جس کی بناء پر برصغیر میں جا بجا ہندو مسلم فسادات رونما ہوتے رہے ۔[1]

ڈاکٹر خالد بن سعید نے شدھی تحریک کا ایک سبب یہ بھی بیان کیا ہے کہ صوبہ یو پی میں ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے بعد مسلمانوں کی آبادی میں ہندوؤں کی نسبت زیادہ اضافہ ہوا تھا اور ہندوؤں کی آبادی کا تناسب پچھلی مردم شماری کے مقابلتاً کچھ کم ہوگیا تھا ۔ یہ بات ہندوؤں کے لیے باعث تشویش تھی ۔[2] "علی گڑھ گزٹ" نے اپنے اداریے میں "البشیر" کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ سوامی شردھانند ، مختلف مقامات پر شدھی اور سنگھٹن پر لیکچر (تقریر) دیتے پھرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مردم شماری میں جو ہر ۱۰ سال کے بعد ہوتی ہے ، ہندوؤں کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے اور اگر اس بات کا جلد تدارک نہ کیا گیا تو چار سو سال کے بعد ، دنیا کے پردے پر کوئی ہندو باقی نہ رہے گا ۔[3] مزید برآں ہندوؤں کو ایک وسوسہ یہ بھی تھا کہ ہندوستان کو آزادی ملنے کے بعد ، مسلمانان ہند ، دیگر اسلامی حکومتوں سے ساز باز کر لیں گے اور ہو سکتا ہے کہ اسلامی حکومتیں ، دینی اور اسلامی اخوت کے پیش نظر مسلمانان ہند کی اخلاقی اور مادی مدد بھی کریں ۔ جس کے نتیجے میں ہندو پھر دوبارہ مسلمانوں کی غلامی میں آ جائیں گے ۔ چنانچہ اسی خطرے کے پیش نظر "ہردیال" نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ افغانستان اور

---

1. *Pathway to Pakistan*, p. 70;

اللہ بخش یوسفی ، "سرحد اور جد و جہد آزادی"، لاہور : ۱۹۶۸ء ، ص ص ۳۵۴-۳۵۵

2. Khalid Bin Sayeed, *Pakistan : The Formative Phase*, Karachi, 1968, 2nd ed., p.57.

۳ ۔ "علی گڑھ گزٹ" ، ۱۳ ستمبر ۱۹۲۲ء ، ج ۳ ، نمبر ۲۴ ، ص ۱ ، ک ۱ ، (اداریہ)

سرحدی علاقوں کو فتح کرکے وہاں کے باشندوں کو شدھی بنایا جائے ۔ تاکہ مسلمانان ہند ، مستقبل میں اپنا غلبہ اور تسلط قائم نہ کر سکیں ۔[1]

الغرض سوامی شردھانند نے وائسرائے ہند سے ملاقات کرنے کے بعد ، شدھی کی تحریک کو عملی جامہ پہنایا ۔ شردھانند کا خیال اور منصوبہ یہ تھا کہ شدھی کے ذریعہ ملکانہ راجپوتوں کو دوبارہ ہندو بنانے میں کوئی مزاحمت یا رکاوٹ نہ ہوگی ۔ کیونکہ اولاً تو وہ پہلے ہندو ہی تھے ۔ ثانیاً یہ کہ انہوں نے اپنی جہالت کی وجہ سے ہندوؤں کے کئی رسم و رواج کو اب تک ترک نہیں کیا تھا ۔[2] بقول اللہ بخش یوسفی ، اس تحریک میں ، شردھانند نے دوسرے متعصب ہندو لیڈروں سے بھی صلاح مشورہ کیا تھا ۔ جن میں ڈاکٹر مونجے اور پنڈت مدن موہن مالویہ قابل ذکر ہیں ۔ محرکین شدھی کی تحریک نے (تحریک کو منظم کرتے وقت یعنی ۲۲-۱۹۲۱ء میں جب کہ یہ تحریک عملی طور پر منظم کی گئی) یہ اعلان کیا کہ "سر زمین ہند پر بسنے والے تمام افراد ہندو ہیں ۔ انھیں ہندوؤں کی حیثیت سے ہی زندگی بسر کرنی ہوگی ۔ غیر مبہم الفاظ میں یہ بھی اعلان کیا کہ مسلمان ، عیسائی اور جو لوگ بھی ، ہند میں آباد ہیں انھیں ہندوؤں کی حیثیت سے رہنا ہوگا ۔"[3]

تحریک سنگھٹن اور اس کے علل و اسباب :

سنگھٹن کی تحریک بھی ، شدھی کی تحریک کی طرح ، مہاسبھائی متعصب ذہنیت کی پیداوار تھی ۔ اس تحریک کے بانی اور موسس کے متعلق مورخین میں اختلاف رائے ہے ۔ ان میں سے اکثریت ، اس تحریک کا بانی پنڈت مدن موہن مالویہ کو بیان کرتی ہے ۔ لیکن چودھری خلیق الزمان نے اس تحریک کا بانی لالہ لاجپت رائے کو بیان کیا ہے ۔[4] اس

---

1. ***Pathway to Pakistan*, p. 70;**
***Pakistan : The Formative Phase*, 2nd ed., p. 57;**
***A History of the Freedom Movement*, vol. 3, pt. 1, pp. 259-62;**
"برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ، ص ص ۳۶۴-۳۶۵ (حاشیہ)

2. **Mohammad Noman, *Muslim India*, Allahabad, 1942, p. 218;**
***Pakistan : The Formative Phase*, 2nd ed., p. 57;**
***Muslim Separatism in India : A Brief Survey*, p. 155;**
***India Divided*, pp. 18-19.**

3. ***Modern Muslim India and The Birth of Pakistan*, pp. 142-68;**
"سرحد اور جد و جہد آزادی" ، ص ص ۳۵۴-۳۵۵

4. ***Pakistan : The Formative Phase*, 2nd ed., p. 57;**
***Muslim Separatism in India : A Brief Survey*, pp. 155-72;**
***Pathway to Pakistan*, p. 70.**

(نوٹ : سنگھٹن کے لفظی معنی جوڑنا اور اس سے مراد تنظیم ہے)

تحریک کی ایک وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ مسلمان فن سپہ گری ، فن بنوٹ اور فن اکھاڑا میں ماہر تھے ۔ اور وہ ان فنون کا مظاہرہ عام پبلک کے سامنے محرم وغیرہ کے موقعوں پر کیا کرتے تھے ۔ جس کی بناء پر ہنود ، ان کے اس فن سے بڑے خائف اور متاثر ہوتے تھے ۔ تحریک سنگھٹن کے بانیوں نے ہندوؤں کو منظم طور سے ، جسمانی ورزش ، فن سپہ گری ، (تلوار نیزہ چلانا وغیرہ) اور فن (اکھاڑے) کشتی (یعنی بنوٹ چلانا ، اکھاڑہ کا ہنر ، لاٹھیوں کا استعمال ، اینٹوں کے ٹکڑوں وغیرہ کا استعمال شامل تھا) وغیرہ کی تربیت دی جائے ۔ اس تنظیم سے ان کے دو مقاصد تھے ۔ ایک تو ہندوؤں کے دلوں سے ، مسلمانوں کا خوف و دبدبہ دور کرنا ، دوسرے فن سپہ گری اور فن اکھاڑہ کا علم حاصل کرکے اپنا دفاع کرنا ۔ ڈاکٹر خالد بن سعید نے ان دو مقاصد کے علاوہ ایک مقصد یہ بھی بیان کیا ہے کہ چھوت چھات کو دور کیا جائے اور ہندوؤں کے تمام فرقے ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کریں تاکہ اس طرح آپس میں اتحاد اور تنظیم پیدا ہو اور اپنے مخالفین یعنی مسلمانوں اور عیسائیوں وغیرہ سے مقابلہ کرنے میں سہولت پیدا ہو سکے ۔[1] تحریک سنگھٹن کے بارے میں سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ والیان ریاست اور ہندو زعماء نے بھی اس تحریک میں عملی حصہ لیا اور اسے کامیاب بنانے کی کوشش کی ۔ ان مہاراجگان و زعماء میں ''مہاراجہ دھول پور ، مہاراجہ پٹیالہ ، راجہ آف مالڈی اور چیف جسٹس سرشادی لال'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ ان حضرات نے اپنی اپنی ریاستوں اور علاقوں میں حتی الامکان ، اس تحریک کو تقویت پہنچائی ۔[2]

فتنہ ارتداد کو روکنے کے لیے تبلیغی اور تنظیمی جماعتوں کا قیام :

ہندو مت کے عقیدے کے مطابق ، مسلمانوں کو شدھی کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ان کو پاک یا پوتر کیا جائے ۔ عجیب بات یہ ہے کہ انگریزوں کے عہد میں ، عیسائیوں نے ، جو ہزاروں اور لاکھوں ہندوؤں کو عیسائی بنایا تھا ۔ ان کو شدھی کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی بلکہ اہل ہند کی تمام قوت اس امر پر صرف ہوتی تھی کہ مسلمانوں کو ہی مرتد بنایا جائے ۔[3] معلوم نہیں کہ شدھی کرنے کے سلسلے میں مسلمانوں اور

---

1. *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd., ed., p. 57;
Muslim Separatism in India : A Brief Survey, pp, 155-72;
Modern Muslim India and the Birth of Pakistan, p. 168;
Pathway to Pakistan. p. 70.

(نوٹ : بنوٹ سپہ گری کے ایک فن کا نام ہے ۔)

2. *The Comrade*, 4th December 1925, vol, 7, no. 1, p. 258, col. 2.

۳ ۔ ''علی گڑھ گزٹ'' ، ۱۴ ستمبر ۱۹۲۳ء ، ج ۳ ، نمبر ۲۳، ص ۱ ، ک ۱ (بحوالہ ''البشیر'')

ہندوستانی عیسائیوں میں کیوں امتیاز کیا گیا اور اس کے پیچھے کون سے مصالح اور مفاد کار فرما تھے ۔ اتنی بات بہرکیف ظاہر ہوتی ہے کہ سنگوٹن کے پیچھے مذہبی نہیں بلکہ سیاسی عوامل کار فرما تھے ۔ مسلمانان ہند بھی اس فتنہ سے غافل نہ تھے ۔ اور انھوں نے بھی ۱۹۰۹ء سے ہی اپنی جد و جہد اور تنظیمیں منظم کرنا شروع کر دی تھیں ۔ ''علی گڑھ گزٹ'' کے اداریے کے مطابق "انجمن تبلیغ اسلام" ۱۹۰۹ء میں یا اس سے بھی پہلے قائم ہوئی ہوگی ۔ اداریہ مذکور میں اس انجمن کے قیام کی تاریخ بیان نہیں کی گئی ۔ لیکن یہ اطلاع ستمبر ۱۹۰۹ء کے شمارے میں شائع ہوئی ۔ اس لیے گمان اغلب ہے کہ یہ انجمن اسی سن میں یا اس سے پہلے ہی قائم ہوگئی ہوگی ۔ اس انجمن کے معتمد جناب عبداللہ تھے ۔ علاوہ ازیں دیگر چھ ، سات اور انجمنوں کے تبلیغی کاموں کی طرف بھی موصوف نے نشاندھی کی ہے ۔ نیز یہ کہ انجمنوں کی شاخیں یا اس قسم کی انجمنیں ملک کے مختلف شہروں اور قصبوں میں بھی قائم ہو چکی تھیں[1] ۔ ان انجمنوں نے سب سے بڑا اور اہم کام یہ کیا کہ جہاں پر نو مسلم راجپوتوں کی حالت مشتبہ تھی اور اندیشہ تھا کہ وہ لوگ مرتد ہو جائیں گے (مثلاً گڑگاؤں ، بھرت پور ، الور ، میرٹھ ، آگرہ وغیرہ) ، میں ان جماعتوں نے مقامی مسلمانوں کو خطرہ سے آگاہ کیا اور واعظین روانہ کیے ۔ ان واعظین کے پہنچنے سے یہ اثر ہوا کہ جس وقت وہاں پر ارتداد کا کوئی خطرہ در پیش ہوتا ، تو وہاں کے مقامی افراد ان تبلیغی انجمنوں کے ذمہ داران کو مطلع کر دیتے اور ان انجمنوں کے ذمہ دار حضرات گمراہ کرنے والے افراد کی شورشوں کو رفع کرنے کی کوشش کرتے[2] ۔ مگر یہ فتنہ اس وقت زیادہ زور نہیں پکڑ سکا تھا ۔ البتہ ۱۹۲۲ء کے آخر میں اس فتنہ نے باقاعدہ ایک ملک گیر مہم کی شکل اختیار کر لی تھی اور ایسی صورت میں اہل اسلام پر عموماً اور علماء کرام پر خصوصاً یہ ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ اس فتنے کا سد باب کریں ۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ''جماعت مبارکہ رضائے مصطفیٰ بریلی'' نے سب سے پہلا علماء کا وفد روانہ کیا ، جو دس ارکان پر مشتمل تھا ۔ (صاحب تحریر نے اس وفد میں شریک علماء کے نام بیان نہیں کیے ہیں ۔) یہ وفد ان علاقوں میں گیا ، جہاں نو مسلم راجپوت آباد تھے ۔ نیز ان مقامات پر ہی ہندو مہاسبھا اور سوامی شردھانند کے پرچاری سرگرم عمل تھے ۔ یہ وفد جنوری ۱۹۲۳ء میں سب سے پہلے میرٹھ کے علاقوں میں گیا ۔ ان علاقوں میں چار لاکھ افراد کے گمراہ ہونے کا خطرہ در پیش تھا ۔ اس وفد نے گمراہ ہونے والے

---

۱ ۔ ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' ، یکم ستمبر ۱۹۰۹ء ، ج ۹ ، ش ۳۵ ، (اداریہ) ، ص ۱۰ ، ک ۱

۲ ۔ ایضاً

افراد کو وعظ و تلقین کے ذریعہ دعوت اسلام دے کر دوبارہ نظام اسلام کی طرف رجوع ہونے کے لیے آمادہ کیا[1] ۔ علماء کرام نے اس فتنہ کا سدباب کرنے کے لیے فوری طور پر جد و جہد شروع کی اور مندرجہ ذیل جماعتوں نے اپنے وفود میں علماء کرام کو مختلف مقامات کے دوروں پر روانہ کیا :

(اول) جماعت مبارکہ رضائے مصطفیٰ بریلی ۔

(دوم) جمعیۃ علماء ہند ، دہلی ۔

(سوم) جمعیۃ تبلیغ الاسلام ، آگرہ ۔

(چہارم) جمعیۃ دعوۃ تبلیغ (صاحب تحریر نے اس جماعت کے قیام کا مقام بیان نہیں کیا ۔)

(پنجم) دارالعلوم دیوبند ۔

(ششم) انجمن خدام الصوفیہ علی پور سیداں (ضلع بیان نہیں کیا) ،

(ہفتم) جماعت احمدیہ کی دو پارٹیاں ۔[2]

یہ تمام جماعتیں علیحدہ علیحدہ کام کرتی رہیں اور باوجود کوششوں کے یکجا نہ ہو سکیں ۔ مگر ان جماعتوں کی منجملہ کارکردگی اطمینان بخش تھی ۔ اس لیے مسلم جمہور نے ان کی ہمت افزائی کی اور مالی امداد بھی دیتے رہے[3] ۔ ان جماعتوں نے اپنے اپنے وفود، ان علاقوں میں روانہ کیے جو خاص طور سے ارتداد کی زد میں تھے ۔ مثلاً اضلاع آگرہ ، بھرت پور، متھرا، علی گڑھ ، مین پوری، ایٹہ، اٹاوہ، گڑگاؤں اور الور وغیرہ ۔[4] "الجمعیۃ" نے اپنے اداریے میں مندرجہ بالا علاقوں کے علاوہ ، میرٹھ ، بلند شہر ، بجنور ، بہرائچ ،

---

۱ ۔ "علی گڑھ گزٹ" ، ۵ فروری ۱۹۲۳ء ، ج ۳ ، ش ۳ ، نمبر ۱۹۵ ، ص ۳ ، ک ۳
(نوٹ : ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے بیان کیا ہے کہ جمعیۃ علماء ہند نے "تنظیم" تحریک میں معمولی دلچسپی لی ۔ موصوف نے یہ بات بغیر حوالے کے بیان کی ہے جب کہ راقم نے اس وقت کے اخبارات اور ذریعوں سے یہ بات ثابت کی ہے کہ جمعیۃ نے تنظیم اور تبلیغ کے ذریعہ فتنہ ارتداد کو روکنے میں اہم کردار ادا کیا) ۔
I.H. Qureshi, *Ulema in Politics*, Karachi, 1972, p. 289.

۲ ۔ "علی گڑھ گزٹ" ، ۲۲ فروری ، ۱۹۲۵ء ، ج ۳ ، نمبر ۲۶۳ ، ص ۵ ، ک ۲-۳

۳ ۔ ایضاً

۴ ۔ "مسلم"، ۲۳ جنوری ۱۹۲۳ء ، ص ۷ ، ک ۱ ؛
"علی گڑھ گزٹ" ، ۱۹ - ۲۰ مارچ ۱۹۲۳ء ، ج ۳ ، نمبر ۳ ، ص ۳ ، ک ۲

رائے بریلی ، بارہ بنکی ، دہلی ، جہلم اور اجمیر وغیرہ کو بھی شامل کیا ہے ۔ جمعیۃ علماء نے ان مقامات پر نہ صرف تبلیغی وفود روانہ کیے ۔ بلکہ اس فتنے کو آئندہ ابھرنے سے روکنے کے لیے ، ایک سو باون مدارس بھی قائم کیے ۔ جن میں نو مسلم بچوں کی دینی اور دنیاوی دونوں طرح کی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا ۔ تا کہ مستقبل میں آنے والی نسلوں کو ارتداد کی زد سے محفوظ کیا جا سکے ۔[1]

تبلیغی جماعتوں کے وفود کو ، خاص طور سے ان مقامات پر روانہ کیا جاتا تھا ۔ جہاں یہ قدیم مسلم راجپوت قوم کثیر تعداد میں آباد تھی اور وہ لوگ اپنی جہالت اور احکام اسلام سے عدم واقفیت کی بناء پر گمراہ ہو سکتے تھے اور ان ہی لوگوں کو بالخصوص اسلام اور نسبت دین اسلام سے علیحدہ و جدا کرنے کی کوششیں جاری تھیں ۔ اس کے پیش نظر اور فتنہ ارتداد کو ختم کرنے کے لیے اچھنیرہ متصل آگرہ ، میں ایک مرکزی دفتر قائم کیا گیا ۔ جہاں تبلیغی جماعتوں کے وفود جمع ہوتے تھے اور وہیں سے متاثرہ علاقوں کے لیے روانہ کیے جاتے تھے ۔ اس مرکز کے معتمد مولوی محمد اسحاق مقرر ہوئے تھے[2] ۔ جماعت احمدیہ کے وفود اس مرکزی نظم سے باہر تھے ۔

تبلیغی جماعتوں کے ان وفود میں ، جمعیۃ علماء ہند ، دہلی کا کردار مرکزی حیثیت کا حامل تھا ۔ یوں تو دارالعلوم دیوبند اور دیگر جماعتیں بھی بڑی سرگرمی کے ساتھ حصہ لیتی رہی تھیں ۔ مگر جمعیۃ اور دارالعلوم دیوبند کے وفود خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ چونکہ ان وفود میں ان کے سربراہان اور سرکردہ علماء خود بھی حصہ لیتے رہے تھے ۔ مثلاً جمعیۃ علماء ہند ، دہلی کے امیر اور ناظم ، مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید اور دیگر مقتدر علماء نے اس فتنے کو فرو کرنے میں بڑی بے لوث خدمت ، کوشش اور انہماک و خلوص کے ساتھ کام کیا ۔ چناں چہ اس سلسلے میں مفتی کفایت اللہ ، صدر جمعیۃ علماء ہند نے ۹ مارچ ۱۹۲۳ء کو ایک بیان میں کہا کہ آریہ سماج اور سناتن دھرم مل کر مسلمانوں کو شدھی کرتے ہیں اور ہندوؤں کے سرگرم لیڈر سوامی شردھانند ، ہمہ تن مسلمانوں کو ہندو بنانے میں مصروف ہیں ۔ اس فتنہ کو دور کرنے کے لیے ہمیں اپنے سارے وسائل استعمال کرکے پوری جد و جہد کرنی چاہیے ۔ علاوہ ازیں دارالعلوم دیوبند

---

۱ ۔ "الجمعیۃ" ، ۲۸ فروری ۱۹۲۷ء ، ص ۱۱ ، ک ۱ (اداریہ)

۲ ۔ "مسلم" ، ۱۶ مارچ ۱۹۲۳ء ، ص ۳ ، ک ۳ ؛

عبدالرشید ، ارشد ، "بیس بڑے مسلمان" ، لاہور : س ۔ ن ، ص ۳۲۲

(نوٹ : اچھنیرہ ڈسٹرکٹ آگرہ ، صوبہ یو ۔ پی میں واقع ہے)

The Imperial Gazetteer of India, vol. 1, Calcutta, 1908, p. 404.

کا پہلا وفد فروری ۱۹۲۳ء کو متاثر علاقوں میں تبلیغ کے لیے گیا ۔ اس وفد کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اچھنیرہ پہنچے اور انجمن ہدایت الاسلام کے ماتحت ، آنریری سکریٹری، مولوی محمد اسحاق کی حسب ہدایت اپنا پروگرام مرتب کرکے اس پر عمل کرے ۔ اس وفد کی ترتیب ، مولانا حبیب الرحمٰن قائم مقام مہتمم ، دارالعلوم دیوبند نے کی تھی[1] ۔ اسی طرح دارالعلوم دیوبند کے دوسرے اور تیسرے وفود بھی متاثرہ علاقوں میں گئے اور پھر دیوبند کا چوتھا وفد ، جس میں بائیس مبلغین شامل تھے ، متاثرہ علاقوں میں روانہ کیا گیا ۔ مزید برآں ایک پانچواں وفد بھی ترتیب دیا گیا تا کہ وقت ضرورت اسے بھی متاثرہ علاقوں میں فوری طور پر روانہ کیا جا سکے[2] ۔

جمعیۃ علماء ہند نے جو وفود روانہ کیے، ان میں سے خاص خاص اور قابل ذکر حسب ذیل تھے :

(الف) ۱۱ مارچ ۱۹۲۳ء کو ایک وفد ، جس میں مدرسہ امینیہ کے بارہ مبلغ اور دو مدرس بھی شامل تھے ، مفتی کفایت اللہ نے ترتیب دیا ۔ اس وفد میں اکابر علماء میں ، مولانا وحید حسن ، مولانا محمد عرفان ("الجمعیۃ" کے پہلے مدیر) اور دیگر اکابر شریک تھے ۔

(ب) ایک دوسرا وفد جس کی قیادت مفتی کفایت اللہ نے کی اچھنیرہ گیا اور وہاں کے مسلمانوں کو مرتد ہونے سے بچایا ۔[3] جمعیۃ علماء ہند کا ایک تیسرا وفد ، جس کے مصارف مدرسہ معین الاسلام ، اور

(ج) انجمن حمایت الاسلام ، انبالہ چھاؤنی نے اپنے ذمہ لیے تھے ، تبلیغی امور کی انجام دہی کے لیے مخدوش علاقوں یعنی (گڑگاؤں ، میرٹھ ، بھرت پور ، اور الور وغیرہ) کو روانہ کیا گیا ۔ اس وفد نے بڑی تندہی اور سرگرمی سے اپنے فرائض انجام دیئے ۔[4]

---

۱ ۔ "مسلم" ، ۲۳ جنوری ۱۹۲۳ء ، ص ۷ ، ک ۱

۲ ۔ "علی گڑھ گزٹ" ، ۱۳ اپریل ۱۹۲۳ء ، ج ۳ ، نمبر ۲۰۹ ، ص ۱ ، ک ۲-۳

۳ ۔ "مسلم" ، ۱۶ مارچ ۱۹۲۳ء ، ص ۳ ، ک ۳
"بیس بڑے مسلمان" ، ص‌ص ۳۲۲ - ۳۳۲

۴ ۔ "مسلم" ، یکم اپریل ۱۹۲۳ء ، ج ۳ ، نمبر ۴۴ ، ص ۱ ، ک ۲

(نوٹ : مولانا محمد عرفان اس وقت جمعیۃ علماء ہند سے منسلک تھے ۔ بعدہ مولانا محمد علی نے مولانا عرفان کی خدمات خلافت کمیٹی کے لیے حاصل کر لی تھیں ۔

(د) جمعیۃ نے اپنا چوتھا وفد ، ضلع روھتک اور دیگر متاثرہ علاقوں میں روانہ کیا اور اس وفد نے بھی بڑی جانفشانی اور تندہی سے اپنے فرائض انجام دیے ۔

ڈاکٹر خالد بن سعید نے ، اس سلسلے میں جمعیۃ کی کارکردگی کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ جمعیۃ علماء ہند نے تبلیغی امور کے سلسلے میں بڑی اہم اور نمایاں خدمات انجام دیں ۔ نیز دو ہزار افراد کو مشرف بہ اسلام کیا اور گیارہ ہزار مرتدین کو اسلام کی طرف دوبارہ رجوع کیا ۔[1]

اخبار ''الجمعیۃ'' نے اپنی اشاعت ۲٦ مئی ۱۹۲۵ء کو لکھا ہے کہ علماء کرام نے بلا تخصیص بریلوی ، دیوبندی اور وہابی کے ، مل جل کر شدھی اور سنگھٹن کے فتنہ کو رفع کرنے میں ، اخلاص اور اتحاد کے ساتھ کام کیا ۔ ایک طرف تو علماء کرام اپنی سعی بلیغ سے فتنہ ارتداد کو ختم کرنے کے لیے اپنی مقدور بھر کوشش کر رہے تھے ۔ تو دوسری طرف تمام اسلامی جماعتیں ایک متحدہ کانفرنس منعقد کرنے کی کوشش کر رہی تھیں ۔ اس کانفرنس کی غرض و غایت یہ تھی کہ شدھی و سنگھٹن کے فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمان اکابر اتحاد و معاونت باہمی کے ساتھ کام کریں ۔ اس کانفرنس کے انعقاد کے لیے امرتسر کا مقام منتخب کیا گیا ۔[2] ''الجمعیۃ'' کے صاحب تحریر نے آگے چل کر بیان کیا ہے کہ یہ مجوزہ کانفرنس (جس کو آل پارٹیز کانفرنس) کے نام سے لکھا ہے ۔ ۱٦ جولائی ۱۹۲۵ء کو نواب محمد اسماعیل خان کی زیر صدارت منعقد ہوئی ۔[3] اس کل جماعتی کانفرنس سے مراد وہ کانفرنس ہے جو شدھی اور سنگھٹن کے فتنہ کا سدباب کرنے کے لیے مشترکہ طور پر بلائی گئی تھی ۔ (اس کانفرنس سے دہلی کی مشہور آل پارٹیز کانفرنس یا مسلم آل پارٹیز کانفرنس کا کوئی تعلق نہیں ہے) سوامی شردھا نند اور پنڈت مدن موہن مالویہ اپنی تحریکات کو کامیاب بنانے کے لیے ، اپنے ہم مذہبوں سے مالی امداد اور تعاون حاصل کر رہے تھے۔ اور اہل ہنود توقع سے زیادہ ان کی مالی امداد اور اخلاقی مدد بھی خارج کر رہے تھے ۔

---

1. *Ulema in Politics*, p. 289;
Pakistan : The Formative Phase, 2nd ed., p. 58;

''علی گڑھ گزٹ'' ، ۱۳ اپریل ۱۹۲۳ء ، ج ۳ ، نمبر ۲۰۹ ، ص ۱ ، ک ۲ - ۳

۲ - ''الجمعیۃ'' ، ۲٦ مئی ۱۹۲۵ء ، ص ۲ ، ک ۳ -

۳ - ایضاً ، ۲٦ جولائی ۱۹۲۵ء ، ص ۴ ، ک ۳ -

(نوٹ : مصنف ''سیرت محمد علی'' نے اس آل پارٹیز کانفرنس کو ۱۹۲۴ء میں منعقد ہونا بیان کیا ہے - مولانا خورشید علی مہر ، ''سیرت محمد علی'' ، دہلی : ۱۹۳۱ء ، ص ۵۳) -

یہ وقت مسلمانان ہند کے لیے صبر آزما اور کٹھن تھا ۔ اس مسئلے کی نزاکت کے پیش نظر جملہ اسلامی تنظیموں نے ، اہل اسلام سے اپیل کی کہ اس وقت "فرزندان اسلام کا فرض ہے کہ وہ مقدور بھر کوشش کریں اور اعدائے اسلام کو دکھا دیں کہ مسلمان ایک زندہ قوم ہے اور زندہ رہے گی"۔ چنانچہ اس اپیل کا عملی مظاہرہ امرتسر کی آل پارٹیز کانفرنس منعقدہ ۱۶ جولائی ۱۹۲۵ء میں ہوا ۔ (اس کانفرنس میں شریک ہونے والی جماعتوں کے نام "الجمعیہ" نے اپنے اداریے میں ظاہر نہیں کیے)۔[1]

مزید برآں ، "البشیر" نے اپنے اداریے میں مورخہ ۲۵ تا ۲۷ دسمبر ۱۹۲۷ء کی ایک اور آل انڈیا تبلیغی کانفرنس کا ذکر کیا ہے ۔ جو دہلی میں منعقد ہوئی تھی ۔ جس کی صدارت انگلستان کے مشہور نو مسلم حاجی لارڈ ہیڈلے نے کی تھی ۔ اور انگلستان سے بعض دیگر نو مسلم انگریز بھی شریک جلسہ ہوئے تھے ۔ صاحب تحریر نے بیان کیا ہے کہ یہ کانفرنس شدھی اور سنگھٹن کے مضر اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے کی گئی تھی ۔ مدیر موصوف نے مزید کہا کہ شدھی اور سنگھٹن کی تحریکات ، اگر سیاسی اغراض سے بالاتر ہو کر ، صرف اصلاح ہنود کے لیے کی جاتیں تو بری نہ تھیں ۔ مگر اس وقت یہ تحریکات سیاسی مقاصد کے تحت مسلمانوں کے خلاف ، ہنود میں جذبہ منافرت پیدا کر رہی تھیں ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۲۵ء کی کانفرنس ، مسلمانوں کی تنظیمی اور تبلیغی کانفرنسیں تھیں ۔ چنانچہ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مندرجہ بالا دونوں کانفرنسیں برائے تبلیغ ہی منعقد ہوئی تھیں ۔[2]

شدھی اور سنگھٹن کے فتنے نے اس حد تک تجاوز کیا کہ آگے چل کر ہنود نے ، مسلمانوں کے معابد تک کو منہدم کرنا شروع کر دیا ۔ اور نہ صرف اس بات پر ہی اکتفا کیا ، بلکہ "رسول خدا (صلعم) اور بزرگان دین کی شان میں گستاخی تک کرنے پر آمادہ ہوئے ۔ مثلاً ریاست بھرت پور میں مساجد کے انہدام کے واقعات رونما ہوئے ۔ اس مسئلے کی نوعیت سنگین تھی اور خاص توجہ کی محتاج بھی تھی ۔ اس لیے مولانا مفتی کفایت اللہ ، صدر جمعیۃ علماء ہند ، مولانا احمد سعید ، ناظم جمعیۃ علماء ہند اور مولانا عبدالماجد قادری بدایونی مع دیگر اکابرین بھرت پور گئے ۔ یہ وفد ۳۱ مئی ۱۹۲۴ء کو روانہ ہوا تھا ۔ اس وفد نے اپنی مساعی جمیلہ سے اس بات کی کوشش کی کہ

---

۱ ۔ "علی گڑھ گزٹ" ، ۲۲ فروری ۱۹۲۴ء ، ج ۳ ، نمبر ۲٦۳ ، ص ۵ ، ک ۱ ۔ ۲ ؛
"الجمعیۃ" ۲۵ مئی اور ۲۶ جولائی ۱۹۲۴ء ، ص ۲ ، ک ۳ و ص ۳ ، ک ۳

۲ ۔ "البشیر" ، ۲۰ دسمبر ۱۹۲۷ء ، ج ۲۹ ، نمبر ۹۶ ، ص ۱ ۔ ۲ ، ک ۱ ۔ ۲ ۔

آئندہ مساجد کا انہدام بند ہو جائے۔[1]

شدھی اور سنگھٹن کی تحریکات کے نتیجے میں برِ صغیر میں جا بجا ہندو مسلم فسادات رونما ہوئے اور ان فسادات میں متعصب ہنود نے مسلمانوں کے خلاف تشدد اور خونریزی کا مظاہرہ کیا ۔ چنانچہ (بقول رام گوپال) ہندو اور مسلمانوں کے تہواروں مثلاً ہولی ، دیوالی ، محرم اور عیدین وغیرہ پر فسادات ہونا ملک کا معمول بن گیا ۔ ان فسادات نے ہندو مسلمانوں کے تعلقات کو خراب سے خراب تر کر دیا ۔ جس کے نتیجے میں برِ صغیر کے طول و عرض میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی حقارت اور نفرت کی فضا پیدا ہو گئی ۔[2] ان فسادات نے ملک کے بڑے بڑے اور اہم شہروں کو بھی اپنی زد میں لے لیا ۔ مثلاً گلبرگ ، دہلی ، ناگپور ، لکھنؤ ، شاھجہان پور ، الہ آباد اور جبلپور وغیرہ جیسے اہم اور مرکزی مقامات بھی ان فسادات کی لپیٹ میں آ گئے ۔ مگر سب سے بڑا اور دلدوز حادثہ ۱۹۲۴ء میں ''کوہاٹ'' میں رونما ہوا ۔ یہ واقعہ ایک ہندو شاعر کی اشتعال انگیز نظم (جو اسلام دشمنی سے مملو تھی) کے نتیجے میں رونما ہوا ۔ کوہاٹ میں غیر مسلم آبادی کم تھی ۔ دو دن تک ہنگامہ ہوا ۔ اور اس فساد میں ۳۶ جانیں تلف ہوئیں اور ۱۴۵ افراد زخمی ہوئے ۔ اس درمیان میں بازار میں عام لوٹ مار ہوتی رہی ۔ جس کے نتیجے میں کوہاٹ کے ہندو باشندے خوف و ہراس کی وجہ سے اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر دوسرے صوبوں میں منتقل ہونے پر مجبور ہو گئے ۔[3]

کوہاٹ کے فساد کے بعد ، ہندو زعماء کو بھی یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ فسادات یک طرفہ نہیں بلکہ زیادتی دونوں جانب سے ہوتی ہے ۔ چنانچہ گاندھی جی نے بھی اس فساد کے بعد یہ بیان دیا کہ اب یہ بات خود بخود کمزور ہو گئی کہ فسادات صرف ہندوؤں کی جانب سے ہی ہوتے ہیں ۔ ان فسادات کے نتیجے میں ، خلافت کمیٹی اور

۱۔ ''علی گڑھ گزٹ'' ، ۳۰ مئی ۱۹۲۳ء ، ج ۳ ، ش ۲۷۸ ، ص ۲
(نوٹ : یہ وفد جمعیۃ کے ان پانچ وفود کے علاوہ تھا جو شدھی و سنگھٹن کے سلسلے میں مختلف مقامات پر گئے تھے) ۔

2. *The Indian Muslims*, p. 184 ; *India Divided*, p. 19;
Muslim Separatism in India : A Brief Survey, p. 162;
The Muslim Community of Indo-Pakistan Sub-continent, pp. 281-82;

پی ۔ پٹا بھائی سیتا رامیہ ، ''تواریخ کانگریس'' ، لاہور : ۱۹۳۰ء ، ص ۲۷۹

3. *Muslim Separatism in India : A Brief Survey*, p. 162;
Pathway to Pakistan, p. 70;

سی ۔ ایف اینڈریوز ، ''خیالات مہاتما گاندھی'' (حصہ دوم) ، بمبئی ، س ۔ ن ، ص ۵۱۴

کانگریس کی مشترکہ جد و جہد سے جو ہندو مسلم اتحاد قائم ہوا تھا وہ اب بے اثر ہو گیا ہے[1]

برصغیر کی بگڑتی ہوئی فرقہ وارانہ فضا کے روبرو ملک کے سنجیدہ اور مخلص زعماء یہ چاہتے تھے کہ ہندو مسلم اتحاد برقرار رہے ، تاکہ ملک کو آزاد کرانے میں آسانی پیدا ہو ۔ شدھی و سنگھٹن کی تحریکات نے ہندو مسلم اتحاد کو ناقابل عمل بنا دیا تھا ۔ کچھ محب وطن جن میں سی ۔ آر ۔ داس ، بنگالی لیڈر ، ڈاکٹر انصاری ، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور لالہ لاجپت رائے وغیرہ شامل تھے ، یہ چاہتے تھے کہ ملک میں فرقہ وارانہ صورت حال مزید خراب نہ ہو ۔ اس مسئلے کے لیے سی ۔ آر ۔ داس نے ۱۹۲۳ء کے آخر میں ایک فارمولا پیش کیا ۔ جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین اتحاد پر زور دیا گیا ۔ اسی طرح کا ایک اور معاہدہ بنام "سولن پیکٹ" (Solan Pact) ۱۹۲۳ء میں عمل میں آیا ۔ یہ معاہدہ ہندو مسلمانوں کے تعاون اور اتحاد کی تجدید کے مقصد سے کیا گیا تھا ۔ لالہ لاجپت رائے نے کانگریس کے نمائندے کی حیثیت سے اس پیکٹ پر دستخط کیے ۔[2] کانگریس آزاد گروپ کے لیڈر ، موتی لال نہرو اور سی ۔ آر ۔ داس یہ چاہتے تھے کہ ہندو مسلم اتحاد برقرار رہے ۔ سی ۔ آر ۔ داس نے اعلان کیا کہ بنگال میں نئے تقرروں پر ساٹھ فی صد ملازمتیں اس وقت تک مسلمانوں کو ملنی چاہئیں ، جب تک کہ ملازمتوں میں آبادی کے تناسب سے کوٹہ برابر نہ ہو جائے ۔ غرض یہ کہ سی ۔ آر ۔ داس مسلمانوں کے ساتھ منصفانہ سلوک کرنے کے حامی تھے ۔[3]

ان ایام میں فسادات رونما ہونے کے باوجود خلافت کمیٹی نے اپنے ۱۹۲۳ء کے اجلاس منعقدہ کوکناڈا میں اس بات کی کوشش کی کہ حصول سوراج کے لیے دونوں قوموں کا اتحاد و اتفاق ضروری ہے ۔ مزید برآں اس جلسے میں ، جملہ مذاہب کی عبادت گاہوں کی حفاظت کے لیے ایک قرارداد پاس کی گئی اور بلوائیوں کی (خواہ وہ

---

1. *Pathway to Pakistan*, p. 70.

2. *Muslim Separatism in India : A Brief Survey*, p. 172;
Muslim India, p. 211;
Pakistan : The Formative Phase (1857—1947), 2nd ed., pp. 66-67;
یوسف حسین خان ، "یادوں کی دنیا" ، اعظم گڑھ : ۱۹۶۷ء ، ص‌ص ۱۹۰ ، ۱۹۳

(نوٹ : اس پیکٹ پر دیگر دستخط کرنے والے افراد کے اسماء گرامی معلوم نہ ہو سکے ۔ خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کی جانب سے ڈاکٹر انصاری نے دستخط کیے ہوں گے) ۔

3. *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd ed., pp. 66-67.

کسی قسم کے ہوں) مذمت کی گئی - مزید برآں کمیٹی نے ہندو مسلم اتحاد قائم رکھنے کی پر زور اپیل کی -[1]

مگر دوسری طرف متعصب ہنود اور فرقہ پرست لیڈر ان مصالحتی تدابیر کو بے عمل اور غیر مؤثر کرنے میں پیش پیش تھے اور انھوں نے ان معاہدات اور اتحاد و اتفاق کی تدابیر کو بے اثر کر دیا - جس کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو مسلم نفاق اور عناد کی خلیج وسیع ہوتی گئی - گاندھی جی ، ملک کی ناسازگار فضا سے بہت پریشان تھے - ملک میں امن و امان کی جب کوئی صورت نظر نہ آئی تو انھوں نے ستمبر ۱۹۲۴ء کو اکیس دن کا مرن برت رکھا -[2] حالانکہ گاندھی جی اوائل ۱۹۲۴ء میں سخت بیمار تھے - اور ابھی بیماری سے کلیتاً صحتیاب نہیں ہوئے تھے - مگر اس کے باوجود انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کی خاطر یہ برت رکھا تھا - ہندو مسلم لیڈران نے ، گاندھی جی کی صحت اور ملک کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے گاندھی جی کو اطمینان دلایا کہ ملک میں اتحاد قائم کرنے کے لیے پوری کوشش کی جائے گی - ان لوگوں کی یقین دہانی پر گاندھی جی نے اپنا برت تو ختم کر دیا مگر اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا - اور برصغیر کی فضا مزید مسموم ہی ہوتی چلی گئی -[3] ان فسادات سے والسرائے ہند ، لارڈ اِروِن بھی پریشان تھے اور انھوں نے ۲۹ اگست ۱۹۲۷ء کو اپنے ایک خطبہ میں اسمبلی کے ممبران کو مخاطب کرتے ہوئے ان فسادات کے اعداد و شمار بیان کیے جس کے تحت یو پی ، بمبئی ، پنجاب ، سی پی و برار ، بنگال اور بہار وغیرہ میں کل پچیس فسادات ہوئے تھے - چودھری خلیق الزماں کے اصل الفاظ حسب ذیل ہیں جن کی تائید پٹا بھائی سیتا رامیہ نے بھی کی ہے :

> **"The situation became so exasperating that Lord Irwin the Viceroy, had to take notice of it in his address to the Indian Legislature on 29 August 1927, when he informed the members that during the previous eighteen months the total loss of**

---

۱ - "خیالات مہاتما گاندھی" ، ص ص ۳۱۴ - ۳۲۲ ؛
"علی گڑھ گزٹ" ، ۴ جنوری ۱۹۲۴ء ، ج ۳ ، نمبر ۲۵۷ ، ص ۲ ؛
Pathway to Pakistan, p. 70.

۲ - "یادوں کی دنیا" ، ص ۱۸۹ -

3. *The Muslim Community of Indo-Pakistan Sub-continent*, p. 282;
Muslim India, p. 211;
"البشیر" ، ۱۹ جولائی ۱۹۲۷ء ، ج ۲۹ ، ش ۲۱ ، ص ۳ ، ک ۱ -

life resulting from the riots amounted to 250 killed and over 2,500 injured."

پیغمبر اسلام کی شان میں گستاخی اور اس کا ردِ عمل :

ہندو مسلم زعماء کی جد و جہد ، گاندھی جی کا مرن برت ، سی آر داس فارمولا اور سولن پیکٹ کے باوجود ، فرقہ پرست ، مہاسبھائی ذہنیتوں کے حامل اور دیگر متعصب افراد ، فسادات کرنے سے باز نہ آئے ، بلکہ بدطینت افراد نے پیغمبر اسلام کی شان میں گستاخی کرنے تک سے گریز نہ کیا ۔ اور ایک شخص "راجپال" نے "رنگیلا رسول" نامی ایک کتاب لکھی ۔ اس کتاب میں رسول کی سیرت پاک اور ان کی ذات گرامی پر رکیک حملے کیے گئے تھے ۔ جس کی بناء پر مسلمانوں کو بڑا دکھ پہنچا اور ان کے احساسات کو سخت ٹھیس لگی ۔ اس کتاب کی اشاعت نے ہندو مسلمانوں کے مابین ، عداوت اور منافرت بھڑکانے میں ایک فتیلے کا کام کیا ۔ مزید برآں ایک اور رسالہ "ورتمان" بھی ہندوؤں نے شائع کیا ۔ جس میں پیغمبر اسلام پر بے بنیاد اور خلاف واقعہ اتہام لگا کر ، مسلمانوں کی دلآزاری میں مزید اضافہ کیا گیا ۔ اس بڑھتی ہوئی منافرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر سال ہندو مسلمانوں کے تہواروں مثلاً ہولی ، دیوالی ، محرم ، اور عیدین وغیرہ پر ہندو مسلم فسادات ملک کا معمول بن گئے ۔[2]

علماء کرام نے "رنگیلا رسول" نامی کتاب پر سخت احتجاج کیا ۔ مفتی کفایت اللہ ، صدر جمعیۃ علماء ہند نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا "ہند کے سات کروڑ مسلمان پیغمبر کی شان میں گستاخی اور شرمناک حملے پر بہت مضطرب اور ملول ہیں ۔ اور یہ نازیبا حرکت ہندو مسلمانوں میں عداوت اور منافرت پھیلانے کے لیے جان بوجھ کر کی گئی ہے"۔[3] ہنود کی ان حرکات سے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کا مشتعل ہونا فطری امر تھا ، چنانچہ ایک غیور، اور جانباز، شیدائی رسول(صلعم) عبدالرشید نے سوامی شرد ھانندکو مسلم آزار رویہ کی بناء پر ان کے مکان پر جا کر دسمبر ۱۹۲۶ء میں قتل کردیا ۔ اس قتل نے ہنود

1. *Pathway to Pakistan*, pp. 70-71;

"تواریخ کانگریس" ، ص ۵۱۶ ۔

2. *Muslim India*, p. 184

(نوٹ : محمد نعمان مصنف "مسلم انڈیا" نے "رنگیلا رسول" اور رسالہ "ورتمان" کا سن اشاعت نہیں لکھا ۔ مفتی کفایت اللہ کا بیان جو "رنگیلا رسول" نامی کتاب کے سلسلے میں "الجمعیۃ" ۲۶ مئی ۱۹۲۷ء کو شائع ہوا تھا ، اس کی بناء پر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب اور رسالہ سن ۱۹۲۶ء یا اوائل ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئے ہوں گے ۔ راقم)

۳ ۔ "الجمعیۃ" ، ۲۶ مئی ۱۹۲۷ء ، ص ۲ ، ک ۲

کو مزید مشتعل کر دیا ، جس کے نتیجے میں مزید ہنگامے برپا کرنے کا ایک عذر ہاتھ آ گیا ۔ اور اس کے بعد ہنود نے جو ہنگامے برپا کیے وہ سفاکی اور بربریت میں خود اپنی مثال تھے ۔ ان سیاہ اور خونی کارناموں کی فہرست میں آرہ ، شاہ باد ، گیا اور کتار پور کے واقعات خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔[1]

سوامی شردھانند کے قاتل " عبدالرشید " پر مقدمہ چلایا گیا تو ملزم نے دلیرانہ اقرار جرم کیا اور اسلامی عقیدے کے تحت عاقبت میں جہاد کا مرتبہ حاصل کرنے کی خاطر اپنے جرم سے انکاری نہ ہوا ۔ ایک طرف عبدالرشید پر مقدمہ چل رہا تھا اور دوسری طرف ملزم ''راجپال'' مصنف 'رنگیلا رسول' پر بھی مقدمہ قائم تھا ۔ عبدالرشید کو عدالت سیشن نے پھانسی کا حکم سنا دیا ۔ مگر راجپال کو کنور دلیپ سنگھ ، جج ہائی کورٹ نے زیر دفعہ ۱۵۳ (الف) صرف چھ ماہ کی قید کا حکم سنایا ۔ عبدالرشید نے اپنی سزا کے خلاف عدالت عالیہ میں اپیل دائر کی ۔ مگر عدالت عالیہ نے سیشن جج کی سزا کو ہی بحال رکھا اور عبدالرشید نے اپنی موت کی سزا بخوشی قبول کی[2] ۔ راجپال کی غیر معمولی کم سزا کے خلاف مسلمانان ہند میں بڑا غم و غصہ پیدا ہوا اور مسلمانوں نے احتجاجاً "دلیپ سنگھ مستعفی ہو جاؤ کے نعرے بھی بلند کیے ۔" اس سلسلے میں کچھ مسلم اخبارات کے خلاف توہین عدالت کے مقدمات بھی قائم کیے گئے ۔ حالانکہ بعد میں "راجپال" کو ایک مسلمان نے قتل کر دیا ۔[3]

---

۱ ۔ رئیس احمد جعفری ، ''افادات محمد علی'' ، حیدر آباد دکن : س ۔ ن ، ص ص ۲۲۹-۲۳۲

(نوٹ نمبر ۱ : مصنف ''افادات محمد علی'' نے سوامی شردھانند کے قتل کی تاریخ دسمبر ۲۳ ، ۱۹۲۷ء لکھی ہے جو خلاف واقعہ ہے ۔ ڈاکٹر خالد بن سعید اور ڈاکٹر عبدالحمید نے دسمبر ۱۹۲۶ء بیان کی ہے ۔ یہ تاریخ قرائن سے بھی صحیح معلوم ہوتی ہے ۔ کیونکہ ''البشیر'' کی اطلاع کے مطابق ۱۵ مارچ ۱۹۲۷ء کو عبدالرشید کو پھانسی دے دی گئی تھی ۔ ''البشیر'' ، ۱۵ مارچ ۱۹۲۷ء ، ص ۱ ؛

***Muslim Separatism in India* : *A Brief Survey*, p. 178;**
***Pakistan* : *The Formative Phase*, 2nd. ed., p. 57 ;**

(نوٹ نمبر ۲ : یعنی آرہ ، شاہ آباد ڈسٹرکٹ ۔ صوبہ بنگال میں اور گیا بھی ڈسٹرکٹ بنگال میں واقع ہے ۔)

***The Imperial Gazetteer of India*, vol. xxv, New ed., Index, Oxford, 1909pp. 34-201**

۲ ۔ ''البشیر'' ، ۱۵ مارچ ۱۹۲۷ء ، ص ۱ ، ک ۲ اور جولائی ۱۹۲۷ء ، ص ۳ ، ک ۱

۳ ۔ ''افادات محمد علی'' ، ص ص ۱۵۲-۱۵۳

(نوٹ : اخبار ''مدینہ بجنور'' اور ''زمیندار'' لاہور نے جج کے فیصلے کے خلاف مستعفی ہونے کے نعرے بلند کیے ۔)

مولانا محمد علی نے ، سوامی شردھانند کے قتل پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور اسے بڑی نازیبا حرکت قرار دیا ۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی سوامی شردھانند کے قتل پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ۔[1] علاوہ ازیں راجپال کو محض چھ ماہ کی سزا پر ، جس وقت مسلم پریس اور مسلم جمہور نے ، کنور دلیپ سنگھ کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا تو مولانا محمد علی نے، عاشق رسول(صلعم)ہوتے ہوئے بھی اس جج کی مذمت کرنے میں مسلم جمہور کا ساتھ نہیں دیا ۔ بلکہ انھوں نے کہا کہ "یہ قصور قاضی کا نہیں ہے بلکہ قانون کا ہے لہذا قانون کو بدلوانا چاہیے" ۔ مزید برآں مولانا محمد علی نے ان مسلمانوں کی ہمت افزائی بھی نہیں کی جو تبلیغ اور تنظیم میں نمایاں حصہ لیتے رہے ۔ بلکہ اس کے برعکس ان کی مخالفت کی ۔ ان تمام وجوہات کی بناء پر مولانا محمد علی ، اپنے ہم مذہبوں کی ہردلعزیزی اور مقبولیت عامہ سے کسی حد تک محروم ہوگئے ۔[2] مولانا ابوالکلام آزاد نے تو شدھی اور سنگھٹن کی تحریکات کو جائز قرار دیتے ہوئے کسی حد تک ان کی ہمت افزائی کی ۔[3] مولانا محمد علی اور دیگر مسلم زعماء اس بات کے متمنی تھے کہ جس طرح ہم نے ، اپنے مسلمان بھائیوں کی فرقہ وارانہ ذہنیت پر ان کی دل شکنی کی ہے ۔ اسی طرح ہندو زعماء کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ بھی اپنے ہم مذہبوں کی فرقہ وارانہ ذہنیت اور ان کے اعمال و افعال کی مذمت کریں ، جس کی بناء پر دونوں قوموں کے مابین منافرت اور حقارت پیدا ہوئی ۔ لیکن ہندو قوم پرست لیڈروں نے ، فرقہ پرست ہندوؤں کی تحریکات اور دلآزار کتب کی اشاعت پر کسی قسم کی بھی مذمت نہیں کی اور نہ ہی ان کی ہمت شکنی کی ۔ بلکہ اس کے برعکس ڈاکٹر راجندر پرشاد نے شدھی اور سنگھٹن تحریکات کی ہمت افزائی کی ۔ نیز انھوں نے تحریک شدھی کا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ جس طرح مسلمانوں اور عیسائیوں کو اپنے مذاہب کی تبلیغ کا حق حاصل ہے اسی طرح ہندوؤں کو بھی یہ حق ہے ۔ اور تحریک شدھی کو کسی انتقامی تحریک سے وابستہ کرنا مناسب نہیں ۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد کے اصل الفاظ حسب ذیل ہیں :

---

۱ ۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ، "اسلام کا سرچشمہ قوت" ، لاہور : ۱۹۷۱ء ، ص ۸

۲ ۔ "افادات محمد علی" ، ص ص ۱۵۲-۱۵۳ (بحوالہ "ہمدرد" ۲۷ تا ۲۹ دسمبر ۱۹۲۷ء؛ "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ، ص ۳۶۷

(نوٹ : ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے بیان کیا ہے کہ مولانا محمد علی اپنے ہم مذہبوں کی ہمدردی سے محروم ہوگئے تھے اور ان کی ہردلعزیزی میں کمی آ گئی ۔ "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ، ص ۳۶۷ ، حاشیہ (ذ))

Muslim India, p. 218.

۳ ۔ غلام رسول مہر ، "تبرکات آزاد" ، لاہور ۔ س ن ، ص ۲۰۸

"The Shuddhi movement of Swami Shardhanand has come in for a great deal of criticism both from the Nationalists and Musalmans. Whatever one may have to say about its opportuneness at that particular moment, it is difficult to understand how Christians and Musalmans can object to it on merits. They are constantly engaged in their proselytizing mission and in converting Hindus to their own faiths. If the Hindus on their side also start converting non-Hindus to their faith, it is no business of non-Hindus to object especially if they are themselves engaged in the work of conversion. The Hindus must have the same right of propagating their faith as others have. But men are not always guided by logic or by a sense of justice and fairness."[1]

غرض یہ ہے کہ شدھی اور سنگھٹن کی تحریکات نے ، آزادی حاصل کرنے کی تحریک کو بہت کمزور کر دیا جس کے نتیجے میں ہندو مسلم دشمنی اور عناد بڑھتا گیا ۔[2]

جمعیۃ علماء اور سیاسی جد و جہد :

جمعیۃ علماء ہند نے اپنی تشکیل اور قیام کے وقت سے ہی ملک کی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا ۔ مگر ۱۹۲۲ء میں جب کہ برصغیر میں شدھی اور سنگھٹن کی تحریکات نے زور پکڑا تو جمعیۃ نے اس مسئلے کی طرف اپنی خصوصی توجہ مرکوز کی ۔ اور اس دوران میں جمعیۃ کی ملی خدمات اور سیاسی جد و جہد خاص طور پر قابل ستائش ہیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ جمعیۃ نے ملک کی دیگر سیاسی جماعتوں کے ساتھ مل کر ، ملک کو آزاد کرانے کی مہم میں بھی بھر پور حصہ لیا ۔ آزادی کی جد و جہد میں علماء کے مخصوص موقف کو پہچاننے کے لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ایک طرف علماء کرام ملک کو آزاد کرانے کے متمنی تھے تو دوسری طرف وہ اس کے خواہاں بھی تھے کہ برصغیر میں مسلمانوں کی مذہبی حیثیت محفوظ رہے ۔ اور آزادی ملنے کے بعد ان کے شخصی قوانین شریعت پر مبنی ہوں ۔ سیاست کی اس جد و جہد میں جمعیۃ نے انفرادی اور اجتماعی دونوں طریقوں سے کوششیں کیں ۔ بسا اوقات علماء کرام کو اس جد و جہد میں ملوکیت اور استعماریت کے دیوتاؤں سے بھی ٹکر لینی پڑی مگر انھوں نے ہر تکلیف و مصیبت کا

1. *India Divided*, 3rd ed., 1947, p. 123.
2. *Pakistan ; The Formative Phase*, 2nd ed., pp. 57-58.

خندہ پیشانی کے ساتھ مقابلہ کیا ۔ اور کبھی بھی ناکامیابی سے گھبرا کر یا حوادثات کی تکان سے مجبور ہو کر اپنا مشن ترک نہیں کیا[1] ۔ دور ارتداد میں جمعیۃ کا پانچواں اجلاس ۱۹۲۳ء میں بصدارت مولانا سید حسین احمد مدنی ، کوکناڈا میں منعقد ہوا ۔ اس وقت ملک کی سیاسی فضا بڑی مسموم اور تکلیف دہ تھی ۔ ملک کی سب سے پرانی مسلم سیاسی جماعت یعنی مسلم لیگ ، اس وقت یا تو گوشہ نشین تھی یا پھر کونسلوں میں داخل ہونے کے لیے حکومت سے گٹھ جوڑ کر رہی تھی ۔ اس کے برعکس ، جمعیۃ علماء ہند ایک طرف ہندو مسلم فسادات میں مسلمانوں کو ہمہ قسم کی مدد پہنچا رہی تھی ، اور دوسری طرف وہ کانگریس کے ساتھ مل کر ملک کی آئینی جد و جہد میں اپنی استقامت اور ثابت قدمی کا ثبوت دے رہی تھی ۔ جمعیۃ نے جو تجاویز اپنے اجلاسوں میں پاس کیں ، ان میں ایک طرف ہندو بلوائیوں کی زیادتی کی شکایات تھیں ، تو دوسری طرف ہندو مسلم سمجھوتے کی کوششیں بھی شامل تھیں ۔[2]

جمعیۃ کا چھٹا سالانہ اجلاس مولانا سید محمد سجاد بہاری کی زیر صدارت ۱۹۲۵ء میں مراد آباد میں منعقد ہوا ۔ اس زمانے میں فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے ہندو مسلم فضا بہت مکدر تھی ۔ اور گاندھی جی نے بھی ، ہندو مسلم اتحاد پیدا نہ ہونے پر ملک کے سیاسی امور میں دلچسپی لینا کم کر دی تھی ۔ بلکہ بقول چودھری خلیق الزمان گاندھی جی نومبر ۱۹۲۶ء کے پہلے ہفتے میں سیاست سے سبکدوش ہوگئے تھے ۔ مگر جمعیۃ ، ان ناسساعد حالات کا جم کر مقابلہ کرتی رہی ۔ اور ملک کو آزاد کرانے کے لیے اپنی کوششیں برابر جاری رکھیں ۔ یہی نہیں بلکہ اس نے اپنے اجلاس بتاریخ ۱۴ مارچ ۱۹۲۶ء زیر صدارت سید سلیمان ندوی بمقام کلکتہ ، آزادی وطن کی قرار داد بھی منظور کی ۔ ان ایام میں ، کانگریس اور جمعیۃ کا اتحاد عمل بھی کمزور ہوگیا تھا ۔ جمعیۃ نے آزادی ہند کے لیے جو قرار داد منظور کی وہ حسب ذیل تھی :

"چونکہ برادران وطن کے مخالفانہ طرز عمل سے منافرت کی خلیج وسیع ہو رہی ہے اس لیے مسلمان اپنی تنظیم کر کے اپنے بل بوتے پر ملک کو آزاد کرالیں ۔ البتہ

---

۱ ۔ مولانا محمد میاں ، "جمعیۃ علماء کیا ہے" ؟ (حصہ اول) ، دہلی : س ۔ ن ، ص ص ۳-۴

۲ مولانا محمد میاں ، "جمعیۃ علماء کی شرعی حیثیت" ، دہلی : س ۔ ن ، ص ۹ ؛
"خیالات مہاتما گاندھی" ، ص ص ۲۱۳-۲۱۵ ؛
مولوی سید طفیل احمد منگلوری ، "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، دہلی : ۱۹۴۵ء ، ص ص ۵۲۹-۵۳۰

جو غیر مسلم حضرات اس بارے میں اتحاد عمل کرنا چاہیں ۔ ان کے ساتھ اتحاد عمل کیا جائے گا" ۔[1]

جمعیۃ علماء کا آٹھواں اجلاس ۱۹۲۷ء میں زیر صدارت ، مولانا سید انور شاہ کشمیری بمقام پشاور منعقد ہوا ۔ اس اجلاس میں مندرجہ ذیل تجاویز پاس ہوئیں : ۔

۱ ۔ حصول آزادی ہند کے لیے جد و جہد ،

۲ ۔ شیعوں ، سنیوں کے باہمی مناقشات پر اظہار افسوس ، اور

۳ ۔ سائمن کمیشن کا مقاطعہ" ۔[2]

مولانا طفیل احمد منگلوری نے اس اجلاس کی تجاویز کا ذکر کرتے ہوئے ایک چوتھی منظور شدہ تجویز اس عنوان سے بیان کی ہے "مسٹر جناح کے چودہ نکات کی تائید" لیکن ظاہر ہے کہ مولانا سے یہ سہو ہوا ہے اس لیے کہ جمعیۃ کا یہ اجلاس ۱۹۲۷ء میں منعقد ہوا تھا ۔ جب کہ جناح صاحب کے چودہ نکات ۱۹۲۸-۲۹ء کی آل پارٹیز کانفرنس میں طے ہونے کے بعد منظر عام پر آئے تھے ۔ اور آئندہ چل کر "مسلم آل پارٹیز کانفرنس" کے طے شدہ نکات ہی جناح صاحب کے چودہ نکات کے نام سے موسوم ہوئے ۔[3]

غرض یہ کہ جمعیۃ علماء ہند نے ملک کو آزادی سے ہم کنار کرنے میں اپنی پوری قوت اور وسائل صرف کیے ۔ جمعیۃ کا موقف ہمیشہ یہ رہا کہ ملک کے ہر باشندے کو ،

---

۱ ۔ "جمعیۃ علماء کی شرعی حیثیت" ، ص ۱۰ ؛
"الجمعیۃ" ، ۱۸ فروری ۱۹۲۶ء ، ص ۵ ، ک ۲-۳ ؛
"مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص‌ص ۵۳۰-۵۳۱
(نوٹ : اس زمانے میں ہندو مسلم فسادات کے نتیجے میں ، جمعیۃ علماء ہند اور کانگریس کا اتحاد عمل باقی نہ رہا تھا ۔ اور ۱۹۲۶ء سے لے کر ۱۹۳۰ء تک جمعیۃ آزادی ہند کے لیے تن تنہا کوشاں رہی ۔ نیز دیگر جماعتیں بھی علیحدہ علیحدہ کوشاں رہیں) ۔

۲ ۔ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص‌ص ۵۳۱-۵۳۲؛
"جمعیۃ علماء کی شرعی حیثیت" ، ص ۱۰

3. *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*, p. 186;
Pathway to Pakistan, pp. 100-1;

"مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص‌ص ۵۳۱-۵۳۲

ملک کی آزادی میں برابر کا فیض پہنچے اور اس کے جائز اور بنیادی حقوق حاصل ہوں۔ اسی مقصد کے پیش نظر جمعیۃ نے ملک کی ہر اس سیاسی جماعت کے ساتھ اتحاد عمل کرنے کی کوشش کی جو اس نظریے کی حامل تھی۔ اس وقت، سیاسی جماعتوں میں کانگریس اور مسلم لیگ ہی سرفہرست تھیں۔ مگر مسلم لیگ ۱۹۲۲ء کے بعد، اپنی بے عملی کی بنا پر کم و بیش ایک بے جان جماعت ہو کر رہ گئی اور اس نے ۱۹۲۳ء کے بعد ملک کی آزادی کے لیے دیگر جماعتوں سے بھی کماحقہ اشتراک عمل نہیں کیا۔ مگر جمعیۃ اپنی طے شدہ پالیسیوں کے تحت کانگریس کے ساتھ بھی اشتراک عمل کرتی رہی۔ مگر اس درمیان میں ۴، ۵ سال کے لیے کانگریس اور جمعیۃ میں بعد پیدا ہوگیا تھا۔ لیکن جیسے ہی کانگریس نے اپنے اجلاس منعقدہ لاہور ۱۹۳۰ء میں مکمل آزادی کا اعلان کیا اور ساتھ ہی نہرو رپورٹ کو خارج کر دیا۔ تو ویسے ہی جمعیۃ نے کانگریس کے ساتھ پھر اشتراک عمل قائم کر لیا[1]۔

عالم اسلام اور علماء ہند:

خلافت عثمانیہ کو محفوظ اور قائم رکھنے کے لیے مسلمانان ہند عموماً اور علماء کرام خصوصاً کوشاں تھے۔ برصغیر میں ۱۹۱۱ء سے یہ جد و جہد مسلسل جاری تھی۔ اس ضمن میں ہندوستانی زعماء ملت نے ۱۹۱۹ء میں خلافت کمیٹی اور بعد میں جمعیۃ علماء ہند کی بنیاد ڈالی۔ ان ہر دو جماعتوں کے مقاصد میں سے ایک اہم اور بنیادی مقصد یہ بھی تھا کہ خلافت عثمانیہ اور اماکن مقدسہ کی بہر قیمت حفاظت کی جائے۔ (اس کی تفصیلات ماسبق میں دیکھیے) - ۱۹۲۲ء میں مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت میں، جب ترکوں نے اپنے مقبوضہ علاقے دول مغرب سے آزاد کرا لیے تو مسلمانان ہند نے، اس خوشی میں اپنے مکانوں اور عمارتوں پر چراغاں کیا۔ لیکن مسلمانان ہند کی یہ خوشی دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ کیوں کہ جب قوم پرست ترک، قسطنطنیہ پر قابض ہوگئے، تو پہلے انہوں نے سلطنت کو منسوخ کر دیا اور پھر ۱۹۲۴ء میں خلافت کو بھی ختم کر دیا[2]۔ مسلمانان ہند کو ترکوں کے اس عمل سے بڑی تکلیف پہنچی۔ کیونکہ یہ لوگ عرصے سے جزیرۃ العرب اور خلافت کو بچانے کے لیے برابر کوشش کر رہے تھے۔ اب جب کہ ترکوں نے خلافت کو خود ہی ختم کر دیا تو ان کی تمام محنتیں اور امیدیں رائیگاں ہوگئیں۔ مسلمانوں کو اب یہ خطرہ لاحق تھا کہ، غیر مسلم حکومتیں، جو اپنے پنجے عرب ممالک میں گاڑ چکی تھیں اور انہیں خود بعض عرب زعماء کا تعاون بھی

---

1. *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*, p. 86; *Pathway to Pakistan*, pp. 100-1;

"مسلمانوں کا روشن مستقبل"، ص ص ۵۳۱-۵۳۶

۲ - "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ"، ص ۳۸۰

حاصل تھا ، کہیں پھر حملہ آور ہو کر حکومت ترکی کو دوبارہ ختم نہ کر دیں[1] ۔ دوسری طرف حجاز میں شاہ ابن سعود نے اکتوبر ۱۹۲۴ء میں ، شریف حسین مکہ کو بے دخل کر کے اپنا غلبہ اور تسلط قائم کر لیا[2] ۔ شاہ سعود نے برسراقتدار آ کر ، نجدی فوج کے ذریعہ مقابر اور مآثر کو منہدم کرانا شروع کیا ۔ یہ امر مسلمانان ہند کے لیے باعث اذیت ہوا ۔ اس خبر کے ملتے ہی خلافت کمیٹی نے ۱۹۲۵ء میں مندرجہ ذیل علماء کا ایک وفد حجاز روانہ کیا :

"(اول) مولانا سید سلیمان ندوی ، رئیس وفد ،

(دوم) مولانا عبدالقادر قصوری ، اور

(سوم) مولانا عبدالماجد بدایونی"[3] ۔

اس وفد کا مقصد یہ تھا کہ موصولہ اطلاعات کے مطابق ، مقابر و مآثر کے انہدام کی صحیح تحقیق کرے اور ساتھ کے ساتھ حکومت کے رویے کا بھی پتہ چلائے اور ایک مکمل رپورٹ پیش کرے[4] ۔ اس وفد کی روانگی اور اس کے مقاصد میں ، مصنفین اور مورخین میں کچھ اختلاف ہے ۔ "الجمعیۃ" نے اس وفد خلافت کی روانگی ۱۸ دسمبر ۱۹۲۴ء کو بیان کی ہے ۔ اور اس کے مقاصد ذیل بیان کیے ہیں :

"(الف) تمام عرب ریاستوں کا اتحاد ، اور ان کی جمہوری حکومت کے قیام کے لیے عملی کوشش کرنا ۔

(ب) اہل حجاز سے استصواب کے ذریعہ حکومت طے کرنا ۔

---

۱ ۔ "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ"، ص ۳۷۰

۲ ۔ ابوسلمان شاہجہان پوری (مرتب) ، "مکاتیب مولانا ابوالکلام آزاد"، کراچی ، ۱۹۶۸ء ص ۱۷۷

(نوٹ : ڈاکٹر عبدالحمید نے شاہ ابن سعود کا حجاز پر تسلط ، ۱۹۲۵ء میں بیان کیا ہے مگر "الجمعیۃ" ۲ فروری ۱۹۲۵ء ، کے بیان سے اور دیگر شواھد سے ، یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ شاہ ابن سعود کا تسلط اکتوبر ۱۹۲۴ء میں ہوا تھا ۔)
"الجمعیۃ" ۲ فروری ۱۹۲۵ء ، ص ۸ ، ک ۱

۳ ۔ "آج کل"، ۱۵ ستمبر ۱۹۳۵ء ، ص‌ص ۱۳-۱۴ ، ک ۱-۲؛
"مکاتیب ابوالکلام آزاد" ، ص ۱۷۷

۴ ۔ "الجمعیۃ" ، ۲ فروری ۱۹۲۵ء ، ص ۸ ، ک ۱ ؛
"مکاتیب ابوالکلام آزاد" ، ص ۱۷۷

(ج) نجدیوں کے مظالم کے متعلق جو افواہیں شائع ہوئی ہیں ، ان کی آزادانہ تحقیق کرنا ۔

(د) ایک ایسا نظام قائم کرنا جو عربوں کو ہمیشہ کے لیے اجانب کے تسلط سے محفوظ کر دے ۔

(ھ) عربوں کو مطالبۂ خلافت میں عالم اسلام کا ہمنوا بنانا اور عام مؤتمر اسلامی میں صحیح نمائندوں کے انتخاب کی دعوت دینا" ۔

مولانا آزاد نے اپنے مکتوب میں ، اس وفد کے ارکان میں مندرجہ ذیل اصحاب کی شمولیت بیان کی ہے :-

"مولانا سید سلیمان ندوی ، مولانا محمد عرفان ، مولانا ظفر علی خان ، مولانا عبدالماجد قادری بدایونی ، اور سید خورشید حسن" ۔

لیکن مولانا نے مزید بیان کیا ہے کہ مولانا عبدالماجد قادری بدایونی اور سید خورشید حسن ، بعض نامعلوم اسباب کی بناء پر حجاز نہ جا سکے ۔ مگر باقی تین ارکان یعنی مولانا محمد عرفان ، مولانا ظفر علی خان اور سید سلیمان ندوی (رئیس وفد) حجاز گئے[۲] ۔

مولانا ابوالکلام آزاد اس وقت خلافت کمیٹی کے صدر تھے ۔ اس لیے انہوں نے اس وفد خلافت کی رہنمائی کے لیے یادداشت مرتب کی[۳] ۔ مندرجہ بالا تینوں بیانات میں وفد کی حجاز کو روانگی کی تاریخ میں تضاد ہے ۔ مگر قیاس کہتا ہے کہ ان تینوں اطلاعات میں "الجمعیۃ" کی اطلاع زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے ۔ چوں کہ اس کی خبر واقعہ کے بالکل قریب اور شواھد کے مطابق ہے ۔ مگر یہ امر قابل غور ہے کہ اس وفد نے اپنی کامیابی یا ناکامیابی کی کوئی رپورٹ یا خبر شائع نہیں کی ۔ اور نہ ہی عصر زیر بحث کے مآخذ سے اس باب میں کچھ رہنمائی ملتی ہے ۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ شاہ ابن سعود

---

۱ ۔ "الجمعیۃ" ، ۲ فروری ۱۹۲۵ء ، ص‌ص ۵-۸ ، ک ۱

۲ ۔ "مکاتیب مولانا ابوالکلام آزاد" ، ص‌ص ۱۶۵-۱۷۷

(نوٹ : مرتب "مکاتیب آزاد" نے غالباً سہواً اس وفد کی تاریخ روانگی ۲۶ اکتوبر ۱۹۲۵ء لکھ دی ہے ۔ جو شواھد کی بنا پر درست معلوم نہیں ہوتی البتہ "الجمعیۃ" کی اطلاع ۱۸ دسمبر ۱۹۲۴ء ، درست معلوم ہوتی ہے ۔"مکاتیب آزاد"، ص ۱۷۷ ، (ذ))

"الجمعیۃ"، ۲ فروری ۱۹۲۵ء ، ص‌ص ۵-۸ ، ک

(نوٹ ۲: ارکانِ وفد میں بھی مصنفین کا اختلاف ہے ۔)

۳ ۔ "مکاتیب ابوالکلام آزاد"، ص ۱۷۷

نے ، موتمر اسلامی کانفرنس طلب کی ، جس میں مختلف اسلامی ممالک کے نمائندوں کو مدعو کیا گیا ۔ اس کانفرنس میں جن ملکوں کے وفود نے شرکت کی ، وہ حسب ذیل تھے :-

"ہندوستان ، سوڈان ، مصر ، جاوا ، فلسطین ، بیروت ، شام ، نجد ، حجاز ، روس ، ترکستان ، افغانستان ، ترکی"[1] ۔

ان کے علاوہ بھی بعض اسلامی ممالک کے نمائندے شامل ہوئے تھے ۔ موتمر عالم اسلامی میں شرکت کے لیے ، بر صغیر سے جمعیۃ علماء اور خلافت کمیٹی کے علیحدہ علیحدہ وفود گئے ۔ ان وفود کے شرکاء حسب ذیل تھے :-

ارکان وفد جمعیۃ علماء ہند :

"مولانا مفتی کفایت اللہ (رئیس وفد) ، مولانا عبدالحلیم صدیقی (پرائیویٹ سکریٹری رئیس وفد) ، مولانا محمد عرفان (سکریٹری وفد) ، مولانا شبیر احمد عثمانی (رکن وفد) ، مولانا احمد سعید (رکن وفد) ، اور مولانا نثار احمد (رکن وفد)" ۔

ارکان وفد خلافت کمیٹی :

"مولانا سید سلیمان ندوی (رئیس وفد) ، مسٹر شعیب قریشی (معتمد وفد) ، مولانا شوکت علی (رکن وفد) ، اور مولانا محمد علی (رکن وفد)"۔

۹ مئی ۱۹۲۶ء کو جمعیۃ علماء ہند کا وفد حجاز کو روانہ ہوا ۔ جب کہ وفد خلافت ۱۰ مئی ۱۹۲۶ء کو روانہ ہوا[2] ۔ موتمر عالم اسلامی میں شرکت کے لیے ایک تیسرا وفد ، جو اہل حدیث کا تھا ۔ مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری کی قیادت میں روانہ ہوا ۔ اس وفد نے اپنے مسلک سلفی کی نمائندگی بہت اچھے انداز سے کی ۔ موتمر عالم اسلام کا یہ تاریخی اجلاس ۲۶ ذیقعدہ ۱۳۴۴ھ مطابق ۸ جون ۱۹۲۶ء کو شروع ہوا ۔ جلالۃ الملک عبدالعزیز بن عبدالرحمان نے افتتاحیہ خطبہ پڑھا ۔ اس کے بعد وفد خلافت کے ایک رکن مولانا محمد علی نے شاہ ابن سعود کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "تو اپنے

---

۱ - "الجمعیۃ" ، ۱۰ جولائی ۱۹۲۶ء ، ص ۳ ، ک ۲ ؛
عبدالرشید ارشد ، (مرتب) ، "بیس بڑے مسلمان" ، لاہور : س ۔ ن ، ص ۳۳۳ ؛
"مکاتیب ابوالکلام آزاد" ، ص ۱۷۷

۲ - "بیس بڑے مسلمان" ، ص ۳۳۳ ؛
"الجمعیۃ" ، ۱۰ مئی ۱۹۲۶ء ، ص ۱ ، ک ۲ - ۳
(نوٹ : مرتب "بیس بڑے مسلمان" نے ان وفود کی روانگی ۱۳ مئی ۱۹۲۶ء بیان کی ہے) ۔

آپ کو اس مقدس سرزمین کا بادشاہ (ملک الحجاز) کہتا اور کہلواتا ہے ۔ جہاں رسول (صلعم) نے اپنی زندگی بسر کی تھی ۔ حالانکہ تیرے پیش رو ، ترکوں نے ، اپنے آپ کو ہمیشہ خادم الحرمین الشریفین کہا اور کہلوایا ۔ تو بھی اپنے آپ کو ان کی تقلید میں خادم الحرمین کہہ اور ملوکیت پر ، جو معاویہ کی سنت ہے ہرگز ہرگز نہ چل" ۔[1]
(یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس جرأت مندانہ خطاب پر شاہ ابن سعود کا کیا رد عمل ہوا) مولانا مفتی کفایت اللہ نے موتمر عالم اسلامی کانفرنس میں ، حجاز کے لیے حکومت کی تشکیل کا مسئلہ بھی پیش کیا ۔ جو ایجنڈے میں شامل کر لیا گیا ۔ مولانا محمد علی کی تقریر اور مفتی صاحب کے مطالبے کا یہ نتیجہ نکلا کہ موتمر عالم اسلامی کی سبجیکٹ کمیٹی مقرر کی گئی ۔ اور اس کمیٹی کی سفارش کے نتیجے میں ، حجاز میں کئی اصلاحات زیر غور آئیں ۔ وہ یہ کہ مذاہب اربعہ (مالکی ، شافعی ، حنفی اور حنبلی) اور تمام فرقوں کی آزادیٔ خیال و آزادیٔ عمل کا مطالبہ کیا ۔ اور حجاز میں بردہ فروشی کے غیر شرعی رواج کے انسداد کی تجویز پیش کی ۔ ان کے علاوہ بعض اور اصلاحی تجاویز پیش کیں اور اپنے قوت استدلال سے انھیں منظور کرایا[2] ۔ مجوزہ سبجیکٹ کمیٹی میں مندرجہ ذیل ارکان شامل تھے :

"مفتی اعظم الحاج امین الحسینی ، مفتی اعظم ہند مفتی کفایت اللہ ۔ حافظ وہبہ وزیر اعظم حکومت سعودیہ ، مولانا شوکت علی (رکن وفد خلافت کمیٹی) ، ضیاء الدین (رئیس وفد روسی) ، اور عمر سعید (رئیس وفد جاوا)"[3]

مفتی کفایت اللہ ، رئیس وفد جمعیۃ علماء ہند نے موتمر عالم اسلامی میں بڑے انہاکِ اور سرگرمی کے ساتھ کام کیا ۔ اور آپ نے علماء حجاز اور شاہ سعود سے حجاز کے انتظامی امور کے متعلق مندرجہ بالا اصلاحات اور رفاہی تجاویز منظور کرائیں ۔

مفتی کفایت اللہ نے شاہ ابن سعود کی توجہ اس امر کی جانب بھی مبذول کرائی کہ آپ کو "حسب وعدہ ، موتمر اسلامی کے فیصلے سے پہلے مدینہ منورہ میں مقابر و مآثر کو

---

۱ ۔ "الجمعیۃ" ، ۱۰ مئی ۱۹۲۶ء ، ص ۱ ، ک ۲ ۔ ۳؛
"جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ" ، ص ۸۵؛
ضیاء الدین احمد برنی ، "عظمت رفتہ" ، کراچی : ۱۹۶۱ء ، ص ۵۶
(نوٹ : مرتب "مکاتیب آزاد" نے موتمر عالم اسلامی کانفرنس کے انعقاد کی تاریخ ۲ جون ۱۹۲۸ء بیان کی ہے ۔ یہ تاریخ غیر تحقیقی اور خلاف واقعہ ہے ۔ "مکاتیب آزاد" ص ۱۶۵)

۲ ۔ "بیس بڑے مسلمان" ، ص ۳۳۴

۳ ۔ ایضاً ، ص ص ۳۳۳ ۔ ۳۳۴

منہدم کرانا جائز نہ تھا۱» - اس موتمر عالم اسلام میں جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ تمام اسلامی ممالک کے سربرآوردہ علماء و فضلاء شریک تھے - ان سب حضرات نے مفتی کفایت اللہ صاحب کی جرأت مندی ، بے باکی ، اور مستحکم و مضبوط دلائل کا بڑے غور و فکر سے مشاہدہ کیا - اور اس طرح آپ کے تدبر اور قابلیت کا شہرہ عالم اسلام میں دور دور تک پہنچ گیا - دوسری طرف اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ علماء اسلام کی نظر میں ، مفتی کفایت اللہ کی قابلیت اور استعداد کی بناء پر علماء ہند کی شان دوبالا ہو گئی ، اور ممالک اسلامیہ کے وفود نے ، مفتی صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا -۱ (یہ امر بھی لائق توجہ ہے کہ ان بیانات کی تصدیق یا تکذیب عربی اخباری مآخذ سے نہ ہو سکی) -

مختصراً یہ کہ جمعیۃ علماء نے ، اپنی تشکیل کے وقت سے لے کر زمانہ زیر بحث تک اور پھر اس کے بعد ملک کی سیاست میں بھرپور حصہ لیا - لہٰذ برصغیر کو آزاد کرانے کے لیے مسلسل اور بے لوث کام کیا - جمعیۃ کے مقاصد میں سب سے اہم مقصد یہ تھا کہ ملک کو بیرونی غلامی سے نجات دلائی جائے اور حصول آزادی کے بعد ، برصغیر میں ، مسلمانوں کے لیے شریعت اسلامی نافذ کرائی جائے - مزید برآں جمعیۃ کا مطمع نظر یہ بھی تھا کہ مسلمانان ہند کے لیے خصوصاً اور عالم اسلام کے لیے عموماً ، دین کی احیاء و بقا کے لیے انتھک اور بے غرض خدمات انجام دی جائیں - ان مقاصد کی تکمیل کے لیے جمعیۃ نے ملک کے اندر اور باہر ممکنہ خدمات انجام دیں - دوسری طرف خود اعتمادی اور یقین محکم کے اصولوں کا پاس رکھتے ہوئے جمعیۃ علماء ہند نے ایسے وقت ملک کو آزاد کرانے کا دم بھرا جب کسی جماعت سے اس کا اتحاد نہ تھا - اور خود کانگریس کے ساتھ بھی اس کے تعلقات کشیدہ تھے -۲

---

۱ - مولانا امداد صابری ، "فرنگیوں کا جال" ، دہلی : ۱۹۴۹ء ، ص‌ص ۲۹۰ - ۲۹۱ ؛ "بیس بڑے مسلمان" ، ص ۴۳۴

۲ - "جمعیۃ علماء کی شرعی حیثیت" ، ص ۰۹ ؛ "الجمعیۃ" ، ۱۸ فروری ۱۹۲۶ء ، ص ۵ ، ک ۲ - ۳ ؛ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص‌ص ۵۳۰ - ۵۳۱

فصل دوم

آئینی مشاورت ، سائمن کمیشن ، نہرو رپورٹ ، مسلم کانفرنس آل پارٹیز کانفرنس اور فرقہ وارانہ فیصلہ

آئینی مشاورت ، سائمن کمیشن :

برطانیہ نے ١٨٥٧ء میں بر صغیر پر اپنا مکمل عمل دخل قائم کرنے کے بعد سے ہی ہندوستان میں کچھ آئینی تبدیلیاں شروع کی تھیں۔ یعنی سب سے پہلے ١٨٦١ء میں وائسرائے کی کونسل میں نظم و نسق کی بنیادی تبدیلی کی گئی۔ اور انتظامی و دستوری اصلاحات کے پیش نظر گورنر جنرل کی کونسل میں تین ہندوستانی ممبروں کو شریک کیا گیا۔ ان دستوری اور انتظامی تبدیلیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ١٨٨٢ء میں لارڈ رپن نے ، لوکل سیلف گورنمنٹ کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد ١٩٠٩ء میں لارڈ منٹو نے ، علیحدہ نیابت کی بنیاد پر انتخابات کا آئینی ڈھانچہ منظور کرایا۔ یہ سکیم مارلے منٹو اسکیم کے نام سے معروف ہوئی۔ ۲۰ اگست ١٩١٧ء کو مسٹر مانٹیگو ، حکومت خود اختیاری رائج کرنے کے سلسلے میں ، ہندوستان آئے ، تاکہ اہل ہند سے اس سلسلے میں ان کی رائے معلوم کریں۔ نیز ملک کی سیاسی حالت کا بھی جائزہ لیں۔ مسٹر مانٹیگو کی مرتب کردہ رپورٹ کی بنیاد پر وسط دسمبر ١٩١٩ء میں نئے قانون ہند کا اعلان کیا گیا۔[1] اہل ہند اب سیاسی طور پر بیدار ہو چکے تھے۔ تحریک خلافت اور تحریک موالات نے بر صغیر کے طول و عرض میں سیاسی اضطراب کی ایک لہر دوڑا دی تھی۔ اور تھوڑے عرصے کے لیے ، ایوان حکومت کی بنیادیں ہل گئیں۔ مگر بدقسمتی سے ، اسی درمیان میں شدھی اور سنگھٹن کی تحریکات نے اہل ہند کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا ، جس کے نتیجے میں حکومت اس نتیجے پر پہنچی کہ ہندوستانی اپنے سیاسی مطالبات کی حمایت میں متحد اور متفق نہیں ہوسکتے۔ مدبرین برطانیہ نے دیکھا کہ ہندوستانی ایک طرف تو آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں اور دوسری طرف اپنے مطالبات کی حمایت میں متفق نہیں۔ لہٰذا لارڈ برکن ہیڈ (Lord Birkenhead) نے ١٩٢٧ء میں اپنی ایک تقریر کے دوران ہندوستانیوں کو چیلنج کیا کہ وہ برطانیہ کو ہدف ملامت بنانے کی بجائے خود ہی کوئی متفقہ فارمولا تیار کر کے حکومت کو پیش کریں ، تاکہ حکومت اس فارمولے پر غور و خوض کے بعد اسے

---

١ ۔ ڈاکٹر یوسف حسین ، "تاریخ دستور ہند" ، دہلی : ١٩٤٤ء ، ص ص ٧٦ - ٧٧
٢ ۔ ایضاً ، ص ص ٩٧ - ١٢٧ ؛
"علی گڑھ گزٹ" ، ٣٠ جنوری ١٩٣٠ء ، ج ٢٠ ، نمبر ١ ، ص ٣ ، ک ١ - ٢ ؛
مکتبہ جامعہ اسلامیہ ، "رپورٹ آل پارٹیز کانفرنس" ، ١٩٢٨ء ، دہلی: ١٩٢٨ء ، ص ص ١١-٨

پارلیمنٹ سے منظور کرا سکے - لارڈ برکن ہیڈ نے اپنی تقریر میں ، مخلوط طریقہ انتخاب کی تائید کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ "بغیر مخلوط اور مشترکہ انتخاب" ہندوستان آگے نہیں بڑھ سکتا -[1]

اہل ہند کے مسلسل مطالبہ آزادی کے نتیجے میں حکومت برطانیہ نے ہندوستانیوں کو آئینی اصلاحات دینے کے سلسلے میں ۸ نومبر ۱۹۲۷ء کو ایک شاہی کمیشن کا تقرر کیا - جس کا اہم مقصد یہ تھا کہ بر صغیر میں تمام سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کی آراء معلوم کی جائیں اور دیگر نیم سیاسی جماعتوں اور اہم شخصیتوں سے مل کر ان کے بھی خیالات معلوم کیے جائیں اور تمام آراء کو یکجا کر کے ، رپورٹ مرتب کی جائے - تاکہ برطانوی پارلیمنٹ اس رپورٹ کی روشنی میں اہل ہند کے لیے آئینی اصلاحات منظور کر سکے -[2] اس کمیشن کی آئینی حیثیت (Statutory Commission) کی تھی ، اور یہ سائمن کمیشن (Simon Commission) کے نام سے مشہور ہے - اس کمیشن میں سات انگریز تھے ، جو برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر تھے - کوئی ہندوستانی ممبر اس میں شامل نہ تھا - اس کے چیئرمین سر جان سائمن (Sir John Simon) تھے اور باقی چھ (۶) ممبران تھے -[3] کمیشن مذکور میں ہندوستانی ممبران کی عدم شمولیت کی بناء پر ہندوستان کے طول و عرض میں اس کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا گیا - کمیشن کی ساخت کے پیش نظر ملک کی تمام سیاسی جماعتوں نے کم و بیش کمیشن کے مقاطعہ کا اعلان کیا - اس مقاطعہ کے شاخسانے میں مسلم لیگ میں دو جماعتیں بن گئیں - ایک جناح لیگ اور دوسری سر شفیع لیگ - جناح لیگ مقاطعہ کی حامی تھی - مگر شفیع لیگ نے تمام جماعتوں کے فیصلے کو نظر انداز کرتے ہوئے ، کمیشن کے ساتھ اپنے تعاون کا اعلان کر دیا -[4]

---

1. *The Muslim Community of Indo-Pakistan Sub-continent*, p. 288;
"تاریخ دستور ہند" ، ص‌ص ۱۵۱ - ۱۵۲؛
"مسلمانوں کا روشن مستقبل"، ص ۲۱۷؛
Sayed Rais Ahmad Jafri, *Rare Documents*, Lahore, 1967, p. 119.
2. *Muslim India*, p. 253.
3. *The Indian Muslims*, p. 187;
Ibid., pp. 187-88;
Muslim India, p. 253;
Muslim Separatism in India : A Brief Survey, pp. 195-96.
4. *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*, p. 159;
Pathway to Pakistan, p. 89.

سائمن کمیشن کے سلسلے میں جمعیۃ علماء ہند کے رول کے متعلق یہ بات اہم ہے کہ جمعیۃ علماء ہند اپنے اغراض و مقاصد کے تحت ۱۹۲۶ء میں مکمل خود مختاری کی قرار داد پاس کر چکی تھی - اور ۱۹۲۷ء میں جمعیۃ ، کانگریس کے ساتھ بھی متحد اور متفق نہ تھی - اور اس نے اپنے سالانہ اجلاس ۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کے مقاطعہ کی قرار داد پاس کی[۱] - ملک کے وقار کے تحت ، دیگر سیاسی جماعتیں اور خلافت کمیٹی بھی سائمن کمیشن کے مقاطعہ کا فیصلہ کر چکی تھی - دوسری طرف مسلم لیگ جناح گروپ اور کانگریس بھی ، آزادی کی خاطر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہوگئی تھیں[۲] -

کانگریس نے گوہاٹی کے اجلاس منعقدہ دسمبر ۱۹۲۶ء میں مجلس عاملہ کو ہدایت کی کہ وہ ہندو مسلم فرقہ وارانہ اختلافات کو رفع کرنے کے لیے مسلم رہنماؤں سے مشورہ کرے - اور ان کو دور کرنے کی تدابیر اور ان کا قابل عمل حل تلاش کرے - اور اپنی رپورٹ مرتب کر کے ۳۱ مارچ ۱۹۲۷ء تک آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سامنے پیش کرے - کانگریس کی مجلس عاملہ نے مسلم زعماء سے گفت و شنید کی اور افہام و تفہیم کے نتیجے میں ، کانگریس کی مجلس عاملہ (حسب تفصیل ذیل) ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء والی مسلم تجاویز کو ماننے کے لیے آمادہ ہوگئی[۳] - اس کے بعد کانگریس نے اکتوبر ۱۹۲۷ء میں ، ہندو مسلم اتحاد کے لیے ایک فارمولا تیار کیا اور ایک طویل قرار داد کے ذریعہ مندرجہ ذیل ریزولیوشن پاس کیا :-

"(۱) ہندوستان میں کسی قوم کو دوسری قوم پر اپنے مذہبی عقائد وغیرہ ٹھونسنے نہ چاہئیں -

(۲) بلکہ اخلاق کے مدنظر ہر شخص کو مذہب اور عقائد کی مکمل آزادی ملنی چاہئے -

---

۱ - "جمعیۃ علماء کی شرعی حیثیت" ، ص ۱۰؛
مولوی سید طفیل احمد منگلوری ، "روح روشن مستقبل" ، بدایوں : ۱۹۳۶ء ، ص ۹۸؛
"مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۳۲۰ ؛

۲ - "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ، ص‌ص ۳۷۳-۳۷۴
"مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۳۲۱؛
"روح روشن مستقبل" ، ص ۹۸ ؛

۳ - "رپورٹ آل پارٹیز کانفرنس ۱۹۲۸ء" ، ص‌ص ۲۹-۳۰

(۳) ہندوؤں کے کسی خاص تہوار یا جلوس پر مسجدوں کے سامنے باجہ بجانے کی پوری آزادی ہونی چاہئیے لیکن مسجدوں کے سامنے خاص طور پر کھڑے ہو کر مظاہرے کرنا ، نہایت قابل اعتراض ہے ۔ کیوں کہ اس طرح مسلمانوں کو خواہ مخواہ مشتعل کرنے کا ذریعہ اختیار کیا جاتا ہے ۔

(۴) مسلمانوں کو اپنے تہواروں پر گاؤ کشی کرنے کی کھلی چھٹی ہے ۔ مگر شارع عام اور کسی مندر کے سامنے دیدۂ دانستہ ایسا کرنا خواہ مخواہ لڑائی مول لینے کے مترادف ہے ۔ گائے کو ذبح کرنے سے پیشتر جلوس کی شکل میں مظاہرے کرتے ہوئے نہیں لے جانا چاہیے ۔ چوں کہ گائے ہندوؤں کے لیے قابل پرستش ہے ۔ اس لیے مسلمانوں سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ اس طرح گاؤ کشی کریں کہ گاؤں کے ہندوؤں کے جذبات مشتعل نہ ہوں"[1] ۔

اس کانفرنس میں ہندو مسلم فسادات کی مذمت کی گئی اور ہندو مسلم زعماء سے اپیل کی گئی کہ وہ امن و امان برقرار رکھیں ۔

مسلم تجاویز یا دہلی تجاویز (Delhi Proposals) :

سائمن کمیشن کی آمد سے پہلے ، بعض ممتاز مسلم زعماء ، ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو دہلی میں جمع ہوئے ۔ اس اجتماع میں علماء کی شرکت یا عدم شرکت کے بارے میں کوئی مواد تو نہ مل سکا ۔ البتہ ڈاکٹر عبدالحمید نے ، مولانا شوکت علی کی شرکت کے متعلق بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ موصوف نے بحث میں حصہ لیا ۔ اس میں تیس مسلم زعماء نے شرکت کی ۔ غور و خوض اور بحث و تمحیص کے بعد پانچ تجاویز منظور ہوئیں ۔ جنہیں "مسلم تجاویز" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ۔ تجاویز حسب ذیل ہیں :

"(اول) مخلوط انتخاب اور مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب کے لیے مسلمانوں کو رضامند کیا جائے ۔

(دوم) سندھ کو ایک علیحدہ صوبہ کا درجہ دیا جائے ۔

(سوم) شمالی مغربی سرحدی صوبہ اور صوبہ بلوچستان کے ساتھ ، دیگر صوبوں کی طرح برتاؤ کیا جائے ۔

(چہارم) پنجاب اور بنگال میں نمائندگی کا تناسب آبادی کے لحاظ سے کیا جائے ۔ اور

---

۱ ۔ "تواریخ کانگریس" ، ص ص ۵۱۶۔۵۱۷

(پنجم) مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی نمائندگی ایک ثلث سے کم نہ کی جائے" ۔

کانگریس نے ان "مسلم تجاویز" کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ ان بنیادوں پر ہندو مسلم مفاہمت پیدا ہونے کے روشن امکانات ہیں ۔ نیز یہ کہ ایک سب کمیٹی مقرر کی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ آئینی فارمولا کی تیاری میں ہندو مسلم رہنماؤں سے مشورہ کرے[1] ۔ مجوزہ سب کمیٹی کی سفارشات یا اس کی تجاویز کے متعلق مورخین نے کوئی روشنی نہیں ڈالی ۔ لیکن کانگریس کی مجلس عاملہ ، مسلم تجاویز مؤرخہ ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو ماننے کے لیے آمادہ ہوگئی اور کانگریس کی مجلس عاملہ نے دوسرے ہی روز یعنی ۲۱ مارچ ۱۹۲۷ء کو مسلم تجاویز کی بنیاد پر قابل اطمینان مفاہمت پیدا ہونے کی امید ظاہر کی[2] ۔ البتہ کانگریس کی مجلس عاملہ کے فیصلے کے مطابق ملک کی سیاسی اور نیم سیاسی جماعتوں کی ایک میٹنگ بلائی گئی ۔ جس میں چھبیس انجمنوں کو دعوت نامے روانہ کئے گئے[3] ۔ آئندہ چل کر یہی اجلاس "دہلی کی آل پارٹیز کانفرنس" کے نام سے معروف ہوا ، جس کا پہلا اجلاس ۱۲ فروری ۱۹۲۸ء کو دہلی میں منعقد ہوا[4] ۔

سائمن کمیشن کی آمد اور لارڈ برکن ہیڈ کی ہدایات :

مندرجہ بالا صفحات میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ سائمن کمیشن کی آمد پر اہل ہند نے کمیشن کے مقاطعہ کا اعلان کیا تھا ۔ اور اس کے خلاف جلسے اور جلوس کا پروگرام بھی بنایا تھا ۔ ممبران کمیشن ۳ فروری ۱۹۲۸ء کو بمبئی پہنچے ۔ ان کی آمد پر ، حسب پروگرام ، سیاسی جماعتوں نے اس کا مقاطعہ کیا اور جا بجا اس کے خلاف "سائمن واپس جاؤ" (Simon go back) کے نعرے لگائے ۔ مزید برآں کئی مقامات پر ہڑتال اور مظاہرے بھی کئے گئے ۔ ان تمام کارروائیوں میں اہل ہند کو توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی ۔ اور مقاطعہ کا منصوبہ بڑی حد تک کامیاب رہا[5] ۔ حکومت نے مظاہروں اور جلوسوں کو

---

1. *Muslim Separatism in India : A Brief Survey*, pp. 193-94;
"رپورٹ آل پارٹیز کانفرنس" ، ۱۹۲۸ء ، ص‌ص ۲۵-۲۶
"روح روشن مستقبل" ، ص ۹۹
۲ ۔ "رپورٹ آل پارٹیز کانفرنس" ، ۱۹۲۸ء ، ص‌ص ۲۴-۲۶
۳ ۔ ایضاً ، ص‌ص ۲۶-۲۹
۴ ۔ ایضاً ، ص ۲۹
5. *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd ed., p. 64;
Muslim Separatism in India : A Brief Survey, p. 196;
Pathway to Pakistan, pp. 92-93;
"تواریخ کانگریس" ، ص‌ص ۵۲۷-۵۲۸

ناکامیاب بنانے کے لیے ، مظاہرین کے خلاف تشدد کا استعمال کیا - اور ان پر لاٹھیاں اور گولیاں برسائیں - اور اس تشدد کے استعمال میں بڑے بڑے لیڈروں کو بھی نہیں بخشا - سائمن کمیشن نے اہل ہند کی بے چینی اور اضطراب کا اندازہ کرتے ہوئے حکومت ہند کو مشورہ دیا کہ اس کمیشن میں ہندوستانیوں کو شریک کیا جائے تا کہ اہل ہند کا اضطراب کم ہو جائے - لیکن انڈین لیجسلیٹو اسمبلی نے اس تجویز کو در خور اعتنا نہ سمجھا - حکومت نے اسمبلی کے اس فیصلے کے بعد مرکزی اسمبلی کے سات ممبران کو بذریعہ نامزدگی اس کمیشن میں کام کرنے کے لیے مقرر کر دیا - اور ان لوگوں نے سائمن کمیشن کے ساتھ بیٹھ کر کام کیا[1] - کمیشن کے مقاطعہ سے پیدا ہونے والے حالات و واقعات کی اطلاعات برابر ، برطانیہ کے ارباب حل و عقد کو پہنچ رہی تھیں - اس کے پیش نظر لارڈ برکن ہیڈ نے فروری ۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن کو مشورہ دیا کہ ، کمیشن ان لوگوں سے رابطہ قائم کرے ، جو مقاطعہ کی تحریک سے علیحدہ ہیں - جن میں خاص طور پر مسلم لیگ شفیع گروپ اور پست اقوام کے ہندو شامل تھے - برکن ہیڈ کے اس خط میں یہ بھی تاکید تھی کہ کمیشن غیر جانب دار افراد سے ملنے کے بعد اپنی رپورٹ مرتب کرے[2] -

مسلم لیگ نے اپنے اجلاس منعقدہ ۱۹۲۸ء کلکتہ میں ایک سب کمیٹی کا تقرر کیا - جس کو آل انڈیا کانگریس اور دیگر سیاسی جماعتوں سے مشورہ کرنے کا اختیار دیا گیا - اور اس کمیٹی کو ہدایت کی گئی کہ وہ کوئی ایسا موزوں آئینی فارمولا تیار کرے ، جس میں مارچ ۱۹۲۷ء کی "مسلم تجاویز" بھی زیر غور آئیں - اور اس کے بعد کوئی متفقہ فارمولا بنایا جائے[3] - اس کے بعد ، کانگریس نے ملک کی معروف و غیر معروف سیاسی اور نیم سیاسی ، پچیس انجمنوں کو دعوت دی ، لیکن اس دعوت نامے میں ، جمعیۃ علماء ہند دہلی کو نظر انداز کر دیا تھا[4] -

---

1. *Muslim India*, p. 255;
Rare Documents, p. 121;
"مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۴۲۱

2. *Pakistan: The Formative Phase*, 2nd ed., p. 66;
Modern Muslim India and Birth of Pakistan, p. 159;
Muslim Separatism in India : A Brief Survey, p. 196;
The India Muslims. p. 189.

۳ - "رپورٹ آل پارٹیز کانفرنس"، ۱۹۲۸ء ، ص ص ۲۳-۲۷؛
"مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۲۸۶

۴ - "رپورٹ آل پارٹیز کانفرنس" ، ۱۹۲۸ء ، ص ۲۸

یہ بات قابل غور ہے کہ علماء کی واحد نمائندہ سیاسی جماعت کو نظر انداز کر دیا تھا جب کہ اس کے برعکس دیگر غیر معروف جماعتوں کو دعوت نامے روانہ کئے گئے۔ ہو سکتا ہے کہ کانگریس اور جمعیۃ کے اختلافات جو ۱۹۲۶ء سے چلے آ رہے تھے۔ اس کی بناء پر یا کوئی نامعلوم اسباب کی بناء پر جمعیۃ کو شرکت کی دعوت نہیں دی گئی ہو۔

دہلی کی آل پارٹیز کانفرنس :

۱۲ فروری ۱۹۲۸ء تا ۲۳ فروری ۱۹۲۸ء ، برصغیر کی مختلف سیاسی اور نیم سیاسی جماعتوں کی ایک نمائندہ کانفرنس ، دہلی میں منعقد ہوئی۔ ان جماعتوں میں ، جمعیۃ علماء ہند دہلی شریک نہ تھی۔ البتہ مرکزی خلافت کمیٹی اس میں شریک تھی۔ ۲۳ فروری کو کانفرنس نے اپنے اختتام پر ایک سب کمیٹی مقرر کی۔ جسے مندرجہ ذیل امور پر رپورٹ مرتب کرنے کی ہدایت کی گئی :-

"آیا آئین کو دو ایوانی ہونا چاہیے یا ایک ایوانی ، حق رائے دہندگی ، اعلان حقوق، مزدوروں ، کسانوں کے حقوق ، ہندوستانی ریاستیں"۔

اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ مقررہ مدت میں پیش کر دی۔ مگر افسوس ہے کہ اس رپورٹ کی تفصیلات نہ مل سکیں۔[۱]

دہلی کی آل پارٹیز کانفرنس اس بات پر متفق ہوگئی تھی کہ ملک کا آئندہ "دستور کامل ذمہ دار حکومت کے قیام کو پیش نظر رکھ کر بنایا جائے۔ اس کانفرنس کا دوبارہ اجلاس ۸ مارچ ۱۹۲۸ء کو دہلی میں ہوا۔ اور فرقہ وارانہ مسائل پر کافی غور و خوض بھی ہوا۔ مہاسبھا سندھ کو علیحدہ صوبہ بنانے کے حق میں نہ تھی۔ نیز مہاسبھا نے بعض دیگر مسلم تجاویز کی بھی شدید مخالفت کی۔ اسی اثنا میں مسلم لیگ جناح گروپ کونسل کا اجلاس بھی ہوا۔ مسلم لیگ نے ، آل پارٹیز کانفرنس کے رویے پر احتجاج کیا، کیونکہ اس نے "مسلم تجاویز" (دہلی پروپوزلز) پر مسلم لیگ کی قرار داد (منظور شدہ اجلاس کلکتہ) کی روشنی میں غور نہیں کیا تھا۔ مسلم لیگ کی ناپسندیدگی کی بناء پر آل پارٹیز کانفرنس کو بڑی دشواری اور نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم ۸ مارچ ۱۹۲۸ء کو کانفرنس کا اجتماع ہوا۔ اور اس جلسے میں فرقہ وارانہ مسائل پر کافی غور و

---

۱ - "رپورٹ آل پارٹیز کانفرنس" ، ۱۹۲۸ء ، ص ص ۲۸-۳۰؛
"مسلمانوں کا روشن مستقبل"، ص ۳۲۵؛
Pathway to Pakistan, p. 93.

شروع ہوا ۔ اس کے بعد ۱۱ مارچ ۱۹۲۸ء کو کانفرنس نے دو سب کمیٹیاں مقرر کیں ۔ ایک کمیٹی کے ذمہ سندھ کی علیحدگی کے بارے میں اس کے مالی پہلو سے غور کرنا تھا ۔ اور دوسری کمیٹی کے ذمہ ، نمائندگی بہ اعتبار تناسب آبادی کے عملی پہلو پر غور کرنا تھا ۔[1] اسی درمیان یعنی اپریل ۱۹۲۸ء میں ، جبلپور میں مہاسبھا کا اجلاس ہوا ۔ اس اجلاس میں بعض مسلم تجاویز کی شدید مخالفت کی گئی اور ان کے خلاف قرار دادیں منظور کی گئیں ۔ جس کی بناء پر فرقہ وارانہ بغض و عناد اور بڑھ گیا ۔ ۱۹ مئی ۱۹۲۸ء کو آل پارٹیز کانفرنس بمبئی میں منعقد ہوئی ۔ اس درمیان میں فرقہ وارانہ انجمنوں میں کافی بعد بڑھ چکا تھا اور یہ انجمنیں اپنے رویہ میں نرمی پیدا کرنے پر آمادہ نہ تھیں ۔ دہلی میں جو دو سب کمیٹیاں (سندھ کے علیحدہ صوبہ بننے کے بعد اس کے مالی پہلو پر غور کرنے اور باعتبار تناسب آبادی ، نمائندگی دینے کے لیے مقرر کی گئی تھیں) ان کمیٹیوں نے کوئی رپورٹ پیش نہیں کی ۔ اس لیے اب یہ بات مناسب خیال کی گئی کہ ایک مختصر کمیٹی قائم کی جائے ، جو فرقہ وارانہ مسائل پر بہ حیثیت مجموعی غور کرے ۔ اور ترتیب دستور سے اس کے تعلق پر نظر کرے ۔ اور کوئی مناسب اور قابل عمل حل اور راستہ اختیار کرے ۔ اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک نمائندہ کمیٹی ، جس میں کم و بیش تمام جماعتوں کے نقطہ ہائے نگاہ کے حامی افراد کو شامل کرنے کی کوشش کی گئی تھی ، تشکیل کی گئی ۔ (اس میں جمعیۃ علماء ہند دہلی کے نمائندے شریک نہ تھے) اس کمیٹی کی تشکیل مندرجہ ذیل نسبت سے عمل میں آئی :

(۱) سر علی امام ، مسٹر شعیب قریشی (مسلم نمائندے) ،
(۲)-(۳) مسٹر م ۔ س ۔ آنے اور مسٹر م ۔ ر ۔ جیاکارا (ہندو مہاسبھا کے نمائندے) ،
(۴) مسٹر ج ۔ ر ۔ پردھان (غیر برہمنوں کا نمائندہ) ،
(۵) مسٹر سردار منگل سنگھ (سکھوں کا نمائندہ) ،
(۶) سر تیج بہادر سپرو (لبرل نظریہ کا نمائندہ) ،
(۷) ن ۔ م ۔ جوشی (مزدوروں کے مفاد کا نمائندہ) ، اور پنڈت موتی لال نہرو اس کمیٹی کے چیرمین مقرر ہوئے[2] ۔

---

۱ ۔ "رپورٹ آل پارٹیز کانفرنس" ، ۱۹۲۸ء ، ص ص ۔۳۰-۳۱؛
۲ ۔ ایضاً ، ص ص ۳۱-۳۲ ؛

Pathway to Pakistan, p. 94;
Muslim Separatism in India : A Brief Survey, p. 197.

(نوٹ : موتی لال نہرو نے اپنی رپورٹ ۱۰ اگست ۱۹۲۸ء کو شائع کی تھی ۔ اس میں کم و بیش تمام جماعتوں کے نمائندوں کو شریک کیا گیا تھا ۔ اس کا نام پہلے "مختصر کمیٹی" تجویز کیا گیا تھا ۔ پھر یہ نہرو کمیٹی کے نام سے معروف ہوئی ۔)

نہرو رپورٹ :

مندرجہ بالا نمائندہ مختصر کمیٹی ، جس میں کم و بیش تمام سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں کو شامل کیا گیا تھا ۔ اب نہرو کمیٹی کے نام سے موسوم ہوگئی ۔ اور آئندہ چل کر اس کی مرتب کردہ رپورٹ نہرو رپورٹ کے نام سے شائع ہوئی ۔ اس رپورٹ میں تین مسائل پر خاص توجہ دی گئی تھی :

(اول) ہندوستان میں ذمہ دار حکومت کا قیام جو قلمروی طرز (Dominion Status) کی ہو ۔

(دو) ہندو مسلم مسئلے ، اور

(سوم) دیسی ریاستیں"۔[1]

اس رپورٹ کی اشاعت کے بعد ۲۸ لغایت ۳۱ اگست ۱۹۲۸ء ، لکھنؤ میں آل پارٹیز کانفرنس کے چار اجلاس منعقد ہوئے ۔ مندرجہ بالا سطور میں یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ آل پارٹیز کانفرنس دہلی ، کی ابتدائی کاروائی میں جمعیۃ علماء ہند کو مدعو نہیں کیا گیا تھا ۔ لیکن جب نہرو رپورٹ کو منظور کرنے کے لیے لکھنؤ میں اجلاس طلب کیے گئے تو اس موقعہ پر جمعیۃ علماء ہند کو بھی مدعو کیا گیا ۔ ایک دلچسپ امر یہ ہے کہ جب کانفرنس میں نہرو رپورٹ مرتب کرنے والوں کے لیے شکریہ کا ووٹ تجویز ہوا تو ، مولانا حسرت موہانی نے اس کی مخالفت کی ۔[2] دوسرے دن جب ممبران کمیٹی ، دو تجاویز پر بحث کر رہے تھے یعنی :

"ایک کامل خود مختاری اور دوسرے حکومت کسی صورت میں خود مختار نو آبادیوں کی حکومت سے کم درجہ کی نہ ہو" ۔

تو اس بحث میں دیگر حضرات کے علاوہ مولانا مفتی کفایت اللہ اور مولوی محمد شفیع نے بھی حصہ لیا ۔ مولانا حسرت موہانی نے ایک ترمیم پیش کی کہ مندرجہ بالا تجویز نمبر ۲ کو حذف کر دیا جائے مگر مولانا حسرت موہانی کی اس تجویز کا کوئی مولید نہ

---

1. ***Muslim Separatism in India : A Brief Survey.*** **p. 197 ;**
 سید فضل حسین ، "سیاست ہند مابعد غدر" ، لکھنؤ : س ۔ ن ، ص ص ۱۵۱-۱۵۲ ؛
 تاریخ دستور ہند" ، ص ص ۵۲-۵۳

۲ ۔ "رپورٹ آل پارٹیز کانفرنس" ، ۱۹۲۸ء ، ص ص ۱۹۵-۱۹۸ (ضمیمہ ج)

تھا اس لیے یہ ترمیم رد ہوگئی ۔[1]

تیسرے اور چوتھے روز کی کارروائی میں سندھ کو علیحدہ صوبہ بنانا طے پایا اور پنجاب میں مسلم نشستوں کے تعین کے بغیر حق بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخاب کا ہونا منظور کیا ۔ مولانا شوکت علی نے اس تجویز کی مخالفت کی ، چونکہ موصوف مسلم نشستوں کا تعین چاہتے تھے ۔[2] اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمام جماعتیں اس رپورٹ کو منظور کرنے کے حق میں نہ تھیں ۔ علاوہ بریں اگر تمام جماعتیں اس رپورٹ کو منظور کر لیتیں تو پھر ، جمعیۃ علماء ہند اور مسلم لیگ نے اس کے خلاف ، اپنی اپنی آراء کا کیوں اظہار کیا ؟ بلکہ جمعیۃ کے سرکردہ اصحاب نے تو اس رپورٹ کے خلاف پمفلٹ تک شائع کرائے تھے ۔ مزید برآں مسلم آل پارٹیز کانفرنس منعقدہ دہلی نے متفقہ طور پر چودہ تجاویز بھی پیش کیں ۔ جن کی تفصیلات پیش کی جا رہی ہیں ۔ اس بات سے یہ نتیجہ بہ آسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تمام جماعتوں نے اس رپورٹ کو بخوشی منظور نہیں کیا تھا ۔

مسلم آل پارٹیز کانفرنس :

حسب تفصیل سابق ، ۱۹۲۷ء میں مسلم لیگ میں دو گروپ بن گئے تھے ۔ ایک گروپ کی قیادت مسٹر محمد شفیع اور دوسرے کی مسٹر محمد علی جناح کر رہے تھے ۔ ان کے علاوہ بھی مسلمانوں کی دیگر سیاسی جماعتیں تھیں ، جن میں خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علماء ہند ، دہلی قابل ذکر ہیں ۔ ان میں سے ہر جماعت اپنے کو مسلم نمائندگی کا مدعی سمجھتی تھی ۔ برصغیر کے مسلمانوں کی یہ بڑی بدقسمتی تھی کہ اس وقت کوئی ایک مسلم جماعت ان کی واحد نمائندہ جماعت نہ تھی ۔ اس لیے موجودہ آئینی تعطل کو حل کرنے کے لیے ایک مسلم آل پارٹیز کانفرنس دہلی میں طلب کی گئی تاکہ وہ مسلمانوں کے آئینی اور دستوری حقوق کے لیے کوئی مفید اور قابل عمل ، لائحہ عمل مرتب کر سکے ۔[3]
یہ کانفرنس ۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء تا یکم جنوری ۱۹۲۹ء زیر صدارت سر آغا خان دہلی میں منعقد ہوئی ۔ اس کانفرنس میں شفیع لیگ ، جناح لیگ کے نمائندوں کے علاوہ ، خلافت

---

۱ - "رپورٹ آل پارٹیز کانفرنس" ، ۱۹۲۸ء ، ص ص ۱۹۹-۲۰۰

۲ - ایضاً ، ص ص ۲۰۰-۲۰۳
نوٹ : مولانا حسرت موہانی ، تجویز نمبر ۲ یعنی "حکومت کسی صورت میں خود مختار نو آبادیوں کی حکومت سے کم درجہ کی نہ ہو" کو حذف کرانا چاہتے تھے ۔)

3. *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*, p. 186;
"مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ص ۳۲۸-۳۲۹

کمیٹی اور جمعیۃ علماء ہند نے بھی شرکت کی ۔[1] اس کانفرنس نے مسلمانوں کے مطالبات کو یکجا کرکے ، ایک قرار داد منظور کی ، جس کا خلاصہ یہ تھا :

(۱) ہندوستان کی مرکزی حکومت وفاقی ہو ،

(۲) فاضل اختیارات (Residuary Powers) مختلف ریاستوں اور صوبوں کو حاصل ہوں ،

(۳) اگر کسی فرقہ کے تین چوتھائی ممبر کسی تجویز یا بل سے اختلاف کریں تو وہ قانون ساز جماعت کے سامنے پیش نہ ہو ،

(۴) مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق اس وقت تک حاصل رہے جب تک وہ اسے ضروری سمجھیں ،

(۵) مرکزی اور صوبہ جاتی کابینوں میں ان کی مناسب نیابت ہو ۔

(۶) سندھ کو علیحدہ صوبہ کر دیا جائے ،

(۷) جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں ان کے ممبران کی موجودہ تعداد میں کمی نہ کی جائے ،

(۸) مرکزی اسمبلی میں مسلم ممبران کی تعداد ایک ثلث ہو ،

(۹) صوبہ سرحد اور صوبہ بلوچستان میں اصلاحات جاری کی جائیں ،

(۱۰) سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا مناسب حصہ ہو ،

(۱۱) مسلمانوں کی تہذیب ، زبان ، تعلیم ، مذہب ، پرسنل لاء (شخصی قوانین) اور اوقاف کی حفاظت کی جائے ،

(۱۲) سرکاری تعلیمی امداد میں مناسب حصہ دیا جائے ،

Modern Muslim India and the Birth of Pakistan, pp. 186-87;

R. Coupland, *Report on the Constitutional Problem in India*, pt.1, London, 1942, (pt. 1, reprinted January, 1945, p. 96). Coupland says," At the end of the year an all India Moslem conference met at Delhi at which representations of all shades of Moslem opinion from the fartherest 'Left' to the fartherest 'Right assembled under the Presidency of the Agha Khan, on January 1, 1929, this conference adopted by a unanimous resolution a full scale manifesto of Moslem claims." R. Coupland., 1, p. 96).

(۱۳) آئین ہند کی کوئی تبدیلی صوبوں کی خواہش اور رضامندی کے بغیر نہ کی جائے ،
(۱۴) آئین ہند میں کوئی تبدیلی بلا رضامندی جملہ ریاستوں کے نہ کی جائے[1]"۔

مفتی کفایت اللہ نے کانفرنس کی اس چودہ نکاتی قرارداد سے ، بہ حیثیت نمائندہ جمعیۃ اتفاق کیا ۔ اس فیصلے میں کم و بیش وہ سارے نکات تھے جو آئندہ چل کر جناح صاحب کے چودہ نکات کے نام سے معروف ہوئے ۔ علاوہ ایک اضافے کے ۔ وہ یہ کہ ان چودہ نکات میں جناح صاحب نے ایک اضافہ یہ کیا تھا کہ اگر کانفرنس دیگر تمام نکات کو منظور کرلے گی تو مسلم لیگ جوائنٹ الیکشن کی بنیاد پر انتخاب لڑنا قبول کرلے گی[2] ۔ مولانا طفیل احمد منگلوری ، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور چودھری خلیق الزمان اس رائے سے متفق ہیں کہ مسلم آل پارٹیز کانفرنس کے منظور شدہ نکات ہی آئندہ چل کر جناح صاحب کے چودہ نکات سے معروف ہوئے ۔ خالد بن سعید نے مسئلہ بالا پر روشنی ڈالے بغیر جناح صاحب کے چودہ نکات کو صرف جناح صاحب سے ہی منسوب کیا ہے ۔

"الجمعیۃ" نے اپنے اداریے میں بیان کیا ہے کہ "جمعیۃ نے اپنے اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ آل پارٹیز کانفرنس دہلی کی ابتدائی کارروائی میں جمعیۃ علماء ہند کو مدعو نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی اس کانفرنس کی رپورٹ کا کوئی نسخہ جمعیۃ کو مہیا کیا گیا تھا ۔ اس لیے جمعیۃ نے مندرجہ ذیل اشخاص کو اس رپورٹ پر مفصل تبصرہ کرنے کے لیے مقرر کیا :

"مفتی کفایت اللہ (صدر جمعیۃ) ، مولانا احمد سعید (ناظم جمعیۃ) ، مولانا حسرت موہانی ، مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجاد بہاری اور مولانا حسین احمد مدنی"۔[3]

---

1. ***The Muslim Community of Indo-Pakistan Sub-continent***, pp. 288-89;
Modern Muslim India and the Birth of Pakistan, pp. 186-87;
Pathway to Pakistan, p. 100;
"مسلمانوں کا روشن مستقبل"، ص‌ص ۳۲۸-۳۳۰
2. ***Ulema in Politics***, p. 300 ;
Pathway to Pakistan, pp.100-1;
"مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ۳۳۰-۳۳۲ ؛
The Struggle for Pakistan, pp. 55-56.
۳ - "الجمعیۃ" ، ۱۵ ستمبر ، ۱۹۲۸ء ، ص ۲ ، ک ۱-۲

(نوٹ : مولانا حسرت موہانی اور اس قبیل کے دوسرے افراد کے متعلق جمعیۃ کی تشکیل اور تاسیس والے باب میں روشنی ڈالی جا چکی ہے یعنی ایسے حضرات مستند علماء تو نہ تھے ۔ مگر جمعیۃ کے مذاکرات اور معاملات میں دخیل تھے ۔ اس لیے انھیں علماء کے گروہ میں ہی شمار کیا گیا ہے) ۔

(نوٹ ۲ : "الجمعیۃ" نے اس بات کی صراحت نہیں کی کہ کونسی رپورٹ پر تبصرہ کرنے کے لیے علماء کا تقرر کیا گیا تھا ۔ غالباً اس سے مراد نہرو رپورٹ ہے ۔ چونکہ جمعیۃ علماء کو نہرو رپورٹ کی تیاری کے وقت مدعو نہیں کیا گیا تھا) ۔ ۱

لیکن ان حضرات نے اگر رپورٹ پر کوئی تبصرہ مرتب کیا تو اس کا کوئی حوالہ دستیاب نہ ہو سکا ۔ البتہ مولانا مفتی کفایت اللہ ، مولانا احمد سعید اور مولانا سجاد بہاری کے انفرادی فیصلے نہرو رپورٹ کے خلاف ملتے ہیں ۔ جن کی تفصیلات پچھلے باب میں بیان کی گئی ہیں ۔

مسلم نیشنلسٹ پارٹی کا قیام :

مارچ ۱۹۲۹ء کے آخری ہفتے میں ، مسلم لیگ کا ایک جلسہ ، دہلی میں منعقد ہوا ۔ اس جلسے کی صدارت جناح صاحب کو کرنی تھی ۔ مگر وہ شفیع لیگ سے گفتگو کرنے کی بناء پر جلسے میں تاخیر سے پہنچے ۔ اس درمیان میں حاضرین جلسہ نے ڈاکٹر عالم کو صدارت کے لیے منتخب کیا ۔ موصوف نے جناح صاحب کی عدم موجودگی میں صدارت کے فرائض انجام دیے ۔ لیکن جناح صاحب جب جلسہ گاہ میں آئے تو انھوں نے جلسے کی تمام کارروائی کو کالعدم قرار دے دیا ۔ جناح صاحب کی اس کارروائی سے کچھ لوگوں میں بد دلی اور بے چینی پیدا ہوئی اور مسلم لیگ میں اختلاف پیدا ہوا ۔ اور اسی وقت سے بعض مسلم زعماء مسلم لیگ سے علیحدہ ہو گئے ۔ اور انھوں نے "مسلم نیشنلسٹ پارٹی" کے نام سے ایک علیحدہ جماعت قائم کر لی ۔ اس پارٹی کا پہلا اجلاس ۲۷ جولائی ۱۹۲۹ء کو بمقام الہ آباد منعقد ہوا ۔ اس جلسے کی صدارت کے بارے میں اختلاف آراء ہیں ۔ مولوی طفیل احمد منگلوری نے ، مولانا آزاد کو اس جلسے کا صدر اور مسٹر تصدق حسین شیروانی کو اس کا معتمد بتایا ہے ۔ مگر چودھری خلیق الزمان نے اس جلسے کی صدارت ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی جانب منسوب کی ہے ۔ اس کی سکریٹری شپ اپنی طرف منسوب کی ہے[1] ۔ (سوء اتفاق سے کوئی ایسے مزید شواہد نہ مل سکے جس کی بناء پر مندرجہ بالا جلسہ کی صدارت کے اختلاف پر فیصلہ صادر کیا جا سکے) ۔ ڈاکٹر عالم نے حاضرین جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "مسلم نیشنلسٹ پارٹی" کا ہر ممبر کانگریس کا بھی ممبر ہونا چاہیے ۔ چنانچہ اس جماعت کے تین معزز ممبران، مولانا آزاد ، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مسٹر تصدق حسین شیروانی ، کانگریس کے ممبر رہے[2] ۔ اس جماعت کا دوسرا اجلاس ۲۰ جولائی ۱۹۳۰ء بمقام لکھنؤ زیر صدارت ڈاکٹر مختار احمد انصاری منعقد ہوا ۔ جس میں سائمن کمیشن کی رپورٹ ، مئی ۱۹۳۰ء کی مخالفت کی گئی اور اس کے خلاف ملک بھر میں تحریک سول نافرمانی کی تجویز پاس

---

1. *Pathway to Pakistan*, p. 102;

"مسلمانوں کا روشن مستقبل"، ص۳۹۴ ؛

Modern Muslim India and the Birth of Pakistan, p. 281.

۲ ۔ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ۔ ص ۳۹

کی گئی[1]۔ اس سلسلے میں طرفہ تماشا یہ ہے کہ چودھری صاحب، ایک طرف تو مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے پہلے معتمد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور دوسری طرف اس واقعہ کے ۳۱ یا ۳۲ سال بعد اپنی کتاب میں مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ مسلم قوم پرست جماعت ایک بے جان تنظیم تھی، جس کا نہ کوئی دفتر تھا، نہ ہی کوئی لائحہ عمل اور نہ کوئی قواعد و ضوابط تھے اور نہ ہی مسلم معاشرے میں اس کی کوئی خاص اہمیت اور وقعت تھی ۔ مزید فرماتے ہیں کہ یہ جماعت ہندو مہاسبھا کی پشت پناہی پر قائم تھی اور ہندو اخبارات میں اس کا پروپیگنڈہ تھا ۔ اور اس کی حیات بھی اخبارات کی حد تک تھی[2] ۔

مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے متعلق چودھری صاحب نے جو باتیں بیان کی ہیں وہ غور طلب ہیں ۔ اول تو اس جماعت کے قیام میں دیگر عوامل کے علاوہ مسٹر جناح کا سخت رویہ بھی ایک وجہ تھی ۔ دوم یہ کہ اس جماعت میں جو لوگ شریک تھے ، ان میں سے ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا آزاد برِّصغیر کی سیاست میں عرصہ دراز سے اپنے واضح کردار کی بناء پر عوام و خواص میں ایک خاص مقام کے حامل تھے ۔ مسلم اور غیر مسلم عوام میں ان کو عزت حاصل تھی ۔ اور چودھری صاحب نے جو یہ کہا ہے کہ اس جماعت کا نہ تو دفتر تھا اور نہ ہی قواعد و ضوابط تھے تو اس سلسلے میں گمان اغلب یہ ہے کہ اس جماعت نے ، یوم تاسیس سے ہی اپنے ممبران کو کانگریس کا ممبر ہونا لازمی قرار دے دیا تھا ۔ ہو سکتا ہے کہ اس جماعت نے اپنا علیحدہ دفتر نہ بنایا ہو ۔ جہاں تک ہندو مہاسبھا کی پشت پناہی اور ہندو اخبارات کا تعلق ہے ۔ یہ بیان بھی مشکوک معلوم ہوتا ہے ، کیوں کہ اس وقت مہاسبھا اور ہندو اخبارات زیادہ تر "ہندو راج" قائم کرنے کی فکر میں تھے اور مسلم نیشنلسٹ جماعت کے ذی حیثیت افراد ، کانگریس کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے حقوق کی نگرانی کو اپنا فرض سمجھتے تھے ۔ اور کانگریس بہ حیثیت ایک سیاسی جماعت "برِّصغیر" کے باشندوں کی نمائندگی کی دعویدار تھی ۔ للہذا چودھری صاحب کا یہ استدلال کہ یہ جماعت مسلم معاشرے میں اپنا کوئی مقام نہیں رکھتی تھی ، حقیقت سے بعید معلوم ہوتا ہے ۔ لیکن اس کے ممبران مثلاً ڈاکٹر انصاری اور مولانا آزاد وغیرہ مسلم اور غیر مسلم معاشرے میں خاص اہمیت کے حامل تھے ۔ مگر اس جماعت نے اپنے آپ کو کانگریس سے کلیتاً منسلک کر کے خود ہی اپنی جداگانہ حیثیت کو کمزور کر دیا تھا ۔

---

۱ - "تاریخ دستور ہند" ، ص ۱۵۶ ؛
"مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص‌ص ۴۳۹ - ۴۴۴؛

2. *Pathway to Pakistan*, p. 102.

شاردا بل اور علماء :

۱۹۲۹ء میں ایک نئی سماجی اصلاح شاردا بل کے نام سے اسمبلی میں پیش ہوئی۔ اور پاس ہو کر شاردا ایکٹ کے نام سے مشہور ہوئی[۱]۔ اس ایکٹ کے تحت صغر سنی کی شادی ممنوع قرار دی گئی۔ اس قانون کی زد میں ہندو اور مسلمان سب ہی آتے تھے۔ اس لیے اس ایکٹ کے خلاف دونوں قوموں نے احتجاج کیا۔ مگر علماء نے اس سلسلے میں بڑی جانفشانی اور سرگرمی سے کام کیا۔ علماء ہند نے عموماً اور مفتی کفایت اللہ نے خصوصاً یہ موقف اختیار کیا کہ شادی کا مسئلہ ایک مذہبی معاملہ ہے، اور مذہب کے اندر کسی قسم کی مداخلت مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں۔ اور مسلمان اس غیر شرعی قانون کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ مفتی صاحب نے اس ایکٹ کے خلاف سخت احتجاج کیا[۲]۔

"حیات جوہر" کے مصنف نے بیان کیا کہ مولانا محمد علی، ۹ نومبر ۱۹۲۹ء کو والسرائے ہند کے پاس مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل ایک وفد لے گئے :

"مولانا محمد علی (رئیس وفد)، مولوی محمد یعقوب، مولوی محمد اسماعیل، مولوی محمد شفیع داؤدی، مسٹر اے۔ ایچ۔ غزنوی، مولانا قطب الدین عبدالولی، نواب جمشید علی خان (ایم۔ ایل۔ سی)، حکیم اجمل خان، مولانا حسین احمد مدنی دیوبندی"۔

ان حضرات کے علاوہ اور بھی دیگر حضرات وفد میں شامل تھے جن کی مجموعی تعداد پچیس تھی۔ وفد نے تیس صفحات کی ایک یادداشت والسرائے ہند کو پیش کی اور مطالبہ کیا کہ ایک ایسا قانون نافذ کیا جائے، جو مسلمانوں کو شاردا ایکٹ سے مستثنی کر دے[۳]۔ نتیجتاً علماء نے اس ایکٹ کے خلاف مسلمانوں کی شادیاں صغر سنی میں کرائیں اور اس طرح اپنے عمل سے اس ایکٹ کے نفاذ کو بے عمل ثابت کر دیا۔

جمعیۃ علماء نے ۲۹ نومبر ۱۹۲۹ء کو اس ایکٹ کے خلاف، عوام سے اپیل کی کہ وہ ملک میں مکمل ہڑتال کریں۔ جمعیۃ کے صدر مولانا مفتی کفایت اللہ نے جب

۱۔ "الجمعیۃ"، ۲۰ ستمبر ۱۹۲۹ء، ص ۱، ک ۱

۲۔ "جمعیۃ علماء کیا ہے"؟، ص ۵۹ ؛

"الجمعیۃ"، ۹ نومبر ۱۹۲۹ء، ص ۳، ک ۱ - ۲ ؛

رئیس احمد جعفری (مرتب)، "علی برادران"، لاہور : ۱۹۶۳ء، ص ۵۵۷

۳۔ صالح الدین خان لشتر بلرامی، "حیات جوہر"، علی گڑھ : ۱۹۳۱ء، ص ص ۳۰ - ۳۱

ہڑتال کرنے کی اپیل کی تو مولانا احمد سعید ، جو کسی کام سے لاہور جانے والے تھے ، انھوں نے اپنی روانگی ملتوی کر دی تاکہ مجوزہ ہڑتال کو کامیاب بنائیں ۔ مفتی صاحب نے ، مولانا احمد سعید کی روانگی کی التواء کی اطلاع مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی کو دی اور تاکید کی کہ اس التواء کی تفصیلی اطلاع ، مولانا ظفر علی خان ، غلام رسول مہر ، اور مولانا سالک کو دے دیجیے ۔ کیونکہ یہ حضرات اس وقت جمعیۃ کے ہمنوا تھے[1] ۔ ہڑتال کے اعلان کے بعد مولانا محمد علی نے جو اولاً شاردا بل کی مخالفت میں جمعیۃ علماء کے ساتھ تھے ، جامع مسجد دہلی میں ایک تقریر کی ، جس میں جمعیۃ علماء ہند دہلی اور مجلس تحفظ ناموس شریعت پر نکتہ چینی کی ۔ اور جمعیۃ کی مجوزہ ہڑتال کی مخالفت کی[2] ۔ بہرحال جمعیۃ علماء ہند نے شاردا ایکٹ کو بے عمل اور بے اثر بنانے کے لیے اپنے اثرات کو استعمال کیا ۔ کیوں کہ اس وقت جمعیۃ علماء ہند کی آواز نہ صرف ہندوستان میں بلکہ برما تک اثر رکھتی تھی ۔ نیز جمعیۃ علماء کی آواز پر ان مقامات کے مسلمان ، لبیک کہنے کو تیار تھے ۔ لہٰذا جمعیۃ نے یہ مناسب خیال کیا کہ اس قانون کے نفاذ کو بے عمل بنانے کے لیے مسلمانان ہند و برما سے اپیل کی جائے کہ وہ اس کی خلاف ورزی کریں اور حسب الحکم شرع اپنے صغر سن لڑکے اور لڑکیوں کی شادی کریں ۔ مزید برآں جمعیۃ نے اس قانون کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا کہ یہ اور اسی طرح کے دیگر قانون ہم پر اس لیے مسلط کیے جاتے ہیں کہ ہم غیروں کے محکوم اور غلام ہیں ۔ ان تمام خرابیوں اور برائیوں کو دور کرنے کا واحد علاج یہ ہے کہ ہم مکمل آزادی حاصل کریں اور ان سے نجات حاصل کریں[3] ۔

مختصراً یہ کہ شاردا ایکٹ بہ تعجیل تمام پیش کر کے منظور کرایا گیا ۔ حالانکہ مسلم ممبران اسمبلی نے اس کی سخت مخالفت کی ۔ لیکن قیاس یہ کہتا ہے کہ مسلمانوں نے

---

۱ ۔ حفیظ الرحمان واصف ، "مفتی اعظم کی یاد نمبر" ، دہلی : ۱۳۸۶ھ ، ص ۱۵

۲ ۔ "حیات جوہر" ، ص‌ص ۳۰ ۔ ۳۳ ؛
"مفتی اعظم کی یاد نمبر" ، ص ۱۵

(نوٹ : یہ بات واضح نہ ہو سکی کہ جمعیۃ کی مجوزہ ہڑتال ہوئی یا نہیں ؟ کیوں کہ راقم الحروف کو اس سلسلے میں کوئی مستند شواہد نہ مل سکے ۔ جس کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ ہڑتال ہوئی یا نہیں) ۔

۳ ۔ "جمعیۃ علماء کیا ہے ؟" ، ص ۱۶

(نوٹ : مفتی پنجاب مولانا مفتی فقیر اللہ نے اپنے بیٹوں کے کمسنی میں نکاح پڑھائے اور اپنے گھر سے ہی اس قانون کی خلاف ورزی کی ابتداء کی ۔ "بیس بڑے مسلمان" ، ص ۳۸۳ ، حاشیہ) ۔

اس کی کوئی پروا نہ کی اور برصغیر کے گوشے گوشے میں اس ایکٹ کی مخالفت کرنے میں کوئی تامل نہ ہوا - لہٰذا اس ایکٹ پر غالباً اس کی روح کے مطابق عمل نہ ہو سکا اور شادی بیاہ حسب سابق ہوتے رہے -

نہرو رپورٹ اور حکومت نوآبادیات کا دوسری بار اعلان :

سائمن کمیشن کے تقرر سے پہلے ہی برصغیر میں سیاسی بے چینی زور پکڑ چکی تھی - ۱۹۲۹ء میں اس بے چینی کا ظہور بہت سی شکلوں میں نمودار ہوا - جس کے تحت پبلک سیفٹی ایکٹ کی خلاف ورزی کی گئی - بدیشی کپڑے اور مسکرات کا مقاطعہ کیا گیا - حکومت کو عارضی قوانین یعنی آرڈی نینسوں کا اجراء کرنا پڑا - جس کے تحت مولانا ظفر علی خان گرفتار ہوئے[1] - اس زمانے میں ہندوستان کی سیاسی فضا اس قدر مکدر تھی کہ وائسرائے ہند کو انگلستان جا کر، سیاسی مسائل پر گفتگو کرنا ضروری ہوگیا[2] - اور وائسرائے ہند، لارڈ اروِن نے ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو حکومت خود مختاری کے سلسلے میں ایک اعلان جاری کیا تا کہ سیاسی بے چینی کم ہو سکے - اس اعلان کا مرکزی جملہ یہ تھا کہ "مجھے ملک معظم کی حکومت کی طرف سے یہ اعلان کرنے کا اختیار دیا گیا ہے کہ میں صاف طور پر واضح کر دوں کہ ۱۹۱۷ء والے اعلان میں یہ بات مضمر ہے کہ ہندوستان کی دستوری ترقی کا فطری منتہا قلمروی مرتبہ کی حکومت ہے"[3] - اس سلسلے میں وائسرائے ہند نے ۲۳ دسمبر ۱۹۲۹ء کو بمقام لکھنؤ ایک کانفرنس منعقد کرنے کا اعلان کیا - جس کا مدعا یہ تھا کہ، سیاسی لیڈروں سے بات چیت کے بعد، آئینی اصلاحات پر کوئی فیصلہ کیا جائے - کانفرنس ۲۳ دسمبر کو منعقد ہوئی - جس میں مسٹر جناح اور گاندھی جی کے علاوہ دیگر نمائندگان بھی شریک ہوئے - مگر گاندھی جی اور دیگر کانگریسی زعماء نے، اس کانفرنس میں پہلے سیاسی قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا - لہٰذا یہ کانفرنس کسی سیاسی تصفیہ کے بغیر ہی ختم ہو گئی[4] -

---

۱ - "مسلمانوں کا روشن مستقبل"، ص ص ۴۳۲-۴۳۳

۲ - "مسلمانوں کا روشن مستقبل"، ص ۴۳۲

3. *Pakistan: The Formative Phase*, 2nd ed., p. 70;
Pathway to Pakistan, p. 102;

"تاریخ دستور ہند"، ص ۱۰۶؛

"تواریخ کانگریس"، ص ص ۵۷۱-۵۷۳

(نوٹ: مصنف "تاریخ دستور ہند" نے لارڈ اروِن کے اعلان کی تاریخ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۹ء بیان کی ہے - "تاریخ دستور ہند"، ص ۱۰۶)

4. *Pathway to Pakistan*, pp. 102-3.

"مسلمانوں کا روشن مستقبل"، ص ص ۴۳۳-۴۳۴

نہرو رپورٹ کا خاتمہ اور آزادیٔ کامل کا اعلان :

۳۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو وائسرائے ہند نے جو اعلان ، خود مختاری کے متعلق کیا تھا ، وہ بھی حسب سابق وعدوں اور وعیدوں تک ہی محدود تھا ۔ اس قسم کے اعلانات ماضی میں بھی ہوتے رہے تھے ۔ اور اب تک عملاً اس کی کوئی صورت یا مثبت نتیجہ ظاہر نہ ہوا تھا ۔ نہرو رپورٹ کو حکومت کی جانب سے قبول کرنے کے لیے ایک سال کی مدت مقرر کی گئی تھی ۔ جس کی میعاد ۳۰ دسمبر ۱۹۲۹ء تک تھی ۔ مگر اب تک اس رپورٹ پر بھی عمل کی کوئی صورت نظر نہ آئی ۔ چنانچہ کانگریس نے اپنے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور ، زیر صدارت پنڈت جواہر لال نہرو ، ایک قرار داد پاس کی ، جس کے تحت یہ طے کیا کہ نہرو رپورٹ کو منسوخ کر کے غرق راوی کر دیا جائے ۔ نیز اس اجلاس میں ''آزادیٔ کامل'' کی قرار داد بھی منظور کی گئی[1] ۔

مجلس احرار اسلام کا قیام :

۱۹۲۶ء سے خلافت کمیٹی میں انتشار و افتراق پیدا ہوگیا تھا ۔ پھر بھی یہ کمیٹی ۱۹۲۸ء تک ایک جماعت کی حیثیت سے کام کرتی رہی ۔ مگر پنجاب میں ، علی برادران کے خلاف عدم اعتماد اور بے چینی چلی آ رہی تھی ۔ اس عدم اعتمادی میں ذاتی مخاصمت کا عنصر بھی شامل تھا ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ علی برادران نے ، ۱۹۲۸ء میں پنجاب خلافت کمیٹی کو غیر آئینی قرار دے دیا[2] ۔ اس کے بعد پنجاب کے قوم پرور رہناؤں نے ، پنجاب میں کام کرنے کے لیے ایک نئی جماعت بنام ''مجلس احرار اسلام'' ۲۹ دسمبر ۱۹۲۹ء کو قائم کی ۔ اس جماعت کی تشکیل میں حسب ذیل حضرات قابل ذکر ہیں :-

''چودہری افضل حق ، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری ، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ، مولانا داؤد غزنوی ، مولانا مظہر علی اظہر ، مولانا ظفر علی خان ، مولانا عبدالقادر قصوری اور غازی عبدالرحمٰن''[3] ۔ ''پیام مشرق'' نے اپنے اداریے میں لکھا ہے کہ یہ جماعت مولانا آزاد کے مشورے سے عمل میں آئی تھی ۔ ''مذہبی اور سیاسی عمل کے اعتبار سے یہ جماعت ، جمعیۃ علماء ہند دہلی کے قریب

---

1. *Pathway to Pakistan*, pp. 103-4;
''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' ، ص‌ص ۳۳۴-۳۳۶
2. *Pathway to Pakistan*, p. 150;
''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' ، ص ۵۳۶
3. *Pathway to Pakistan*, p. 150;
''پیام مشرق'' ، ۱۳ اگست ۱۹۳۵ء ، ص ۲۸ (اداریہ)
''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' ، ص ۵۳۶

تھی۔ اس کا پہلا اجلاس ۲۹ دسمبر ۱۹۲۹ء زیر صدارت مولانا افضل حق، لاہور میں منعقد ہوا۔ اور مولانا عطا اللہ شاہ بخاری کو اس جماعت کا امیر منتخب کیا گیا[1]۔

افسوس ہے کہ اس جماعت کا دستور دستیاب نہ ہو سکا، لیکن جماعت کے صدور کے بیانات سے، اس کے مقاصد پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ مولانا چودھری افضل حق نے جماعت احرار اسلام کا مقصد یہ بتایا کہ:

"ملک آزاد ہو، جس میں غریب آسودہ ہوں"۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے کہا کہ:

"ہندوستان میں بجائے ایک سرمایہ دار حکومت کے غرباء کی حکومت قائم کی جائے"۔

اور صاحب زادہ فیض الحسن نے اس امر پر احتجاج کیا کہ:

"سرمایہ دار دائمی عزت اور مسرتوں کا مالک بن گیا ہے اور مزدور اس کے ہاتھ کٹھ پتلی بن گیا"[2]۔

مولانا مظہر علی اظہر نے اپنے خطبہ لاہور، جولائی ۱۹۳۱ء میں فرمایا کہ:

"جب تک استحصال دولت کی بیخ کنی نہیں ہوتی اور اقتصادی مساوات کی راہیں نہیں کھلتیں۔ اس وقت تک معاشرہ انسانی کا کوئی اضطراب ختم نہیں ہو سکتا۔ اور کوئی مرکزیت انسانوں کو اکٹھا نہیں کر سکتی۔ احرار ہندوستان میں اسی صداقت کی نام لیوا ہے اور اس محتاج طبقے کی نمائندگی کی دعویدار ہے۔ جنھیں ان دلوں ہر حالت میں سہ گونہ مصائب کا سامنا ہے۔ پہلی شکل، غیر ملکی سامراج اور اس کی گرانبار زنجیریں ہیں۔ دوسرا خطرہ، ہندو عصبیت کی گہری ضربیں ہیں، اور تیسرا مرض خود مسلمان امراء کا وجود، ان کے اغراض اور ان اغراض کی گوناگوں شاخیں ہیں"۔

آگے چل کر مولانا اظہر نے کہا کہ:

۱۔ "پیام مشرق"، ۱۴ اگست ۱۹۳۵ء، ص ۲۸ (اداریہ)؛
"مسلمانوں کا روشن مستقبل"، ص ۵۴۷
۲۔ ایضاً

"یہ دنیا صرف امیروں کی جولانگاہ نہیں ۔ اور اس میں غریبوں کا بھی حصہ ہے"[1]۔

ڈاکٹر خالد بن سعید نے بیان کیا ہے کہ جماعت احرار کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ہندوستان میں حکومت الٰہیہ (یعنی قانون خداوندی) نافذ کیا جائے[2]۔ بہر کیف اس جماعت کے صدور کے بیانات سے یہ بات ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ سیاسی آزادی کے ساتھ "جمعیۃ احرار اسلام" سماجی انصاف اور معاشی فلاح کی بھی دلدادہ تھی ۔ جیسا کہ چودہری افضل حق صاحب نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا تھا :

"ہم مسلمانوں کی حکومت کے خواہاں نہیں ، بلکہ خدا کی حکومت چاہتے ہیں ، جس میں لوگ آسودہ ہوں ، ہر شخص کو عدل و انصاف ملے ۔ وہ عدل و انصاف نہیں جو اب موجود ہے ، بلکہ وہ جس کی بنیاد عرب کے یتیم نے ڈالی ۔ حکومت خدا کی ، مخلوق خدا کی نہ کوئی چھوت نہ چھات ، بلکہ کامل سیاسی اور اقتصادی مساوات ہو"[3]۔

یہی سبب ہے کہ ایک زمانے میں اس نے پنجاب کے شہری عوام پر اچھا خاصا اثر پیدا کر لیا تھا ۔ شورش کاشمیری صاحب نے ، "خطبات احرار" (مرتبہ ۱۹۴۴ء) کے دیباچے میں مجلس احرار اسلام کی روش کا اظہار مندرجہ ذیل نکات میں بیان کیا ہے :-

"(اول) مجلس احرار اسلام کو کسی ایسی تحریک سے کوئی دلچسپی نہیں ، جس کی کامیابی کے لیے لندن کا طواف یا انگریزی سنگینوں کی احتیاج ہو ۔

---

۱ ۔ شورش کاشمیری (مرتبہ) ، "خطبات احرار" ، لاہور : ۱۹۴۴ء ، ص ۴ (از مولانا مظہر علی اظہر ، "خطبہ لاہور" ، جولائی ۱۹۳۱ء)

نوٹ : شورش کاشمیری نے "خطبات احرار" میں بیان کیا ہے کہ مولانا مظہر علی اظہر نے مسٹر جناح کے ساتھ ۱۹۲۸ء میں گاندھی جی سے ملاقات کی اور کہا کہ نہرو رپورٹ میں ایک ترمیم کر دیجئے۔ وہ یہ کہ اگر حکومت حق رائے دہی بالغاں کو تسلیم نہ کرے تو پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کے لیے آبادی کے تناسب سے نشستیں مخصوص کر دی جائیں ۔ مگر گاندھی جی نے یہ تجویز منظور نہ کی ۔ "خطبات احرار" ، ص‌ص ۱۳۵-۱۳۶)

2. ***Pakistan : The Formative Phase***, 2nd ed., p. 180;

"خطبات احرار" ، ص ۱۰۱

۳ ۔ "خطبات احرار" ، ص‌ص ۱۰۰-۱۰۱

(دوم) مجلس احرار ہندوستان میں ایک مرکز کے قیام اور صوبوں کی موجودہ تقسیم کو روا رکھنے کے حق میں ہے ۔ ہر حالت میں صلح جویانہ عہد و پیمان اور امن آشتی کا ماحول ضروری ہے ۔

(سوم) مجلس احرار اسلام منافرت انگیز پروپیگنڈہ ، خواہ کسی طرف سے بھی کیا گیا ہو یا جاری کیا جا رہا ہے، اسے ہندوستان کے مستقبل کےلیے مہلک سمجھتی ہے ۔ اور ایسے لوگوں سے درخواست کرتی ہے کہ وہ ملک کی فضا کو مسموم کرنے والی تقریروں اور تحریروں سے باز رہیں ۔

(چہارم) مجلس احرار اسلام زمانہ کے موجودہ حالات میں فیصلہ کر چکی ہے کہ اب ہمیں ملک کو اندرونی فساد کے فرقہ وارانہ یا اقتصادی خطروں سے بچانے کی ضرورت ہے ۔ وہ مذہبی یا سیاسی اختلافات کی بنا پر کسی فریق یا جماعت سے تصادم مناسب نہیں سمجھتی ۔ اور جہاں وہ ہندو ، سکھ یا عیسائی وغیرہ سے تصادم یا فتنہ انگیز اختلاف مناسب نہیں سمجھتی ہے ، وہاں وہ مسلمانوں کے درمیان خانہ جنگی پیدا کرنا ہرگز پسندیدہ تصور نہیں کرتی ۔

(پنجم) مجلس احرار اسلام موجودہ وقت میں حکومت برطانیہ سے کوئی مطالبہ نہیں کرتی ۔ پھر بھی وہ ہندوؤں اور مسلمانوں یا مسلم لیگ اور کانگریس کے سمجھوتے کی راہ میں سنگ گراں بننے کی خواہش مند نہیں ۔

(ششم) مجلس احرار اسلام ، ہر حالت میں خدا اور رسول (صلعم) کی دکھائی ہوئی راہ پر چلنا پسند کرتی ہے ۔ دنیا میں نیکی سے رہنا ، نیکی سے تعاون کرنا ، نیکی کی حکومت قائم کرنا ، اور نیکی کو رواج دینا ، ہی خلقت انسانی کی خدمت سمجھتی ہے ۔ اور مجلس احرار اسلام دنیا کے جس حصے میں بھی ممکن ہو حکومت الٰہیہ کے قیام کی خواہاں ہے "[1]۔

شورش صاحب کے بیان میں خلط مبحث کے باوجود احرار کے سیاسی مسلک کے بعض بنیادی عناصر کی نشاندھی ہوتی ہے ۔ یعنی بیرونی حکمرانوں کی والہانہ مخالفت اور مذہب سے والہانہ وابستگی ۔ لیکن ساتھ ہی مذہبی رواداری کا اصول ۔ البتہ شورش صاحب کے بیان میں غرباء کی حمایت کا واضح ذکر نہیں ۔ جس پر اس جماعت کے صدور نے اس قدر زور دیا تھا ۔

---

۱ ۔ "خطبات احرار" ، جلد اول ، ص‌ص ۷ ۔ ۱۱

جماعت احرار اسلام ، مذہبی اور سیاسی امور میں جمعیۃ کی پالیسیوں اور اس کے مقاصد سے ہم آہنگ اور قریب تر تھی ۔ اور چونکہ جمعیۃ ایک مختصر مدت کو چھوڑ کر بالعموم کانگریس کی سیاسی پالیسیوں کی حمایت کرتی تھی ۔ اس لیے جمعیۃ علماء ہند اور جماعت احرار اسلام ، سیاسی امور میں ساتھ ساتھ اور کانگریس کے شانہ بشانہ کام کرتی رہیں ۔ جماعت احرار اسلام کے صدور اور مولانا اظہر کے مندرجہ بالا بیانات سے اس بات کی نشاندھی ہوتی ہے کہ یہ جماعت غرباء کی حالت بہتر کرنے اور انھیں افلاس و نکبت سے نجات دلانے میں پیش پیش تھی ۔ اس لیے کچھ عرصے کے بعد اس نے کشمیری مسلمانوں کی حالت زار کو درست کرانے کے لیے کچھ عملی اقدامات کیے ۔ ویسے تو عام مسلمانان ہند غربت اور افلاس میں مبتلا تھے ۔ مگر کشمیری مسلمانوں کی حالت بہت زیادہ قابل رحم اور لائق توجہ تھی ۔ اس لیے احرار نے اپنی خصوصی توجہ کشمیری مسلمانوں کو پستی اور افلاس سے نکالنے میں صرف کی ۔ جن کی مزید تفصیلات آئندہ اوراق میں پیش کی جائیں گی ۔

گول میز کانفرنس :

سائمن کمیشن کی آمد پر حسب تفصیل سابق ، ملک کی سیاسی پارٹیوں کی اکثریت نے اس کا مقاطعہ کیا تھا ۔ دوسری طرف برطانیہ میں سیاسی تبدیلی رونما ہوئی ۔ یعنی یہ کہ ۱۹۲۹ء میں لیبر پارٹی بر سر اقتدار آ گئی ۔ مئی ۱۹۳۰ء میں سائمن کمیشن نے اپنی رپورٹ پیش کر دی ۔ ہندوستانی اس رپورٹ سے غیر مطمئن تھے ۔ نئی حکومت عوام اور اپنے مابین کسی سیاسی سمجھوتے کی متلاشی تھی ۔ چنانچہ حکومت برطانیہ نے اعلان کیا کہ ہندوستانی رہنماؤں سے جن میں ریاستوں کے نمائندے بھی شریک ہوں گے ، سیاسی مسائل حل کرنے کے لیے ایک گول میز کانفرنس ، انگلستان میں منعقد کی جائے ۔ جس میں آئینی حقوق اور سیاسی مطالبات کو برطانیہ اور ہندوستان کے نمائندے مل بیٹھ کر طے کریں[1] ۔ کانگریس نے ہونے والی گول میز کانفرنس میں شرکت نہ کرنے کا اعلان کر دیا ۔ اس سے پہلے ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کو کانگریس اپنے اجلاس منعقدہ لاہور میں نہرو رپورٹ کو منسوخ کر چکی تھی ۔ اور ہندوستان کے لیے آزادی کامل کی قرار داد بھی پاس کر چکی تھی ۔ کانگریس نے ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو یوم آزادی منایا اور حکومت کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کا اعلان کیا ۔ اس تحریک میں محاصل کی عدم ادائیگی اور سول حکام کی نافرمانی بھی شامل تھی ۔ اس سول نافرمانی کی

1. *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd. ed., p. 75;

"تاریخ دستور ہند" ، ص ۱۵۶

تحریک کے جواز میں یہ بات بیان کی گئی کہ جس حکومت نے ہمارے ساتھ "معاشی سیاسی ، تہذیبی اور روحانی" قسم کی بے اعتنائی برتی ہے ، ہم ایسی حکومت کے ساتھ تعاون نہیں کر سکتے[1] ۔ گاندھی جی نے نمک کے قانون (Salt Act) کی خلاف ورزی کی اور ڈانڈی کو مارچ کیا ۔ حکومت نے اس تحریک میں حصہ لینے والوں کو گرفتار کیا ۔ کانگریسی لیڈران بھی گرفتار ہوئے ۔ گاندھی جی ۵ اپریل ۱۹۳۰ء کو گرفتار کیے گئے اور انھیں یاروادا (Yarvada) جیل میں نظر بند کر دیا گیا ۔ اس تحریک میں جمعیۃ علماء ہند ، احرار اسلام اور کانگریسی مسلمانوں نے شرکت کی ۔ چنانچہ مولانا آزاد ، مفتی کفایت اللہ ، مولانا احمد سعید ، مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی ، مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی وغیرہ گرفتار کیے گئے[2] ۔ اسی زمانے میں یعنی ۱۹۳۰ء میں جمعیۃ علماء ہند کا ایک جلسہ پشاور میں منعقد ہوا ۔ اس جلسے کے بعد خدائی خدمت گاروں نے شراب کی دوکانوں اور بدیشی کپڑے کی دوکانوں پر زبردست پکٹنگ کی ۔ اس پکٹنگ میں جمعیۃ کے کارکنان اور خدائی خدمت گار شامل تھے ۔ پکٹنگ روکنے کے لیے اور قابو میں کرنے کے لیے ، حکومت نے نہتے اور پر امن لوگوں پر اندھا دھند فائرنگ کی ۔ اس فائرنگ سے بہت سے لوگ شہید و زخمی ہوئے ۔ جن میں خاص طور پر جمعیۃ کے کارکنان اور خدائی خدمت گار زیادہ تھے[3] ۔ اس واقعہ کی آزادانہ تحقیق کے لیے کانگریس نے ایک کمیٹی مقرر کی ، جو مفتی کفایت اللہ اور سردار پٹیل پر مشتمل تھی ۔ ان کی رفاقت میں مفتی محمد نعیم رکن جمعیۃ علماء ہند بھی شریک تھے ۔ حکومت نے اس کمیٹی کو پشاور جاکر تحقیق کرنے اجازت نہیں دی ۔ لیکن اہل پشاور نے راولپنڈی پہنچ کر ، کمیٹی کے سامنے شہادتیں قلم بند کرائیں ۔ کمیٹی نے جب اپنی رپورٹ شائع کی تو حکومت نے اسے ضبط کر لیا ۔ کیونکہ اس رپورٹ میں انگریزوں کے مظالم کا پردہ چاک کیا گیا تھا[4] ۔

---

1. *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd ed., p. 76;
India Divided, p. 126;

"مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۲۳۷؛

The Muslim Community of Indo-Pakistan Sub-continent, p. 230.

2. *Pathway to Pakistan*, pp. 106-7.

"بیس بڑے مسلمان" ، ص ۳۳۳؛ ۔
"مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۲۳۷ ۔

۳ ۔ "مفتی اعظم کی یاد نمبر" ، ص ۴۴؛ ۔
"جمعیۃ علماء کیا ہے ؟" ، ص ۳۵ ۔

۴ ۔ "جمعیۃ علماء کیا ہے ؟" ، ص ۳۵؛ ۔
"مفتی اعظم کی یاد نمبر" ، ص ۴۴ ۔

جمعیۃ علماء اور کانگریس میں دوبارہ اشتراک :

کانگریس سے ، جمعیۃ علماء کا اشتراک ۱۹۲۶ء سے معطل تھا - ۱۹۳۰ء میں جمعیۃ کا سالانہ اجلاس ۳ تا ۶ مئی بمقام امروھہ ، زیر صدارت شاہ معین الدین اجمیری منعقد ہوا - اس درمیان ، جمعیۃ علماء ہند کانگریس سے علیحدہ رہنے کے باوجود آزادی حاصل کرنے کی جد و جہد میں مصروف رہی - ادھر کانگریس نے بھی ، اپنے اجلاس منعقدہ لاہور میں مکمل آزادی کی قرارداد پاس کر دی - اور نہرو رپورٹ کو بھی خارج کر دیا - اس لیے جمعیۃ علماء نے امروھہ کے اجلاس میں ملک کے بہتر مفاد کے پیش نظر کانگریس کے ساتھ پھر اشتراک عمل کا فیصلہ کیا - اور مندرجہ ذیل امور پر عمل کرنے کے لیے زور دیا :

''(اول) جمعیۃ علماء کانگریس سے علیحدہ نہ رہے ، بلکہ اس کے ساتھ اشتراک عمل کرے ،

(دوم) سول نافرمانی کا پروگرام مرتب کیا جائے -

(سوم) ضبط شدہ فتووں کی اشاعت کی جائے ،

(چہارم) ترک مسکرات کیا (کذا : صحیح : کرایا) جائے -

(پنجم) ولایتی مال کا مقاطعہ کیا جائے ،

(ششم) کانگریس کی مہاسبھائی ذہنیت پر اظہار افسوس کیا جائے ، اور

(ہفتم) گول میزل کانفرنس کی شرکت سے مسلمانوں کو منع کیا جائے[1]'' -

یہ بات قابل توجہ ہے کہ اگر جمعیۃ نے ایک طرف کانگریس کے ساتھ غیر مشروط تعاون کا اعلان کیا ، تو دوسری طرف بعض کانگریسیوں کی مہاسبھائی ذہنیتوں پر اظہار افسوس کیا اور اس بات میں جرأت مندانہ تنقید بھی کی - یہ وہ وقت تھا ، جب کہ کانگریس اور جمعیۃ نے اہل ہند کے مفاد کے پیش نظر ، ایک دوسرے کے تعاون کے ساتھ اپنے مرتب کردہ سول نافرمانی کے پروگرام پر عمل کیا[2] - مندرجہ بالا صفحات میں

---

۱ - ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' ، ص ۵۳۳؛
''تواریخ کانگریس'' ، ص ص ۵۹۷-۶۰۶ -
Pathway to Pakistan. pp. 105-7.

2. K.K. Aziz, *The Making of Pakistan*, London, 1967, p. 179;
''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' ، ص ۵۲۲

تحریک سول نافرمانی کے تحت گرفتار شدگان کا ذکر کیا گیا ہے ۔ جن میں ، مفتی کفایت اللہ ، صدر جمعیۃ کو ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو گرفتار کیا گیا ۔ مولانا احمد سعید، ناظم جمعیۃ ، مولانا عطا اللہ شاہ بخاری اور دیگر علماء کو بھی گرفتار کیا گیا[1] ۔ ادھر کانگریس نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کا اعلان کیا اور ساتھ ہی گول میز کانفرنس کے مقاطعہ کا بھی اعلان کیا ۔ تو دوسری جانب جمعیۃ نے ہندوؤں کی مہاسبھائی ذہنیتوں سے بد دل ہونے کے باوجود ، کانگریس کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے ، سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ لیا ۔ اور گول میز کانفرنس کا مقاطعہ بھی کیا ۔ تا کہ ملک کے عظیم تر مفاد کو محفوظ کیا جا سکے ۔ اور مسلمانوں کے لیے قانونی و دستوری حقوق ان کی حسب خواہش حاصل کیے جائیں اور اس طرح جنگ آزادی کو مشترکہ طور پر کامیاب بنایا جا سکے[2] ۔ جمعیۃ کا یہ فیصلہ اور طرز عمل علماء کے ایک گروہ کو پسند نہ آیا ۔ جمعیۃ کے اس فیصلے سے قبل ہی کچھ حضرات نے جمعیۃ" علماء سے علیحدہ ہو کر ایک نئی جماعت بنام ''موتمر اسلامی'' قائم کی جسے بعد میں جمعیۃ" علماء کان پور بھی کہا جانے لگا ۔ اس کی تفصیلات پچھلے صفحات میں گزر چکی ہیں ۔

اس جماعت کے دوسرے اجلاس منعقدہ امروھہ میں گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے کا اعلان کیا ۔ چنانچہ، اس جماعت کے صدر مولانا محمد علی نے پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کی ۔ نیز اس جماعت کے اراکین نے تحریک سول نافرمانی میں اور گول میز کانفرنس کے مقاطعہ میں کوئی حصہ نہیں لیا[3] ۔ قیاس کہتا ہے کہ ''موتمر اسلامی'' کے صدر مولانا محمد علی نے گول میز کانفرنس میں شرکت کی ۔ موصوف کی شرکت سے ایک کمی پوری ہوگئی جس کے تحت کوئی عالم گول میز کانفرنس میں شریک نہ ہوا تھا ۔ چونکہ

---

۱ ۔ ''الجمعیۃ'' ، ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۰ء ، ص ۳ ، ک ۲؛
''فرنگیوں کا جال'' ، ص ص ۲۸۳-۲۹۱؛
''عظمت رفتہ'' ، ص ۵۲۸؛
''بیس بڑے مسلمان'' ، ص ص ۵۳۲-۵۳۳

۲ ۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل؛ ، ص ص ۵۳۲-۵۳۳
Pakistan : *The Formative Phase*, 2nd. ed., p. 76.

3. *Pakistan* : *The Formative Phase*, 2nd, ed., p. 76.
''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' ، ص ص ۵۳۲-۵۳۳
''حیات جوہر'' ، ص ص ۳۲-۳۹
(نوٹ : جمعیۃ علماء کانپور کے اجلاس کے صدر مولانا محمد علی تھے ۔ اس کانفرنس میں دس قرار دادیں پاس ہوئیں ۔ جس میں شاردا ایکٹ اور راؤنڈ ٹیبل کانفرنس والی قراردادیں بھی شامل تھیں ۔ ''حیات جوہر'' ، ص ص ۳۲-۳۹)

جمعیۃ علماء ہند نے اس کانفرنس کا مقاطعہ کیا اور ان کی جانب سے کسی عالم نے شرکت نہیں کی ۔

پہلی گول میز کانفرنس :

ارباب اقتدار نے اعلان کر دیا تھا کہ گول میز کانفرنس میں اہل ہند کے آئینی حقوق ، حکومت اور اہل ہند کے نمائندوں کے مابین طے کیے جائیں گے ۔ ادھر ملک میں تحریک سول نافرمانی جاری تھی ۔ کانگریس ، جمعیۃ علماء ہند دہلی ، احرار اسلام وغیرہ گول میز کانفرنس کے مقاطعہ کا اعلان کر چکے تھے ۔ مزید برآں ان جماعتوں کے مقتدر رہنما بھی جیلوں میں نظر بند تھے کہ اسی درمیان یعنی ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو گول میز کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کر دیا گیا ۔ مولانا محمد علی جو مسلم لیگ اور جمعیۃ علماء کانپور کے رہنما تھے ، اس کانفرنس میں شرکت کے لیے روانہ ہوگئے ۔ ہندوستانی ریاستوں کے سربراہان نے بھی اس کانفرنس میں شرکت کی ۔ اس کانفرنس میں کل ۸۶ ڈیلی گیٹس شامل تھے ۔ جن میں سے ۱۶ ہندوستانی ریاستوں کے نمائندے ، ۵۷ برطانوی ہندوستان کے نمائندے اور ۱۳ انگلستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کے نمائندے شامل تھے ۔ لیکن راقم الحروف کو کوئی ایسا مواد نہیں مل سکا ، جس کی بناء پر اس کانفرنس میں کسی عالم کی شرکت پائی جانا ثابت ہو ۔ گمان اغلب یہی ہے کہ طبقہ علماء میں سے کوئی شخص اس کانفرنس میں شریک نہیں ہوا ۔ اِلاّ یہ کہ مولانا محمد علی کو بہ حیثیت صدر جمعیۃ علماء کانپور عالم گردانا جائے[1] ۔

مولانا محمد علی نے ۱۹ نومبر ۱۹۳۰ء کو گول میز کانفرنس میں اعلان کرتے ہوئے کہا کہ :

"میں اپنے وطن عزیز کی آزادی ، سرسبزی ، خوشی اور امن و سکون کا خواہش مند ہوں ۔ اور دنیائے اسلام میں ایک عالمگیر اتفاق و اتحاد کا متمنی ہوں" ۔

انھوں نے اپنی طویل تقریر میں کہا کہ :

"آج ایک مقصد کے لیے آیا ہوں ، وہ یہ کہ میں اپنے ملک کو صرف ایسی حالت میں واپس جاؤں ، جب کہ آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں ہو ، میں ایک غلام

---

1. ***Muslim Separatism in India* : *A Brief Survey*, pp. 203-4.**
***Rare Documents*, p. 128;**

"تواریخ کانگریس" ، ص ۶۹۱

ملک کو واپس نہیں جاؤں گا ۔ میں ایک غیر ملک میں جو آزاد ہو ، مرنے کو ترجیح دوں گا ۔ اور اگر مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں گے تو پھر آپ کو یہاں ، مجھے قبر کے لیے جگہ دینی پڑے گی"[1] ۔

مولانا محمد علی کے یہ الفاظ ان کا آخری اعلان ثابت ہوئے اور موصوف نے ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو اس دار فانی سے کوچ کیا ۔ ۲۸ جنوری ۱۹۳۱ء کو آپ کے جسد فانی کو ، آپ کی دلی خواہش کے مطابق ، ایک آزاد ملک یعنی سرزمین مقدس (یروشلم) میں سپرد خاک کر دیا گیا[2] ۔ مولانا محمد علی نے ، عمر کے بیشتر حصے میں ملک کو آزاد کرانے اور حق و صداقت کی خاطر ، کئی مرتبہ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں ۔ آخر کار ، مذہب اسلام کی خاطر ، اپنی جان و مال و وقت اور سب کچھ قربان کرنے کے بعد ابدی زندگی سے ہم کنار ہوگئے ۔

پہلی گول میز کانفرنس کی ناکامی کے بعد حکومت دوسری گول میز کانفرنس میں کانگریس کی شرکت کی خواہاں تھی ۔ ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی کے نتیجے میں کانگریس کے لیڈران بشمول گاندھی جی نظر بند تھے ۔ حکومت نے اپنے منصوبے کے تحت ، جنوری ۱۹۳۱ء میں ان لیڈران کو رہا کرنا شروع کر دیا ۔ ۲۶ جنوری کو گاندھی جی بھی رہا ہوگئے ۔ اس کے بعد ، لارڈ ارون نے کانگریس سے صلح کی گفت و شنید شروع کی ۔ تا آں کہ ۵ مارچ ۱۹۳۱ء کو ایک میثاق بنام "گاندھی ارون میثاق" عمل میں آ گیا ۔ جس کی رو سے حکومت نے تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا اور حالیہ تحریک میں گرفتار شدہ علماء بھی رہا کر دیے گئے ۔ کانگریس نے ، تحریک سول نافرمانی بند کر دی اور دوسری گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کا اعلان کر دیا[3] ۔ بالآخر کانگریس نے ، گول میز کانفرنس میں شرکت کے مسئلے پر وہی موقف اختیار کیا جس کے مولانا محمد علی موئید تھے ۔

---

۱ ۔ "سیرت محمد علی" ، ص ص ۶۰-۶۶؛
"حیات جوہر" ، ص ص ۶۴-۶۵

۲ ۔ "سیرت محمد علی" ، ص ص ۸۵-۹۳؛

3. Abul Kalam Azad, *India Wins Freedom*, Bombay, 1959, p. 11;
"برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ، ص ۳۷۸
(نوٹ : گیرٹ اینڈ تھامپسن نے بیان کیا ہے کہ ان سیاسی قیدیوں کو رہا کیا گیا جو تشدد کے الزام میں ملوث نہ تھے ۔ جب کہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب تمام سیاسی قیدیوں کی رہائی بیان کرتے ہیں)

1. *Thompsan and Garrat*; *Rise and Fulfilment of British Rule in India*, Allahabad, 1958, pp. 565-76.

دوسری گول میز کانفرنس اور کانگریس کی شرکت :

۷ ستمبر ۱۹۳۱ء کو دوسری گول میز کانفرنس کا اجلاس شروع ہوا ۔ اس اجلاس میں آل انڈیا کانگریس کی جانب سے گاندھی جی نے شرکت کی ۔ مسلمانوں کے نمائندوں میں ڈاکٹر محمد اقبال کا اضافہ ہوا ۔ لیکن مولانا محمد علی کی کمی کوئی پورا نہ کر سکا ۔ اس کانفرنس میں وفاقی طرز حکومت کے ڈھانچے کی تفصیلات اور اقلیتوں کے تحفظ کے مسئلے پر گفت و شنید کرنے کے لیے دو بڑی کمیٹیاں قائم کی گئیں ۔ لیکن یہ کمیٹیاں کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکیں اور ایک ہفتے میں اپنی ناکامی کا اعلان کر دیا[1] ۔ آخر کار یہ اجلاس بھی اپنی ناکامی کے بعد یکم دسمبر ۱۹۳۱ء کو ختم ہوگیا[2] ۔

کانگریس کا فرقہ وارانہ فارمولا اور جمعیۃ کا رد عمل :

۱۹۳۱ء میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کے لیے ایک فارمولا مرتب کیا ۔ کانگریس کی نظر میں یہ فارمولا تمام فرقوں کے لیے اطمینان بخش تھا اور کانگریس کو توقع تھی کہ یہ فارمولا سب فرقوں کے لیے قابل قبول ہوگا ۔ اس فارمولا کے متعلق مولانا محمد میاں نے بیان کیا ہے ، کہ کانگریس نے اس فارمولا کی اشاعت کے ساتھ یہ بھی اعلان کیا کہ اگر کسی فرد یا جماعت کے پاس ، اس سے بہتر فارمولا یا اس کا کوئی نعم البدل ہو تو پیش کریں[3] ۔ کانگریس کا فارمولا حسب ذیل تھا :-

(الف) ''شخصی اور شہری حقوق کے متعلق جو قرار داد منظور کی گئی ہے اس میں ہندوستان کی تمام اقوام کی ''تہذیب ، زبان ، مذہب ، پیشوں اور تعلیم وغیرہ کی حفاظت کی گارنٹی بھی شامل ہوگی'' ۔

(ب) ''شخصی قوانین کی دستور اساسی کی خاص شرائط کے ذریعہ حفاظت کی جائے گی'' ۔

(ج) ''مختلف صوبوں میں اقلیتوں کے سیاسی و دوسرے حقوق کی حفاظت فیڈرل گورنمنٹ کے ہاتھوں میں ہوگی'' ۔

---

۱ ۔ ''برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ'' ، ص ۳۷۸ ؛

3. *Rare Documents*, p. 131.

۲ ۔ ایضاً ، ص ۳۷۸

۳ ۔ ''تواریخ کانگریس'' ، ص ۷۶۵ ؛
''جمعیۃ علماء کیا ہے ؟'' ، ص ۱۸

۲ - ''تمام بالغ مردوں اور عورتوں کو حق رائے دہی حاصل ہوگا'' -

۳ - (الف) ''ہندوستان کے لیے دستور اساسی میں نمائندگی مشترکہ انتخاب کے ذریعہ ہوگی'' -

(ب) ''سندھ میں ہندوؤں اور آسام میں مسلمانوں ، پنجاب اور صوبہ سرحد میں سکھوں کے لیے اور ان تمام صوبوں میں ، جہاں ہندو ، مسلمان ۲۵ فیصد سے کم ہیں ، فیڈرل اسمبلی اور صوبجاتی کونسلوں میں آبادی کے تناسب سے نشستوں کی تخصیص کر دی جائے گی - اور اس کے ساتھ ہی مشترکہ انتخاب میں بھی مقابلہ کرنے کے حقوق دیے جائیں گے'' -

۴ - ''ملازمتوں کی تقرری نان پارٹی پبلک سروس کمیشن کے ذریعہ ہوگی ، جو تمام اقوام کو مناسب حصہ کے لیے مساوی موقعہ دے گی'' -

۵ - ''پراونشل اور فیڈرل وزارتوں کی تشکیل کے وقت اقلیتوں کے مفاد کا خاص خیال رکھا جائے گا'' -

۶ - ''سندھ کو علیحدہ صوبہ بنایا جائے گا - بشرطیکہ سندھ کے لوگ اس کے علیحدہ ہونے پر اس کے مالی اخراجات کا بوجھ اٹھا سکیں'' -

۷ - ''صوبہ سرحد اور بلوچستان میں بھی وہی اسکیم نافذ ہوگی جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں ہے'' -

۸ - ''ہندوستان کا آئندہ دستور اساسی فیڈرل ہوگا'' -[۱]

کانگریس کے مجوزہ فارمولے پر ملک کی دیگر سیاسی جماعتیں تو خاموش رہیں - مگر جمعیۃ علماء ہند نے کانگریس کے فارمولے کی نہ صرف مخالفت کی ، بلکہ اپنا ایک علیحدہ فارمولا تیار کیا ، جو مندرجہ ذیل نکات پر مبنی تھا :

۱ - ہندوستان کی مختلف ملتوں کے کلچر ، زبان ، رسم الخط ، پیشہ ، مذہبی تعلیم ، مذہبی تبلیغ ، مذہبی آزادی ، مذہبی عقائد ، مذہبی اعمال ، عبادت گاہیں ، اوقاف آزاد ہوں گے - حکومت ان میں مداخلت نہ کرے گی -

۲ - دستور اساسی میں اسلامی پرسنل لاء کی حفاظت کے لیے خاص دفعہ رکھی

---

۱ - ''تواریخ کانگریس'' ص ص ۶۵ - ۶۶ -

جائے گی - جس میں تصریح ہوگی کہ مجالس مقننہ اور حکومت کی جانب سے اس میں مداخلت نہ کی جائے گی - اور پرسنل لاء یا شخصی قانون میں حسب ذیل قسم کے معاملات شامل ہوں گے مثلاً :
"احکام نکاح ، طلاق ، رجعت ، عدت ، خیار بلوغ ، تفریق زوجین ، خلع ، عنین و مفقود ، نفقہ زوجیت ، حضانت ، ولایت نکاح و مال ، وصیت ، وقف وراثت ، تکفین و تدفین ، قربانی وغیرہ"۔

۳ - مسلمانوں کے ایسے مقدمات فیصل کرنے کے لیے جن میں مسلمان حاکم کا فیصلہ ضروری ہے ، مسلم قاضیوں کا تقرر کیا جائے گا - اور ان کو اختیارات تفویض کیے جائیں گے -

۴ - صوبوں اور فیڈرل اسمبلی میں اقلیتوں کے سیاسی اور دیگر حقوق کی حفاظت کے متعلق شکایات سننے اور فیصلہ کرنے کے لیے سپریم کورٹ قائم کیا جائے گا۔ جو مختلف ملتوں کے ارکان پر مشتمل ہوگا - اس کے فیصلوں کی تنفیذ فیڈرل حکومت کرے گی -

۵ - صوبہ سرحد اور بلوچستان اور ان صوبوں میں جو نئے قائم کیے جائیں ، طرز حکومت وہی ہوگا جو دیگر صوبوں میں قرار دیا جائے گا -

۶ - سندھ کو علیحدہ مستقل صوبہ بنا دیا جائے گا - اور اس کا نظم اس طرح قائم کیا جائے گا کہ اس کی آمدنی اس کے مصارف کو کافی ہو جائے -

۷ - حق رائے دہی تمام بالغوں کو دیا جائے گا اور کسی صورت میں کوئی ایسا طریقہ قبول نہ کیا جائے گا جس سے کوئی ملت اپنے تناسب آبادی کے مطابق رائے دہندگی کے حق سے محروم رہ جائے -

۸ - طریقۂ انتخاب مخلوط ہوگا -

۹ - پنجاب اور بنگال میں کسی ملت کے لیے ریزولیوشن (کذا ، صحیح ریزرویشن) نہیں کیا جائے گا - اور اگر کوئی اقلیت ریزولیشن (کذا ، صحیح ریزرویشن) کے لیے اصرار کرے تو تمام ملتوں کی نشستیں تناسب آبادی کے اعتبار سے ریزرو کر دی جائیں گی - باقی صوبوں کی انتخابی مجالس اور فیڈرل اسمبلی میں اقلیتوں کی نشستیں تناسب آبادی کے مطابق ریزرو کر دی جائیں گی - اور مزید نشستوں کے لیے مقابلہ کرنے کا حق بھی حاصل ہوگا -

۱۰ - طرز حکومت وفاق ہوگا - تمام صوبے کامل خود مختار ہوں گے - فیڈرل اسمبلی کو صرف وہی اختیار دیے جائیں گے ، جن کا تعلق تمام ہندوستان کے ساتھ یکساں ہوگا - غیر مفروضہ (کذا ، صحیح غیر مفوضہ) اختیارات صوبوں کو حاصل ہوں گے - الا یہ کہ تمام صوبے بالاتفاق تسلیم کر لیں کہ غیر مفوضہ اختیارات فیڈرل اسمبلی کو دیے جائیں -

۱۱ - ملازمتوں پر تقرر ایک غیر جانب دار پبلک سروسز کمیشن کی طرف سے کیا جائے گا - جو لیاقت کا کم از کم معیار مقرر کر کے اس امر کا لحاظ رکھے گا کہ اس معیار کے تحت ہر ملت اپنے تناسب آبادی کے موافق حصہ پانے سے محروم نہ رہے - نیز ماتحت ملازمتوں میں بھی کسی خاص فرقہ کی اجارہ داری نہ ہوگی - تمام فرقوں کو ان کا واجبی حصہ ملے گا -

۱۲ - وفاق اور صوبہ جاتی حکومتوں کی وزارتوں میں اقلیتوں کی نمائندگی تفاہم کے ذریعہ قائم کر دی جائے گی -

۱۳ - دستور اساسی کی بنیادی دفعات میں کوئی تغیر ، ترمیم، اضافہ اس وقت تک نہ ہو سکے گا - جب تک تمام وفاق اجزاء اسے منظور نہ کریں -

۱۴ - یہ عام دفعات ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں - اگر ان میں سے کوئی ایک دفعہ بھی منظور نہ ہوئی تو تمام فارمولا کالعدم ہو جائے گا"۔[1]

جمعیۃ علماء کا مندرجہ بالا فارمولا ۳ اگست ۱۹۳۱ء کے اجلاس منعقدہ سہارنپور میں مجلس عاملہ نے منظور کیا تھا - اور مولانا احمد سعید ، ناظم جمعیۃ نے اس فارمولے کو ، انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع کرا کر ہندوستان کی تمام جماعتوں کے سربرآوردہ حضرات کے پاس بھیجا - مولانا محمد میاں کے بیان کے مطابق ، جمعیۃ نے اس فارمولے کی نقول ، ڈاکٹر محمد اقبال اور حافظ ہدایت حسین ، شرکاء دوسری گول میز کانفرنس کو بھی روانہ کیں - ان حضرات سے کہا گیا تھا کہ وہ فارمولے کو "دستور حکومت ہند" میں شامل کرانے کی کوشش کریں - مگر شومئی قسمت کہ دیگر مسلم جماعتوں نے ان تجاویز کو لائق اعتنا نہ سمجھا اور اس طرح مسلمانوں کے مذہبی حقوق اور شرعی نظام کو دستور ہند ۱۹۳۵ء میں جگہ نہ مل سکی - غرض یہ کہ جمعیۃ کی جملہ مساعی ، جو اس سلسلے میں کی گئی تھیں بارآور نہ ہو سکیں -[2]

---

۱ - "جمعیۃ علماء کیا ہے ؟" ، ص ص ۸۲ - ۸۴

۲ - "جمعیۃ علماء کیا ہے ؟" ، ص ص ۱۷ - ۱۸

دوسری گول میز کانفرنس کی ناکامی ، ملک میں سول نافرمانی اور علماء کی قربانیاں :

دسمبر ۱۹۳۱ء میں جب دوسری گول میز کانفرنس ناکامیاب ہو گئی تو کانگریس اور ان کے ہم خیال لیڈروں نے دوبارہ سول نافرمانی کی تحریک شروع کی۔ جمعیۃ علماء نے اس تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ اور مفتی کفایت اللہ کو اس تحریک کا سب سے پہلا ڈکٹیٹر مقرر کیا گیا۔[1] ۱۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو بعد نماز جمعہ ، جمعیۃ علماء ہند کی جانب سے ، جامع مسجد دہلی سے ایک جلوس نکالا گیا۔ جس کی قیادت مفتی کفایت اللہ نے کی۔ اس جلسے میں تقریباً ایک لاکھ افراد شریک تھے۔ جلسہ آزاد پارک پہنچ کر ختم ہوا۔ مفتی صاحب اسٹیج پر کھڑے ہو کر مجمع سے خطاب کرنا ہی چاہتے تھے کہ پولیس نے بغیر اطلاع ، اور متنبہ کیے ، مجمع پر لاٹھی چارج کرنا شروع کر دیا۔ جس کے نتیجے میں عوام کے علاوہ ، مولانا عبدالحلیم صدیقی اور دیگر ممتاز علماء بھی شدید مجروح ہوئے۔[2] پولیس کے لاٹھی چارج کی وجہ سے جب مجمع منتشر ہو گیا تو ، کوتوال شہر نے ، مفتی کفایت اللہ کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ آپ کے خلاف جیل میں ہی عدالت قائم کی گئی۔ اور اٹھارہ ماہ قید بامشقت کا حکم سنایا۔[3] عدالتی فیصلے کے بعد موصوف کو نیو سنٹرل جیل ملتان میں منتقل کر دیا گیا۔ ملتان جیل میں جنگ آزادی کے بہت سے دیگر اسیر بھی موجود تھے۔ جن میں مولانا احمد سعید دہلوی ، مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی ، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری ، مولانا داؤد غزنوی اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری قابل ذکر ہیں۔[4] ان علماء کے علاوہ مولانا نور الدین لائل پوری اور مولانا ظفر علی خان بھی جیل میں تھے۔ مفتی صاحب نے حسب معمول دوران اسیری بھی ، علمی مشاغل جاری رکھے۔ اور حسب معمول خدمت خلق بھی کرتے رہے مثلاً آپ عام مجرم قیدیوں کے پھٹے پرانے کپڑے وغیرہ بھی سی دیا کرتے تھے۔[5]

فرقہ وارانہ فیصلہ یا کمیونل ایوارڈ :

ارباب بست و کشاد (برطانیہ) دونوں گول میز کانفرنسوں کے نتیجے میں جب کسی

۱۔ "بیس بڑے مسلمان" ، ص ۴۳۴

۲۔ ایضاً ، ص ص ۴۳۴ - ۴۳۵

۳۔ ایضاً ، ص ۴۳۵

۴۔ ایضاً

(نوٹ : مصنف "بیس بڑے مسلمان" نے مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی کا نام غالباً سہو سے دہلوی لکھ دیا ہے)۔

۵۔ "بیس بڑے مسلمان"، ص ۵۳۵

قابل عمل سمجھوتے پر نہ پہنچ سکے تو وزیر اعلیٰ برطانیہ نے ۱۷ اگست ۱۹۳۲ء کو اپنے فیصلے کے مطابق کمیونل اوارڈ یا فرقہ وارانہ فیصلے کا اعلان کر دیا[1] ۔ اس فیصلے کے تحت جداگانہ انتخاب اور پاسنگ کا اصول حسب سابق رکھا گیا ۔ مسلمانوں کو بھی اقلیتی صوبوں میں پاسنگ کا حق دیا گیا ۔ اور سکھوں نیز ہندوؤں کے لیے پنجاب میں پاسنگ کا حق بحال رکھا ۔ لیکن مسلم اکثریت والے بڑے صوبوں یعنی پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو اقلیت میں تبدیل کر دیا گیا ۔ نشستوں کی تقسیم حسب ذیل تھی :-

نام صوبہ	کل نشستیں	مسلم نشستیں
مدراس	۲۱۵	۲۹ ، معہ ایک خاتون
بمبئی معہ سندھ	۲۰۰	۶۳ معہ ایک خاتون
بنگال	۲۵۰	۱۱۹ معہ دو خواتین
یو ۔ پی	۲۲۸	۶۶ معہ دو خواتین
پنجاب	۱۷۵	۸۶ معہ دو خواتین
بہار و اڑیسہ	۱۷۵	۴۲ معہ ایک خاتون
سی ۔ پی اور برار	۱۱۲	۱۴
آسام	۱۰۸	۳۴
شمال مغربی سرحدی صوبہ	۵۰	۳۶
بمبئی علاوہ سندھ	۱۷۵	۳۰ معہ ایک خاتون
سندھ	۶۰	۳۴ معہ ایک خاتون[2]

---

1. *India Divided*, pp. 128-29; *The Struggle for Pakistan*, p. 63;

"تواریخ کانگریس" ، ص ۸۳۶؛ "سیاست ہند مابعد غدر" ، ص ۱۶۰؛
"برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ، ص ۳۷۸ ؛

(نوٹ : ڈاکٹر خالد بن سعید نے اس فیصلے کے اعلان کی تاریخ ۱۶ اگست ۱۹۳۲ء لکھی ہے ۔)

Nicholas Mansergh (ed.), *Documents and Speeches on British Commonwealth Affairs*, (1931-1952), vol. 1. London, 1953, pp. 229-40 f.n. ;

Pakistan : The Formative Phase, 2nd ed., p. 77.

2. Sir Maurice Gwyer and A. Appadorai, (eds.), *Speeches and Documents on the Indian Constitution*, Bombay, 1957, pp. 262-63, extra page.

فرقہ وارانہ فیصلے سے برصغیر کی سیاسی پارٹیاں مطمئن نہ تھیں - لیکن یہ فیصلہ ناگزیر بھی تھا - چوں کہ اس مسئلے پر سیاسی پارٹیاں آپس میں متفق بھی نہ ہو سکی تھیں - لیکن کانگریس نے اس اوارڈ کو اس لیے بالکل مسترد کر دیا کہ اس فیصلے نے پست اقوام کے لیے جدا گانہ حق انتخاب دیا تھا - فیصلہ کے اس پہلو پر مہاتما گاندھی سخت برہم ہوئے اور یارودا جیل میں مسلسل برت (روزے) رکھنے کا اعلان کر دیا اور ساتھ کے ساتھ یہ بھی دھمکی دی کہ اگر حکومت نے اپنا فیصلہ نہ بدلا تو میں اپنی جان دے دوں گا[1] - ظاہر ہے کہ گاندھی جی اور کانگریس ، پست اقوام کے جداگانہ حق انتخاب کو اس لیے ختم کرانا چاہتے تھے تاکہ اسمبلیوں وغیرہ میں ہندو برتری مسلم ہو جائے -

کمیونل اوارڈ اور جمعیۃ علماء ہند :

دوسری گول میز کانفرنس کے بعد جب کوئی متفقہ فارمولا طے نہ ہو سکا تو ہندوؤں اور مسلمانوں میں ، بے چینی و اضطراب پیدا ہوا - اس کے پیش نظر ایک کانفرنس طلب کی گئی جو جولائی ۱۹۳۲ء میں لکھنؤ میں بلائی گئی - جس میں دیگر مندوبین کے علاوہ جمعیۃ علماء نے بھی شرکت کی - اس کانفرنس نے طے کیا کہ اگست ۱۹۳۲ء میں ایک اتحاد کانفرنس (یونٹی کانفرنس) الہ آباد میں منعقد کی جائے - حسب فیصلہ کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مختلف جماعتوں کے نمائندے بہ کثرت شریک ہوئے (محرر نے تمام جماعتوں کے نام بیان نہیں کئے ہیں) - اس کانفرنس نے فرقہ وارانہ کچھ مسائل تو حل کر لیے تھے ، مگر مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی کا تعین اور سندھ کو علیحدہ صوبہ بنانے کا مسئلہ زیر غور تھا - چونکہ ان دونوں مسائل کا کوئی متفقہ فیصلہ نہ ہو سکا تھا کہ اسی درمیان یعنی ۱۷ اگست ۱۹۳۲ء کو برطانیہ نے کمیونل اوارڈ کا اعلان کر دیا - جس کی تفصیلات پچھلے صفحات میں گزر چکی ہیں[2] - چنانچہ یہ کانفرنس بھی بے سود رہی -

---

1. *Rise and Fulfilment of British Rule in India*, p. 579; *The Struggle for Pakistan*, p. 64.; "سیاست ہند مابعد غدر" ، ص ۱۶۰ ؛ "تاریخ دستور ہند" ، ص ۱۶۵ ؛

2. *A History of the Freedom Movement*, vol. 3, pt. 2, p. 311; *Pathway to Pakistan*, p. 118;
"سیاست ہند مابعد غدر" ، ص ۱۶۱

میثاق پونا اور اتحاد کانفرنس :

گاندھی جی نے جب برت کا اعلان کیا تو ہندو لیڈران نے، پہلے بمبئی اور پھر پونا میں پست اقوام کے نمائندوں سے گفت و شنید کی ۔ بالآخر ڈاکٹر امبیدکر، پست اقوام کے نمائندے اور گاندھی جی کے مابین ایک سمجھوتہ ہوگیا ۔ جسے میثاق پونا کہتے ہیں ۔ یہ معاہدہ برت کے پانچویں دن عمل میں آ گیا تھا ۔ اس معاہدے کے تحت جداگانہ انتخاب کا خاتمہ تو نہیں ہوا ۔ البتہ اتنی بات ضرور ہوئی کہ پست اقوام کو گورنمنٹ کے فیصلے سے زائد جگہیں مل گئیں ۔ فرقہ وارانہ فیصلے سے ہندو قوم نقصان میں رہی ۔ ہندو لیڈروں نے پونا میں جمع ہو کر نیچ قوم کو اور زیادہ جگہیں دے دیں[1] ۔ میثاق کے الفاظ گیرٹ و تھامپسن نے حسب ذیل لکھے ہیں :-

"Mr. Gandhi came to terms with Dr. Ambedkar, under which the depressed classes, while voting for the General Constituencies, also formed 'Electoral Colleges' to choose their representatives for the reserved seats, which, according to this 'Poona Pact', were to be increased, 'and it was accepted by the Government"'.

کمیونل اوارڈ کے اعلان سے کچھ پہلے مسلمانان ہند نے یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کی کوئی بین المسلمین تنظیم ضروری ہے ۔ چنانچہ اس غرض کے تحت سلیم پور ہاؤس لکھنؤ میں جولائی ۱۹۳۲ء کو ایک مسلم آل پارٹیز کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں کانگریس کے مولانا آزاد، جمعیۃ علماء ہند کے نمائندے اور سابق خلافت کمیٹی کے مولانا شوکت علی نے شرکت کی ۔ اس مجلس کی غرض و غایت یہ تھی کہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے ایک نمائندہ مجلس کا تقرر عمل میں آنا ضروری ہے ۔ تا کہ وہ بین المسلمین اتحاد کی غرض و غایت پورا کرنے کے لیے عملی قدم اٹھا سکے ۔ اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے ایک کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی ۔ جس میں مولانا آزاد، مولانا شوکت علی اور مولانا

---

1. *Rise and Fulfilment of British Rule in India*, pp. 578-79;
"سیاست ہند مابعد غدر"، ص ص ۱۶۰-۱۶۱

2. *Rise and Fulfilment of British Rule in India*, p. 579 ;
"تواریخ کانگریس"، ص ۸۴ ؛ "تاریخ دستور ہند"، ص ۱۶۵

سید حسین احمد مدنی کے علاوہ پندرہ دیگر معززین شامل کیے گئے[1] -

بعدہ' الہ آباد میں اوائل اگست ۱۹۳۲ء میں اتحاد کانفرنس منعقد ہوئی اور حسب تفصیل سابق اس میں جمعیۃ علماء اور مختلف سیاسی جماعتوں کے نمائندوں نے شرکت کی - اس کانفرنس میں ، کئی متنازعہ امور تو طے ہوگئے تھے ، مگر دو امور حل طلب رہے - ایک امر تو مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کو ۱/۳ فیصد نمائندگی دینے کا تھا اور دوسرا امر سندھ کو علیحدہ صوبہ کا درجہ دینا تھا - جس کے تحت ہندوؤں کے حقوق کا تحفظ بھی ملحوظ رکھنا تھا[2] - ان دونوں امور کو حل کرنے کے لیے سیاسی لیڈروں کے درمیان ابھی گفت و شنید جاری تھی کہ سر سموئیل ہور نے ۱۶ اگست ۱۹۳۲ء کو لندن سے اعلان کیا کہ مسلمانوں کی مرکزی مجلس قانون ساز میں ۱/۲ ۳۲ فیصد نشستیں مخصوص کر دی گئیں اور سندھ کو بھی ایک علیحدہ صوبہ کا درجہ دے دیا گیا - یہ اعلان مسلمانان ہند کے لیے باعث مسرت اور کامیابی ہوا - چونکہ اس کے تحت مسلمانان ہند کے دیرینہ و جائز مطالبات (جن کا ذکر سطور بالا میں گذر چکا ہے) تسلیم کر لیے گئے - للہذا اب مندرجہ بالا مصالحتی کمیٹی کی ضرورت ختم ہوگئی اور اسے توڑ دیا گیا[3] -

تیسری گول میز کانفرنس :

دسمبر ۱۹۳۲ء میں لندن میں تیسری گول میز کانفرنس منعقد ہوئی - اس کانفرنس میں کانگریس نے شرکت نہیں کی اور بقول گیریٹ اینڈ تھامپسن برطانیہ کی لیبر پارٹی نے بھی کوئی حصہ نہ لیا - پہلی دونوں گول میز کانفرنسیں ، نتیجہ کے اعتبار سے ، کسی

---

۱ - "الجمعیۃ" ، ۲ اکتوبر ۱۹۳۲ء ، ص ۲ ، ک ۱-۲؛
"مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۲۵۲؛ *Pathway to Pakistan*, p. 118.

۲ - "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ص ۲۵۲-۲۵۳؛ *Pathway to Pakistan*, p. 118;
"سیاست ہند مابعد غدر" ، ص ۱۶۱

۳ - "سیاست ہند مابعد غدر" ، ص ۱۶۱؛
Muslim Separatism in India : A Brief Survey, p. 213.

(نوٹ : ڈاکٹر خالد بن سعید نے فرقہ وارانہ فیصلہ کے اعلان کی تاریخ ۱۶ اگست ۱۹۳۲ء لکھی ہے - جب کہ ڈاکٹر عبدالحمید نے ۴ اگست ۱۹۳۲ء بیان کی ہے -)

متفقہ فارمولا پر متحد نہ ہو سکی تھیں اس لیے بے سود رہیں ۔ تیسری کانفرنس بھی لاحاصل تھی ۔ کیونکہ اس میں تمام سیاسی پارٹیاں بھی حصہ نہیں لے رہی تھیں ۔ اس لیے یہ کانفرنس کسی خاص اہمیت کی حامل نہ تھی[۱] ۔ تینوں گول میز کانفرنسوں کے نتیجہ میں اہل ہند کے لیے ، آئینی اور دستوری مسائل کا کوئی قابل قبول اور قابل عمل فارمولا تیار نہ ہو سکا ، لہٰذا حکومت نے خود ہی یہ طے کیا کہ ، ہندو مسلم تنازعات اور دستوری حقوق کے لیے ، کوئی اپنا ہی منصوبہ پیش کرے ۔ اسی خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت نے تینوں گول میز کانفرنسوں کی تجاویز اور سفارشات کو ایک قرطاس ابیض (White Paper) میں شائع کیا ۔ یہ قرطاس ابیض مارچ ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا ۔ اور پارلیمانی جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کا تقرر بھی عمل میں آیا ۔ جوائنٹ کمیٹی میں دیگر ہندوستانی ممبران کے علاوہ ، سر آغا خان ، سر محمد ظفر اللہ خان ، شفاعت احمد خان ، عبدالرحیم اور اے ۔ ایچ غزنوی بھی شامل تھے ۔ اس کمیٹی کے ذمہ گورنمنٹ آف انڈیا بل کی تیاری کا کام سپرد کیا گیا[۲] ۔ قرطاس ابیض اور جوائنٹ پارلیمانی کمیٹی کی روشنی میں برطانوی حکومت نے ایک نیا آئینی بل مرتب کیا جو ۱۹۳۵ء میں پارلیمنٹ سے پاس ہو کر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کہلایا[۳] ۔

فصل سوم

انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء ، مسلمانوں کا رد عمل اور علماء کا کردار

انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی رو سے مرکز میں دو عملی وفاقی حکومت اور صوبوں میں خود مختاری کا اصول مان لیا گیا ۔ اس ایکٹ کی رو سے صوبائی گورنروں کے اختیارات ایک مقررہ حد تک ، محدود و متعین ہوگئے ۔ اپنے نقائص کے باوجود ۱۹۳۵ء کا ایکٹ

---

۱. ***Pakistan* : *The Formative Phase*, 2nd ed., p. 77;**
***Rise and Fulfilment of British Rule in India*, p. 579;**
***Muslim Separatism in India* : *A Brief Survey*, p. 214;**
"سیاست ہند مابعد غدر" ، ص ۱۶۱؛ "تاریخ دستور ہند" ، ص ۱۶۶

2. ***Rise and Fulfilment of British Rule in India*, p. 579;**
***The Struggle for Pakistan*, pp. 64-65.** ؛ "تاریخ دستور ہند" ، ص ص ۱۶۶-۱۶۷

3. ***Rise and Fulfilment of British Rule in India*, p. 597.**

حکومت خود مختاری کی جانب ایک پہلا قدم تھا ۔ مگر انڈین نیشنل کانگریس اس ایکٹ کے قبول کرنے میں پس و پیش کر رہی تھی[1] ۔

مسلمانوں میں اس وقت اتفاق اور یک جہتی معدوم تھی ۔ ملک کی موجودہ مسلم سیاسی جماعتیں ، یعنی مسلم لیگ ، جمعیۃ علماء ہند ، احرار اسلام اور خلافت کمیٹی (جو برائے نام تھی) وغیرہ میں سیاسی ہم آہنگی کا فقدان تھا ۔ اور یہ جماعتیں ایک دوسرے پر نکتہ چینی کرتی رہتی تھیں ۔ خاص طور پر مسلم لیگ کے خلاف بے عملی کا اور حکومت کی جانبداری کا الزام تھا ۔ مگر انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے منظور ہونے کے بعد مسلمانوں میں یہ خیال زور پکڑتا گیا کہ اب مسلم لیگ کو دوبارہ زندہ کیا جائے ۔ آغا خان عرصے سے ملک سے باہر تھے ، مولانا محمد علی فوت ہو چکے تھے ۔ سر محمد شفیع بھی ، ۷ جنوری ۱۹۳۲ء کو فوت ہو چکے تھے[2] ۔ اب لے دے کے محمد علی جناح ہی نظر آتے تھے ۔ لٰہذا مسلم لیگی لیڈروں نے ، مسلم لیگ کی قیادت کے لیے مسٹر جناح کا انتخاب کیا ۔ مسٹر جناح چند سال سے انگلینڈ میں مقیم تھے ۔ مسلم لیگ کے ہی خواہوں نے ، انھیں ملک واپس آنے کی دعوت دی اور جناح صاحب اکتوبر ۱۹۳۵ء میں مستقلاً وطن واپس آ گئے[3] ۔ اہل وطن کے عظیم مفاد اور ملک کی بھلائی کی خاطر ، مسٹر جناح کی یہ خواہش تھی کہ ”لکھنؤ پیکٹ کی اسپرٹ کو دوبارہ زندہ کر کے“ دوستانہ ماحول پیدا کیا جائے ۔ تا کہ ہندو مسلم مفاد کے حقوق کا تحفظ اور خودمختاری میں مشترکہ جدوجہد کی جا سکے ۔ نیز انتخاب کے بعد قائم ہونے والے خود مختار ، صوبائی اداروں میں تعاون اور رفاقت کی فضا پیدا ہو سکے ۔ مگر کانگریس نے اس پر عملی آمادگی کا اظہار نہ کیا ۔ لٰہذا جناح صاحب کی یہ خواہش بروئے کار نہ آ سکی[4] ۔

---

1. *Muslim Separatism in India : A Brief Survey*, pp. 214-15; *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd ed., p. 280; *Muslim India*, p. 328.

2. *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*, p. 208.

3. *Ibid.*, pp. 206-9.

(نوٹ : ڈاکٹر محمد اکرام نے کوپ لینڈ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ :

"About Jinnah's own attitude in 1934 (and 1935) Coupland says...it was soon evident that Mr. Jinnah who had again become President of the Muslim League in 1934 was prepared to revive the entente of the Lucknow Pact period in the common cause of nationalism". (*op. cit.*, pp. 208-358).

4. *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*, pp. 208-358.

لاہور کی مسجد شہید گنج کا حل اور مسٹر جناح کی کوششیں :

۱۹۳۵ء میں لاہور کی ایک مسجد شہید گنج کو سکھوں کے مطالبے پر گورنر کے حکم سے شہید کر دیا گیا تھا ۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے بیان کیا ہے کہ مسجد کو ، گوردوارہ میں تبدیل کر دیا تھا[1] ۔ جس کی وجہ سے حکومت کے خلاف ، مسلمانوں میں سخت اشتعال اور بے چینی تھی ۔ جمعیۃ علماء ہند اور احرار اسلام وغیرہ نے حکومت کے اس فعل کے خلاف شدید احتجاج کیا ۔ ۱۹۳۵ء میں مسٹر جناح ، جب دوبارہ انڈیا واپس آئے تو انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت صوبوں میں انتظامی مہم شروع کرنا از بس ضروری تھی ۔ مگر شہید گنج کے واقعہ نے مسلمانوں کے ذہنوں پر برا اثر ڈالا ہوا تھا ۔ اور خصوصاً مسلمانان پنجاب بہت ہی مضطرب تھے ۔ حکومت نے مسجد شہید گنج کے واقعہ کے خلاف احتجاج کرنے والوں کو نظر بند کر دیا تھا ۔ اور بہت سے افراد کے خلاف مقدمات بھی قائم کیے گئے تھے ۔ جناح صاحب نے اس تعطل اور مسموم فضا کو دور کرنے کے لیے یہ ضروری خیال کیا کہ اس مسئلے میں ماخوذ نظر بندوں کو رہائی دلائی جائے اور ان کے خلاف قائم کردہ مقدمات بھی واپس لیے جائیں تا کہ صوبہ میں امن و امان کی کیفیت پیدا ہو سکے اور سیاسی فضا بھی سازگار ہو جائے[2] ۔ مسٹر جناح نے اسیران شہید گنج کے بارے میں حکومت سے گفت و شنید کی اور ارباب اقتدار کو اس بات پر رضامند کر لیا کہ تمام اسیران کے خلاف مقدمات واپس لے کر انھیں رہا کر دیا جائے تا کہ صوبہ کا درہم برہم شدہ امن و امان بحال ہو سکے ۔ چنانچہ حکومت پنجاب نے ، جناح صاحب کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے گرفتار شدگان کو رہا کر دیا ۔ اور پولیس ایکٹ کے تحت جو مقدمات زیر تفتیش تھے وہ بھی واپس لے لیے گئے ۔ اس کے بعد مسٹر جناح نے مسلمانان پنجاب کے ان زعماء سے گفت و شنید کی جو اس تحریک میں پیش پیش تھے ۔ اس گفت و شنید کے نتیجے میں پنجاب میں تحریک سول نافرمانی بند کر دی گئی[3] ۔ جناح صاحب اپنی ان کوششوں میں جب کامیاب ہو گئے تو انھوں نے پنجاب میں پائیدار امن کی خاطر غیر مسلموں کے ساتھ تعاون کو ضروری خیال کیا ۔ اور اس سلسلے میں ایک کمیٹی بنام "شہید گنج مصالحتی کمیٹی" کے قیام کی تجویز پیش کی ۔ چنانچہ ایک کمیٹی کا قیام عمل میں آ گیا ۔ جس میں ڈاکٹر محمد اقبال ، مولوی عبدالقادر قصوری ، پنڈت نانک چند ، سردار بوٹا سنگھ ، سردار اجل سنگھ اور سردار سمپورن سنگھ ، شامل تھے ۔ نواب احمد یار خان دولتانہ کو اس کمیٹی کا کنوینر

1. *Ulema in Politics*. p. 323.
2. *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*, p. 358.
3. *Ibid.*, pp. 358-59.

مقرر کیا گیا ۔ اس کمیٹی کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ کوئی ایسا لائحہ عمل تلاش کرے ، جو تمام پارٹیز کو قابل قبول ہو[1] ۔ جناح صاحب ، اس مسئلے کو حل کرنے کے سلسلے میں کئی ہفتوں تک کوشش کرتے رہے ۔ موصوف کا مقصد یہ تھا کہ ، مسلمان آئندہ ہونے والے انتخاب میں یکسوئی اور دل جمعی کے ساتھ اپنی توجہ منعطف کر سکیں ۔ تا آں کہ موصوف اپنی اس جد و جہد میں وقتی طور پر کامیاب ہوگئے ۔ جس پر گورنر پنجاب نے آپ کا بہت شکریہ ادا کیا[2] ۔

مسلم پارلیمنٹری بورڈ اور علماء و مسٹر جناح :

انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت ہونے والے انتخابات میں ، مسلمانوں کو کامیاب بنانے کے لیے مسٹر جناح نے ملک کے بیشتر حصوں کا دورہ کیا ۔ اور اس سلسلے میں جون ۱۹۳۶ء میں ایک مرکزی مسلم الیکشن بورڈ یا مسلم پارلیمنٹری بورڈ قائم کیا[3] ۔ اس بورڈ میں ، مسلم لیگ ، جمعیۃ علماء ہند ، مجلس احرار اسلام ، پرجا پارٹی بنگال اور خلافت کمیٹی کے نمائندوں نے شرکت کی[4] ۔ اس بورڈ نے ایک قرار داد پاس کی جس کے ذریعہ آئندہ انتخابات میں حصہ لینے کے لیے لائحہ عمل طے کیا گیا ۔ اس بورڈ میں جمعیۃ علماء ہند کو نمایاں مقام دیا گیا ۔ اس بورڈ کی تشکیل صوبوں کے لحاظ سے عمل میں آئی ۔ اس کے ارکان میں مفتی کفایت اللہ ، صدر جمعیۃ علماء ہند ، مولانا احمد سعید دہلوی ، معتمد جمعیۃ علماء ہند ، مولانا سید حسین احمد مدنی ، مولانا عبدالحامد بدایونی ، مفتی عنایت اللہ ، مولانا جمال میاں ، مولانا شوکت علی ، اور مولانا کرم علی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ مولانا شوکت علی نے ، مسلم امیدواروں کو کامیاب بنانے کے لیے تمام صوبے کا دورہ کیا ۔[5] دیگر علماء نے بھی جو اس کمیٹی کے رکن تھے ، تمام صوبے کا

---

1. *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*, p. 359.
2. *Ibid.*, p. 369.
3. *All India Muslim League : Presidential addresses By Mr. Jinnah*, Delhi, 1945, p. 4.
4. مولانا سید محمد قریش شمسی ، ”نظام نامہ کل ہند جمعیۃ علماء اسلام“ ، کلکتہ ، س ۔ ن ، ص ۴۳ ۔
5. A.H. Alberuni, *Makers of Pakistan*, Lahore, 1950, p. 210; *Pathway to Pakistan*, p. 142, *Muslim India*, p. 133;
”نظام نامہ کل ہند جمعیۃ علماء اسلام“ ، ص ص ۴۳ - ۴۴ ۔
(نوٹ : چودھری خلیق الزمان نے ، مولانا جمال میاں کا نام بیان کیا ہے ، جب کہ ”نظام نامہ کل ہند جمعیۃ علماء اسلام“ کے مصنف نے اس پر خاموشی اختیار کی ہے ، حالانکہ اس نے تمام صوبوں کے ارکان کی مکمل فہرست بیان کی ہے) ۔
Pathway to Pakistan, p. 142;
(ذ) ”نظام نامہ کل ہند جمعیۃ علماء اسلام“ ، ص ص ۴۳ - ۴۴) ۔

دورہ کر کے مسلم اُمیدواروں کے حق میں رائے عامہ ہموار کی ۔ خاص طور سے جمعیۃ علماء ہند نے مسلم لیگ کی بڑی مدد کی ۔ اس سلسلے میں اے ۔ ایچ البیرونی نے بیان کیا ہے کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت ہونے والے انتخابات میں ، جمعیۃ علماء ہند نے مسلم لیگ کے نمائندوں کی بڑی گرم جوشی سے مدد کی ۔

"In the election the League was actively assisted by Jamiat-ul-Ulama"[1].

علماء کی اس جد و جہد کے نتیجے میں یوپی میں مسلم لیگ کے نمائندوں کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی ۔ کوپ لینڈ کے بیان کے مطابق مسلم لیگ نے ۲۶ نشستیں حاصل کیں ۔ جب کہ کانگریس کے ٹکٹ پر صرف ایک مسلم نمائندہ کامیاب ہوا[2] ۔

جمعیۃ علماء کا کردار ، مسلم کانفرنس ۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء سے لے کر انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء تک :

جمعیۃ علماء ہند ، اپنی تشکیل اور قیام کے وقت سے جنگ آزادی کے حصول تک ، مسلمانان ہند کی سیاسی ، روحانی ، مذہبی ، معاشرتی اور اخلاقی خدمات انجام دیتی رہی ۔ اس جماعت کو بجا طور پر یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے علماء کے فروعی اختلافات کو رفع کر کے علماء کرام کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا تھا[3] ۔ ہندوستان میں آئینی اصلاحات کی تکمیل کے لیے ۲۸ - ۱۹۲۹ء میں جب سائمن کمیشن اپنی رپورٹ مرتب کر رہا تھا تو ہندوستان میں ایک آل پارٹیز کانفرنس منعقد ہوئی جس کے صدر مسٹر موتی لال نہرو تھے ۔ اس کمیٹی نے جب اپنی رپورٹ بنام "نہرو رپورٹ" پیش کی تو جمعیۃ علماء نے ، ملکی اور اسلامی مفاد کو مد نظر رکھتے ہوئے ، نہرو رپورٹ کے خلاف ایک تنقیدی رپورٹ تیار کی[4]۔ اس تنقیدی رپورٹ میں ان امور کا لحاظ رکھا گیا تھا جس کا ہونا ، اسلامی نظام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لیے ، دستوری حکومت ہند میں ضروری تھا ۔ (افسوس ہے کہ اس کا کوئی نسخہ راقم الحروف کو دستیاب نہ ہو سکا)۔ یہ تنقیدی رپورٹ مولانا محمد علی مرحوم کے ذریعہ آل پارٹیز کانفرنس کے کنوینشن ، منعقدہ کلکتہ پہنچی گئی تھی ، تاکہ زعماء قوم اس پر بحث و تمحیص کے بعد کسی نتیجے پر پہنچ سکیں اور اس

---

1. *Makers of Pakistan*, p. 210.

2. *Report on the Constitutional Problem in India*, Pt. 2, pp. 110-11.

۳ - "جمعیۃ علماء کیا ہے؟" ، ص ۲۳ ۔

۴ - ایضاً ، ص ص ۱۳ - ۱۵ ۔

رپورٹ کے پیش نظر دستوری اصلاحات میں مسلم نقطۂ نظر کو ، نظر انداز نہ کر سکیں[1] ، مصنف "جمعیۃ علماء کیا ہے ؟ " کے بیان سے اس امر کی مزید تصدیق ہوتی ہے کہ جمعیۃ علماء ہند ، نہرو رپورٹ کی سفارشات سے مطمئن نہ تھی ، اور جمعیۃ کے صدر مولانا کفایت اللہ نے ، جمعیۃ کی تنقید اور جوابی تجاویز کو ایک کتابی شکل میں چھپوا کر ، آل پارٹیز کانفرنس کے پاس بتوسل مولانا محمد علی مرحوم روانہ کیں ۔ موصوف کا مقصد یہ تھا کہ اگر آئندہ دستوری اصلاحات نہرو رپورٹ کی بنیاد پر مرتب کی جائیں تو مسلم نقطۂ نظر اور اسلامی مفاد کا تحفظ صرف نظر نہ ہو جائے ۔

مسٹر جناح کے چودہ نکات اور جمعیۃ کا مثبت کردار :

مسٹر جناح کے چودہ نکات کے متعلق مندرجہ بالا صفحات میں روشنی ڈالی جا چکی ہے ۔ یہ چودہ نکات (جن کا ذکر صفحات بالا میں کیا گیا ہے) اصل میں آل پارٹیز کانفرنس منعقدہ دسمبر ۔ جنوری ، ۲۸ - ۱۹۲۹ء بمقام دہلی ، سر آغا خان کی قیادت میں ، تمام مسلم جماعتوں نے مل کر تیار کیے تھے ۔ اس کانفرنس میں خلافت کمیٹی ، شفیع لیگ اور جمعیۃ علماء ہند نے بھرپور حصہ لیا تھا ۔ یہ مسلم کانفرنس ، مفتی کفایت اللہ ، مولانا محمد علی اور سر محمد شفیع مرحوم کی انتھک کوششوں سے کامیاب ہوئی تھی ۔ یہ چودہ نکات کا فارمولا ، اس وقت کے ماحول ، ملک کے سیاسی حالات اور مسلم تقاضوں کو مد نظر رکھ کر ایک متوازن اور مناسب حل پیش کرنے کی غرض سے تیار کیا گیا تھا ۔ اس فارمولے پر تمام مسلم جماعتیں متفق ہو گئی تھیں[2] ۔ مندرجہ بالا مسلم آل پارٹیز کانفرنس میں مسٹر جناح اور ان کی لیگ نے شرکت نہیں کی تھی ۔ ۱۹۲۹ء میں جب سر شفیع اور مسٹر جناح میں اتفاق و اتحاد ہو گیا تو مارچ ۱۹۲۹ء میں جناح صاحب نے اپنے چودہ نکات مرتب کیے ۔ چودہ نکات والا فارمولا بنیادی طور پر ان ہی نکات پر مبنی تھا ، جن پر مسلم آل پارٹیز کانفرنس نے اپنے نکات مرتب کیے تھے ۔ مگر مسٹر جناح نے اپنے نکات میں اس بات کا اضافہ کیا کہ "اگر کانگریس مسلم لیگ کے دیگر تمام نکات کو منظور کر لے گی تو مسلم لیگ جوائنٹ الیکشن کی بنیاد پر انتخاب لڑنا قبول کر لے گی" ۔ جمعیۃ علماء نے اپنے آئندہ اجلاس میں مسٹر جناح کے چودہ نکات کی تصدیق کی اور جمعیۃ

---

۱ - "جمعیۃ علماء کیا ہے ؟"، ص ۱۵ ۔

2. ***Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*, pp. 159-186-87, 208; *Struggle for Pakistan*, pp. 55-57; *Pathway to Pakistan*, p. 100.**

"جمعیۃ علماء کیا ہے ؟" ، ص ۱۵ ۔

علماء کی حمایت اور تائید نے اس فارمولے کو مسلم عوام کے لیے مزید قابل قبول بنا دیا [۱]۔ مصنف "جمعیۃ علماء کیا ہے ؟" نے مزید بیان کیا ہے کہ ۱۹۲۹ء میں مسلم کانفرنس دہلی نے جو فارمولا ، جمعیۃ علماء ہند کی شمولیت سے تیار کیا تھا ۔ قریب قریب وہی فارمولا آگے چل کر گول میز کانفرنس میں مسلم نمائندوں کے لیے رہبر اصول بنا مگر (ان کے بیان کے مطابق) مسلم نمائندوں نے فارمولے کے تحت گول میز کانفرنس میں اپنے مطالبات کی پوری وضاحت نہیں کی ۔ اس لیے یہ فارمولا کلی طور سے ، انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں شامل نہ ہو سکا [۲] ۔

جمعیۃ علماء کی سماجی اصلاحات اور قانونی امور :

شاردا ایکٹ : اس ایکٹ کے متعلق ما سبق میں مختصر ذکر کیا جا چکا ہے ۔ اس قانون کا اطلاق ، ہندو ، مسلمان نیز ہندوستان کی دیگر اقوام پر بھی ہوتا تھا ۔ یہ قانون ۱۹۲۹ء میں منظور ہوا تھا ۔ ہندو مسلم عائلی قوانین کے تحت شادیوں کے لیے لڑکے اور لڑکیوں کی عمر کی کوئی حد یا تعین نہ تھی ۔ جسے مسلمان اور بعض ہنود اپنے مذہبی امور میں مداخلت سمجھتے تھے ۔ جمعیۃ علماء نے اس قانون کے خلاف شدید احتجاج کیا ۔ اور اس قانون کی بنا پر جمعیۃ علماء نے سول نافرمانی کی دھمکی بھی دی (تفصیلات ماسبق میں پڑھئیے)[۳]۔ مرتب "حیات جوہر" نے بیان کیا ہے کہ شاردا ایکٹ کے متعلق مولانا محمد علی نے (حسب تفصیل سابق) ۲۵ سرکردہ مسلمانوں کے وفد کے ہمراہ وائسرائے ہند سے ملاقات کی ۔ موصوف رئیس وفد تھے ، مولانا نے وائسرائے سے کہا کہ کوئی مسلمان ، جو اسلام کو سچا مذہب سمجھتا ہے ۔ اس قانون کو برداشت نہیں کرے گا اور نہ ہی اس ایکٹ کی منظوری کی پرواہ کرے گا [۴] ۔ جمعیۃ علماء نے اس ایکٹ کو ناقابل عمل بنانے کے لیے

---

1. ***Pakistan* : *The Formative Phase*, 2nd. ed., pp. 72-73;**
***Struggle for Pakistan*, pp. 56-57; *Pathway to Pakistan*, pp. 100-1;**

"جمعیۃ علماء کیا ہے ؟"۔ ص ص ۱۵ - ۱۶ ؛

۲ ۔ ایضاً ، ص ص ۱۵ - ۱۶ ۔

۳ ۔ ایضاً ، ص ۶ ؛ "جمعیۃ علماء کی شرعی حیثیت" ، ص ۱۲ ۔
"مفتی اعظم کی یاد نمبر" ، ص ۱۵ ۔

۴ ۔ "حیات جوہر" ، ص ص ۳۰ - ۳۲ ۔

(نوٹ : اس ایکٹ کے تحت لڑکے کی عمر ۱۸ سال اور لڑکی کی عمر ۱۴ سال مقرر کی گئی تھی ۔ "جمعیۃ علماء کیا ہے ؟" ، ص ۱۵ ۔)

مسلمانان ہند اور برما سے اپیل کی کہ وہ اس کی پروا نہ کریں اور اس کے خلاف شادی بیاہ کرکے اس ایکٹ کے نفاذ کو بے عمل بنا دیں ۔ جمعیۃ علماء کی اس اپیل کا اثر خاطر خواہ برآمد ہوا ۔ کیونکہ اس وقت برما اور ہندوستان میں عامۃ المسلمین مذہبی امور میں جمعیۃ العلماء ہند کی رائے کو بڑی وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے[1] ۔ مسلمانوں نے اس ایکٹ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے شرع کے مطابق اپنے لڑکے اور لڑکیوں کے ازدواجی رشتے طے کیے ۔ "حیات جوہر" نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ مولانا محمد علی نے بھی کہا تھا کہ "شاردا ایکٹ کی مخالفت کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے[2] ۔" جمعیۃ علماء کا اس سلسلے میں یہ موقف تھا کہ ہمارے آئے دن کے آلام و مصائب کی سب سے بڑی وجہ ہماری غلامی اور محکومی ہے ۔ یعنی ہم غیروں کی غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں ۔ اور اغیار ، جو بھی قانون یا اصلاحات اپنے مفاد کے لیے ضروری سمجھتے ہیں اسے محکوموں پر مسلط کر دیتے ہیں ۔ ان خرابیوں سے نجات پانے کا واحد حل یہ ہے کہ ہم مکمل آزادی حاصل کریں[3] ۔

مسلم اور غیر مسلم ، شادی بیاہ کا قانون :

۱۹۳۲ء میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان ، شادی بیاہ کا ایک قانونی مسودہ پیش ہوا ۔ اس مسودے کا مطلب یہ تھا کہ مسلم اور غیر مسلم باہمی شادی کر سکیں اور اسے قانونی تحفظ بھی حاصل ہو جائے ۔ جیسے ہی اس مسودے کی اطلاع جمعیۃ علماء کو ہوئی ، اس نے بعض مسلم ممبران اسمبلی کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اس مسودہ کی مخالفت کریں ۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ اس ناپسندیدہ تجویز کی مخالفت جمعیۃ علماء کے علاوہ کسی مسلم جماعت نے نہیں کی ۔ جمعیۃ نے "اخبار الجمعیۃ" میں اس بل کے خلاف اسلامی نقطۂ نگاہ سے روشنی ڈالی اور اس پر کڑی تنقید کی ۔ اس اخبار کی کاپیاں بھی سرکاری اور غیر سرکاری ممبران کے پاس بھیجی گئیں اور بعض مسلم ممبران کو اس مسودے کی مخالفت کرنے کے لیے آمادہ کیا گیا ۔ مسلم ممبران اسمبلی جن کو جمعیۃ نے اس بل کی مخالفت کے لیے آمادہ کیا تھا ان کے نام معلوم نہ ہو سکے ۔ نیز یہ کہ بل کی خواندگی کے وقت جمعیۃ نے اپنے نمائندوں کو اسمبلی کی روداد سننے کے لیے روانہ کیا ، تا کہ پاس ہونے کے وقت ، مسلم ممبران کی حمایت اور مخالفت کا اندازہ کر سکیں ۔ اس سلسلے میں جمعیۃ کی کوششیں بار آور ہوئیں ۔ اور بعد میں یہ مسودہ واپس لے لیا

---

۱ ۔ "جمعیۃ علماء کیا ہے؟" ، ص ۱۶ ; "جمعیۃ علماء کی شرعی حیثیت" ، ص ۱۲ ؛
"مفتی اعظم کی یاد نمبر" ، ص ۱۵ ۔

۲ ۔ "حیات جوہر" ، ص ۳۲ ۔

۳ ۔ "جمعیۃ علماء کیا ہے ؟" ، ص ۱۶ ۔

کیا۔[1] اس بل کے واپس لے لینے سے مسلمان، مستقبل میں ایک بڑے فتنہ سے محفوظ ہو گئے۔ اس بارے میں شریعت کا حکم واضح اور غیر مبہم ہے کہ غیر مسلم کے ساتھ مسلمان کی شادی ناجائز بلکہ حرام ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں وارد ہے کہ:

"ولا تنکحوا المشرکین حتی یؤمنوا۔ ط"[2]

(ترجمہ: اور عورتوں کو کافر مردوں کے نکاح میں مت دو جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں۔)

حجاج اور زوار کے لیے نیا قانون اور جمعیۃ کا احتجاج:

مصنف "جمعیۃ علماء کیا ہے؟" نے بیان کیا ہے کہ "حکومت برطانیہ کی پالیسی کے تحت حکومت ہند نے حجاج اور زوار کو، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ جانے کی راہ میں مشکلات پیدا کرنے کے لیے بل یعنی قانونی مسودے پیش کیے۔ لیکن ان مسودوں کی تفصیلات مصنف مذکور نے بیان نہیں کیں اور نہ ہی راقم الحروف کو کسی دوسری جگہ سے مل سکیں۔ ان قانونی مسودوں میں ترمیم و اصلاح کے لیے، جمعیۃ علماء ہند نے زر کثیر خرچ کر کے پوسٹر و اشتہارات شائع کرائے اور اس طرح رائے عامہ کو بیدار کر کے، حکومت کو مجبور کیا کہ، یا تو وہ دو مسودوں میں کچھ ترمیمیں قبول کرلے، یا پھر مسودوں کو واپس لے لیا جائے۔ کیونکہ اس طرح کے قوانین مداخلت فی الدین میں شمار ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کی دیگر جماعتوں نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ یا وہ یہ سمجھتی تھیں کہ جمعیۃ کی موجودگی میں، انہیں مذہبی امور کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ کام علماء کے کرنے کا ہے۔ جمعیۃ کے احتجاج اور جد و جہد کے نتیجے میں، حکومت ہند نے قانون کے دو مسودوں میں کچھ ترمیمات کیں۔ اگر تمام مسلم ممبران ان مسودوں کے خلاف ہوتے تو جمعیۃ علماء کی تمام ترمیمات قبول ہو جاتیں[3]۔

۱۔ "جمعیۃ علماء کیا ہے؟"، ص ۱۴۔

۲۔ "القرآن"، سورہ بقرہ، ر۔ ۲۷۔ آیت ۲۲۱ جزو۔ مترجم مولانا اشرف علی تھانوی، لاہور س۔ ن، ص ۵۴۔ (راقم)

۳۔ "جمعیۃ علماء کیا ہے؟" ص‌ص ۱۶ - ۱۷۔
"جمعیۃ علماء کی شرعی حیثیت"، ص‌ص۔ ۱۲ - ۱۳۔
(نوٹ: مصنف یعنی مولانا محمد میاں نے ان مسودوں کو پیش کرنے کا سن تحریر نہیں کیا۔ البتہ ۱۹۳۱ - ۱۹۳۲ء کے اخبارات کے قابل دیکھنے کا مشورہ دیا ہے۔ جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ مسودے بل ۱۹۳۱ء میں ہی پیش ہوئے ہوں گے۔)

اسلام کے معاشرتی قوانین اور علماء :

صوبہ سرحد ، صوبہ پنجاب اور صوبہ بمبئی وغیرہ میں برطانوی عدالتیں ، اسلامی فقہ کو نظرانداز کر کے ، مسلمانوں کے قانون عرف یعنی رسم و رواج کو ترجیح دیتی تھیں جو بسا اوقات غیر اسلامی ہوتا تھا ۔ جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو غیر اسلامی اور شرع کے خلاف فیصلے قبول کرنے پڑتے تھے ۔ مثلاً یہ کہ لڑکیوں کو والدین کے ترکے میں سے کوئی حصہ نہیں ملتا تھا ۔ (حالانکہ فقہ اسلام کے تحت ترکہ میں لڑکیوں کا حصہ مقرر ہے جو مرنے کے بعد ورثاء میں حسب ہدایت فقہ ملنا ضروری ہے)[1] ۔ جمعیۃ نے اس غیر اسلامی رواج کو ختم کرانے کے لیے شریعت بل کے نام سے ایک قانون پیش کروایا ۔ یہ مسودہ مولانا مفتی کفایت اللہ ، صدر جمعیۃ علماء ہند کی رہنمائی میں مرتب کیا گیا ۔ اس بل کا منشاء یہ تھا کہ مسلمانوں پر ، نکاح ، طلاق ، مہر اور ترکہ وغیرہ میں اسلامی شریعت نافذ ہونی چاہیے ۔ سرمایہ داروں اور ارباب ہوا و ہوس نے اس بل کی مخالفت کی ۔ مگر سرحد کی اکثریت اسلام اور مذہب کی وفادار تھی ۔ جمعیۃ اور مسلمانان سرحد کی کوششوں سے ، مخالفت کے باوجود یہ بل پاس ہوگیا ۔ (اس کا ماہ و سن معلوم نہ ہو سکا ۔)[2] اس بل کے پاس ہونے کے بعد اہل پنجاب نے کوشش کی کہ ایسا ہی بل تمام ہندوستان کے لیے پاس ہونا چاہیے ۔ چنانچہ حافظ عبداللہ لائل پوری نے ۱۹۳۵ء میں شریعت بل مرکزی اسمبلی میں پیش کیا[3] ۔ اسمبلی میں پیش ہونے کے بعد بل رائے عامہ معلوم کرنے کے لیے مشتہر کیا گیا ۔ پھر آخری خواندگی کے لیے ستمبر ۱۹۳۷ء میں ایوان میں پیش ہوا ۔ مسٹر جناح نے کچھ ترمیمات پیش کیں اور ایک ترمیم کے تحت "اگر کوئی شخص اپنی مرضی سے چاہے تو وہ مقرر کردہ حاکم کے سامنے اقرار کر کے اپنے اور اپنے بچوں اور آئندہ نسلوں کے اوپر متذکرہ بالا قانون شریعت نافذ کرا سکتا ہے ۔ اس کو ایسا کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا" ۔ اس ترمیم کے ساتھ یہ بل ۱۶ ستمبر ۱۹۳۷ء کو پاس ہوگیا ۔ لیکن اس ترمیم نے اس کی روح کو ختم کر دیا تھا[4] ۔ غرض یہ کہ پھر بھی اس بل کے پاس ہو جانے سے بہت سے مسلمان گناہ کبائر سے نجات پا گئے ۔ اس کا تاسف ہے کہ سرحد کے شریعت بل اور مرکزی اسمبلی کے شریعت بل کے بارے میں دوسرے ماخذ سے تصدیق نہ ہو سکی ۔

---

۱ ۔ "جمعیۃ علماء کیا ہے ؟"، ص ص ۱۷

۲ ۔ ایضاً ، ص ص ۱۷ اور ۵۳-۵۵

۳ ۔ ایضاً ، ص ص ۵۳-۵۶

۴ ۔ ایضاً ، ص ص ۵۳-۵۶

جمعیۃ علماء کا مجموعی رول :

اکابر جمیعۃ" علماء خصوصاً مفتی کفایت اللہ صدر جمعیۃ" اور مولانا حافظ احمد سعید ، ناظم جمعیۃ" نے دور زیر بحث میں ملکی سیاست اور فرقہ وارانہ مسائل کے طے کرنے اور انھیں مسلمانوں کی ضرورت اور شرعی احکامات کے تحت حل کرنے کے لیے بڑی جد و جہد کی ۔ یہ بزرگ ایک طرف تو مسلمانوں کے سیاسی اور مذہبی حقوق کی نگہداشت اور اس کی حفاظت کے لیے ، شب و روز سرگرم عمل تھے اور دوسری طرف ملک کی سب سے بڑی اور پرانی سیاسی جماعت یعنی کانگریس سے افہام و تفہیم کے ذریعہ مسلمانوں کے جائز اور بنیادی حقوق کو منوانے کے لیے کوشاں تھے ۔ اور آپس کے اتحاد اور اتفاق سے ملک میں سیاسی استحکام اور بھائی چارگی یعنی ہندو مسلم اتحادکو فروغ دینا چاہتے تھے ۔ تا کہ اس بھائی چارے اور اتحاد کے نتیجے میں پائیدار سیاسی استحکام اور یک جہتی پیدا ہوسکے ۔

ملک اور مسلمانوں کے مفاد کی خاطر ، جمعیۃ" نے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت ، انتخابات میں مسلم لیگ کے ساتھ نہ صرف سیاسی تعاون کیا ، بلکہ مسلم لیگی امیدواروں کو کامیاب بنانے کے لیے مفتی کفایت اللہ ، مولانا احمد سعید جیسے اکابر نے حتی المقدور کوشش بھی کی ۔ جس کا اعتراف نہ صرف اپنوں بلکہ (حسب تفصیل سابق) غیروں نے بھی کیا ہے ۔ جمعیۃ" کی یہ پرخلوص جد و جہد صوبہ یوپی میں مسلم لیگی امیدواروں کی کامیابی میں ممدو معاون ثابت ہوئی ۔

مجلس احرار اسلام اور کشمیری مسلمان :

مجلس احرار اسلام ۱۹۲۹ء میں قائم ہوئی تھی (جس کی تفصیلات ماسبق میں بیان کی جا چکی ہیں) جمعیۃ" احرار کی تاسیس اور تشکیل میں ، جن لوگوں نے حصہ لیا وہ زیادہ تر علماء تھے ۔ الا یہ کہ بقول چودھری خلیق الزمان، چودھری افضل حق ایک سابق پولیس ملازم تھے ۔ مگر بہت ہی دیانتدار اور بڑی سمجھ بوجھ کے حامل تھے [1] اور ثانیاً غازی عبدالرحمن بھی علماء میں سے نہ تھے ۔ باقی تمام موسسین حضرات میں "مولانا عطا اللہ شاہ بخاری ، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی ، مولانا سید محمد داؤد غزنوی ، مولانا ظفر علی خان ، مولانا عبدالقادر قصوری ، وغیرہ طبقۂ علماء میں سے تھے"[1] ۔ ان کے علاوہ ، بعد میں جو لوگ اس جماعت میں شریک ہوئے یا اس جماعت سے متعلق تھے ان میں زیادہ تر علماء ہی تھے ۔ مثلاً مولانا غلام غوث ہزاروی ۔ اس جماعت کے شرکاء میں

---

۱ ۔ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۶۳۵؛
"پیام مشرق" ، ۱۳ اگست ۱۹۵۳ء ، ص ۲۸ (اداریہ)؛
Pathway to Pakistan, p. 150.

جو لوگ طبقہ علماء میں سے نہ تھے ، ان کا عمل و کردار بھی صالح اور متدین تھا[1] ۔

اسی جذبۂ مساوات و اخوت نے ، احرار اسلام کو کشمیری مسلمانوں کی حالت زار کی طرف متوجہ کیا ، جو کشمیر میں اکثریتی فرقہ ہونے کے باوجود خستہ حالی اور پریشانی میں عسرت کی زندگی بسر کر رہے تھے ۔ انھیں اس مصیبت سے نجات دلانے کے لیے اکتوبر ۱۹۳۱ء میں احرار اسلام نے ڈوگرہ راج کے مظالم کے خلاف ایک تحریک شروع کی، اور کشمیر میں داخل ہو کر مسلمانان کشمیر کے حقوق بحال کرانے کے لیے ، سول نافرمانی کی ۔ اور اپنے ہزاروں رضاکار جیل میں پہنچا دئے[2] ۔ مجلس احرار اسلام کے روح رواں مولانا عطا اللہ شاہ بخاری کو بھی اس تحریک میں ، زیر دفعہ ۱۲۴ الف ایک سال کی قید و بند برداشت کرنی پڑی[3] ۔ حسب بیان سابق ، اس جماعت کا قیام ۱۹۲۹ء میں ہوا تھا ۔ مگر اس میں شریک علماء و دیگر حضرات ملکی سیاست میں تحریک خلافت اور جمعیۃ علماء ہند کی تشکیل کے وقت سے ہی عملی حصہ لے رہے تھے ۔ اور اس نے اپنی تشکیل کے بعد بھی ، اپنا سیاسی مسلک ، جمعیۃ علماء ہند دہلی کی مطابقت میں ہی رکھا ۔ نیز ملک کے سیاسی مفاد اور مسلمانان ہند کے سیاسی اور مذہبی حقوق کے پیش نظر کانگریس کے ساتھ بھی تعاون کیا ۔ لہٰذا کانگریس کے متعصب اور مہاسبھائی ذہنیتوں کے حامل افراد پر تنقید بھی کرتے رہے ، اور اپنے دین متین کی تبلیغ و اشاعت کے لیے شعبۂ تبلیغ بھی قائم کیا ۔ جماعت احرار اسلام نے بیک وقت مندرجہ ذیل امور انجام دیے یعنی سیاست ملکی ، خدمت خلق ، رضاکاروں کی تنظیم ، رد مرزائیت ، مدح صحابہ اور مسجد شہید گنج کی بحالی وغیرہ وغیرہ ۔ احرار اسلام نے مندرجہ بالا امور میں حتی المقدور کوشش کی نیز اپنی مالی و اقتصادی مشکلات کے باوجود جماعت کے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے برابر کوشاں رہی[4] ۔

---

۱ ۔ "تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء" ، ص ص ۳۹۶-۳۹۷؛ "خطبات احرار" ، ص ص ۵۵-۵۷؛ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۵۳۷

۲ ۔ "پیام مشرق" ۱۴ اگست ۱۹۵۴ء ، ص ۲۸ ؛ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۵۳۷

۳ ۔ "بیس بڑے مسلمان" ، ص ۵٦۷

۴ ۔ "خطبات احرار" ، ص ۴۷

باب ہفتم

۱۹۳۶ - ۴۰ء
برصغیر پاک و ہند کی سیاست
اور تحریک پاکستان

فصل اول

مسلم لیگ کی تشکیل نو ، کانگریس ، لیگ کشمکش اور علماء میں اختلاف

مسلم لیگ کی تنظیم نو اور علماء کا تعاون :

۱۹۳۴ء میں مسٹر جناح نے دوبارہ مسلم لیگ کی قیادت سنبھالی ۔ حسب تفصیل سابق ۱۹۱۶ء میں میثاق لکھنؤ کے معمار خصوصی مسٹر جناح تھے ۔ مسٹر جناح اب بھی یہ چاہتے تھے کہ ہندو مسلم اتحاد قائم ہو جائے اور ملک کے تمام باشندے حقوق آزادی کے لیے متحد و متفق ہو کر کام کریں ۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء میں مسٹر جناح نے ، ڈاکٹر راجندر پرشاد سے مصالحت کی گفت و شنید کی ۔ اس گفتگو میں پوری طرح تو کامیابی حاصل نہ ہوئی تاہم انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت ہونے والے انتخابات میں کچھ مقامات پر مسلم لیگ و کانگریس نے آپس میں تعاون کیا[1] ۔

اکتوبر ۱۹۳۵ء میں مسٹر جناح انگلینڈ سے مستقلاً ہندوستان واپس آ کر مسلم لیگ کی تنظیم نو کی طرف متوجہ ہوئے ۔ مسلم لیگ ماقبل سالوں میں کچھ عرصے تک دو گروہوں میں بٹی (تقسیم) رہی تھی ۔ نیز یہ کہ اس کی تنظیم بھی اہل اور مخلص افراد کے ہاتھوں میں نہ تھی ۔ اس لیے وہ اس وقت ایک کمزور اور غیر مؤثر جماعت تھی ۔ مسلم لیگ اور کانگریس ابھی تک صوبائی خود مختاری اور فیڈرل حکومت کے قیام کی تجویز کے قبول کے بارے میں پس و پیش کر رہی تھیں ۔ بالآخر دونوں جماعتیں اس مجوزہ ایکٹ کے تحت

---

1. ***History of The Freedom Movement***, **Board of Editors, vol. 3, pt. 2, Karachi, 1963, p. 316;**
I. H. Qureshi, *The Struggle for Pakistan*, Karachi, 1965, p. 109.

صوبائی انتخابات لڑنے پر آمادہ ہو گئیں ۔ مسلم عوام ابھی تک سیاسی بدنظمی کا شکار تھے۔ مسلم لیگ کا بھی عوام سے خاطر خواہ رابطہ نہ تھا ۔ اس لیے وہ ایک مؤثر سیاسی جماعت نہ تھی ۔ حالانکہ اس الیکشن سے قبل عوام کے ساتھ سیاسی رابطہ قائم کرنا ناگزیر تھا[1] ۔

۱۲ اپریل ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کا اجلاس بصدارت سرسید وزیر حسن ، بمبئی میں منعقد ہوا ۔ اس اجلاس میں مسلم لیگ نے ، اپنی تیس سالہ زندگی میں پہلی مرتبہ عوام سے رابطہ قائم کرنے کی قرار داد پاس کی ۔ جس کے تحت عوام کو پارلیمانی نظام کا مقصد اور انتخابات کے فوائد و نقصانات اور نتائج سے آگاہ اور باخبر کرنا تھا ۔ تاکہ مسلم عوام بھی صوبائی انتخابات میں اپنا مناسب حصہ لے سکیں[2] ۔ اس اجلاس میں مولانا احمد سعید ، ناظم جمعیۃ ہند کی تحریک پر مسٹر جناح کو ایک مرکزی الیکشن بورڈ قائم کرنے کا اختیار دیا گیا ۔ اور اس بات کا بھی مجاز ٹھہرایا گیا کہ مسٹر جناح ، مرکزی پارلیمانی بورڈ کے ممبران خود نامزد کریں ۔ اس مسلم مرکزی پارلیمانی بورڈ کی تشکیل میں دیگر حضرات کے علاوہ علماء بھی شریک تھے ۔ اس جگہ موضوع کی مناسبت سے صرف علماء کرام کے نام ہی بیان کیے جاتے ہیں ۔

مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ میں کل ۵۴ ممبران تھے ۔ جن میں علماء کی تعداد بہ لحاظ صوبہ حسب ذیل تھی :

نام صوبہ	نام رکن	تعداد
یو ۔ پی	مولانا سید حسین احمد مدنی مولانا شوکت علی	۲
سندھ	مولانا محمدصدیق (کذا فی الاصل ، صحیح صادق) ، کھڈہ ، کراچی مولانا حکیم فتح محمد شروانی	۲
پنجاب	مولانا محمد اسحٰق خان مانسہروی مولانا عبدالقادر قصوری ، اور مولوی سید شاہ زین الدین	۳

---

۱ ۔ "تاریخ دستور ہند"، ص ص ۲۳۸ ۔ ۲۳۹ ؛

A. H. Alberuni, *Makers of Pakistan*, Lahore, 1950, p. 210;

"مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۳۵۴ ۔ ۳۵۹ ۔

2. Shamsul Hasan, S., *Presidential Addresses of Mr. M. A. Jinnah*, Delhi, 1945. (October 1937), pp. 3,4.

نام صوبہ	نام رکن	تعداد
شمالی مغربی سرحد	مولانا عبدالرحیم غزنوی ، اور مولانا اللہ بخش یوسفی	۲
بہار	مولانا سجاد پھلواری (کذا فی الاصل ، صحیح بہاری) ، مفتی کفایت اللہ ، اور مولوی عبدالحفیظ	۳
دہلی	مولانا احمد سعید	۱
مدراس	مولانا سید مرتضیٰ بہادر ، صدر خلافت کمیٹی	۱
بنگال	مولانا محمد اکرم خان ، اور مولوی مجیب الرحمٰن	۲
سی - پی	مولوی سید عبدالرؤف شاہ	۱
	کل تعداد	۱۵

صوبہ سی - پی کے مولوی سید عبدالرؤف شاہ سے متعلق یہ امر تصدیق طلب ہے کہ موصوف علماء میں سے تھے - مصنف "نظام نامہ کل ہند جمعیہ علماء اسلام" نے آپ کا شمار مولویوں میں کیا ہے - اس لیے یہاں بھی موصوف کو علماء کے زمرے میں شامل کیا گیا ہے[1] -

1. Rais Ahmad Jafri, Syed, *Rare Documents*, Lahore, 1967, pp. 145-47;
The Struggle for Pakistan. p. 73;
Presidential Addresses of Mr. Jinnah, Oct. 1937, p. 4;
"نظام نامہ کل ہند جمعیۃ علماء اسلام" ، ص‌ص ۳۳-۳۴ -
(نوٹ : مصنف "نظام نامہ کل‌ہند جمعیۃ علماء اسلام" نے نمائندگان کی تعداد ۵۰ بیان کی ہے - جبکہ مرتب ، "مسٹر جناح کے خطبات" نے کل نمائندگان کی تعداد ۳۵ بیان کی ہے - اور لکھا ہے کہ ۵۳ کی تعداد سے کم نہ ہوں - اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ممبران کی تعداد ۳۵ سے زیادہ ہو سکتی ہے -)

مزید برآں مسلم لیگ مرکزی پارلیانی بورڈ نے ایک قرار داد منظور کی ، جس کے تحت جمعیۃ علماء ہند اور مجتہدین کو مسلمانان ہند کے مذہبی اور شرعی امور کا نگران اور حافظ تسلیم کیا گیا ۔ اصل عبارت حسب ذیل ہے :

"To protect religious rights of Musalmans in which connection for all matters of purely religious character, due weight shall be given to opinions of the Jamiat-Ulama -i-Hind and the Mujtahids[1]."

مسلم لیگ مرکزی پارلیانی بورڈ کے اجلاس میں دیگر جماعتوں کے علاوہ جمعیۃ علماء ہند اور مجلس احرار اسلام کے نمائندوں نے بھی شرکت کی ۔ اس پارلیانی بورڈ نے اپنا ایک منشور بھی شائع کیا ۔ جس کے خاص خاص نکات حسب ذیل ہیں :

"۱ ۔ ملک سے تمام جابرانہ قانون منسوخ کرائے جائیں گے ،

۲ ۔ ملک سے انتظامیہ کے گرانبار اخراجات کو کم کرایا جائے گا ،

۳ ۔ فوج کو قومیا کر ، فوجی اخراجات کو کم کرایا جائے گا ،

۴ ۔ ملک میں دیسی صنعت و حرفت کی ہمت افزائی کی جائے گی اور اسے ترقی دی جائے گی ،

۵ ۔ سکہ و شرح تبادلہ کا خیال رکھا جائے گا ،

۶ ۔ دیہی آبادی کو سماجی ، تعلیمی اور اقتصادی ترقی دی جائے گی ،

۷ ۔ مسلمانوں کے مذہب ، زبان اور حروف کی حفاظت کی جائے گی ، اور

۸ ۔ ملک میں صحت مند سیاسی بیداری پیدا کی جائے گی"۔ وغیرہ وغیرہ[2]

۸ تا ۱۰ جون ۱۹۳۶ء ، آل انڈیا مسلم لیگ مرکزی پارلیانی بورڈ کا اجلاس بمقام لاہور بصدارت مسٹر جناح منعقد ہوا ۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر اقبال اور علماء ہند کے

---

1. *The Struggle for Pakistan*, pp. 73-74;
"النظام للامہ کل ہند جمعیۃ علماء اسلام" ، ص ۳۵ ۔

2. *The Struggle for Pakistan*, pp. 73-74;
"مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ص ۴۵۸ - ۴۵۹ ۔

نمائندے بھی شریک تھے - چار دن کی بحث و تمحیص کے بعد مرکزی پارلیمانی بورڈ کے اصول و ضوابط ، منشور اور دستور العمل منظور ہوئے - جس کے خاص خاص نکات حسب ذیل ہیں :

۱ - انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء ناقص اور غلط ہے ، اور لیگ اس کی ترمیم کا مطالبہ کرتی ہے -

۲ - صوبائی خود مختاری کی اسکیم بھی ناقص ہے اور اس کی ترمیم ضروری ہے - لیکن صوبائی خود مختاری کے نظام کو قبول کرکے چلانا چاہیے -

۳ - کمیونل اوارڈ ہی کو لیگ قبول کرتی ہے - اس وقت تک جب تک کسی معاہدہ بین الاقوامی کے ذریعہ اس کا بہتر بدل پیدا کیا جا سکے -

۴ - آل انڈیا فیڈریشن اسکیم کو لیگ سختی کے ساتھ رد کرتی ہے اور بنیادی اور اساسی طور پر اس کے خلاف ہے اور اس کو کبھی قبول نہیں کرے گی -

۵ - مسلم لیگ ۱۹۱۶ء کے لیگ کانگریس ، لکھنؤ پیکٹ کے مطابق کانگریس سے ایک فریق اور پارٹی کی حیثیت سے معاہدہ کرنا چاہتی ہے - لیکن کسی حال میں مسلم قوم کی جداگانہ تنظیم اور جداگانہ انفرادیت کو کم کرنے کی روادار نہیں ہوگی -

۶ - جداگانہ انتخاب کی بنیاد پر جداگانہ مسلم پارٹی کا قیام ضروری ہے - لیکن مسلم لیگ کسی گروپ یا گروہوں سے جن کے اغراض و مقاصد آل انڈیا مسلم لیگ سے قریب تر ہیں ، تعاون کرنے کے لیے آزاد ہے -

۷ - مسلم لیگ مسلمانان ہند سے اپیل کرتی ہے کہ وہ اقتصادی یا کسی دوسری بنیاد پر مسلمانوں سے کسی کو ناجائز استفادہ کرنے ، ان میں پھوٹ ڈالنے کا موقعہ نہ دیں - اور اقتصادی یا کسی طبقاتی سوال پر ملت اسلامیہ کو کسی طرح شکست نہ ہونے دیں[۱]"

مسلم لیگ نے جمعیۃ علماء ہند اور دیگر مسلم جماعتوں کی شرکت و مدد سے صوبائی انتخابات میں حصہ لیا - جمعیۃ علماء نے مسلم لیگ کے امیدواروں کو کامیاب بنانے کے لیے

---

۱ - "انتظام نامہ کل ہند جمعیۃ علماء اسلام" ، ص ص ۳۳-۳۴ -

انتھک کوششیں کیں ۔ بلکہ مولانا سید حسین احمد مدنی نے تو یہاں تک فرما دیا تھا کہ جو شخص (مسلمان) مسلم لیگ کے خلاف کام کرے گا یا مسلم لیگ کے امیدوار کو ووٹ نہ دے گا وہ ''و من شذ شذ فی النار'' کی حدیث کے مطابق واصل جہنم ہوگا ۔ (مزید تفصیلات کے لیے ما سبق صفحہ ۳۲۴ دیکھیے) جمعیة علماء کی اس جد و جہد کے نتیجے میں ، عوام سے کم رابطگی کے باوجود مسلم لیگ کے امیدواروں کو انتخابات میں امید سے زیادہ کامیابی ہوئی[1] ۔

مندرجہ ذیل اعداد و شمار صوبائی انتخابات کے جماعتی نتائج کو ظاہر کرتے ہیں :-

نام صوبہ	نام جماعت	نشستوں کی تعداد
بنگال	مسلم لیگ	۴۰
"	مسلم آزاد	۴۲
"	دیگر مسلمان	۳۸
پنجاب	مسلم لیگ	۲
"	دیگر مسلم	۲
"	یونینسٹ	۸۸
آسام	مسلم لیگ	۹
"	آسام ملی مسلم	۵
"	آزاد مسلم	۹
"	سرما ویلی مسلم	۵
سندھ	مسلم لیگ	×
"	سندھ یونائیٹڈ پارٹی مسلم	۱۸
"	آزاد مسلم	۹

۱ ۔ ''نظام نامہ کل ہند جمعیة علماء اسلام'' ، ص‌ص ۳۰ - ۳۱ ۔

(نوٹ : حدیث بالا کا مطلب یہ ہے کہ ، جو جماعت سے علیحدہ ہو گیا ، وہ جہنم میں دھکیل دیا جائے گا ۔)

سندھ	سندھ مسلم پارٹی	۳ (۱)
یوپی	آزاد مسلم	۲۸
,,	کانگریسی مسلم	۱ (۲)

علاوہ ازیں سی - پی ، اڑیسہ اور بمبئی وغیرہ میں بھی مسلم لیگی امیدوار کامیاب ہوئے - ڈاکٹر عبدالحمید کے بیان کے مطابق سی - پی ، اڑیسہ اور بمبئی میں کانگریس کے ٹکٹ پر کوئی مسلم امیدوار کامیاب نہیں ہوا[3] - کانگریس بر صغیر کی قدیم اور مضبوط سیاسی جماعت تھی نیز عرصہ دراز سے بڑے منظم طریقے پر عوام سے اپنا رابطہ بھی قائم کیے ہوئے تھی چنانچہ اس نے صوبائی انتخابات میں غیر مسلم نشستوں پر بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی - انتخابات کے نتیجے میں یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو صوبائی خود مختاری عمل میں آئی - مگر کانگریس نے اپنے چھ اکثریتی صوبوں میں وزارتیں قائم کرنے سے انکار کر دیا - دیگر پانچ غیر کانگریسی صوبوں میں یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو ہی وزارتیں قائم ہو گئیں - کانگریس کا یہ مطالبہ تھا کہ ہمیں اس بات کا یقین دلایا جائے کہ گورنر صاحبان انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت حاصل شدہ خصوصی اختیارات ، اشد ضرورت کے بغیر استعمال نہیں کریں گے - اور حکومت ہمیں اس سلسلے میں جب تک مطمئن نہیں کرے گی - اس وقت تک ہم وزارتیں قبول نہیں کریں گے - اس مسئلے نے طول کھینچا - آخرکار مسٹر گاندھی اور لارڈ لنلتھ گو کے مابین ایک شریفانہ معاہدہ (Gentle-men's Agreement) ہوا - جس کے نتیجے میں جولائی ۱۹۳۷ء میں کانگریس نے بھی چھ صوبوں میں وزارتیں سنبھال لیں[4] - غیر کانگریسی پانچ صوبوں یعنی پنجاب ، سندھ ،

---

1. *The Struggle for Pakistan*, pp. 81-83.
2. *Ibid.*, pp. 84-85 ; R. Coupland, *Report on the Constitutional Problem in India*, pt. 2, pp. 110-11.
3. Abdul Hamid, *Muslim Separatism in India : A Brief Survey (1858-1947)*, reprint 1971, p. 215.
4. *Ibid.*, p. 215.
5. *Muslim Separatism in India : A Brief Survey*, p. 216;
A History of the Freedom Movement, vol. 3, pt. 2, pp. 312-15;
The Struggle for Pakistan, p. 78;
"نظام نامہ کل ہند جمعیۃ علماء اسلام" ، ص ۹۰ -
(نوٹ : کے - کے - عزیز نے کانگریسی صوبوں کی تعداد آٹھ بیان کی ہے - مگر اصل میں چھ صوبوں میں کانگریس وزارتیں قائم ہوئیں -
K. K. Aziz, *The Making of Pakistan : A Study in Nationalism*, London, 1967, p. 48).

شمال مغربی سرحد اور آسام میں یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو ہی وزارتیں قائم ہوگئی تھیں[1] ۔

فصل دوم

کانگریسی وزارتیں اور مسلم لیگ سے مخالفت

انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت ہونے والے صوبائی انتخابات میں ، مسلم لیگ اور کانگریس نے کچھ مقامات پر باہمی تعاون اور ہمدردی کا اظہار کیا ۔ مگر یہ تعاون و اتحاد صرف وقتی اور عارضی ثابت ہوا ۔ چونکہ انتخابات کے نتائج نے اس تعاون کو نہ صرف ختم کر دیا ۔ بلکہ کانگریس کو چھ صوبوں میں بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل ہو جانے کے بعد ، کانگریسی سیاست نے اپنا رخ ہی دوسری جانب متعین کر لیا ۔ منجملہ دیگر علل و اسباب کے علاوہ ، اس اتحاد کو صدمہ اور ٹھیس پہنچانے میں ڈاکٹر انصاری کی وفات (۱۰ مئی ۱۹۳۶ء) بھی ایک وجہ تھی ۔ چونکہ مرحوم ابتداء ہی سے ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے ۔ نیز کانگریسی حلقوں میں موصوف کی بڑی عزت و تکریم تھی ۔ علاوہ ازیں مندرجہ ذیل عوامل بھی اتحاد و تعاون کو ختم کرنے میں بڑی اہمیت کے حامل تھے :-

۱ ۔ کانگریس میں مہاسبھائی ذہنیتوں کے افراد کا غلبہ ۔

۲ ۔ گاندھی جی کا انتخابات کے بعد اعلان ، کہ برِ صغیر میں صرف ایک ہی سیاسی پارٹی ہے ۔

۳ ۔ جواہر لال نہرو کا بیان کہ ملک میں صرف دو پارٹیاں یعنی کانگریس اور حکومت ہیں ۔

۴ ۔ انتخابات میں کامیابی کے نشے میں کانگریس کا اپنے تمام وعدے وعیدوں سے انحراف ۔

غرض یہ کہ ان مندرجہ بالا عوامل کی بناء پر مسلم لیگ اور کانگریس کے اختلافات کی بنیاد پڑی[2] ۔

---

1. *Muslim Separatism in India : A Brief Survey*, p. 216.

2. *Ibid.*, pp. 216-17; R. Coupland, p. 179;

"مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ص ۳۵۹ - ۳۶۰؛

"الجمعیۃ" ، ۱۲ مئی ۱۹۳۶ء ، ص ۲ ، ک ۱ - ۲ -

حسب تفصیل سابق کانگریس نے جولائی ۱۹۳۷ء میں چھ صوبوں میں وزارتیں قائم کیں ۔ اس کے بعد صوبہ یوپی میں مسلم لیگ اور کانگریس کے مابین کولیشن (Coalition) یعنی مخلوط حکومت بنانے کی گفت و شنید شروع ہوئی ۔ اس گفتگو میں مسلم لیگ کی جانب سے چودھری خلیق الزمان اور نواب محمد اسماعیل خان اور کانگریس کی جانب سے پنڈت جواہر لال نہرو ، مولانا آزاد اور پنڈت گوبند بلبھ پنت شریک تھے[1] ۔

کانگریس کی آمریت :

کانگریس ورکنگ کمیٹی نے مارچ ۱۹۳۷ء میں ایک پارلیمانی سب کمیٹی مقرر کی ۔ اس کمیٹی میں مولانا آزاد، راجندر پرشاد اور ولبھ بھائی پٹیل شریک تھے[2] ۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اس سب کمیٹی کو بڑے وسیع اختیارات سپرد کیے تھے ۔ مثلاً آئینی امور میں صوبائی حکومتوں کو ہدایت اور رہنمائی کرنا ۔ کانگریس پارلیمانی پارٹی سے قریبی روابط قائم کرنا ۔ کسی بھی ایمرجنسی (خصوصی حالات) میں مناسب اور ضروری کارروائی عمل میں لانا ۔ صوبائی وزراء کا تقرر اور تنزل کرنا ۔ صوبائی کابینہ کے تمام آئینی اور انتظامی امور کا محاسبہ اور کنٹرول کرنا ۔ نیز صوبائی وزراء اور ممبران اسمبلی بھی اس کمیٹی کے سامنے جواب دہ تھے ۔ اور یہ سب کمیٹی صوبائی وزیر اعلیٰ کو بھی حسب ضرورت ہدایات جاری کر سکتی تھی ۔ مختصر یہ کہ کانگریس نے ، ورکنگ کمیٹی اور پارلیمانی سب کمیٹی کو اختیارات اعلیٰ (ہائی کمانڈ) سپرد کر دی تھی[3] ۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی نے اس سب کمیٹی کے ایک رکن مولانا آزاد کے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''مولانا کو بنگال ، یوپی ، پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبہ کا مختار کار مقرر کیا گیا تھا ۔'' بقول ڈاکٹر قریشی صاحب ایک مسلمان اکثریتی یا مسلم صوبوں کا نگران اور ذمہ دار ٹھہرایا گیا[4] ۔

کانگریس پارلیمانی پارٹی کے رکن مولانا ابوالکلام آزاد اور صوبہ یو ۔ پی میں مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کے ارکان چودھری خلیق الزمان اور نواب محمد اسمعیل خان کے درمیان ،

---

۱ ۔ ''انظام نامہ کل ہند جمعیۃ علماء اسلام'' ۔ ص ص ۔ ۳۶ ۔ ۳۷

2. *The Struggle for Pakistan*, p. 96.

3. *Ibid.*, p. 96 - 97.

(نوٹ : یہ امر بالکل واضح ہے کہ صوبہ یو ۔ پی کا شمار مسلم اکثریتی یا مسلم صوبوں میں نہیں ہو سکتا) ۔

4. *Ibid.*, p. 96.

کولیشن (مخلوط) حکومت بنانے کے سلسلے میں ۲۷ جون ۱۹۳۷ء سے گفت و شنید شروع ہوئی جو طول طویل بحث و مباحثے کے بعد امید و بیم کے عالم میں ختم ہوگئی[1] - اسی درمیان میں ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس نے اس گفت و شنید کو مزید نا کامیابی سے ہمکنار کیا - وہ یہ کہ حافظ محمد ابراہیم ، مسلم لیگ کے ٹکٹ سے صوبہ یو - پی کے ممبر منتخب ہوئے تھے (حافظ صاحب مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے برادر نسبتی تھے)۔ حافظ صاحب نے "مولانا حسین احمد مدنی کی منظوری سے کانگریس پلیج (عہد نامہ) پر دستخط کر دیے اور بلا شرط و معاہدہ کانگریس کی تائید و حمایت کا اعلان کرکے منسٹری قبول کر لی[2]"۔ حافظ صاحب کی مسلم لیگ سے معاہدہ شکنی اور کانگریس سے خفیہ معاہدے کے بارے میں عبدالوحید خاں صاحب (سابق وزیر اطلاعات) کی کتاب "تقسیم ہند" میں مولانا احمد سعید کا ۲ ستمبر ۱۹۳۷ء کا ایک عکسی مراسلہ شائع ہوا ہے - اس عکسی مراسلے میں تحریر ہے کہ حافظ ابراہیم نے مولانا آزاد سے ایک خفیہ معاہدہ کیا تھا اور اس کے بعد کانگریس میں شرکت کی - اور مولانا حسین احمد مدنی کے ایماء سے کانگریس کے پلیج یا عہد نامے پر دستخط کیے[3]۔

مولوی طفیل احمد منگلوری کے بیان کے مطابق حافظ محمد ابراہیم نے مئی ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ سے استعفیٰ دے کر علیحدگی اختیار کرلی[4] - جولائی ۱۹۳۷ء میں کانگریس نے وزارتیں سنبھالیں تو یو - پی میں حافظ محمد ابراہیم کو وزیر مقرر کیا گیا - حافظ صاحب کے وزارت قبول کرنے پر مسلم لیگ نے اصرار کیا کہ حافظ صاحب صوبائی اسمبلی کی نشست پر مسلم لیگ کے ٹکٹ سے کامیاب ہوئے ہیں ، اس لیے اب صوبائی ممبری سے بھی استعفیٰ دیں اور دوبارہ الیکشن لڑیں - لہٰذا حافظ صاحب نے صوبائی اسمبلی کی نشست سے استعفیٰ دے کر اکتوبر ، نومبر ۱۹۳۷ء میں ضمنی انتخاب لڑا اور کامیاب ہوئے - یہ انتخاب دونوں جماعتوں یعنی کانگریس اور مسلم لیگ کے وقار کا مسئلہ تھا - اور دونوں جماعتوں نے بڑی کوشش کی - مگر مولانا حسین احمد مدنی اور حافظ صاحب کے ذاتی اثرات سے ، حافظ صاحب اس ضمنی انتخاب میں کامیاب ہوگئے - حافظ صاحب ممبری سے استعفیٰ دینے کے بعد بھی وزیر رہے[5] -

---

1. *Pathway to Pakistan*, pp. 173-185.

۲ - "الظام نامہ کل ہند جمعیۃ اسلام"، ص ۴۸؛
"مسلمانوں کا روشن مستقبل" ص ص ۳۶۳ - ۳۶۴ -

۳ - عبدالوحید خاں ، "تقسیم ہند" ، کراچی ، ص ص ۱۷۶-۱۷۷ -

۴ - "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۳۶۴ -

5. *Pathway to Pakistan*, pp. 176-77;

"مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ص ۳۶۴-۳۶۵ -

مسلم لیگ اور کانگریس کی بناء مخالفت :

چودھری خلیق الزماں نے بیان کیا ہے کہ کانگریس وزارتیں قائم ہونے کے بعد ، مولانا آزاد ۱۳ جولائی ۱۹۳۷ءکو میرے (چودھری صاحب کے) پاس آئے اور دوران گفتگو مولانا نے ، مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کے رویے اور طریقہ کار کے متعلق دریافت کیا اور کہا کہ ''اگر حکومت اور کانگریس کے درمیان کسی معاملے پر کشیدگی ہو جائے اور کانگریس وزارتوں سے مستعفی ہو تو مسلم لیگ ایسی صورت میں ہمارا ساتھ دے گی یا نہیں؟ چودھری صاحب نے جواباً کہا ؛ کہ ہم مناسب اور جائز امور میں کانگریس کی اخلاقی تائید اور حمایت کریں گے ۔ اس کے بعد مولانا آزاد ۱۵ جولائی ۱۹۳۷ء کو دوبارہ لکھنؤ آئے اور دو صفحوں کا ٹائپ شدہ نوٹ چودھری صاحب کو دیا ۔ جس میں کانگریس کے ساتھ مخلوط حکومت بنانے کی شرائط درج تھیں ۔ مولانا آزاد نے اس نوٹ پر ، چودھری صاحب سے دستخط کرنے کو کہا ۔ مگر چودھری صاحب نے ایسے قابل اعتراض سمجھ کر دستخط نہ کیے[1] ۔ کوپ لینڈ نے کانگریس کی وہ شرائط درج کی ہیں جن کے تحت کانگریس مسلم لیگ کے ساتھ مفاہمت کرنا چاہتی تھی :

''۱ ۔ مسلم لیگ گروپ صوبہ یو ۔ پی کی اسمبلی میں بہ حیثیت ایک علیحدہ گروپ کام نہ کرے ،

۲ ۔ مسلم لیگ گروپ کے صوبائی ممبران ، کانگریس کا ایک حصہ بن جائیں ،

۳ ۔ تمام مسلم ممبران اسمبلی کانگریس ورکنگ کمیٹی کی ہدایات و احکام پر عمل کریں ،

۴ ۔ اسمبلی کے باہر مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ توڑ دی جائے اور آئندہ انتخابات میں بھی مسلمان کانگریس کے ٹکٹ پر کھڑے ہوں ،

۵ ۔ تمام مسلمان ممبران کانگریس ڈسپلن کی پابندی کریں ، اور

۶ ۔ اگر کانگریس اسمبلی سے استعفیٰ دے تو تمام مسلم ممبران بھی استعفیٰ دیں''[2]۔

---

1. *Pathway to Pakistan*, pp. 160-61.

2. R. Coupland, pt. 2, p. 111;

''نظام نامہ کل ہند جمعیۃ علماء اسلام'' ۔ ص ص ۳۶-۳۷ ۔

(نوٹ : افسوس ہے کہ مسلم لیگ اور کانگریس کی اس گفت و شنید میں جمعیۃ علماء یا ''الجمعیۃ'' کا کوئی واضح کردار سمجھا نہ ہو سکا ۔)

کانگریس کی مندرجہ بالا چھ شرائط کا فطری اور لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مستقبل میں مسلم لیگ اور دیگر مسلم جماعتیں ختم ہو جائیں ۔ مزید یہ کہ کانگریس نے 'انا ولا غیری' کا نعرہ بلند کیا اور کہا کہ برصغیر میں اس کے سوا کسی دیگر سیاسی جماعت کا وجود ہی نہیں ہے ۔ دوسری طرف کانگریس کی شرائط مسلم قوم کی عزت اور خود مختاری کے نہ صرف منافی تھیں ۔ بلکہ مسلم قوم کی عزت اور انفرادیت کو بیچ کر دینے کے مترادف تھیں ۔ اس لیے مسلم لیگ نے انھیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا[1] ۔

حسب تفصیل سابق ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کی تنظیم نو کے بعد مسلمان ''من حیث القوم'' زیادہ منظم و متحد ہوگئے تھے ۔ اور ان کا قومی مطمح نظر زیادہ واضح اور متعین ہوگیا تھا ۔ مسلم سیاست میں اس انقلاب کے بعد ملکی سطح پر اب سیاسی تعاون اور اتحاد کی واحد شکل یہی تھی کہ کانگریس اور مسلم لیگ مل کر کام کریں ۔ اور ۱۹۳۵ء کی اصلاحات کے ماتحت مل کر صوبائی حکومتیں قائم کریں ۔ مگر مسلم لیگ کی یہ امید موہوم اس وقت ختم ہوگئی جب کہ کانگریس نے ، یو پی اسمبلی میں شرکت کے لیے مندرجہ بالا چھ شرائط پیش کیں ۔ جو کسی حالت میں بھی قابل قبول نہ تھیں ۔ اب جب کہ نہ صرف یو پی بلکہ تمام کانگریسی صوبوں میں مسلمانوں کو ''من حیث القوم'' نظر انداز کرکے خالصتاً کانگریس وزارتیں قائم کر لی گئیں ، تو مسلم لیگ کے لیے مسلم جمہور کو منظم و متحد کرکے ایک پلیٹ فارم پر لانا ناگزیر ہوگیا[2] ۔

یوں تو کانگریس ان انتخابات میں ایک عظیم پارلیمانی پارٹی کی حیثیت سے ابھری تھی ۔ لیکن اس کی ہیئت ترکیبی میں ایک بنیادی کمزوری یہ تھی کہ مسلم انتخابی حلقوں میں اسے بین طور پر ناکامی ہوئی تھی ۔ اس طرح وہ نہ تو پورے ملک کی نمائندگی کا دعویٰ کر سکتی تھی اور نہ صحیح معنوں میں اپنے آپ کو ایک ''قومی جماعت'' کہہ سکتی تھی ۔ اس کمزوری کا مداوا یہی ہو سکتا تھا کہ صوبائی وزارتوں کی تشکیل میں کانگریس پارٹی ، ایسی مسلم جماعتوں یا گروہوں سے الحاق کرتی ، جن کو مسلم عوام کی واقعی تائید حاصل ہو ، لیکن کانگریس نے فتح کے نشے میں ایسا نہیں کیا ۔ بلکہ برسراقتدار آ کر ، حکومت کے زعم میں ملت اسلامیہ اور مسلمانوں کے انفرادی وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ۔ طرفہ تماشا یہ کہ ایک طرف تو کانگریس اپنے اکثریتی صوبوں میں کسی مسلم جماعت سے من حیث الجماعت الحاق کرنے کے لیے تیار نہ تھی ۔ اور دوسری طرف جن صوبوں میں

---

۱ ۔ ''انتظام نامہ کل ہند جمعیۃ علماء اسلام'' ، ص ۴۷ ۔

2. ***Mr. Jinnah's Presidential Address,*** Oct. 1937, p.6;

''کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلے'' ، ص ۲۹ ؛

''انتظام نامہ کل ہند جمعیۃ علماء اسلام'' ، ص ص ۴۲ - ۴۵ ۔

کانگریس اقلیت میں تھی وہاں کانگریس پارلیمانی پارٹی کو دوسرے گروہوں سے الحاق کرنے کی پوری چھوٹ تھی ۔ چنانچہ پنجاب اور سندھ میں کانگریس نے وقتاً فوقتاً سخت رجعت پسند گروہوں کے ساتھ سمبندھ بالدھا[1] اور اس پالیسی کے معمار خود مولانا آزاد ہی تھے ۔

مزید برآں کانگریس نے انتخابات میں غیر معمولی کامیابی کے نشے و غرور میں اپنے ہی معاون اور ہمدردوں کو بھی فراموش کرنا شروع کر دیا ۔ اس سلسلے میں ایک اہم واقعہ یہ پیش آیا کہ ۱۷ تا ۱۹ اپریل ۱۹۳۷ء کو مجلس احرار اسلام کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہو رہا تھا ۔ اس اجلاس میں شرکت کے لیے مسٹر کرپلانی ، سکریٹری کانگریس کو مدعو کیا گیا ۔ مسٹر کرپلانی نے جواب دیا کہ میں بوجہ علالت شریک جلسہ نہیں ہو سکتا اور اگر میں تندرست بھی ہوتا تو تب بھی شریک نہ ہوتا کیونکہ مجلس احرار اسلام ایک فرقہ وارانہ جماعت ہے[2] ۔ اس کے جواب میں مولانا مظہر علی اظہر نے اپنے صدارتی خطبہ ۱۹۳۷ء منعقدہ لکھنؤ میں کہا کہ ۱۹۱۸ء کے آخری ایام سے ہی ، جب کہ مجلس احرار نہ تھی، تو ہمارے کارکن قومی آزادی کی تحریکوں میں برابر سرگرم عمل رہے اور آج تک سرگرم عمل چلے آ رہے ہیں ۔ "مجلس احرار کے قیام کے وقت کانگریس سے کوئی اختلاف نہ تھا ۔ بلکہ ہمارے بہترین کارکن ۱۹۳۰ء کی تحریک میں قید کاٹ چکے ہیں ۔ جن میں سے سید عطا اللہ شاہ بخاری ، مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی ، چودھری افضل حق ، اور شیخ حسام الدین کے نام بیان کر دینا مناسب ہے ۔ اس کے علاوہ ہمارے رضاکاروں نے تحریک سول نافرمانی میں حصہ لیا[3]" ۔

مرتب "خطبات احرار" ، شورش کاشمیری نے احرار کے اختلاف اور ہندوؤں کی الزام تراشی کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ اگر ہم نہرو رپورٹ کے فارمولے کو تسلیم کر لیں اور اس میں کوئی متبادل صورت ہمیں قابل قبول نہ ہو تو ہم قوم پرستی کے دلدادہ ۔ "لیکن اگر پنجاب کے ہندو اور سکھ رہنما جنھوں نے نہرو رپورٹ کے پنجاب والے فارمولے پر دستخط کیے تھے ۔ اپنے تحریری معاہدے سے بے زاری کا اظہار کریں اور اس کی اعلانیہ مخالفت کریں تو ان کی قوم پرستی میں کوئی فرق نہیں آتا[4]" ۔

---

1. ***Muslim Separatism in India : A Brief Survey*, p. 217.**

۲ ۔ "خطبات احرار" ، ص ۱۳۲ ؛ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ۶۱۳ ؛ "تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء" ، ص ۳۹۷ ۔

۳ ۔ "خطبات احرار" ، ص ص ۱۳۳ - ۱۳۵ ۔

۴ ۔ ایضاً ، ص ۱۳۷ ۔

ان زعماء کو جو بعد میں احرار اسلام کے موسس بنے ، کانگریس سے اس وقت اختلاف ہوا جب مہاتما گاندھی نے کلکتے میں کنونشن کے وقت یعنی ۱۹۲۸ء میں مسلمانوں کے وفد سے ملاقات کی ۔ اس وفد کے امیر مسٹر جناح تھے اور مولانا مظہر علی اظہر رکن وفد تھے ۔ اس وفد نے (حسب تفصیل سابق) مہاتما گاندھی اور دوسرے ہندو لیڈروں سے کہا کہ :

"نہرو رپورٹ کے فارمولوں میں اس قدر ترمیم کر دیجئے کہ اگر حکومت برطانیہ حق رائے دہی بالغان کو تسلیم نہ کرے تو پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کے لیے آبادی کے تناسب سے نشستیں مخصوص کر دی جائیں ۔ لیکن مہاتما گاندھی حق رائے دہی بالغان کے سوائے کسی اور معیار رائے دہی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے" ۔

اور انھوں نے فرمایا کہ :

"میں کسی متبادل تجویز کا تصور نہیں کر سکتا"[۱] ۔

سطور بالا میں احرار و کانگریس کی مخالفت کا سبب ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ میں ترمیم پیش کرنا بیان کیا ہے ۔ راقم الحروف کی رائے میں یہ سبب خالصتاً اس کی مخالفت کا باعث نہیں ہو سکتا ۔ کیوں کہ اس وقت تو مجلس احرار کا قیام بھی عمل میں نہیں آیا تھا ۔ البتہ اتنی بات ضرور سمجھ میں آتی ہے کہ مجلس احرار کے قیام سے قبل کچھ زعماء نے جو بعد میں موسیسین بنے، اس وقت نہرو رپورٹ میں ترمیم کا مطالبہ کیا تھا ۔ اور شاید یہی عمل کرپلانی صاحب کے ذہن میں اس وقت سے موجود ہو ۔ چونکہ اب تک انھیں کوئی موقع اس بات کا نہ مل سکا ہو کہ وہ اپنے ذہن کی تنگ نظری یا عصبیت کو ظاہر کریں ۔ لیکن اب جب کہ مجلس احرار نے خود انھیں اپنے اجلاس میں شرکت کی دعوت دی تو انھوں نے اپنے دیرینہ عناد و غبار کو نکال کر اپنا نفس یا غصہ اس طرح ٹھنڈا کیا کہ مجلس احرار کو ہی فرقہ پرست جماعت قرار دے دیا ۔

ایک دوسری وجہ یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ مجلس احرار کے لیڈروں نے مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ میں شرکت کی تھی ۔ ممکن ہے ان کی یہ شرکت کرپلانی صاحب کی نظر میں احرار کو فرقہ پرست جماعت قرار دینے کی ایک دلیل یا حجت ہو ۔

---

۱ ۔ "خطبات احرار" ، ص‌ص ۱۳۵ - ۱۳۶ ۔

غرض یہ کہ کانگریس نے اقتدار سنبھالنے کے بعد، اپنوں اور غیروں سے بھی آنکھیں پھیر لیں ۔ اور ہندو راج قائم کرنے کے لیے راستہ ہموار کرنا شروع کیا ۔ نیز مسلم آزاری کا ظاہر و باطن سامان پیدا کیا ۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل عوامل بڑی اہمیت کے حامل ہیں :

۱ ۔ کانگریس کے ممبران انتظامیہ پر کنٹرول کر کے انھیں اپنی مرضی کے مطابق چلانا چاہتے تھے تا کہ من مانی کاروائی کر سکیں ۔ اور اس کنٹرول کو اصلاح کے نام سے موسوم کرتے تھے ۔

۲ ۔ چیف سکریٹری، یوپی نے ایک خط ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو لکھا ۔ جس میں ہدایت تھی کہ ضلعی حکام اور کانگریسی رہنماؤں کے مابین اعتماد اور یقین کا رشتہ ہونا چاہیے اور کانگریسی ورکرز کی شکایات، خصوصاً نچلے درجے کے گورنمنٹ ملازمین کے متعلق، متعلقہ سکریٹریوں تک پہنچائی جائیں ۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کانگریس نے ایک مقابل انتظامی ڈھانچہ قائم کر رکھا تھا ۔ جس کا کام سرکاری ملازمین اور ان کی جا و بے جا شکایات اضلاع کے سکریٹریوں تک پہنچانا تھا ۔

۳ ۔ مسلم دشمنی کا عملاً ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ "بندے ماترم" کو بہ حیثیت ایک قومی ترانہ منظور کیا ۔ اور گاندھی جی کی شبیہ کو جھک کر سلام کرنا لازمی قرار دیا ۔ (جمعیۃ علماء ہند اور خصوصاً مولانا سجاد بہاری نے گاندھی ازم کی تعلیمات کو اسلامی کلچر اور اسلامی تہذیب کے خلاف قرار دیا[۱] ۔ چونکہ مسلمانوں کے نزدیک کسی بڑے سے بڑے پیغمبر یا نبی یا ولی کی شبیہ کو بھی جھک کر سلام کرنا ناجائز بلکہ حرام ہے ۔ اس عمل سے مسلمانوں کو روحانی صدمہ پہنچا ۔

۴ ۔ کچھ اضلاع میں "کانگریسی پولیس اسٹیشن" قائم کیے گئے ۔ کانگریسی ورکرز نے اپنے ذاتی عناد اور مقامی دشمنیوں کا بدلہ لینے کے لیے ان پولیس اسٹیشنوں کو آلہ کار بنایا ۔ جہاں پر پولیس والوں نے اپنی مرضی سے فرضی جرائم قائم کر کے اپنے مخالفین کے خلاف جائز و ناجائز تحقیقات کیں ۔ جس کی بناء پر لوگوں میں خوف و ہراس پیدا ہوا ۔

---

۱ ۔ "انتظام نامہ کل ہند جمعیۃ علماء اسلام"، ص ص ۲۶-۲۷

۵ - مزید برآں مسلم صوبائی ممبران نے یہ شکایات کیں کہ صوبہ یوپی میں کانگریسی، مذہبی معاملات میں بھی مداخلت کر رہے ہیں (اگرچہ ممبران نے اس امر کی وضاحت نہیں کی) ۔

۶ - علاوہ ازیں ، کانگریس نے مسلم ماس کنٹیکٹ (عوام سے رابطہ) کی مہم جاری کی ۔ اصل میں یہ مہم مسلمانوں کی قومیت کو ختم کر کے ہندوستان کی ایک قومیت میں ضم کر دینے کی ابتداء تھی ۔ اس مہم میں غریب مسلم دیہاتیوں کو ایک قومیت میں ضم کر دینے کے لیے یہ باور کرایا جاتا تھا کہ کانگریس غیر فرقہ پرست جماعت ہے ۔ اس لیے اس میں شریک ہو کر معاشی اور اقتصادی بد حالی کو ملک سے دور کرنے میں کانگریس سے تعاون کیا جائے ۔

۷ - واردھا ، ودیامندر اور دیہات سدھار اسکیمیں جاری کیں ۔ ان اسکیموں کو سرکاری فنڈ سے نافذ العمل بنایا ۔ اور اس کے نفاذ کی جبراً کوششیں کیں ۔ جن کی تفصیلات اگلے صفحات میں پیش ہو رہی ہیں[1] ۔

غرض یہ کہ کانگریس نے اپنے دور وزارت میں ابتدا ہی سے مسلم دشمنی اختیار کی ۔ اور مسلمانوں کو جا و بے جا طور پر پریشان کرنا شروع کیا ۔

کانگریس کی پالیسی اور علماء میں اختلاف :

کانگریس کی مندرجہ بالا مسلم آزار پالیسی کے نتیجے میں مسلم لیگ نے خصوصاً اور علماء نے عموماً اپنا اپنا ایک زاویہ قائم کیا ۔ چنانچہ اس مسئلے میں علماء کے تین مختلف گروہ ہوگئے ۔ ایک گروہ میں وہ علماء تھے جو کانگریس کی پالیسیوں کے موید و حامی تھے ۔ اس گروہ میں مولانا سید حسین احمد مدنی ، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ، خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ دوسرا گروہ ان علماء کا تھا جو کانگریس کی بعض اصلاحات سے ناخوش تھے ۔ اور اس سلسلے میں تنقید بھی کرتے تھے ۔ مگر اس کے باوجود کانگریس کی تائید و حمایت بھی کرتے تھے ۔ اس گروہ میں مفتی کفایت اللہ ، مولانا سجاد بہاری ، اور مولانا احمد سعید وغیرہ شامل تھے[2] ۔ تیسرا گروہ

---

1. *Pakistan : The Formative Phase*, 2nd ed., pp. 88-91; R. Coupland, pt. 2, p. 104.

(نوٹ : نکات نمبر ۵ میں ڈاکٹر خالدبن سعید نے مذہبی معاملات کی توضیح نہیں کی اور صرف بیان ہی نقل کر دیا ہے)

۲ - ''نظام نامہ کل ہند جمعیہ" علماء اسلام" ، ص ص ۳۰ اور ۳۸-۴۱

جمعیۃ علماء کے علاوہ ان علماء کا تھا جنھوں نے کانگریس کی مسلم آزار پالیسیوں اور معاندانہ رویے کے خلاف احتجاج کیا ۔ اس گروہ میں مولانا اشرف علی تھانوی ، مولانا شبیر احمد عثمانی ، مفتی محمد شفیع دیو بندی، مولانا ظفر احمد تھانوی ، مولانا سید سلیمان ندوی ، مولانا جمیل احمد تھانوی ، اور مولانا خیر محمد جالندھری ، وغیرہ شامل تھے ۔ ان حضرات نے نہ صرف کانگریس کی مسلم آزار پالیسیوں کی مخالفت کی بلکہ آگے چل کر مسلم لیگ کے مجوزہ پاکستان کی قرار داد کی حمایت بھی کی[1] ۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے مفتی محمد شفیع صاحب کے اس فتویٰ کی تائید کی جو مفتی صاحب نے اراکین مجلس دعوۃ الحق بمبئی کے استفتاء پر دیا تھا ، جس میں دریافت کیا گیا تھا کہ پاکستان کی حمایت اور مسلم لیگ میں مسلمانوں کی شرکت کے بارے میں شرعی حیثیت کیا ہے ؟ اس فتویٰ میں برصغیر کی سیاست حاضرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے قرآن و حدیث کی روشنی میں مسلمانان ہند کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ مطالبہ پاکستان کی تائید و حمایت کریں اور مسلم لیگ میں شریک ہوں ۔ نیز یہ کہ کانگریس میں بلاشرط و معاہدہ شریک نہ ہوں ۔ اس بات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا سلیمان ندوی بھی پاکستان کی حمایت اور تائید میں تھے[2] ۔

صوبہ سرحد ، اردو اور مولانا آزاد :

قبل اس کے کہ واردھا اور دیگر اسکیموں پر روشنی ڈالی جائے ۔ مولانا آزاد کے ایک خط پر روشنی ڈالنا ضروری ہے جو موصوف نے ۲۵ جنوری ۱۹۳۷ء کو کلکتے سے ، مولانا غلام رسول مہر کے نام لکھا تھا ۔ اس خط کا پس منظر یہ ہے کہ صوبہ سرحد میں الیکشن کے بعد جو وزارت تشکیل ہوئی تھی، اس کے متعلق مولانا نے اخبار ''انقلاب'' کے ایک مضمون ''سرحدی کانگریسوں کے ارادے'' پڑھا ۔ جس میں ڈاکٹر خان صاحب سے کسی نے پوچھا کہ ہندی گورمکھی سرکار کے لیے کیا کرو گے ؟ ''انھوں نے کہا فوراً منسوخ کر دیں گے'' ۔ مولانا آزاد نے اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک طویل خط قلم بند کیا ۔ جو اس باب کے تعلیقہ میں پیش کیا جا رہا ہے ۔ مولانا آزاد نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر خان کا یہ قدم (سرکار کی منسوخی) نہ تو اردو کی کوئی مناسب خدمت کر سکے گا ، اور نہ ہی اسلام یا مسلمانوں کو اس سے کوئی فائدہ پہنچے گا ۔ البتہ اس منسوخی کی بنا پر یہ خدشہ ہے کہ تمام کانگریسی صوبوں میں

---

۱ ۔ ''مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلے'' ، ص ص ۲۷-۲۸
''نظام نامہ کل ہند جمعیۃ علماء اسلام'' ، ص ص ۳۰-۳۸

۲ ۔ ''کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلے'' ، ص ص ۳ ، ۲۴ اور ۲۸

اردو کی سرکاری امداد ہی بند کر دی جائے ۔ چونکہ ان صوبوں کے لیے صوبہ سرحد کی مثال ایک دلیل اور حجت بن جائے گی اور ان صوبوں کے مسلمانوں میں اتنی سکت نظر نہیں آتی کہ وہ بغیر سرکاری امداد کے اپنے مدارس یا اسکولوں کو جاری رکھ سکیں[۱] ۔ مولانا آزاد نے مزید خدشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ دیگر تمام صوبے اس کی آڑ میں اردو کے خلاف کام کریں اور اس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ یہ تمام صوبے نہ صرف اردو کے معاملے میں ، بلکہ اقلیت اور اکثریت کے دیگر معاملات میں ، ایسے طریقے اختیار کریں ، جس کی بنا پر مسلمانوں کو نقصان یا زیاں پہنچے اور ان کی حق تلفی ہو ۔ اور ایک تمثیل (یعنی حکومت کا مندرجہ بالا عمل) قائم ہونے کے بعد اگر مسلمانوں نے کوئی احتجاج بھی کیا تو وہ سود مند نہ ہوگا[۲] ۔

راقم الحروف کی رائے میں مولانا آزاد کا یہ مؤقف صحیح تھا کہ مسلم اکثریت کے صوبوں یا صوبے میں ، اقلیت کی زبان اور حقوق کی حفاظت کرنا چاہیے ۔ کیونکہ رواداری اور حسن سلوک کے برتاؤ سے ہی دوسرے لوگوں سے اچھے عمل کی امید کی جا سکتی ہے ۔ اگر مسلمان خود ہی تنگ نظری (خواہ وہ کسی مسئلے میں ہو) کا مظاہرہ کریں تو دوسرے لوگوں سے فراخدلی کی امید رکھنا خود فریبی سے زیادہ نہیں ۔ اسلام اور مسلمانوں کی خدمت ان کے حقوق اور تہذیب و تمدن کی حفاظت کر کے ہی کی جا سکتی ہے اور وہ اسی صورت میں ممکن ہے جب مسلمان دوسری اقوام کے حقوق اور تمدن کی حفاظت اپنے دور اقتدار یا حکومت میں کریں تا کہ دوسری اقوام بھی ایسا کرنے پر مجبور ہوں یا کم از کم مسلمانوں کے خلاف معاندانہ رویہ اختیار نہ کریں ۔

واردھا اسکیم اور علماء :

واردھا اسکیم کا عام مقصد اور مطلب یہ تھا کہ ملک کے عام باشندگان کے بچوں کو سات سال سے چودہ سال کی عمر تک لازمی جبری تعلیم دی جائے گی[۳] ۔ یہ اسکیم حکومت کے بل بوتے پر ۳۸-۱۹۳۷ء میں نافذ العمل ہوئی تھی اور جہاں یا جس مقام پر نافذ ہوئی تھی ، وہاں کا کوئی باشندہ نہ تو اپنی اولاد کو اس نظام تعلیم میں شریک ہونے سے

---

۱ ۔ مولانا غلام رسول مہر ، ''نقش آزاد'' ، لاہور ، جولائی ۱۹۵۹ء ، (دوسری بار) ، ص ص ۱۲۸-۱۲۲

(مصنف ''نقش آزاد'' نے ہندی ، گورمکھی سرکار کے متعلق کوئی تفصیل نہیں لکھی ، غالباً اس سے مراد ہندی مدارس کی سرکاری امداد بند کرنا تھا ۔)

۲ ۔ ''نقش آزاد'' ، ص ص ۱۲۶-۱۲۷

۳ ۔ ''تحریک آزادی ہند اور مسلمان'' ، ص ۳۱۷

روک سکتا تھا ۔ اور نہ ہی کوئی دوسرا متبادل نظام تعلیم ہو سکتا تھا ، جہاں وہ اپنے بچوں کو داخل کر سکتا[1] ۔ اس اسکیم کا دوسرا نام ''بنیادی قومی تعلیم'' کی اسکیم رکھا گیا ۔ یہ اسکیم ڈاکٹر ذاکر حسین نے تیار کی ، مگر اس کے معمار خاص مسٹر گاندھی تھے ۔ اس اسکیم کے بعض پہلو مفید بھی تھے ۔ مثلاً صنعت و دستکاری پر تاکید اور بعض پہلو مسلمانوں کےلیے قابل اعتراض تھے ۔ جس چیز پر مسلمانوں کو سب سے زیادہ اعتراض تھا وہ یہ تھا کہ اس اسکیم کا بنیادی تصور یہ تھا کہ برصغیر کے سارے باشندے ایک قوم واحد ہیں ۔ اس اسکیم میں مسلمانوں کی جداگانہ قومی حیثیت کی نفی کی گئی تھی ۔ بقول چودھری حبیب احمد یہ اسکیم گاندھی جی نے مسلمانوں کو ہندو بنانے یا ملک بدر کرنے یا غلام اور اچھوت بنانے کے لیے وضع کی تھی[2] ۔ اس اسکیم میں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کی کوئی گنجائش نہ تھی ۔ گاندھی جی نے مذہبی تعلیم کے بارے میں اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ :

''ہم نے واردھا اسکیم میں مذاہب کی تعلیم کو باہر رکھا ہے ۔ اس لیے کہ آج کل مذاہب جس طرح پڑھائے جاتے ہیں ، اور جس طرح ان پر عمل کیا جاتا ہے ، وہ وحدت پیدا کرنے کی بجائے اختلاف پیدا کرنے کا موجب ہیں ۔ مگر میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ جو سچائیاں تمام مذاہب میں مشترک ہیں ، وہ سکھائی جا سکتی ہیں اور سکھائی جانی چاہئیں[3]'' ۔

گاندھی جی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہبی تعلیم دینا اس اسکیم کے دائرہ عمل سے خارج تھا ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خان نے ایک بیان میں اس اسکیم کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ : ''واردھا اسکیم میں تو یہ کہیں نہیں لکھا کہ مذہبی تعلیم نہ ہونی چاہئے'' ۔ مسٹر گاندھی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے بیانات کا تضاد واضح ہے ۔ دراصل اس اسکیم کے تحت بچوں میں اسلامی قومیت کے شعور کو مٹانے کے لیے مذہبی تعلیم کی نفی کی گئی

---

۱ ۔ ''تحریک آزادی ہند اور مسلمان''، ص ۳۱۷ ۔

۲ ۔ ''تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء'' ، ص ۲۷۶؛

The Struggle for Pakistan, pp. 104-5 .

۳ ۔ ''تحریک آزادی ہند اور مسلمان'' ، ص ۳۲۲ ؛

The Struggle for Pakistan, pp. 104-5.

تا کہ اس طرح اسلامی قومیت کا شعور پیدا ہی نہ ہو سکے[1] - چنانچہ اس اسکیم پر علماء میں اختلاف پیدا ہوا - علماء کا ایک بڑا طبقہ حتی کہ جمعیۃ علماء ہند نے بھی اس اسکیم سے اختلاف کیا - مگر اس اسکیم کے معترضین اور مخالفین میں مولانا اشرف علی تھانوی ، ان کے رفقاء اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی پیش پیش تھے -

علماء جنھوں نے واردھا اور دیگر اصلاحی اسکیموں سے اختلاف کیا :

کانگریس نے اپنے دور وزارت میں ، واردھا ، ودیا مندر اور دیہات سدھار اسکیمیں رائج کیں جو رفاہی ، تعلیمی اور اصلاحی اسکیموں کے نام سے متعارف کرائی گئیں - یہ اسکیمیں گاندھی جی کے سیاسی و معاشرتی پروگرام کا حصہ تھیں - کانگریس اپنے دور اقتدار میں گاندھوی فلسفۂ حیات کو ، برصغیر کے ہر فرد پر جبراً مسلط کرنا چاہتی تھی - انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت قائم ہونے والی کانگریسی وزارتوں نے بزعم حکومت ، واردھا، ودیا مندر اور دیہات سدھار اسکیمیں جاری کیں - ان اسکیموں کی آڑ میں سرکاری ذرائع و وسائل کی بنا پر گاندھی ازم اور ہندوستانی قومیت کا پرچار کرنا مقصود تھا - علماء کے ایک طبقے نے ان حالات اور سیاسی تبدیلیوں (جو کانگریسی اقتدار کے بعد عمل میں آئی تھیں) کا بڑے غور و فکر اور دور اندیشی کے ساتھ مطالعہ کیا - ان علماء میں مولانا اشرف علی تھانوی ، ان کے ہم خیال علماء اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی خاص طور سے قابل ذکر ہیں -

مندرجہ بالا سطور میں مولانا اشرف علی تھانوی کے ہم خیال علماء کے نام پیش کیے جا چکے ہیں - مولانا اشرف علی تھانوی نے جمعیۃ علماء ہند سے جو ملک میں علماء کی واحد سیاسی جماعت تھی اور کانگریس کی بیشتر اسکیموں کی حامی بھی تھی ، کانگریس کی ان سیاسی اور رفاہی اسکیموں پر افہام و تفہیم کرنا ضروری خیال کیا - مولانا موصوف ، نہ صرف کانگریس کی تمدنی اور تعلیمی اسکیموں کے خلاف تھے ، بلکہ کانگریس کے ساتھ مسلمانوں کے اشتراک اور اتحاد کے ہی یکسر خلاف تھے - مولانا تھانوی نے اس سلسلے میں ایک وفد جمعیۃ علماء ہند کے پاس بھیجا - اس وفد نے جمعیۃ علماء ہند پر واضح کیا کہ کفار و مشرکین کے ساتھ بلا شرط و معاہدہ موالات و اشتراک مناسب نہیں - مزید برآں اس وفد نے جمعیۃ علماء ہند پر یہ بھی ظاہر کیا کہ مسلم لیگ کی "تنظیم مسلمین" اور مسلمانوں کا اتحاد ، وقت کی اہم ضرورت ہے - جمعیۃ علماء کے امیر مفتی کفایت اللہ نے اس وفد کے سامنے اس بات کا اعتراف کیا کہ کانگریس کی "مسلم ماس

---

۱ - "تحریک آزادی ہند اور مسلمان" ، ص ص ۳۲۲-۳۲۳ ؛
"برہان" ، دہلی ، اگست ۱۹۴۸ء ، ص ص ۴۲-۴۵

"کنٹیکٹ یا عوام سے رابطہ" کی مہم اصولاً اسلامی قومیت اور قیادت کی تحلیل ہے[1]۔
مولانا اشرف علی تھانوی نے ایک بیان دیا، جسے اخبار "الجمعیۃ" نے شائع کیا۔ جس میں موصوف نے فرمایا کہ: "واردھا اسکیم مسلمانوں کی مذہبی زندگی کے لیے خطرناک ثابت ہوگی چونکہ اس اسکیم میں گاندھی ازم اور دہریت کی تخم ریزی کی گئی ہے[2]"۔

مولانا سجاد بہاری اور دیہات سدھار اسکیم کی مخالفت:

مولانا محمد سجاد بہاری، نائب امیر شریعت صوبہ بہار و اڑیسہ اور صدر انڈی پنڈنٹ مسلم پارٹی و ممبر مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند نے، دیہات سدھار اسکیم کی مخالفت کرتے ہوئے، وزیر تعلیم ڈاکٹر سید محمود کو ایک احتجاجی مراسلہ مورخہ ۲۲ اگست ۱۹۳۸ء کو روانہ کیا۔ اس مراسلے میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ دیہات سدھار اسکیم مسلمانوں کی مذہبی، اخلاقی اور تمدنی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے والی ہے لہٰذا اس اسکیم کے پردے میں گاندھی ازم کی نشر و اشاعت کو روکا جائے[3]۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور واردھا و دیگر اسکیموں کی مخالفت:

مولانا مودودی اس وقت کسی سیاسی جماعت سے منسلک نہ تھے اور انفرادی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ مگر ملک کے سیاسی مسائل سے غافل نہ تھے۔ چنانچہ مولانا مودودی نے، واردھا، ودیا مندر اور دیہات سدھار اسکیموں کو مسلمانان ہند کے لیے نہ صرف مضر اور مہلک خیال کیا بلکہ آپ نے فرمایا کہ ان اسکیموں کے پیچھے اسلام اور شعائر اسلام کو ختم کرنے کا منصوبہ بھی کارفرما ہے[4]۔

۱۔ "نظام نامہ کل ہند جمعیۃ علماء اسلام"، ص‌ص ۳۰-۳۱
(نوٹ: افسوس ہے کہ مصنف نے اس وفد کی ملاقات کا ماہ و سن اور ممبران وفد کے اسماء بیان نہیں کیے۔)
۲۔ "الجمعیۃ"، ۹ ستمبر ۱۹۳۸ء، ص ۳، ک ۲-۳؛
"کانگریس و مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلے"، ص ۳۰؛
"ہمارا پاکستان" از علامہ شبیر احمد عثمانی، ص‌ص ۲۲-۲۳
۳۔ "نظام نامہ کل ہند جمعیۃ علماء اسلام"، ص‌ص ۲۶-۲۷
"کانگریس و مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلے"، ص‌ص ۳۲-۳۳
۴۔ "تحریک آزادی ہند اور مسلمان"، ص‌ص ۲۶؛ ۲۹-۳۳

مولانا عبیداللہ سندھی اور گاندھی ازم کی مخالفت :

مولانا سندھی (حسب تفصیل سابق) ۱۹۱۵ء میں شیخ الهند کے حکم پر کابل گئے۔ اور ۲۴ سال تک جلا وطن رہنے کے بعد ، مارچ ۱۹۳۹ء کو وطن واپس آئے[1] ۔ جلا وطنی کے زمانے میں مولانا کا رجحان کانگریس کی جانب تھا ۔ لیکن وطن مراجعت کرنے کے بعد مولانا نے کانگریس کو ایک نئے روپ میں پایا ، جو انھیں ایک آنکھ نہ بھایا ۔ مولانا نے ہندوستانی قومیت اور گاندھی ازم کے فلسفۂ حیات پر تبصرہ فرماتے ہوئے کہا کہ : ''مسلمانوں کا قومی وجود الگ اور منفرد ہے'' ۔

آپ نے مزید کہا کہ وحدت انسانیت کے باوجود ، انسانوں کی قومی اور گروہی تقسیم ناگزیر ہے ۔ فرد ایک مستقل اکائی ہے ، جو افراد پر مشتمل ہے ۔ اس طرح ایک مستقل وجود رکھتی ہے ۔ گاندھی جی غلطی سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہندوستان کو ہزار سال پہلے کے ''جون'' میں بدلنے میں کامیاب ہو جائیں گے ۔ انھوں نے اس کا مطلق خیال نہیں کیا کہ آٹھ سو برس سے ایک قوم ، ایک زبان ، ایک نیا تمدن ، اور ایک نیا فکر اس وطن کو اپنا گھر بنا چکا ہے ۔ اور اس سرزمین پر ان کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ گاندھی جی کی قوم ، اُن کی زبان ، کلچر اور فلسفے کا[2]'' ۔ مولانا نے کہا کہ :

''پچھلے بیس سال سے گاندھی جی نے کانگریس کو مذہبی رنگ دے دیا ہے ۔ لیکن یہ مذہبی رنگ خالص ہندوانہ ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی تمام اقوام کی اکثریت کسی نہ کسی مذہب یا عقیدے کو مانتی ہے لیکن گاندھی جی نے مذہب کو جس رنگ میں پیش کیا ہے ۔ وہ مسلمانوں ، عیسائیوں اور سکھوں کے لیے کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتا اور نہ اشتراکیت والے اس کے روادار ہو سکتے ہیں[3]'' ۔

---

۱ ۔ ''برہان''، دہلی ، نومبر ۱۹۴۴ء ، ص ص ۱۰۶-۱۰۷ ؛

''مولانا عبیداللہ سندھی : حالات زندگی ، تعلیمات اور سیاسی افکار'' ، ص ۳۰

۲ ۔ ''برہان'' ، دہلی ، نومبر ۱۹۴۴ء ، ص ص ۱۵۵-۱۵۶ ؛

Ulema in Politics, pp. 314-15.

(نوٹ : ''جون'' سے مراد ہے زندگی ، یہ لفظ سنسکرت کا ہے ، اس جگہ اس لفظ سے مراد ہے زمانہ ماضی یعنی گذرے ہوئے ایام ۔)

۳ ۔ ''مولانا عبیداللہ سندھی : حالات زندگی ، تعلیمات اور سیاسی افکار'' ص ص ۲۷۰-۲۷۵

جمعیۃ علماء ہند اور واردھا اسکیم کی مخالفت :

جمعیۃ علماء ہند نے واردھا اسکیم کی مخالفت کی اور اس پر تنقید بھی کی ۔ نیز اس کی اصلاح کے لیے بھی کوشش کی ۔ اس سلسلے میں جمعیۃ علماء ہند نے ایک سب کمیٹی مقرر کی ۔ جس کی رپورٹ مارچ ۱۹۳۹ء کے سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی میں منظور ہو کر شائع ہوئی ۔ اس کمیٹی میں مندرجہ ذیل حضرات شریک تھے :

"مولانا مفتی کفایت اللہ ، مولانا سید محمد سجاد بہاری ، مولانا احمد سعید ، مولانا نورالدین بہاری ، اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی" ۔

جمعیۃ کے اجلاس کے بعد اخبارات میں، تنقید و تبصرہ ہوا[1] ۔ اسی طرح جمعیۃ علماء نے ودیا مندر اسکیم پر بھی ، جو صوبہ سی پی میں رائج کی گئی تھی ، تنقید کی اور کہا کہ سرکاری تعلیم کے لیے اس قسم کے نام کا جاری ہونا ، ناقابل فہم اور غیر پسندیدہ امر ہے ۔ جمعیۃ علماء ہند نے ان دونوں اسکیموں کے خلاف اپنی تجاویز کانگریس کی مجلس عاملہ کے پاس روانہ کیں ۔ مگر کچھ دنوں بعد کانگریسی حکومتیں مستعفی ہو گئیں[2]۔ جمعیۃ علماء کی تجویز کے بارے میں کوئی تفصیلات دستیاب نہ ہو سکیں ۔)

کانگریسی وزارتوں کا عمل اور علماء کا رول :

کانگریس نے فتح کے زعم میں ، ملک کی دیگر تمام سیاسی پارٹیوں کو نظر انداز کر دیا ، حتیٰ کہ تمام اقوام ہند کو صرف ایک ہندوستانی قوم کے نام سے معروف کرانے کے لیے ہندوستانی قومیت کا نعرہ بلند کیا ۔ اور مسلم عوام کو گمراہ کرنے کے لیے "مسلم ماس کنٹیکٹ" کی مہم شروع کی ۔ بعض علماء نے اس سلسلہ میں کانگریس سے اختلاف کیا ۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے فرمایا کہ : "مسلم ماس کنٹیک کی مہم اسلامی قومیت و قیادت کی تحلیل ہے اور مسلمانوں کے لیے سخت مہلک بھی ۔ مولانا نے مزید کہا کہ بلا شرط و معاہدہ کفار سے ، موالات و اشتراک درست نہیں ، اور مسلم لیگ کا نظریہ استقلال ملت و تنظیم اُمت اصولاً صحیح ہے[3]" ۔

---

۱ ۔ "جمعیۃ علماء کیا ہے ؟" حصہ اول ، ص ص ۴۲-۴۳؛
"نظام نامہ کل ہند جمعیۃ علماء اسلام" ، ص ۲۶؛
"مسلم لیگ و کانگریس کے متعلق شرعی فیصلہ" ، ص ۳۱

۲ ۔ "جمعیۃ علماء کیا ہے ؟"، ص ۴۳

۳ ۔ "نظام نامہ کل ہند جمعیۃ علماء اسلام" ، ص ص ۲-۳

مزید برآں مولانا اشرف علی تھانوی نے ایک بیان دیا ، جو مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ دسمبر ۱۹۳۸ء میں بمقام پٹنہ پڑھا گیا ۔ جس میں مولانا نے فرمایا کہ : "اس وقت مسلمانوں کو اپنی جداگانہ تنظیم کی ضرورت ہے ۔ کیونکہ عقلاً اور نقلاً یہ بات ثابت ہے کہ جو قوم اپنی جداگانہ تنظیم نہیں رکھتی وہ دوسری اقوام میں متضم اور منجذب ہو کر کالعدم ہو جاتی ہے ۔ باخبر حلقہ اس بات سے بہ خوبی آگاہ ہے کہ مسلمانان ہند اس وقت جس دور سے گزر رہے ہیں وہ آن کے لیے مشکلات اور پریشانیوں کا دور ہے ۔ یعنی گاندھوی فلسفۂ حیات مسلمانوں پر مسلط کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے ۔ لہٰذا مسلم لیگ کی تنظیم نو میں مسلمانوں کو شریک ہونا چاہیے ، تا کہ مسلمانوں کی ایک مستقبل تنظیم مضبوط بنیادوں پر قائم ہوسکے اور مستقبل میں مسلمانوں کا تمدن، تہذیب و معاشرت، زبان و تعلیم وغیرہ کو محفوظ کیا جا سکے"[1] ۔

مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی اور کانگریس :

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اس زمانے میں مجلس احرار اسلام کے صدر تھے ۔ کانگریس نے انتخابات جیتنے کے بعد فتح کے نشے میں تلخ بیانات کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ : "کانگریس اپنی فتح پر ناروا غرور اور غیر مدبرانہ طریقہ عمل اختیار کر رہی ہے، یہ مناسب نہیں"[2] ۔ یہی نہیں بلکہ مجلس احرار نے (بقول چودھری حبیب احمد) اپنے اجلاس منعقدہ پشاور مورخہ ۷ تا ۹ اپریل ۱۹۳۹ء بصدارت چودھری افضل حق (مرحوم) مولانا مظہر علی اظہر، جنرل سکریٹری مجلس احرار اسلام نے یہ اعلان بھی کیا کہ ہندو مسلم مسئلہ کا فیصلہ مسلمانوں کی طرف سے صرف مسلم لیگ کر سکتی ہے ۔ اور اگر پاکستان کے متعلق کسی وقت استصواب عامہ کیا گیا تو احرار، پاکستان کے حق میں ووٹ دیں گے[3] ۔

مولانا مودودی اور کانگریسی عزائم کی مخالفت :

۱۹۳۸ء میں ، جب کہ مولانا اشرف علی تھانوی نے مسٹر جناح کے پاس تبلیغی (یعنی اصلاحی) وفود بھیجے اور علامہ اقبال ، مسٹر جناح کو ترغیبی خطوط لکھنے میں

---

۱ ۔ "تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء" ، ص ص ۳۳۷-۳۳۸

۲ ۔ "الجمعیۃ" ۱۲ مارچ ۱۹۳۷ء ، ص ۵، ک ۱

۳ ۔ "تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء" ، ۳۴۷-۳۰۰؛ "خطبات احرار" ، ص ۵۱ ۔

مصروف تھے، اس زمانے میں مولانا مودودی اپنی کتاب "مسلمان اور سیاسی کشمکش" کی تدوین میں مصروف تھے۔ اس کتاب کا پہلا حصہ فروری ۱۹۳۸ء میں اور دوسرا حصہ دسمبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ مولانا نے جو اس وقت انفرادی حیثیت سے کام کر رہے تھے، پوری شرح و بسط کے ساتھ کانگریس کے استعمار پرستانہ عزائم کا تار و پود بکھیرا۔ مولانا نے ملک کے سیاسی حالات کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے، بعض مسلم جماعتوں کی روش پر بھی تنقید کی۔ اور اپنے مخصوص نظریے کے تحت جدید انقلابی نصب العین کی توضیح کی[1]۔ مولانا نے ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۹ء کے درمیانی دور کے، ملک کے سیاسی حالات پر پرمغز تبصرہ کیا۔ اور نیشنلسٹ علماء دیوبند اور جمعیۃ علماء ہند پر بھی تنقید کی۔ جس کا جواب الجواب طرفین کی جانب سے ہوتا رہا[2]۔

فصل سوم

جمعیۃ علماء ہند اور کانگریسی دور میں سیاسی جد و جہد

انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت ہونے والے انتخابات میں جمعیۃ علماء ہند نے مسلم لیگی امیدواران کو کامیاب بنانے کے لیے جد و جہد کی۔ چونکہ جمعیۃ نے (حسب تفصیل سابق) مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ میں شرکت و تعاون کیا تھا۔ اس اتحاد کے نتیجے میں مسلم لیگ کو الیکشن میں امید سے بھی زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔ مگر ۱۹۳۷ء میں انتخابات کے نتائج کے بعد ملک میں تیزی کے ساتھ سیاسی تبدیلی رونما ہوئی، اور کانگریس نے اپنے رویہ اور برتاؤ میں سختی اور ترش روئی اختیار کی۔ نیز تعلیمی، سماجی اور اصلاحی اسکیمیں نافذ کیں، جو کہ مسلمانوں کے مستقبل اور تمدن و معاشرت کے لیے ضرر رساں تھیں۔ چنانچہ جمعیۃ علماء نے بھی ان اسکیموں کے خلاف تنقید کی[3]۔

جمعیۃ علماء اور اردو زبان کی خدمت :

برصغیر میں تقریباً ساٹھ ستر برس سے، فرنگیوں نے اردو ہندی نزاع پیدا کیا ہوا تھا۔ چند صوبوں میں عدالتی زبان انگریزی اور ہندی تھی۔ بہار میں بھی سرکاری زبان ہندی کر دی گئی۔ بہار کا اردو دان طبقہ خصوصاً مسلمان، ایک عرصے سے اس بات کی

۱۔ "تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء"، ص ص ۵۰۵-۵۰۸۔

2. Aziz Ahmad, *Islamic Modernism in India and Pakistan*, London, 1962, p. 213.

۳۔ "جمعیۃ علماء کیا ہے؟"، حصہ اول"، ص ص ۴۳-۴۴ ؛
"نظام نامہ کل ہند جمعیۃ علماء اسلام"، ص ص ۲-۴۔

کوشش کر رہے تھے کہ سرکاری عدالتوں میں انگریزی اور ہندی کی طرح اردو زبان و رسم الخط کو بھی تسلیم کیا جائے۔ لیکن حکومت نے بعض نا معقول وجہ بتا کر یہ مطالبہ مسترد کر دیا تھا۔ لیکن جب صوبہ بہار میں، اپریل ۱۹۳۷ء میں مسلم انڈی پنڈینٹ پارٹی کی کولیشن وزارت قائم ہوئی تو اس نے صوبہ بہار کی عدالتوں میں ہندی کے ساتھ ساتھ اردو کے اجراء کا حکم نافذ کر دیا[1]۔ اس کے بعد جولائی ۱۹۳۷ء میں جب کانگریس نے وزارت سنبھالی تو اس نے بھی اردو کے نفاذ کے سابقہ حکم کو بحال رکھا۔ بہار میں اردو کا مسئلہ اس لیے طے پایا کہ مسلم انڈی پنڈینٹ پارٹی کو جمعیۃ علماء اور امارت شرعیہ بہار کی پوری تائید و حمایت حاصل تھی۔ اور دونوں جماعتوں کے ارکان کی مشترکہ مساعی جمیلہ اور خلوص نیتی سے یہ مسئلہ حل ہوا[2]۔

دو قومی نظریہ اور جمعیۃ علماء ہند :

۱۹۳۷ء میں کانگریس نے چھ صوبوں میں اپنی وزارتیں قائم کرنے کے بعد مختلف اسکیمیں نافذ کیں۔ ان اسکیموں میں ایک قومی نظریہ یعنی "ہندوستانی قومیت" کا نظریہ کار فرما تھا۔ مسلم لیگ نے ایک قومی نظریہ کے برعکس دو قومی نظریہ پیش کیا۔ اس نظریاتی تصادم نے جمعیۃ علماء کو بڑی مشکل میں ڈال دیا۔ جمعیۃ ایک طرف تو کانگریس سے تعاون کی خواہاں تھی تو دوسری طرف وہ ایک قومی نظریے اور اس کے عواقب کو کلیتاً ماننے کو تیار نہ تھی۔ جمعیۃ علماء نے اس سلسلے میں اپنا موقف ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ باشندگان کے مختلف مذاہب اور رجحانات کو بالکل نظر انداز کر دینے والا اصول نہ صحیح ہے اور نہ عملی، مسلمانوں کے لیے یہ محال ہے کہ وہ اپنے اسلامی کلچر کو چھوڑ کر کسی متحدہ قومیت کے اندر جذب ہو جائیں اور اسلامی و غیر اسلامی کلچروں کا کوئی امتیاز تسلیم نہ کریں۔ مسلمان دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری کا طرز عمل اختیار کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن اگر اس طرز عمل کے برعکس ایک بنا دینے والے کسی ایسے نیشنل ازم (متحدہ قومیت) کا سبق پڑھایا جانے لگا، جو اسلامی تہذیب کی خصوصیات کو برباد کر دینے والا ہے تو یہ پالیسی نہ صرف سطحی ہوگی بلکہ آئندہ کی تباہی کا باعث ہوگی[3]۔

۱۔ "جمعیۃ علماء کیا ہے؟"، حصہ اول، ص ص ۲۹ - ۳۰۔

۲۔ ایضاً، ص ۳۰۔

۳۔ "نظام نامہ کل ہند جمعیۃ علماء اسلام"، ص ۲۶؛
بحوالہ رپورٹ اجلاس جمعیۃ علماء ہند، ۱۹۳۹ء، دہلی، ص ص ۵-۶۔

جمعیۃ علماء ہند اور قومی خود ارادیت :

جمعیۃ علماء ہند کی کانگریس کے ساتھ ، سیاسی اور دنیاوی امور میں شرکت مولانا رشید احمد گنگوہی کے فتویٰ (شائع شدہ ۱۳۰۶ ہجری مطابق ۱۸۸۸ عیسوی) جس کی نقل باب ثانی میں پیش کی جا چکی ہے) کے مطابق اور شیخ الہند کے اصولوں پر مبنی تھی۔ لیکن مولانا گنگوہی نے کانگریس کے ساتھ اشتراک و اتحاد مشروط طور پر جائز قرار دیا تھا یعنی جن امور یا معاملات میں کوئی خلاف شرع امر لازم نہ آتا ہو، ان امور یا معاملات میں ہندوؤں کے ساتھ معاملہ کرنا مباح اور جائز قرار دیا تھا[1] ۔

شیخ الہند بھی کانگریس کے ساتھ مشروط تعاون کے حامی تھے ۔ مولانا سید انور شاہ کشمیری نے ۱۹۲۷ء میں جمعیۃ علماء ہند ، کے اجلاس منعقدہ پشاور کی صدارت کرتے ہوئے کہا تھا کہ "جمعیۃ علماء ہند کا مسلمہ اصول یہ رہا ہے کہ وہ مسلمانان ہند کی مستقل اسلامی قومیت اور ان کے انفراد و استقلال اور مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی تنظیم کی حامی رہی ہے اور ہندو قوم سے بربنائے معاہدہ معاملہ کرنے کے اصول پر کاربند رہی ہے ۔[2]" بقول مولانا سید محمد قریش شمسی "جمعیۃ علماء ہند" دہلی نے نہرو رپورٹ ، ۱۹۲۸ء کی اس بناء پر مخالفت کی تھی کہ وہ ہندوستانی قومیت کی وحدت کے تصور پر مبنی تھی ، اور مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے انکار اور استیصال کے مقصد کے لیے وضع کی گئی تھی ۔ جمعیۃ علماء ہند کے سیاسی دماغ اور مجلس عاملہ کے رکن و نائب امیر شریعت بہار مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاری نے اپنے مقالہ میں "ہندوستان کو دوزخ کا نمونہ بنانے والا دستور" کے عنوان سے نہرو رپورٹ کی سخت تردید کی[3] ۔ دوسری طرف مولانا سجاد بہاری ، پاکستان کے قیام اور دو قومی نظریہ کے حامی بھی نہ تھے ۔ یعنی مولانا کے ذہن اور فکر میں کسی ایک مقصد کے تعین اور اس کی تائید و حمایت میں پختگی نہ تھی ۔ مزید برآں جمعیۃ کی قرار داد مارچ ۱۹۳۹ء (جیسے سطور بالا میں پیش کیا جا چکا ہے) کے تحت جمعیۃ نے یہ بات متفقہ طور پر منظور کرلی تھی کہ ہندوستان میں اقوام بستی ہیں ایک قوم یا ہندوستانی قوم کا کوئی وجود نہیں ہے ۔ اس امر کی تائید مولانا بہاری نے بھی کی تھی ۔ مولانا بہاری نے اس مسئلے کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہ :

---

۱ ۔ "کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ" ، ص ص ۴۰ ۔ ۴۱ ۔

۲ ۔ "انتظام نامہ کل ہند جمعیۃ علماء اسلام" ، ص ۲۹ ۔

۳ ۔ ایضاً ۔

(نوٹ : بقول مولانا شمسی ، مولانا سید محمد سجاد بہاری کا یہ مقالہ اخبار "انقلاب" ، لاہور، کے حقوق نمبر، ۱۹ دسمبر ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا) ۔

"اگر حقیقتاً مخالف (مخالف) تمدن و معاشرت و تباائن جذبات حیات کی بناء پر قوموں کی تقسیم کی جائے اور یقیناً اسی اصول سے قوموں کی تقسیم ہندوستان میں صحیح و درست ہے تو ہمارا یہ دعوی بالکل حقیقت پر مبنی ہے کہ ہندوستان میں صرف دو قومیں بستی ہیں ایک مسلم ، دوم غیر مسلم"۔[1]

پہلے بیانات سے یہ بات خود بخود صاف ہو جاتی ہے کہ جمعیۃ علماء ہند میں اس مسئلے پر دو گروہ ہو گئے تھے ۔ پہلا گروہ ایک قومی نظریہ کا حامی تھا ۔ جب کہ دوسرا گروہ دو قومی نظریہ کا ۔ ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ۱۹۳۷ء کے الیکشن تک جمعیۃ علماء کے اکابر مسلم لیگ کے ساتھ انتخابات میں ، مسلم لیگی امیدواروں کی مدد و حمایت کرتے رہے ۔ لیکن الیکشن میں کانگریس کی کامیابی اور وزارتوں کی تشکیل کے بعد جمعیۃ کے رویے میں واضح تبدیلی پیدا ہوئی اور جمعیۃ کا ایک گروہ (یعنی مولانا مدنی اور ان کے رفقاء) بلا شرط و معاہدہ کانگریس کے ساتھ اشتراک اور تعاون کرنے لگے ۔ اور یہ بھی اعلان کر دیا کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں ۔ مولانا احمد سعید نے مسلم لیگ کی پاکستان بنانے والی اسکیم پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ "پاکستانی فیڈریشن" ، "گویا بنگال ، پنجاب ، سندھ اور سرحد کو ملا کر ایک فیڈریشن بنایا جائے گا ۔ اور وہی اسلامی حکومت ہوگی ۔ اس فیڈریشن میں چالیس فی صد ہندو ، جاٹ ، سکھ اور بنگالی ہندو سندھی ہندو شامل ہونگے ۔ اسی مرکز کو یہ کہہ کر مسلمانوں کو فریب میں مبتلا کیا جاتا ہے کہ پاکستان میں ہماری حکومت ہوگی"۔ یہ بات مولانا احمد سعید نے اپنے خطبۂ صدارت ۱۹۴۶ء میں بیان کی تھی[2] ۔ مولانا احمد سعید نے مزید کہا کہ "مسلمانوں کے لیے یہ تقسیم در تقسیم ایک بلائے بے درمان بن جائے گی"۔ مولانا نے اپنی دلیل میں یہ بات پیش کی کہ روز مرہ کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ "اپنے صوبے کے آدمی کو ، دوسرے لوگوں پر ترجیح دیتے ہیں ۔ حتیٰ کہ بنگالی مسلمان ، بنگالی ہندو کو اور پنجابی مسلمان ، پنجابی ہندو کو دوسرے صوبے کے مسلمانوں پر ترجیح دیتا ہے"۔ مولانا نے فرمایا کہ اس ذہنیت کی موجودگی میں ، ان کا باہمی جوڑ لگنا مشکل ہے[3] ۔ مولانا احمد سعید نے ، مولانا سجاد بہاری کے ایک مضمون کا اقتباس بھی پیش کیا ، جو مرحوم نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل ، مسلم لیگ کی تجویز لاہور پر لکھا تھا ۔ مولانا بہاری نے کہا کہ

---

۱ ۔ "نظام نامہ کل ہند جمعیۃ علماء اسلام" ، ص ۲۹
(نوٹ : مولانا بہاری کا یہ بیان ۱۹۲۹ء میں نہرو رپورٹ پر تبصرہ کرنے کے سلسلے میں شائع ہوا تھا ۔)

۲ ۔ خطبۂ صدارت از مولانا احمد سعید ، ۹۔۱۰ فروری ۱۹۴۶ء ، منعقدہ میرٹھ ، ص ۲۳

۳ ۔ خطبۂ صدارت ، مولانا احمد سعید ، فروری ۱۹۴۶ء ، ص ص ۲۲-۲۳

"دو ڈھائی سال کے سوچ بچار کے بعد مسلم لیگ نے جو اسکیم تجویز کی ۔ مسٹر جناح اس کا مفاد یہ بتاتے ہیں"۔ "کہ مسلم اکثریت والے صوبوں کے مسلمان ، ہندو اکثریت کی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے "۔ اور مسلم اقلیت والے صوبوں کے مسلمانوں کے حقوق و مفاد کی حفاظت کی ضمانت مسلم اکثریت والے صوبوں کی مجموعی طاقت کرے گی ۔ لیکن یہ ایک فرضی نظریہ ہے ۔ اس کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں ۔ مسلم آزاد حکومتیں آج تک فلسطین کے مسلمانوں کی لفظی ہمدردی کے علاوہ کوئی ٹھوس مدد نہیں کر سکیں ۔ ۱۸۵۷ء میں مسلمانان ہند پر کیا کیا مصیبتیں نازل ہوئیں ، مگر مسلمانوں کی آزاد اور طاقت ور حکومتوں ، خاص طور پر "خلافت اسلامیہ" نے اس ظلم سے بچانے کے لیے کبھی ہندوستان پر حملہ نہیں کیا[1] ۔ غرض یہ کہ جمعیۃ علماء کے اکابر نے پاکستان کی مجوزہ اسکیم کی عقلاً اور نقلاً مخالفت کی ۔ اور دلائل سے یہ بات ثابت کی کہ ہندو اور مسلم دو قومیں ہونے کے باوجود بھی آپس میں مل جل کر رہ سکتی ہیں ۔ اور ہمیشہ رہا کرتی تھیں ۔ اگر یہ قاعدہ بنا لیا جائے کہ دو قومیں ایک ملک یا ایک سرزمین پر آباد نہیں ہو سکتیں تو سب سے پہلے پارسیوں کی ایک حکومت قائم کیجیے ۔ مولانا احمد سعید نے اعتراض کیا کہ "آخر کونسلوں ، میونسپلٹیوں ، اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں تم دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کیوں بیٹھتے ہو[2]"۔ مولانا احمد سعید نے جمعیۃ علماء ہند کی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ : "ہم پر یہ بہتان ہے کہ ہمارا نصب العین ، انگریزی راج کو ہٹا کر ہندو راج قائم کرنا ہے ۔ مولانا نے اس سلسلے میں متعدد مثالیں پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا نصب العین یہ ہے کہ ہر فریق کی (جائز اور مناسب) رائے کا احترام کیا جائے"۔ اور اگر ہم فریقین کی جائز تجاویز سے اتفاق نہ کرتے تو پھر : "ہم ۱۹۲۹ء میں سر آغا خان کی مسلم آل پارٹیز کانفرنس میں کیوں شریک ہوتے"۔ "اور اگر ہم ہندو راج قائم کرنے کے خواہشمند ہوتے تو ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کی یونٹی کانفرنس میں کیوں جاتے ؟" نیز ۳۶ - ۱۹۳۵ء میں مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ میں کیوں شریک ہوتے ؟" "ہم نے ہمیشہ مسلم حقوق سے متعلق آواز بلند کرنے میں کمی نہیں کی"۔

---

۱ - "خطبہ صدارت مولانا احمد سعید"، فروری ۱۹۴۶ء ، ص ص ۲۵-۲۹

۲ - ایضاً ، ص ص ۳۲-۳۳

اور اگر ایسا تھا تو جمعیۃ نے "ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر نشستوں کے تعین کے سلسلے میں بنگال اور پنجاب میں ۵۱ ، ۵۱ مسلم نشستوں کے تعین کے لیے کیوں حمایت کی ؟" اور اگر ہم بھی "بعض نیشنلسٹ مسلمانوں کی طرح "متحدہ قومیت" کے حامی ہوتے ، جس طرح وہ ہیں تو مسلمانوں کو "شدھ" ہونے سے بچانے کے لیے متھرا ، آگرہ کے جنگلوں میں کیوں خاک چھانتے ؟"[1] مزید برآں ۱۹۳۷ء میں کانگریسی اقتدار میں مدراس اسمبلی میں ذبیحہ گاؤ کے خلاف ایک بل پیش ہونے والا تھا ۔ جس کی اطلاع ناظم عمومی ، جمعیۃ علماء ہند کو ہوئی تو ، مولانا احمد سعید ناظم جمعیۃ نے وزیر اعلیٰ مدراس کے نام ایک تار دیا ۔ جس میں تحریر تھا کہ یہ بل ہرگز پیش نہ کیا جائے ۔ چنانچہ وہ بل روک دیا گیا ۔ اس کے علاوہ اس قسم کے سینکڑوں مذہبی اور قومی کام ہیں ، جو مولانا احمد سعید نے انجام دیے ۔ جن کا تعلق کبھی صوبجاتی ، کبھی مرکزی ، کبھی والسرائے ہند اور کبھی دیسی ریاستوں سے ہوتا تھا[2] ۔

جمعیۃ علماء ہند دہلی میں انقلاب :

سطور بالا میں یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ میں جمعیۃ علماء کے اکابر نے بڑی انتھک اور بے لوث خدمات انجام دی تھیں ۔ جس کی بنا پر مسلم لیگ نے پہلی دفعہ جمعیۃ علماء کی شرعی قیادت کو تسلیم کر لیا تھا ۔ لیکن ۱۹۳۷ء میں ، جیسے ہی کانگریس نے چھ صوبوں میں اپنی وزارتیں قائم کیں تو مولانا حسین احمد مدنی اور ان کے رفقاء نے بلا شرط و معاہدہ کانگریس میں شرکت کی اور مسلم قوم کے جداگانہ قومی تصور کو نظر انداز کر دیا[3] ۔ اس کے بعد کانگریس نے جب مسلم ماس کنٹیکٹ (مسلم عوام سے رابطہ) کی مہم شروع کی ۔ حالانکہ اس مہم سے مسلم قوم کی انفرادیت اور سالمیت پر براہ راست ضرب پڑتی تھی ۔ پھر بھی مولانا مدنی نے اس کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں ۔ حالانکہ اس کے برعکس جمعیۃ علماء ہند دہلی نے کانگریس کی واردھا ، ودیا مندر اور دیہات سدھار اسکیموں کے خلاف

---

۱ ۔ "خطبۂ صدارت مولانا احمد سعید"، فروری ۱۹۳۶ء ، ص ص ۵۶-۵۷

(نوٹ : مولانا احمد سعید نے اپنے خطبہ صدارت ، ۱۹۳۶ء میں الہ آباد کی یونٹی کانفرنس کا سن ۱۹۳۰ء بیان کیا ہے ۔ حالانکہ یہ کانفرنس ۱۹۳۲ء میں الہ آباد میں منعقد ہوئی تھی ۔)

۲ ۔ "جمعیۃ علماء کیا ہے ؟" ، حصہ اول ، ص ص ۳۳-۳۵

۳ ۔ "نظام نامہ کل ہند جمعیۃ علماء اسلام" ، ص ۲۰

مارچ ۱۹۳۹ء میں تنقید کرتے ہوئے ان اسکیموں سے اپنی نفرت اور بیزاری کا اعلان کیا تھا[1] - اور ان اسکیموں کو اسلامی تہذیب و تمدن کے خلاف قرار دیا - یہ نمایاں تبدیلی کس طرح رونما ہوئی ، یہ سطور ذیل سے واضح ہوگا[1] -

مندرجہ بالا صفحات میں یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ جمعیۃ کے ارکان میں دو گروہ ہو گئے تھے - ایک گروہ ، کانگریس کی پالیسیوں کی حمایت اور متحدہ قومیت کے نظریے کی تائید و حمایت کرتا تھا - جب کہ دوسرا گروہ ، متحدہ قومیت کے نظریے اور کانگریس کی مخصوص اصلاحی و تعلیمی پالیسیوں سے متفق نہ تھا - پہلے گروہ کے سرخیل مولانا سید حسین احمد مدنی اور دوسرے گروہ کے سرخیل مفتی کفایت اللہ تھے[2] - علاوہ ازیں ایک انقلابی جماعت نے دیوبند میں ۸ ستمبر ۱۹۲۷ء میں طلبہ کی اسٹرائک کرائی تھی - دیو بند کی یہ انقلابی جماعت بقول واصف صاحب ۱۹۲۷ء سے کام کر رہی تھی ، جس نے اپنی ناکامی کے بعد ڈابھیل کا رخ کیا - کچھ عرصے تک یہ جماعت ڈابھیل میں سرگرم عمل رہی - مگر یہاں بھی اسے خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوسکی تو پھر اس نے کلکتے کا رخ کیا - مگر کلکتے جا کر ان کی امنگیں اور بھی سرد پڑنے لگیں - بعدہ اس جماعت نے دہلی کا رخ کیا - دہلی کی آب و ہوا انقلابی جماعت کے لیے سازگار تھی - یہ انقلابی جماعت مولانا احمد سعید ، ناظم جمعیۃ کی قیادت کو ختم کرنا چاہتی تھی - بقول حفیظ الرحمان واصف (اس سلسلے کا پہلا بیان واصف صاحب کا ہے) مولانا بشیر احمد بھٹا ، رکن مرکزی ورکنگ کمیٹی ، جمعیۃ علماء ہند کا مولانا احمد سعید سے کچھ اختلاف تھا - اس اختلاف نے ایسی پیچیدہ شکل اختیار کر لی کہ حالات بگڑتے گئے ، حتی کہ مولانا احمد سعید کو ترک نظامت کے سوا کوئی چارہ نہ رہا - ۱۹۳۹ء میں صدر و ناظم جمعیۃ یعنی مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید نے استعفیٰ دے دیا[3] - مولانا بشیر احمد نے مولانا واصف کو بتایا کہ ہمارا اختلاف ناظم یعنی مولانا احمد سعید سے ہے - مفتی صاحب کو ہم کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتے - مگر مفتی صاحب ، مولانا احمد سعید کی عدم موجودگی میں صدارت کے فرائض انجام دینے کو تیار نہ تھے - غرض یہ کہ اس تبدیلی کے نتیجے میں مولانا سید حسین احمد مدنی اور مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی (بقول واصف صاحب

---

۱ - "نظام نامہ کل ہند جمعیۃ علماء اسلام" ، ص‌ص ۲۹-۳۰

۲ - ایضاً ، ص ۳۱

۳ - "مفتی اعظم کی یاد نمبر" ، ص ۲۰۲

(نوٹ : واصف صاحب نے یہ بیان نہیں کیا کہ کلکتے میں کیوں ناکامی ہوئی ؟ انقلابی جماعت نے مولانا بشیر احمد بھٹا اور مولانا احمد سعید کے اختلافات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مولانا بھٹا کا ساتھ دیا اور جمعیۃ میں انقلاب لاکر صدارت اور نظامت تبدیل کرا دی -)

۱۹۳۹ء میں) جمعیۃ کے صدر و ناظم مقرر ہوئے[1] ۔

اس ضمن میں دوسرا بیان مولانا محمد میاں کا ہے ، جنھوں نے بیان کیا ہے کہ جون ۱۹۴۰ء میں مرکزی جمعیۃ علماء کا بارہواں اجلاس جونپور میں منعقد ہوا ۔ مفتی کفایت اللہ جو تقریباً بیس سال سے جمعیۃ کے صدر تھے ، اپنی دائمی علالت کی وجہ سے آئندہ اپنے عہدے پر کام کرنے کے لیے تیار نہ تھے ۔ لہٰذا مولانا مدنی کو جمعیۃ کا مستقل صدر مقرر کر دیا گیا[2] ۔

اس سلسلے کا ایک تیسرا بیان مولانا سید محمد قریش شمسی کا ہے ۔ آپ کا کہنا ہے کہ جمعیۃ علماء ہند دہلی میں انقلاب رونما ہوا ۔ کیونکہ مولانا مدنی نے ایک قومیت اور "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" کے اصول کی حمایت کی ۔ جب کہ مفتی کفایت اللہ اور ان کے رفقاء اس عقیدے سے متفق نہ تھے ۔ مگر وہ اس کے خلاف بولتے بھی نہ تھے ۔ کیوں کہ ان کے اپنے خیال میں اس بات کا خطرہ تھا کہ شاید اس طرح آپس کے نفاق سے جمعیۃ علماء ہند ٹوٹ جائے ۔ چنانچہ "حسینی پارٹی" نے مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید کو معزول کر دیا ۔ اور مولانا مدنی اور مولانا سیوہاروی کو علی الترتیب صدر و ناظم منتخب کر لیا[3] ۔

یہ تینوں بیانات کسی حد تک متضاد اور کسی حد تک مختلف ہیں ۔ ان میں سب سے کمزور بیان مولانا محمد میاں کا ہے ۔ یہ امر بالکل واضح ہے کہ مولانا محمد میاں نے جمعیۃ علماء کے اندرونی اختلافات کی پردہ پوشی کی خاطر مفتی صاحب کی "دائمی علالت" کی آڑ لی ہے ۔ مولانا محمد میاں نے ان تبدیلیوں کا جو زمانہ بتایا ہے وہ بھی غلط ہے ۔ بقیہ دونوں بیانوں کو اس زمانے کی سیاست کے پس منظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کانگریسی وزارتوں کی تشکیل کے بعد اکابر جمعیۃ علماء میں اختلاف رونما ہوا ۔ جو بڑھتے بڑھتے شدت اختیار کر گیا ۔ جس کے نتیجے میں صدارت اور نظامت میں بھی تبدیلی رونما ہوئی ۔ اور یہ تبدیلی ۱۹۳۹ء میں عمل میں آ گئی ۔ جیسا کہ دیگر ذرائع سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید

---

۱ ۔ حفیظ الرحمان واصف، "مفتی اعظم کی یاد نمبر" ، دہلی ، ص ص ۲۰۲ - ۲۰۳

۲ ۔ "علماء حق" ، حصہ دوم ، ص ۱۳۰

(نوٹ : یہ امر واضح ہے کہ مولانا محمد میاں نے جمعیۃ علماء کے اختلاف کی پردہ پوشی کرنے کی خاطر مفتی صاحب کی دائمی علالت کی آڑ لی ہے ۔)

۳ ۔ "نظام نامہ کل ہند جمعیۃ علماء اسلام" ، ص ۳۱

تقریباً بیس سال تک صدارت اور نظامت پر مامور رہے ۔ ان کی یہ مدت ۱۹۱۹ء سے ہی شروع ہوتی ہے ۔ جب کہ جمعیۃ علماء کی تشکیل عمل میں آئی تھی ۔ بہر حال مولانا مدنی اور مولانا سیوہاروی کے صدر و ناظم مقرر ہونے کے بعد جمعیۃ کی پالیسیوں میں بھی نمایاں تبدیلی رونما ہوئی ۔ کانگریسی حکومتوں کے قیام کے بعد جمعیۃ کے اکابر دو خیالوں اور مختلف نظریات میں بٹ گئے تھے ۔ اب ان کا رخ ایک سمت کی جانب متعین ہو گیا ۔ یعنی یہ کہ کانگریس کی پالیسیوں کی حمایت اور کانگریس کے ساتھ بلا شرط و معاہدہ ، اشتراک و اتحاد ، جمعیۃ کا اصول بن گیا ۔ چنانچہ اس درمیان میں مندرجہ ذیل خاص خاص تبدیلیاں رونما ہوئیں :۔

۱ ۔ کانگریسی حکومتوں نے اپنے صوبوں میں مسلمانوں کو من حیث القوم نظر انداز کر کے خالص کانگریسی وزارتیں قائم کیں ۔ جمعیۃ علماء ہند کے حسینی گروہ نے اس کی تائید کی ۔ بلکہ حافظ محمد ابراہیم نے ، جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کی نشست پر کامیاب ہوئے تھے (حسب تفصیل سابق) مولانا مدنی کی منظوری سے کانگریس کے عہد نامے پر دستخط کیے اور بلا شرط و معاہدہ کانگریس کی تائید و حمایت کر کے وزارت حاصل کی[1] ۔ بعدہٗ حافظ صاحب نے مسلم لیگ کی ممبری سے استعفا دے کر اکتوبر ، نومبر ۱۹۳۷ء میں ضمنی انتخاب لڑا اور مولانا مدنی کی پشتیبانی نیز اپنے ذاتی اثرات سے کامیاب ہو کر کانگریس کے ساتھ شانہ بشانہ کام کرتے رہے[2] ۔

۲ ۔ ۱۹۳۷ء میں ، مسلم لیگ اور کانگریس کے مابین کولیشن (مخلوط) حکومت کی شرائط طے نہ ہونے پر جب معاہدہ نہ ہو سکا ، تو اس کے بعد کانگریس نے مسلم ماس کنٹیکٹ یعنی مسلم عوام سے رابطہ کی مہم شروع کی ۔ مولانا مدنی نے اس کی تائید و حمایت کی حالانکہ مفتی کفایت اللہ اور مولانا سجاد بہاری وغیرہ مسلم ماس کنٹیکٹ کی مہم کے خلاف تھے[3] ۔

۳ ۔ کانگریس نے اپنے دور اقتدار میں ، تعلیمی اور اصلاحی اسکیمیں رائج کیں ، جو کانگریسی صوبوں میں حکومت کی زیر نگرانی جاری ہوئیں ۔ مولانا مدنی نے ان

---

۱ ۔ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ص ۳۶۳-۳۶۴ ؛
"نظام نامہ کل ہند جمعیۃ علماء اسلام" ، ص ص ۳۷-۳۸

۲ ۔ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، ص ص ۳۶۴-۳۶۵ ؛ *Pathway to Pakistan*, pp. 176-77.

۳ ۔ "نظام نامہ کل ہند جمعیۃ علماء اسلام" ، ص ص ۳۷-۳۸ ؛
The Struggle for Pakistan, pp. 94-95.

اسکیموں کی بھی تائید و حمایت کی[1] ۔

۳ - ۱۹۳۷ء میں جب کانگریس نے مسلم لیگ کو کولیشن یعنی مخلوط حکومت میں شامل ہونے کے لیے غیر مناسب اور ناقابل قبول شرائط پیش کیں تو مسلم لیگ نے مسلمانان ہند کے آئینی حقوق کے تحفظ کے لیے ملی جد و جہد شروع کی اور مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا علم بلند کیا اور عوام سے براہ راست رابطہ قائم کرنا شروع کیا ۔ مولانا مدنی اور ان کے ہم خیال علماء نے ، مسلم لیگ کی اس مہم کے خلاف کام کیا اور مسلم لیگ کی مخالفت بھی کی ۔ اور بالآخر انھوں نے اپنی قوت "جداگانہ قومیت" کی تعمیر کی مخالفت میں لگا دی ۔ نیز گاندھی ازم کی "متحدہ قومیت" کے حامی اور موید بن کر ہندو مسلم ایک قوم کا نعرہ بلند کرنے لگے[2] ۔

مولانا مدنی نے "متحدہ قومیت" کی حمایت میں قرآن کریم کی آیات بینات اور احادیث شریف پیش کیں ۔ اور اس ضمن میں رسول اکرم (صلعم) اور یہودیوں کے مابین عہد نامے کا ذکر کرتے ہوئے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی کہ رسول (صلعم) نے مسلمانوں اور یہودیوں کو ملا کر ایک قوم بنایا تھا ۔ اور دشمنوں کے مقابلے کے لیے دونوں قومیں متحد ہوئیں ۔ لہذا :

"مسلمانوں کا غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ایک قوم بننا یا بنانا نہ تو نفس دین میں خلل انداز ہے اور نہ یہ امر فی نفسہٖ اسلامی قوانین اجتماعیہ کے خلاف ہے مسلمان اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے ان غیر مسلموں کے ساتھ مل کر جو کہ اپنے دین پر قائم ہیں ایک قوم ہو سکتے ہیں اور زمانہ ہائے سابقہ میں ایک قوم رہے بھی ہیں ۔ اسلام اپنے اندر ایک ایسی لچک رکھتا ہے بالخصوص اس کا مقابلہ کسی دشمن سے ہو اور زمانہ اس بات کا متقاضی ہو کہ اپنے اندر بیش از بیش قوت پیدا

---

۱ - "نظریۂ قومیت اور مولانا حسین احمدمدنی" ، ص ۴۲؛
"متحدہ قومیت اور اسلام" ، ص‌ص ۴۲-۴۳؛
"تحریک آزادی ہند اور مسلمان" ، ص‌ص ۴۵۸-۴۵۹؛
"کانگریس و مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ"، ص‌ص ۳۰-۳۱؛
"ہمارا پاکستان" ، ص‌ص ۲۲-۲۳

2. Jawaharlal Nehru, *Discovery of India*, Calcutta, *etc.*, 1946-61, pp. 396-97;
Aziz Beg, *The Quiet Revolution*, Karachi, 1959, p. 33;
Mr. Jinnah's Presidential Address, December 1938, pp. 6-7;
"انتظام نامہ کل ہند جمعیۃ علماء اسلام" ، ص ۴۸

کی جائے اور دشمن کو شکست دی جائے"[1] ۔

مختصراً یہ کہ "حسینی پارٹی" نے جمعیۃ علماء ہند کی قیادت میں انقلاب پیدا کیا اور مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید کو صدارت اور نظامت کے عہدوں سے معزول کرکے ، جمعیۃ کی قیادت خود سنبھالی ۔ اس دوران میں بر صغیر کے سیاسی حالات روز بروز تبدیل ہو رہے تھے ۔ کانگریسی حکومت نے اپنے ڈھائی سالہ دور میں ہندو راج قائم کرنے کی تخم ریزی کی ۔ لیکن مولانا مدنی اور ان کے رفقاء نے کانگریس کی سیاسی پالیسیوں کی نہ صرف تائید و حمایت کی بلکہ گاندھی ازم کے منصوبوں (جن میں خاص طور پر "ہندوستانی قومیت" کا تخیل تھا) کو بروئے کار لانے میں ہمہ قسم کی اعانت بھی کی ۔

جمعیۃ علماء کا یہ انقلاب بڑے دور رس نتائج کا حامل تھا ۔ جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے متحدہ قومیت کی تائید کا نتیجہ یہ نکلا کہ جمعیۃ علماء کو جمہور مسلمانان کے دلوں پر جو اثر اور اقتدار حاصل تھا وہ بہت جلد زائل ہو گیا اور مسلم لیگ کی نئی قیادت کو جمعیۃ علماء کا حلقہ اثر توڑنے میں زیادہ دقت نہ ہوئی ۔ قرین قیاس ہے کہ اگر جمعیۃ علماء جداگانہ مسلم قومیت کے اصول پر مضبوطی سے قائم رہتی تو مسلم لیگ کے سیاسی فکر میں مذہب کا عنصر زیادہ قوی ہوتا ۔ یہ امر واقعہ ہے کہ لیگ کی سیاسی قیادت اور جمعیۃ کی مذہبی قیادت کا تصادم مسلمانوں کے لیے بڑے دور رس زیاں کا حامل تھا ۔

مسجد شہید گنج اور مسئلہ فلسطین میں مسلم لیگ اور احرار اسلام کا تعاون :

ماسبق میں مسجد شہید گنج کے متعلق مختصراً بیان کیا جا چکا ہے ۔ یعنی یہ کہ وہ مسجد ۱۹۳۵ء میں گورنر پنجاب کے حکم سے شہید کی گئی تھی ۔ اس زمانے میں مسٹر جناح انگلینڈ سے آئے ہوئے تھے ۔ اور مسلم لیگ کی تنظیم نو اور انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت عام انتخابات میں حصہ لینے کی مہم چلانے والے تھے ۔ مسلمانان ہند عموماً اور مسلمانان پنجاب خصوصاً اس سانحہ کی بناء پر بہت مضطرب اور بے چین تھے ۔ مسٹر جناح کی ذاتی کوششوں سے اس وقت یہ مسئلہ عارضی طور پر دب گیا تھا ۔ مگر مسلمانان پنجاب کی خواہشات کے مطابق مسجد شہید گنج کا فیصلہ نہ ہوا تھا ۔ نیز مسلمانوں میں بے چینی باقی تھی ۔ چنانچہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے فیصلہ کیا کہ ۱۸ فروری ۱۹۳۸ء کو پورے ملک میں "یوم شہید گنج" منایا جائے ۔ پورے ہندوستان میں مسلم لیگ کی

---

۱ ۔ "متحدہ قومیت اور اسلام" ، ص ص ۴۹-۵۱؛
"تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء" ، ص ۲۰۲

قرارداد پر عمل کیا گیا ۔ سر سکندر حیات خان وزیر اعلیٰ[1] پنجاب نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ میں اور میری حکومت اس سلسلے میں کوشش کرے گی کہ یہ مسئلہ دونوں فریقین ، یعنی مسلمانوں اور سکھوں کے مابین خوش اسلوبی سے طے ہو جائے[1] ۔

اسی درمیان میں مجلس احرار کے سکریٹری نے اعلان کیا کہ مسجد شہید گنج لاہور اور فلسطین و دیگر اہم اسلامی مسائل پر غور کرنے کے لیے صوبائی مجلس احرار اسلام کانفرنس کا اجلاس بصدارت صاحب زادہ فیض الحسن ۲۱ ، ۲۲ مارچ ۱۹۳۸ء بمقام دہلی منعقد ہوگا ۔ سکریٹری ہذا نے اس اجلاس میں شرکت کے لیے دیگر علماء اور عوام کے علاوہ ، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی ، مفتی کفایت اللہ ، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ، صدر مجلس احرار اسلام ، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ، مولانا عبدالحکیم لکھنوی ، مولانا حامد اللہ انصاری غازی ، شیخ حسام الدین اور مولوی محمد کاظمی وغیرہ کی شرکت کی توقع ظاہر کی[2] ۔ افضل حق ، صدر مجلس احرار کے صدارتی خطبہ مورخہ ۷ تا ۹ اپریل ۱۹۳۹ء سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ مذکورہ اجلاس منعقد ہوا ۔ اور اس جلسے نے حسب سابق یعنی ۱۹۳۵ء کی طرح اس دفعہ بھی حکومت سے پر زور احتجاج کیا کہ مسئلہ مسجد شہید گنج اور مسئلہ فلسطین کو مسلمانوں کی حسب خواہش طے کیا جائے ۔ مزید برآں اس احتجاج کے نتیجے میں سر سکندر حیات خان وزیر اعلیٰ پنجاب نے مسلمانوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مسجد شہید گنج واپس دلانے کے لیے ، اسمبلی میں کوشش کریں گے ۔ مگر یہ وعدہ انھوں نے ۱۹۳۹ء تک پورا نہیں کیا ۔ اس لیے افضل حق نے اپنے مندرجہ بالا خطبہ میں مجلس احرار اسلام کی وہ قربانیاں یاد دلائیں جو انھوں نے ۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج کے سلسلے میں کی تھیں[3] ۔

غرض یہ کہ مسلمانان ہند مسجد شہید گنج کے واقعہ ہائلہ سے بہت متاثر تھے ۔ لیکن آئینی حدود میں رہ کر اس کے منصفانہ اور قابل عمل حل کی تلاش میں تھے ۔ اس لیے مسلم لیگ اور احرار اسلام (جس میں جمعیۃ علماء کے کچھ اکابر بھی شریک تھے) اس مسئلے کے حل کرانے میں اپنی پوری قوت اور صلاحیتیں صرف کر رہے تھے ۔ علاوہ ازیں

---

1. *Mr. Jinnah's Presidential Address*, April 1938, pp. 3-6.

۲ ۔ "یونیورسٹی گزٹ" ، ۱۹ مارچ ۱۹۳۸ء ، ج ۲ ، نمبر ۷ ، ص ۱۰ ، ک ۱

(نوٹ : "یونیورسٹی گزٹ" جس میں اس جلسے کے اعلان کا ذکر ہے اس میں اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ یہ جلسہ منعقد ہوا تھا یا نہیں ۔ گمان غالب یہی ہے کہ یہ جلسہ منعقد ہوا تھا ۔)

۳ ۔ "خطبات احرار" ، ص‌ص ۱۵ اور ۲۸-۲۹

مسئلہ فلسطین کے منصفانہ حل کے سلسلے میں مجلس احرار اسلام اور مسلم لیگ پورے انہماک کے ساتھ کوشاں تھی کہ یہ مسئلہ عربوں کی خواہشات کے مطابق طے ہو جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں مسٹر جناح نے دسمبر ۱۹۳۸ء کے سالانہ اجلاس میں اپنے خطبۂ صدارت میں فلسطین کے مسئلے پر مسلمانان ہند کی توجہ مرکوز کراتے ہوئے کہا کہ : "عرب اپنی قومی آزادی کے لیے کوشش کر رہے ہیں، ہم مسلمانان ہند ان کے جائز اور بنیادی مطالبات میں ان کے ساتھ ہیں اور اگر ضرورت پیش آئی تو ہم ہمہ قسم کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کریں گے اور اپنے عرب بھائیوں کی ہر طرح مدد کریں گے"[1]۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مسجد شہید گنج کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہوا یا نہیں ۔

علامہ اقبال ، مولانا حسین احمد مدنی اور متحدہ قومیت :

حسب تفصیل سابق مولانا مدنی متحدہ قومیت کے موید و حامی تھے ۔ جب کہ علامہ اقبال اس کے مخالف تھے - ۳۸-۱۹۳۷ء کے درمیان علامہ اقبال اور مولانا مدنی کے مابین "متحدہ قومیت" کے موضوع پر خط وکتابت ہوئی ۔ طالوت صاحب (مرتب "نظریۂ قومیت اور مولانا حسین احمد مدنی و علامہ اقبال") اس خط وکتابت کا واسطہ بنے ۔ طالوت صاحب کی کوششوں سے ہی علامہ اقبال نے ۲۸ مارچ ۱۹۳۸ء کو مولانا حسین احمد مدنی کے بیان پر اپنا اعتراض واپس لے لیا تھا ۔ مولانا مدنی کا بیان اخبار "لاہور" میں ۲۸ مارچ ۱۹۳۸ء کو شائع ہوا تھا ۔ جس میں مختصراً یہ بات بیان کی گئی تھی کہ : "میں نے مسلمانوں کو وطنی قومیت قبول کرنے کا مشورہ نہیں دیا"۔ جس کے جواب میں علامہ اقبال نے کہا کہ : "مجھے اس اعتراف کے بعد مولانا پر اعتراض کا حق نہیں رہتا"[2]۔ مولانا مدنی نے اپنی کتاب "متحدہ قومیت اور اسلام" میں اپنے نقطۂ نگاہ کی مزید وضاحت فرمائی ہے ۔ جس کی تفصیلات سطور بالا میں گزر چکی ہیں ۔ علامہ اقبال اس خط و کتابت کے اختتام کے کچھ ہی عرصے بعد اپریل ۱۹۳۸ء میں فوت ہوگئے[3] ۔

---

1. *Mr. Jinnah's Presidential Address*, December 1938, pp. 8-9.

۲ - "نظریۂ قومیت اور مولانا حسین احمد مدنی و علامہ اقبال" ، ص ص ۳٦-۳۸

۳ - "طلوع اسلام" (ماہنامہ) ، اقبال نمبر ، مئی ۱۹۳۸ء ، ج ۲ ، ش ۱ ، ص ص ٦-۷؛
"نظریۂ قومیت اور مولانا حسین احمد مدنی و علامہ اقبال" ، ص ص ۳٦-۳۸

مسلم لیگ ، پیر پور اور شریف رپورٹ :

کانگریسی وزارتوں نے اپنے اپنے صوبوں میں اقلیتوں اور خصوصاً مسلمانوں کے ساتھ جو امتیازی سلوک روا رکھا اور دین و مذہب کے سلسلے میں جو مداخلت کی ، اس کی تحقیق کے لیے مسلم لیگ نے مندرجہ ذیل دو کمیٹیاں حسب تفصیل ذیل مقرر کیں :

مسلم لیگ نے اپنے اجلاس منعقدہ اپریل ۱۹۳۸ء میں ایک کمیٹی بنام "پیر پور کمیٹی" مقرر کی - جس کے چیئرمین راجہ محمد مہدی تعلقہ پیر پور تھے - اور دیگر ممبران میں مسٹر اے - پی - حبیب اللہ معتمد ، خان بہادر حاجی رشید احمد ، سید اشرف احمد ، مولوی عبدالغنی (ایم ایل اے) ، میاں غیاث الدین (ایم ایل اے) ، سید ذاکر علی ، سید حسن ریاض ، سید تقی ہادی نقوی شامل تھے - چونکہ اس کمیٹی کے چیئرمین تعلقہ پیر پور کے راجہ تھے - اس لیے ان کی نسبت سے اس رپورٹ کا نام "پیر پور رپورٹ" معروف ہوگیا - اس کمیٹی نے اپنی تحقیقات مکمل کرنے کے بعد ۱۵ نومبر ۱۹۳۸ء کو اپنی رپورٹ مسلم لیگ کو پیش کر دی -[1] "پیر پور رپورٹ" ۴۷ صفحات پر مشتمل تھی - جس میں کانگریس کے دور اقتدار میں مسلم اقلیت پر ہونے والے مظالم کی تفصیلات درج تھیں[2] - صوبائی مسلم لیگ بہار نے بھی اسی طرح کی ایک کمیٹی مسلمانان بہار کے ساتھ کی جانے والی نا انصافیوں اور مظالم کی تحقیقات کے لیے مقرر کی ، جو "شریف کمیٹی" کے نام سے معروف ہے - اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ مارچ ۱۹۳۹ء میں پیش کی[3] - افسوس ہے کہ جمعیۃ علماء ہند یا "الجمعیۃ" کا ان کمیٹیوں کے بارے میں کوئی تبصرہ یا تنقید دستیاب نہ ہو سکی - مگر مولانا سجاد بہاری کا بیان ، جس کا اقتباس مولانا احمد سعید نے اپنے صدارتی خطبہ میں پیش کیا ہے ملا ہے ، اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ مولانا بہاری نے اس بات پر تنقید کی تھی کہ مسلم لیگ ، کانگریس کے دور اقتدار میں ، مظالم ، مظالم تو پکارتی رہی ،

---

1. *Mr. Jinnah's Presidential Address*, December 1938, p. 7 ;
Pakistan : The Formative Phase, 2nd ed., p. 97.

(نوٹ : چودھری خلیق الزمان نے اس کمیٹی کا تقرر مارچ ۱۹۳۸ء میں بیان کیا ہے جو خلاف واقعہ ہے)

2. *The Struggle for Pakistan*, p. 100. ; *Pathway Pakistan*, p. 228 ;
Rare Documents, pp. 151-52; "ہماری قومی جد و جہد" ، ص ص ۲۳۲-۲۳۳

۳ - "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ، ص ۳۸۱ مع حاشیہ ؛
Pathway to Pakistan, p. 228; *The Struggle for Pakistan*, p. 100.

مگر اس کا کوئی خاطر خواہ حل یا مناسب سدباب پیش نہ کر سکی[1] -

سطور بالا میں یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ صوبائی جمعیۃ علماء ہند اور مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی بہار کی کوششوں سے صوبہ بہار میں ہندی کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی سرکاری عدالتوں میں رائج کرا دیا تھا - جس کی توثیق کانگریسی وزارت نے بھی کر دی تھی[2] - مندرجہ بالا بحث سے یہ نتیجہ اخذ کرنا آسان ہے کہ جمعیۃ علماء ہند بھی ملک میں اردو کو سرکاری زبان تسلیم کرانا چاہتی تھی - مگر وہ اس کام کو کانگریس کے ساتھ مفاہمت اور اشتراک کے جذبہ کے تحت انجام دینا چاہتی تھی - دوسری طرف مسلم لیگ بھی اردو کو بہ حیثیت ایک قومی زبان محفوظ کرانا چاہتی تھی - چنانچہ اس نے یعنی آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے سالانہ اجلاس ۱۹۳۷ء منعقدہ لکھنؤ میں بقول مدیر "علی گڑھ گزٹ"، "عمر میں پہلی مرتبہ اردو کے متعلق قرار داد منظور کی"[3] -

مسلم لیگ کا موقف یہ تھا کہ: "مسلم ثقافت، تہذیب اور تمدن کی بقا اور حفاظت کے لیے اردو کا زندہ رہنا ضروری ہے - ورنہ مسلم قوم دوسری قوم میں ضم ہو کر اپنے اسلاف سے منقطع ہوتی چلی جائے گی"[4] -

---

فصل چہارم

نظریۂ پاکستان اور علماء دیوبند

برصغیر میں ایک جدا گانہ مسلم ریاست کے قیام کا تخیل مختلف ایام میں مختلف شکلوں اور نوعیتوں میں سامنے آتا رہا - مگر اصل میں اس کی صحیح نشو و نما اور آب یاری اس وقت شروع ہوئی جب ۱۹۳۷ء کے عام انتخابات کے بعد کانگریسی حکومتوں نے اپنے اکثریتی صوبوں میں ہندو راج قائم کرنے کے منصوبوں کو (جو در پردہ طور پر عرصے سے کار فرما تھے -) عمل میں لانے کی تدابیر اختیار کیں -

---

۱ - "خطبہ صدارت مولانا احمد سعید"، فروری ۱۹۳۶ء، ص ص ۲۵-۲۷

۲ - "جمعیۃ علماء کیا ہے ؟"، حصہ اول، ص ص ۳۹-۴۰

۳ - "مسلم یونیورسٹی گزٹ"، یکم نومبر ۱۹۳۷ء، ص ۳، ک ۱-۲ (اداریہ)

۴ - "تحریک آزادی ہند اور مسلمان"، ص ص ۳۳۵-۳۳۷

سطور بالا میں یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ مسلم لیگ کی حمایت اور مخالفت میں علماء کے تین گروہ ہوگئے تھے - جن میں سے ایک گروہ کے سرخیل مولانا اشرف علی تھانوی تھے - یہ کلیتاً مسلم لیگ کی تائید و حمایت کرتا تھا - پروفیسر انوار الحسن نے مولانا اشرف علی تھانوی کی ایک پیشین گوئی بیان کی ہے - جو موصوف نے ۱۹۳۸ء میں مولانا شبیر احمد عثمانی کے سامنے کی تھی - وہ یہ کہ مسلم لیگ والے اپنی جد و جہد میں کامیاب ہو جائیں گے - اور "جو سلطنت ملے گی - وہ ان ہی لوگوں کو ملے گی - جن کو آج سب فاسق و فاجر کہتے ہیں" - لٰہذا کوشش کرنی چاہیے کہ یہی لوگ دین دار بن جائیں - مولانا نے مزید کہا تھا کہ آج کل حالات ایسے ہیں کہ اگر مولویوں کو سلطنت مل بھی جائے تو وہ اسے چلا بھی نہ سکیں گے[1] - لٰہذا مولانا تھانوی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ مسلم لیگ کے ارباب اقتدار کو اسلام کا نظریہ حیات سمجھانے کے لیے "تبلیغ" کی ضرورت ہے - اسی لیے موصوف نے مسٹر جناح کے پاس مولانا شبیر احمد عثمانی کی قیادت میں کچھ "تبلیغی وفود" بھیجے - قبل اس کے کہ ان تبلیغی وفود کی تفصیلات پیش کی جائیں ، مولانا تھانوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کا مختصر سا تعلق بیان کرنا ضروری ہے -

مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا عثمانی ، دونوں حضرات مدرسہ دیوبند سے فارغ التحصیل تھے - حسن اتفاق سے دونوں حضرات شیخ الہند سے فیض یافتہ تھے - علامہ عثمانی نے شیخ الہند کی اسارت کے زمانے میں ، شیخ الہند کی رہائی کے لیے کوششیں کیں - نیز شیخ الہند کی نیابت کرتے ہوئے تقاریر کیں - مولانا تھانوی اور مولانا عثمانی کانگریس کی مسلم آزار پالیسیوں سے بے زار و متنفر تھے ، اور کانگریس کے ساتھ بلا شرط و معاہدہ اشتراک و اتحاد کے حق میں نہ تھے - ۱۹۳۷ء میں عام انتخابات کے نتیجے میں جب چھ صوبوں میں کانگریس نے اپنی وزارتیں قائم کیں تو پھر اس کی مسلم آزار پالیسی کھل کر سامنے آئی - لٰہذا دونوں حضرات نے واضح طور پر مسلم لیگ کی تائید و حمایت کی[2] -

مولانا اشرف علی تھانوی اور مسٹر جناح کی دینی تربیت :

مولانا تھانوی کا یہ خیال تھا کہ مسلم حکومت ، مسلم لیگیوں کو ملے گی - اور یہ لوگ دین سے کماحقہ' واقف نہیں ہیں - لٰلہذا کوشش کرنا چاہیے کہ یہی لوگ دین دار

---

۱ - "حیات امداد اللہ" ، ص ص ۲۳-۲۴

(نوٹ : مولانا تھانوی نے پاکستان بن جانے کی پیش گوئی ۱۹۴۰ء کی قرار داد پاکستان سے دو سال قبل کی تھی) -

۲ - "نیس بڑے مسلمان" ، ص ص ۳۱۱ ، ۳۶۰ ، ۳۶۱ ، ۵۴۲ اور ۵۵۲

ان جائیں[1] ۔ چنانچہ مولانا تھانوی نے ، مسٹر جناح کے پاس اس سلسلے میں حسب ذیل تبلیغی وفود بھیجے :-

۱ ۔ مولانا تھانوی نے مولانا شبیر احمد عثمانی کو حکم دیا کہ وہ مسلم لیگ لیڈروں پر "تبلیغ" کریں ۔ یعنی ان کی دینی تربیت کریں ۔ اس سلسلے کا پہلا وفد ۲۳ دسمبر ۱۹۳۸ء کو مولانا مرتضیٰ حسن کی قیادت میں مسٹر جناح کے پاس بھیجا ۔ اس وقت مولانا عثمانی اپنی والدہ کی علالت کی بناء پر وفد کی قیادت کرنے سے معذور تھے ۔ اس وفد نے مسٹر جناح کو نماز پڑھنے کی تلقین (تبلیغ) کی ۔ مسٹر جناح نے جواباً کہا کہ :

"میں گنہگار ہوں ، خطاوار ہوں ، آپ کو حق ہے کہ مجھے کہیں ۔ میرا فرض ہے کہ اس کو سنوں ۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ نماز پڑھوں گا"[2] ۔

دوسرا وفد ۱۲ فروری ۱۹۳۹ء کو مولانا شبیر احمد عثمانی کی قیادت میں مسٹر جناح سے دہلی میں ملا ۔ اس وفد میں مولانا عثمانی کے ہمراہ مفتی محمد شفیع اور مولانا ظفر احمد عثمانی بھی شامل تھے ۔ سیاست اور مذہب کے موضوع پر گفتگو ہوئی ، گفتگو کے اختتام پر مسٹر جناح نے کہا کہ : "دنیا کے کسی مذہب میں سیاست مذہب سے الگ ہو یا نہ ہو میری سمجھ میں اب خوب آ گیا ہے کہ اسلام میں سیاست مذہب سے الگ نہیں بلکہ مذہب کے تابع ہے[3] ۔"

تیسرا وفد ، مولانا عثمانی کی قیادت میں مسٹر جناح سے پھر ملا ، دوران ملاقات ، ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم وائس چانسلر ، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ بھی وہاں موجود تھے ۔ مسٹر جناح نے ، مولانا عثمانی سے کہا کہ مجھے : "آپ کے ذریعہ خاص مذہبی معلومات

---

۱ ۔ "حیات امداد اللہ" ، ص ص ۲۳-۲۴

(نوٹ: پروفیسر انوارالحسن مصنف "حیات امداد اللہ" نے بصراحت "تبلیغی وفود" لکھا ہے ۔ مگر اس جگہ لفظ "تبلیغی وفود" چسپاں نہیں ہوتا ۔ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان وفود کو دینی تربیت کے نام سے موسوم کیا جائے ۔ راقم)

۲ ۔ "حیات امداد اللہ" ، ص ص ۲۳-۲۵

۳ ۔ ایضاً ، ص ۲۵

حاصل ہوئی ہیں ۔ جو اور جگہ نصیب نہیں ہوئیں ۔ اگر آپ کو کچھ اور کہنا ہو تو بیٹھ جائیے مجھے کوئی جلدی نہیں ہے ۔ میں بڑے شوق سے سنوں گا[1] ۔ غرض یہ کہ مولانا تھانوی نے ، مسٹر جناح کی دینی اصلاح کے لیے مولانا شبیر احمد عثمانی کو مامور کیا جنھوں نے احسن طریقہ پر اپنا فرض ادا کیا ۔ (ان تبلیغی وفود کے بارے میں تمام تر مواد ایک ہی مآخذ سے ملا ہے ، لیکن اس بیان کی صحت پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں) یہ امر ملحوظ رہے کہ مسٹر جناح خوجہ شیعہ ہونے کے باوجود اسلامی عبادات کو سنی مسلمانوں کے ساتھ مل کر ادا کرتے تھے[2] ۔

دوسری جنگ عظیم ، کانگریسی وزارتوں کا استعفا اور مسلم لیگ کا یوم نجات :

ستمبر ۱۹۳۹ء کو یورپ میں لڑائی شروع ہوئی ، جس نے بہت جلد عالمی جنگ کا نقشہ اختیار کر لیا ۔ اور ہندوستان بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا ۔ کیونکہ برطانیہ بھی اس جنگ میں ایک فریق کی حیثیت سے شامل تھا ۔ اعلان جنگ کے بعد ، کانگریس نے وزارتوں سے اس بنا پر استعفا دے دیا کہ حکومت ہند نے ان سے بغیر مشورے کے اعلان جنگ کر دیا تھا ۔ مسلمانان ہند کانگریس کے ڈھائی سالہ دور اقتدار میں ، نا انصافیوں اور زیادتیوں کا شکار ہوئے ، مسلم لیگ کی قائم کردہ تحقیقاتی کمیٹی نے کانگریس کے جائز و ناجائز ، ظلم و زیادتی کی رپورٹ مرتب کر کے عوام کے سامنے تفصیلات پیش کیں ۔ چنانچہ مسلم لیگ نے کانگریسی وزارتوں کے مستعفی ہونے پر ، حسب ہدایت مسٹر جناح ۲۲ نومبر ۱۹۳۹ء کو پورے ملک میں "یوم نجات" منایا[3] ۔ یوم نجات کے بارے میں جمعیۃ علماء کا کوئی بیان یا اعلان دستیاب نہ ہو سکا ۔ ۱۹۳۹ء میں چونکہ حسینی پارٹی جمعیۃ علماء میں بر سر اقتدار آ گئی تھی اس لیے یہ امر یقینی ہے کہ جمعیۃ یوم نجات سے الگ تھلگ رہی ہوگی ۔ کانگریس کے تیس ماہ کے دور اقتدار نے مسلمانان ہند کو اس بات کے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنا ایک علیحدہ ملک یا ریاست بنائیں ، تا کہ مستقبل میں ، جب کہ ہندوستان کلیتاً آزاد ہو جائے گا تو اس بات کا اغلب امکان تھا کہ مسلم قومیت کی انفرادیت اور تہذیب و تمدن ، ہندو قومیت میں یا تو ضم ہو جائے گی یا پھر اسے قانوناً ختم کر دیا جائے گا ۔

---

۱ ۔ "حیات امداد اللہ"، ص ۲۵ (بحوالہ "روئیداد تبلیغ" ، ص ص ۹۰۸)

2. *Pakistan: The Formative Phase*, 2nd ed., pp. 195-96.

3. *Discovery of India*, p. 399; *Pathway to Pakistan*, p. 228; *Modern Muslim India and The Birth of Pakistan*, p. 364.

قرار داد پاکستان :

پاکستان کے قیام کا تخیل عرصے سے مسلمانان ہند کے ذہنوں میں پیدا ہو چکا تھا۔ اور مختلف ادوار میں زعماء ملت اس تخیل کو کسی نہ کسی شکل میں پیش کرتے رہے، ڈاکٹر اقبال کے خطبہ الہ آباد اور چودھری رحمت علی کی تحریک کے آغاز کے بعد اس کی واضح شکل سب سے پہلے اس قرار داد میں ملتی ہے جو صوبہ سندھ کی مسلم لیگ نے ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو اپنے صوبائی اجلاس میں پاس کی[1] ۔ مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء سے قبل ۲۷ اگست اور ۱۷ و ۱۸ ستمبر اور ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء اور ۳ فروری ۱۹۴۰ء کو اسی طرح کی قرار دادیں پاس کیں ۔ پھر مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے آئینی مسائل کے حل سے متعلق جو رویہ اختیار کیا تھا اسے آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے اجلاس ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء منعقدہ لاہور، بصدارت مسٹر جناح منظور کیا[2] ۔ پاکستان کی یہ قرار داد مسٹر اے ۔ کے ۔ فضل الحق وزیر اعلیٰ بنگال نے پیش کی تھی، جو بہ اتفاق آراء منظور ہوئی ۔ اس کا متن حسب ذیل ہے :-

> **"Resolved that it is the considered view of this session of the All India Muslim League that no constitutional Plan would be workable in this country or acceptable to the Muslims unless it is designed on the following basic principles, viz., that geographically contiguous units are demarcated into regions which should be so constituted, with such territorial re-adjustments as may be necessary, that the areas in which the Muslims are numerically in a majority as in the North-Western and Eastern Zones of India should be grouped to constitute 'Independent States' in which the constituent units shall be autonomous and sovereign."[3]**

> **Furthermore, "that adequate, effective and mandatory safeguards should be specifically provided in the constitution for minorities in these units for the protection of their religious,**

---

1. ***Modern Muslim India and The Birth of Pakistan*, p. 129;**
   ***Mr. Jinnah's Presidential Address*, March 1940, pp. 3-8;**
   ***Pakistan Resolution to Pakistan*, (1940-47), p. 22.**
2. ***Pakistan Resolution to Pakistan*, (1940-1947), p. 21.**
3. ***Ibid.*, p. 21.**

> **cultural, economic, political, administrative and other rights and interests in consultation with them and in other parts of India where the Mussalmans, are in a minority, adequate effective and mandatory safeguards shall be specifically provided in the constitution for them and other minorities for the protection of their religious, cultural, economic, political, administrative and other rights and interests in consultation with them[1].”**

آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنی مندرجہ بالا قرار داد منظور کرتے ہوئے اس بات کا اعادہ کیا کہ کوئی آئینی نقشہ اس ملک کے لیے اور خصوصاً مسلمانوں کے لیے قابل عمل نہیں ہو سکتا جب کہ وہ مندرجہ ذیل اصولوں کے مطابق وضع نہ کیا جائے :-

”جغرافیائی اعتبار سے جو واحدے باہم دیگر ملحق ہیں انہیں ضروری ترمیمات ارضی کے بعد ایسے قطعات کی صورت میں متعین و متشکل کیا جائے کہ جن علاقوں میں مسلمان بہ لحاظ تعداد اکثریت میں ہیں مثلاً ہندوستان کے شمالی مغربی اور مشرقی منطقوں میں انہیں ایک زمرے میں شامل کر کے مسلمانوں کے آزاد قومی اوطان کے طور پر مستقل ریاستوں کی حیثیت دے دی جائے اور ان میں کا ہر واحدہ ترکیبی خود مختاری اور کامل الاقتدار ہو[۲] ۔“

”مذکورہ بالا واحدوں اور منطقوں کے دستور اساسی میں اقلیتوں کے مشورے سے ان کے مذہبی ، تہذیبی ، اقتصادی ، سیاسی ، انتظامی اور دیگر حقوق و مفاد کی نگہداشت کے لیے بالصراحت ، معقول ، موثر اور حکمی تحفظات رکھے جائیں اور ہندوستان کے دوسرے حصوں کے دستور اساسی میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں ، مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے مشورے سے ان کے مذہبی ، تہذیبی ، اقتصادی ، سیاسی ، انتظامی اور دیگر حقوق و مفاد کی نگہداشت کے لیے بالصراحت معقول ، موثر اور حکمی تحفظات رکھے جائیں“[۳] ۔

---

1. *Pakistan Resolution to Pakistan*, (1940-47), p. 21;
   The Struggle for Pakistan, Appendix "C", p. 329-330.

۲ - ”جناح گاندھی گفت و شنید“ ، ستمبر ۱۹۴۴ء ، مراسلت معہ متعلقات پیش لفظ از نواب زادہ لیاقت علی خان ، ص ۱۳۸ (ضمیمہ الف)

۳ - ایضاً ، ص ص ۱۳۸-۳۹ (ضمیمہ الف)

مزید برآں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے ، ورکنگ کمیٹی کو مزید اختیارات دیتے ہوئے کہا :

"کہ وہ دستور کی ایک ایسی اسکیم مرتب کرے جو مذکورہ بالا بنیادی اصولوں کے مطابق ہو اور جس میں اس کی گنجائش رکھی جائے کہ یہ علاقے بالآخر مکمل اقتدار مثلاً دفاع ، امور خارجہ ، رسل و رسائل ، محاصل ، بحری نیز دیگر ضروری امور کے سارے اختیارات حاصل کر لیں گے"[۱] ۔

پاکستان اور علماء کی موافقت اور مخالفت :

جمعیۃ علماء ہند اور اس کے ہم نوا علماء کے علاوہ ، علماء کا ایک گروہ ایسا بھی تھا (حسب تفصیل سابق) جس نے قرار داد پاکستان کی تائید و حمایت کی ۔ ان علماء میں مولانا اشرف علی تھانوی ، مولانا شبیر احمد عثمانی ، مفتی محمد شفیع دیوبندی ، مولانا ظفر احمد تھانوی وغیرہ شامل تھے ۔ مولانا عثمانی نے اپنے خطبۂ صدارت ، صوبہ پنجاب علماء اسلام کانفرنس لاہور منعقدہ ۱۹۴۶ء میں بصراحت بیان کیا کہ :

"عام مسلمین نے ایک قطعی فیصلہ کر لیا ہے کہ ہندوستان کے ایک حصے کو پاکستان بنایا جائے ، جو اسلامی ثقافت و دیانت اور سیاست و حکومت کا آزاد مرکز ہو"[۲] ۔

غرض یہ کہ علماء کا ایک طبقہ تھا ، جس میں خصوصاً جمعیۃ علماء پیش پیش تھی ، جس نے قرار داد پاکستان کی مخالفت کی ۔ قرار داد پاکستان کے خلاف سب سے پہلی آواز (بقول مولانا احمد سعید) مولانا سجاد بہاری کی تھی ۔ یعنی مسلم لیگ کے ریزولیوشن پاس ہونے کے فوراً بعد مولانا سجاد بہاری نے ، اس کی مخالفت کی اور مسلمانوں کو ان "خطرات اور مصائب و آلام کو مستحضر کر دیا جو پاکستان کے دامن میں پوشیدہ تھے ، اور جس کو نادان لوگ اپنی کامیابی سمجھ رہے ہیں" ۔

مولانا نے مزید کہا کہ :

"اقتدار کے بھوکے چونکہ مسلم اقلیت کے صوبوں سے مایوس ہوگئے ہیں ۔ اس لیے

---

۱ ۔ "جناح گاندھی گفت و شنید" ، ستمبر ۱۹۴۴ء ، ص ۱۳۹ ۔ (ضمیمہ الف)
۲ ۔ علامہ شبیر احمد عثمانی ، "ہمارا پاکستان" ، حیدرآباد دکن ، س ن ، ص ۲۶

یہ قوت و اقتدار کے متلاشی ، مسلم اکثریت کے صوبوں کو اکھاڑہ بنانا چاہتے ہیں"[1] ۔

مولانا حسین احمد مدنی نے پاکستان اور دو قومی نظریے کی مخالفت کرتے ہوئے جون ۱۹۴۰ء میں کہا کہ :

"مسلمانان ہند کی فلاح اور مستقبل کی آئینی و دستوری حفاظت و بقا اس امر میں مضمر ہے کہ تمام صوبے خود مختار ہوں ۔ مرکز کو صرف وہی اختیارات دیے جائیں جنھیں تمام صوبے متفقہ طور پر تسلیم کریں"[2] ۔

علاوہ ازیں مولانا حسین احمد مدنی نے خطبۂ صدارت ۲۰ تا ۲۲ مارچ ۱۹۴۲ء میں کہا کہ :

"مسلم لیگ نے عواقب و نتائج سے گھبرا کر مسلمانوں کی نجات اور خوش عیشی کے لیے صرف یہ راستہ تجویز کیا ہے کہ ہندوستان کی وحدت کو پارہ پارہ کر کے اپنا جدا گانہ سیاسی منطقہ براہ راست تاج برطانیہ کے ساتھ اپنی قسمت کو وابستہ کر دے"[3] ۔

مولانا مدنی نے کہا کہ :

"مجوزین تقسیم نے اس بات پر کوئی روشنی نہیں ڈالی "کہ ہندوستان کے ہر صوبے میں مسلمانوں کی آبادی ان کے مذہبی مقدس شعائر، مساجد ، مزارات ، علمی ادارے، اوقاف وغیرہ اس قدر کثیر تعداد میں موجود ہیں کہ مسلمان کسی حالت میں ان کو نظر انداز نہیں کر سکتے اور تقسیم ہند کی صورت میں ان کا حشر کیا ہوگا"[4] ۔

مولانا نے مزید فرمایا کہ :

---

۱ ۔ مولانا احمد سعید ، "خطبہ صدارت" ، منعقدہ میرٹھ ، ۱۹۴۲ء ، ص ص ۳۸-۳۷

۲ ۔ "علماء حق" ، حصہ دوم ، ص ۱۳۸-۱۳۹

(نوٹ : مولانا محمد میاں نے سن عیسوی بیان نہیں کیا بلکہ بحوالہ "مدینہ" ، ۵ جون ۱۹۴۰ء یہ بات بیان کی ہے ۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا مدنی نے یہ بات جون ۱۹۴۰ء یا اس سے قبل ہی کہی ہوگی ۔)

۳ ۔ مولانا سید حسین احمد مدنی ، "خطبۂ صدارت" ، لاہور ، ۱۹۴۲ء ، (منعقدہ ۲۰ تا ۲۲ مارچ ۱۹۴۲ء ، ص ص ۴۲-۴۳

(نوٹ : مولانا مدنی نے آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی مقام کے نام پر تین گروہ قائم کیے جس میں دوسرا گروہ مسلم لیگ کو مقرر کیا ۔)

۴ ۔ حسین احمد مدنی ، "خطبۂ صدارت" ، ۱۹۴۲ء ، ص ص ۴۷

"اس نظریے کے ماتحت ہندو منطقے قائم ہو جانے کی صورت میں ہندو منطقوں میں مسلمان جن کی پوزیشن زیادہ سے زیادہ ۱۳ فیصدی اور اکثریتی طور پر ے یا ۵ فی صدی ہوگی ۔ بالکل بے دست و پا اور زندہ درگور ہو جائیں گے ۔ اور مسلم منطقوں میں غیر مسلم جن کی تعداد ۴۵ فی صد تک ہوگی مسلم حکومت کے لیے وبال جان ہوں گے"[1] ۔

مولانا نے کہا کہ :

"مسلم منطقے ہندو منطقوں کے تقریباً ساڑھے تین کروڑ مسلمانوں کی تباہی اور ہلاکت کی دستاویز پر خود دستخط کر کے اور اپنی جگہ ایسی حکومت جس میں غیر مسلم متعصب موثر اقلیتیں ان کے لیے وبال جان ہوں ، حاصل کر کے کون سی فلاح و بہبود اور اطمینان و مسرت حاصل کر سکیں گے"[2] ۔

اس سلسلے میں مولانا احمد سعید نے اپنے خطبۂ صدارت ، فروری ۱۹۴۶ء میں پاکستان کے موقف کے بارے میں ایک سوال کرتے ہوئے مسلم لیگ ہائی کمانڈ سے یہ پوچھا کہ تین کروڑ مسلمان جو پاکستان کے علاوہ ہندوستان میں آباد رہیں گے ان کا کیا ہوگا ؟ مولانا نے اپنے خطبۂ مذکورہ میں پاکستان کی اسکیم کا پس منظر بیان کرتے ہوئے کہا کہ :

"یہ اسکیم پہلی مرتبہ ۱۹۲۲ء میں آئی اور پھر بتدریج یہ ہوتے ہوتے ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نے "قرار داد پاکستان" کی شکل میں عوام کے سامنے پیش کی ۔ مولانا نے مسلم لیگ ہائی کمان سے یہ سوال کیا کہ چھ کروڑ مسلمانوں کی آزادی کی خاطر، تین کروڑ مسلمان ، جو اقلیتی صوبوں میں آباد رہیں گے ان کا کیا ہوگا"

مولانا احمد سعید نے کہا کہ :

"ہم اولاً تو اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ ہم متحدہ ہندوستان میں ہندوؤں کے غلام ہو جائیں گے ۔ اگر بالفرض محال یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ایسا ہی ہوگا جب بھی ہندوستان کی آزادی سے اسلامی ممالک کے ۲۰، ۲۵ کروڑ مسلمان تو برطانوی شہنشاہیت کے تسلط سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جائیں گے"[3]۔

---

۱ ۔ حسین احمد مدنی ، "خطبۂ صدارت" ، ۱۹۴۲ء ، ص ۴۴

۲ ۔ ایضاً ، ص ۴۳

۳ ۔ مولانا احمد سعید ، "خطبۂ صدارت" ، ۱۹۴۶ء ، ص ص ۲۰-۲۲

علاوہ ازیں جمعیۃ علماء کا موقف یہ تھا کہ مسلمان ہندوستان میں صدیوں سے آباد ہیں اور ہر صوبے ، ضلع ، شہر ، قصبے اور قریوں تک میں پھیلے ہوئے ہیں ۔ ان کے مقامات مقدسہ ، عبادت گاہیں ، دینی اور دنیوی درسگاہیں ، غرض ہر چیز غیر مسلم صوبوں میں بہ کثرت موجود ہیں ۔ پاکستان بن جانے کی صورت میں ان تمام یادگاروں اور درسگاہوں کو خیر باد کہنا پڑے گا ۔ للہذا عقلاً اور نقلاً کسی طرح بھی پاکستان بن جانے سے مسلمانان ہند کے مسائل حل نہیں ہوں گے بلکہ پہلے سے بھی زیادہ الجھیں گے ۔

مولانا محمد میاں نے ایک بیان مولانا حسین احمد مدنی سے منسوب کیا ہے جو بے حد معنی خیز اور دلچسپ ہے ۔ ان کے بیان کے مطابق مولانا حسین احمد مدنی نے پاکستان کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ :

"اگر پاکستان کا مطلب اسلامی حکومت علیٰ منہاج النبوت مسلم اکثریت کے صوبوں میں قائم کرنا ہے ، تو مبارک اسکیم ہے ۔ اور اگر اس کا یہ مطلب نہیں تو یہ اسکیم بزدلانہ ہے اور ڈوائڈ اینڈ رول (Divide & Rule) کو تقویت پہنچانا ہے ۔ عرب ممالک کو اسی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر کے بانٹا گیا ۔ اور یہی عمل ہندوستان میں مختلف پیرایوں سے ظاہر ہو رہا ہے"[1]۔

مولانا آزاد نے ۱۹۵۷ء میں اپنی کتاب "ہماری آزادی" کی تصنیف کے وقت پاکستان کے بارے میں کہا کہ :

"مسٹر جناح اور ان کے ساتھی یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ جغرافیائی صورت حال ان کے لیے ناموافق ہے ۔ مسلمان سارے برصغیر میں کچھ اس طرح بکھرے ہوئے تھے کہ سمٹے ہوئے علاقے میں ان کی الگ ریاست بنانا ناممکن تھا ۔ مسلمانوں کی اکثریت کے علاقے شمال مشرق اور شمال مغرب میں تھے ۔ یہ دونوں علاقے کسی مقام پر بھی ایک دوسرے سے متصل نہیں ہیں ۔ یہاں کے باشندے مذہب کے سوا ہر لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں ۔ یہ کہنا عوام کو ایک بہت بڑا فریب دینا ہے کہ صرف مذہبی یگانگت دو ایسے علاقوں کو متحد کر سکتی ہے جو جغرافیائی، معاشی ، لسانی اور معاشرتی اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل جدا ہوں"[2]۔

---

۱ ۔ "علماء حق" ، حصہ دوم ، ص ۱۲۶

۲ ۔ محمد مجیب ، مترجم ، "ہماری آزادی" ، از مولانا ابوالکلام آزاد، مطبوعہ ۱۹۶۱ء بار اول، ص ۲۵۳

مولانا ابوالکلام آزاد نے مزید بیان کیا ہے کہ :

"اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے ایک ایسے معاشرے کے قیام کی کوشش کی جو نسلی ، لسانی ، معاشی اور سیاسی حد بندیوں سے بالاتر ہو ۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ شروع کے چالیس برسوں کو یا زیادہ سے زیادہ پہلی صدی کو چھوڑ کر اسلام کبھی سارے مسلمان ممالک کو صرف مذہب کی بنیاد پر متحد نہ کرسکا"[۱]۔

غرض یہ کہ جمعیۃ علماء ہند کے اکابر اور مولانا آزاد نے برصغیر کے جغرافیائی ، تمدنی و لسانی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے تقسیم ہند کی مخالفت کی اور ان کی اپنی رائے یہ تھی کہ موجودہ صورت حال میں تقسیم ہند سے مسلمانوں کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا ۔ بلکہ اس کے نقصانات اور مضار اس کے فوائد سے کہیں زیادہ ہوں گے ۔ مولانا احمد سعید نے اسی بات کا اظہار اپنے خطبۂ صدارت ، ۱۹۴۶ء میں کیا تھا[۲] ۔

راقم کی رائے یہ ہے کہ پاکستان کا قیام (مشرقی و مغربی پاکستان) اسی صورت میں قائم و دائم رہ سکتا تھا ، جب کہ پاکستان کے ارباب بست و کشاد اپنے قول ، فعل اور عمل سے پہلی صدی ہجری جیسی اسلامی سوسائٹی کی تشکیل کر سکتے ۔ تب شاید یہ بعدالمشرقین کا فرق جسمانی اتصال کے بغیر ایک اسلامی ریاست کو پھلنے پھولنے میں ممدو معاون ہو سکتا ۔

---

۱ - "ہماری آزادی" ، ص ص ۲۵۳—۲۵۰

۲ - مولانا احمد سعید ، "خطبۂ صدارت" ، ۱۹۴۶ء ، ص ص ۲۱-۲۳

تعلیقہ اول

مولانا آزاد کے خط کا حوالہ :

مولانا آزاد نے یہ خط ۲۵ جنوری ۱۹۳۷ء کو کلکتے سے غلام رسول مہر کے نام لکھا تھا۔ ''سرحدی کانگریسیوں کے ارادے'' کے عنوان سے مولانا نے اخبار ''انقلاب'' میں مضمون پڑھا۔ اس عنوان سے ''انقلاب'' میں مولانا آزاد نے جو مضمون پڑھا۔ اس میں لکھا تھا کہ :

''کسی نے ڈاکٹر خان سے پوچھا کہ ہندی گورمکھی سرکار کے لیے کیا کرو گے''؟
انھوں نے کہا :
''فوراً منسوخ کر دیں گے''۔ مولانا نے اپنے خط میں کہا کہ :

''اس سے اندازہ کر لینا چاہیے کہ سرحدی کانگریسیوں کی اسلام دشمنیوں کا کیا حال ہے''؟ ''کتنے افسوس کی بات ہے کہ آپ اس معاملے کو اسلام اور مسلمانوں کی خدمت تصور کرتے ہیں، جو فی الحقیقت مسلمانانِ ہند کے مقاصد کے لیے زیادہ سے زیادہ مہلک معاملہ ہے۔ اور جس سے بڑھ کر شاید ہی فتنہ پردازی کی کوئی بات موجودہ سیاسی دور میں ہوا آپ لوگ اس بات پر تو بہت خوش ہوگئے کہ اس عقل فروش ...... نے وحدت زبان و رسم الخط کا راگ گا کر مٹھی بھر سکھوں کے گرلز اسکولوں کی سرکاری اعانت بند کر دینی چاہی ہے، مگر اتنی واضح بات سامنے نہ آئی کہ اگر ٹھیک انہی دلائل کی بناء پر کل کو بہار، یو۔ پی، مدراس، آسام، اور بمبئی میں ہندو اکثریت نے ناگری رسم الخط کو سرکاری قرار دے دیا اور اردو رسم الخط والے اسکولوں کو سرکاری اعانت سے محروم کر دیا تو ان کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہے؟''

اتنا ہی نہیں بلکہ اس فتنے نے تو اقلیتوں کے حقوق کی ساری عمارت ہی درہم برہم کر دی۔ یہ اصل ہی باقی نہ رہی کہ ان امور کے فیصلے کا حق خود اقلیت کو ہے، نہ

کہ اکثریت کو ۔ بنگال کے ہندو اور مسلمان ، دونوں اردو کے مخالف ہیں اور چاہتے ہیں کہ صوبے کی زبان ایک ہی ہو اور وہ بنگلہ ہو ۔ اب پریسیڈنسی ڈویژن کی وہ لسانی اقلیت ، جس کی زبان اردو ہے ، کیا کرے گی ؟ کل کو اگر اس فتنہ پردازی کی مثال سامنے رکھ کر بنگال نے سرکلر جاری کر دیا کہ صرف انھیں اسکولوں کو مدد دی جائے گی ، جو بنگلہ زبان میں تعلیم دیں ، تو اس وقت کلکتے کے ہزاروں ہندو مسلمان کیا کریں گے ، جو اپنے بچوں کو بنگلہ میں تعلیم نہیں دینا چاہتے ؟

ایک لمحہ کے لیے اس غلط فہمی میں اپنے کو نہ ڈالیے کہ ہمارے نزدیک حقیقت و انصاف کیا ہے ؟ اور از روئے دلائل و مصالح کیا ہونا چاہیے ؟ ان امور میں سوال دلائل اور منطق کا نہیں ہوتا ۔ اگر دلائل سے جماعتی کشاکش کا فیصلہ ہو سکتا تو دنیا کے سارے جھگڑے معدوم ہو جاتے ۔ سوال صرف یہ ہے کہ ایک صوبے کی ایک اقلیت ، صحیح بنیادوں پر یا غلط بنیادوں پر ، مگر اپنے بچوں کو کس رسم الخط کی تعلیم دینا چاہتی ہے ؟ اس کو اس کا حق ہے یا نہیں ؟ اور صوبے کی گورنمنٹ کو اس کا اعتراف کرنا چاہیے یا نہیں ؟ تیس برس سے مسلمان ہیٹ رہے تھے کہ کوئی اکثریت جبراً اپنا فیصلہ دوسرے پر نافذ نہ کرے ۔ متعصب ہندوؤں کو اس کے قبول کرنے میں تامل تھا ، لیکن بات اتنی صاف تھی کہ اسے اعلانیہ رد نہیں کر سکتے تھے ۔ وہ چاہتے تھے کہ اس اصل کی کاٹ کے لیے کوئی ہتھیار مل جائے ۔ لیکن ہتھیار ملتا نہیں تھا ۔ اب صوبہ سرحد نے یہ سرکلر جاری کر کے انھیں بنا بنایا ہتھیار پکڑا دیا ۔ پہلے انھوں نے تھوڑا بہت شور مچا دیا تا کہ حجت قائم ہو جائے ، پھر خاموش ہوگئے ۔ اب بہار وغیرہ میں گورنمنٹیں بننے دیجیے ، دیکھ لیجیے گا ، اس ہتھیار کا استعمال کیوں کر کیا جاتا ہے ؟ اس وقت آپ لوگوں کو پتہ چلے گا کہ اس سرکلر کی حمایت میں شور مچا کر آپ لوگوں نے اردو کی کیسی عظیم الشان خدمت انجام دی ہے !

ہندوستان میں مسلمان کو ایک دقت یہ پیش آ گئی تھی کہ کوئی صوبہ ایسا نہ تھا جہاں مسلمانوں کی ویسی عظیم اکثریت ہو ، جیسی ملک کے اکثر صوبوں میں ہندوؤں کی ہے اور جہاں وہ اپنا عملی نمونہ قائم کر کے ہندو اکثریت کے صوبوں کے لیے مثال قائم کر سکیں ۔ وہ اکثریت و اقلیت کے مسئلے میں جو کچھ بھی کر سکتے تھے ، بحث و منطق تھی ۔ عملی اقدام کی کوئی قوت نہیں رکھتے تھے ۔ اب حسن اتفاق سے دو صوبے ایسے نکل آئے جہاں وہ بہار اور یوپی کی ہندو اکثریت کے درجہ کی مسلم اکثریت رکھتے ہیں : سرحد اور سندھ ، اور اس طرح انھیں موقعہ مل گیا کہ یہاں اپنے طرز عمل کی ایسی مثالیں قائم کر دیں جو تمام صوبوں کے مسلمانوں کے لیے عملی دلیل و حجت کا کام دے

سکیں، لیکن صوبہ سرحد نے سب سے پہلی جو مثال قائم کرنی چاہی وہ یہ کہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے مطالبات کا معاہدہ درہم برہم کر دیا اور اردو کی مخالفت میں جو کام اردو کے سخت سے سخت مخالف صوبے بھی نہیں کر سکتے تھے ، وہ اسلامی صوبے نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ انجام دے دیا ۔ سب سے زیادہ رنج و قلق کی بات جو سامنے آتی ہے ، یہ ہے کہ مسلمانوں کے تمام اخبارات نے بلا استثناء اس کی حمایت کی ، اور پنجاب کی تمام اردو پرست انجمنوں نے تجویزیں پاس کر دیں ۔ کسی نے بھی غور کرنا ضروری نہیں سمجھا کہ یہ فی الحقیقت اردو کی حمایت ہو رہی ہے یا اس کی تباہی کا سب سے بڑا دروازہ کھولا جا رہا ہے ؟

قرآن جا بجا اسماء اور ان کی پرستش کا ذکر کرتا ہے ، اسماء سمیتموھا انتم و آباؤ کم ٹھیک یہی حال مسلمانوں کا ہو رہا ہے ۔ چند اسماء و اعلام ہیں اور جونہی کسی کی زبان سے نکل جائیں ، فوراً ان کی حمایت میں چیخنے لگنا چاہیے ۔ باقی رہا حقیقت کا سوال ، تو یہ قطعاً غیر ضروری ہے ۔ اسلام ، حقوق ، مسجد ، اردو ، گائے اور اس طرح کا کوئی لفظ زبان سے نکل جانا چاہیے ، پھر ہر مسلمان کے لیے بلا کسی شرط کے ضروری ہے کہ اس کی تائید کرے ، اگرچہ یہ تائید اسلام اور مسلمانوں کے مقاصد و مصالح کی قطعاً نفی ہی کیوں نہ ہو ۔ ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ حضرت مولانا عبداللہ گاندھی کو لے کر مسلمانوں نے اسلام کی وہ توہین و تذلیل کرنی چاہی (کیونکہ الحمدللہ کسی کے کیے سے اس کی تذلیل ہو نہیں سکتی) کہ شاید ہی اس کی کوئی مثال اس پورے دور غفلت و مذلت میں بھی مل سکے ۔ غریب گاندھی نے ایک ایسے مقام میں آ کر ، جہاں دنیا کا کوئی رشتہ بھی اظہار حقیقت سے مانع نہیں ہو سکتا ، صورت حال کا اعلان کیا ، تو اس پر اس کی ہنسی اڑائی گئی ۔ لیکن مسلمان اخبار نویسوں میں ایک شخص بھی ایسا نہیں نکلا جو دبی زبان ہی سے مگر مسلمانوں کو اس غیر اسلامی خفیف الحرکتی سے روکتا) جو انھوں نے ایک بہروپیے نو مسلم کو خرید کر کرنا شروع کر دی تھی ۔

سرحد کے اس سرکلر کا معاملہ جب پہلے پہل اخباروں میں آیا ، تو میں نے خیال کیا ، اس میں کوئی غلط فہمی کام کر رہی ہے ، کیونکہ خود مسلمانوں کے فرقہ وارانہ نقطہ خیال سے یہ بات اس درجہ غلط اور مہلک تھی کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ صاحبزادہ عبدالقیوم اور ان کے مشیروں نے ایسا کیا ہوگا ۔ لیکن جب میں نے ان سے دریافت کیا تو معلوم ہوا واقعی یہی بات ہے ۔ اس پر میں نے بستر علالت سے بارہ صفحوں کا خط لکھ کر انھیں بھیجا ۔ اور پوری تفصیل کے ساتھ واضح کر دیا کہ یہ کارروائی کس درجہ مضر ہوگی ۔ چونکہ ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا ، اس لیے خاموش ہو کر

رہ گئے ۔ اب معلوم ہوا ہے سرے سے اردو ہی کو اڑا دینا چاہتے ہیں اور پشتو کے مناقب و فضائل ورد زبان ہیں ۔

بہار میں سالہا سال سے کوشش کی جا رہی ہے کہ ناگری رسم الخط کے سوا اور کسی خط کا اعتراف نہ کیا جائے ۔ دو بار اقدام ہو چکا ہے ۔ اور محض کانگریس کی مداخلت سے رکا ہے ۔ اب صوبۂ سرحد کی اس حماقت نے از سر نو دوبارہ کھول دیا ۔ چند دنوں کے بعد دیکھ لیجیے گا ، وہی زبان ، وہی دلیل ، وہی منطق کام میں لائی جائے گی ، جس پر تمام مسلمانوں کی تائید و توثیق کی مہر لگ چکی ہے ۔

اگر فی الحقیقت ڈاکٹر خان یا وہاں کی کوئی جماعت ایسا کر سکتی ہے کہ اس فتنہ انگیز سرکلر کو منسوخ کر دے تو عزیز من ! یہ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ دشمنی نہیں ہو گی ، بلکہ ایک نہایت ضروری خدمت ہو گی جو سرحد کی کوئی جماعت انجام دے سکتی ہے ۔

یقیناً آپ لوگوں نے اس کی حمایت یہی سمجھ کر کی ہے کہ اردو اور مسلمانوں کے مقاصد کی حمایت کر رہے ہیں ، لیکن کیا معاملہ کا یہ پہلو قابل غور نہیں ہے کہ حمایت کا معاملہ کس طرح ہم سے تخریب و مخالفت کا کام کرا رہا ہے ؟ اگر مسلمانوں کی رائے عامہ اس سانچے میں ڈھالی جائے گی تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا ؟ کس طرح لوگ خود اپنے ہاتھوں سے اپنا مستقبل خطرہ میں ڈالنے لگیں گے ؟ افسوس کہ ڈال رہے ہیں ، ہر گوشے اور ہر میدان میں" !

---

۱ ۔ غلام رسول مہر (مرتب) ، "نقش آزاد" ، لاہور ، جولائی ۱۹۵۹ء ، دوسرا ایڈیشن ، صفحہ ۱۲۲-۱۲۶

باب ہشتم

اختتامیہ

مقالہ کے سابقہ ابواب میں علماء کے سیاسی کردار پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اس باب میں علماء کے سیاسی کردار کا اجمالی خاکہ پیش کیا جا رہا ہے۔

اسلام کے پیروؤں یا مقلدین کے لیے ایک ضابطۂ حیات یعنی قرآن کریم (جو الہامی کتاب ہے) نازل ہوئی۔ اس الہامی کتاب نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کا مقصد یہ بیان کیا ہے کہ:

"و اذ قال ربک للملٰئکۃ انی جاعل فی الارض خلیفۃ"[1]

ترجمہ: "اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے رب نے فرشتوں سے کہ میں ضرور بناؤں گا زمین میں ایک نائب"[2]۔

اللہ تعالی نے یہ خلافت و نیابت انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ قائم کی۔ جس کی منتہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوئی۔

قرآنی تعلیمات اور اسلام کے دائمی فلسفہ حیات سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اسلام میں دین اور سیاست توام (جڑواں) ہیں۔ نظام اسلام کے اس فلسفۂ حیات کو عملاً نافذ کرنے کے لیے علماء کو انبیاء کا وارث قرار دیا گیا۔ اس کی غرض و غایت یہ ہے کہ علماء امت انبیاء علیہم السلام کی الہامی تعلیمات کی وضاحت کریں اور ان پر عمل پیرا ہو کر عوام الناس کی فلاح و بہبود کو مدنظر رکھتے ہوئے عدل و توازن قائم کرنے میں امکانی کوشش کریں۔

تاریخ امم کا ایک بڑا حصہ ظلم و جور کی داستانوں پر مشتمل ہے۔ جابر بادشاہوں نے اور حکمران طبقوں نے قتل و غارت گری اور حقوق العباد کی پامالی کو اپنا شعار اور

۱۔ "القرآن"، پارہ اول، سورہ بقرہ، ر ۳، آیت ۳۰ کا حصہ
۲۔ ایضاً، (ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی)، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، س ن، ص ۸

شیوہ بنا لیا تھا ۔ جب حاکم ہی ظالم ہو تو داد و فریاد کس سے کی جائے ! لیکن اسلام کے فلسفہ حیات کے تحت حقوق اللہ اور حقوق العباد کا واضح تعین کیا گیا ہے ۔ نیز حقوق اللہ کی ادائیگی سے زیادہ زور اور اہمیت حقوق العباد کی ادائیگی پر دیا گیا ہے ۔

علماء ، شریعت کے اور خصوصاً حقوق العباد کے تحفظ و نفوذ میں بڑے بڑے قہار و جبار سلاطین و حکمرانوں سے بھی مرعوب و خائف نہ ہوئے ۔ اس ضمن کے صدہا واقعات کتب تاریخ میں منضبط و مندرج ہیں جو دیگر مذاہب کی تواریخ میں نایاب ہیں ۔ علماء نے اسلامی نظام کے نفوذ میں مسلم اور غیر مسلم کا بھی امتیاز روا نہیں رکھا ۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ (مختصراً) سکندر لودھی کے عہد شہزادگی (گورنری) کا ہے ۔ جب کہ شہزادہ نے ذمی رعایا کے حقوق پامال اور غصب کرنے کا ارادہ کیا ۔ اور اپنے اس ارادہ کی تکمیل کی خاطر ان (غیر مسلموں) کے مندر کو منہدم اور نہانے (اشنان) کے تالاب کو خراب و برباد کرنے کا فیصلہ کیا ۔ لیکن ایک عالم وقت نے گورنر کو حکم شرع سنایا اور اسے اس کے غیر شرعی ارادہ کی تکمیل سے باز رہنے کے لیے کہا ۔ شہزادہ کو یہ حکم شرع بار خاطر ہوا تو عالم موصوف نے بڑی دلیری اور بے باکی کے ساتھ کہا کہ اگر تمہیں شرعی فیصلہ منظور نہ تھا تو پھر مجھ سے رجوع کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ قیام امن و امان اور عدل و توازن کے نفوذ کے لیے یہ بات اشد ضروری ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوں جو اس سلسلے میں بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار ہوں ۔ اس ضمن میں علماء کا کردار بہت واضح اور عیاں ہے ۔ اس امر کی صدہا مثالیں کتب تاریخ میں منضبط ہیں ۔ جن میں سے مندرجہ بالا مثال بھی ایک ہے ۔ تاہم بعض ادوار میں ایسا بھی ہوا ہے کہ مورخین نے حالات و واقعات کو نفس الامر اور حقیقت سے ہٹ کر پیش کیا ہے ۔

اس سلسلے کی ایک مثال عہد اکبر میں شیخ عبدالنبی کی ہے ۔ شیخ اپنے زمانے کے جید عالم تھے ۔ شیخ صاحب نے اکبر کے غیر شرعی امور کی تکمیل میں تعاون نہیں کیا ۔ جب کہ شیخ کو یہ علم تھا کہ حاکم وقت کے تشدد آمیز رویہ سے کسی قسم کے انصاف کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی ۔ بایں ہمہ شیخ نے اکبر کی خواہشات کی عدم تکمیل کی پاداش میں سخت اذیتیں اور تکالیف اٹھائیں حتٰی کہ اپنی جان عزیز تک قربان کر دی ۔

اسی طرح کے افراد میں دور جہانگیر میں شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی بھی

تھے ۔ جنھوں نے اکبر کے دگر اعتقادی اور غیر اعتقادی عقائد کی بیخ کنی کے لیے پر امن جد و جہد کی ۔ گو کہ مجدد الف ثانی کو اس سلسلہ میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں ۔ مگر اس قید و بند کا نتیجہ بڑا امید افزا اور خوش کن برآمد ہوا ۔ وہ یہ کہ اسارت کے بعد مجدد کو شاہی افواج کے ساتھ رہنا پڑا ۔ اور اس طرح سے موصوف کو حکمران ، خواص اور عوام میں اپنے خیالات و نظریات کی نشر و اشاعت کا بروقت اور مناسب موقع ملا ۔ چنانچہ موصوف نے حکمت اور بالغ نظری سے کام لیتے ہوئے گمراہ افراد کو شرعی اور اسلامی اصولوں کی پابندی کرنے کی طرف مائل و رجوع کیا ۔

مغلوں کے عہد زوال و انحطاط میں نظم و نسق میں ابتری و اضمحلال پیدا ہوا ۔ جس کی بنا پر علماء کا اقتدار بھی متاثر ہوا ۔ گو کہ محکمہ قضا پر بدستور علماء کا ہی عمل و دخل تھا ۔ مگر شاہی نظم و ضبط کی ابتری اور کمزوری نے باغیوں اور سرکشوں کو بے مہار اور خود سر بنا دیا ۔ اس افراتفری میں ملک کا ہر باشندہ غیر محفوظ و متفکر اور پریشان تھا ۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ، جو اس وقت کے ایک عظیم مفکر ، مدبر فلاسفر ، محدث اور صوفی تھے ، برصغیر کے حالات سے ملول و متفکر تھے ۔ اور مظلوم عوام کو ظلم سے نجات دلانے کی فکر اور تدبیر میں تھے ۔ ملک کے سیاسی حالات اندرونی و بیرونی خطرات سے دو چار تھے ۔ اندرونی طور پر مرہٹے ، جاٹ ، سکھ اور روہیلے برسر پیکار تھے ۔ تو دوسری طرف انگریز ، فرانسیسی اور ڈچ وغیرہ اس غیر مستحکم اور غیر یقینی صورت حال سے سیاسی فائدہ اٹھانے کی فکر میں تھے ۔ شاہ صاحب نے امن و امان کی گرتی ہوئی حالت کو قابو میں کرنے کے لیے ملک کے بہی خواہوں سے صلاح و مشورہ کرنے کے بعد احمد شاہ ابدالی کو مدعو کیا ۔ جس نے ۱۷۶۱ء میں مرہٹوں کی ابھرتی ہوئی طاقت کو شکست دے کر ان کی کمر توڑ دی ۔ اور ملک میں وقتی طور پر امن و امان بحال ہو گیا ۔ یہی نہیں بلکہ شاہ صاحب نے عوام کی مستقل فلاح و فوز کے لیے ایک تحریک اصلاح و انقلاب بھی قائم کی ۔

شاہ عبدالعزیز کی تعلیمات نے عوام اور خصوصاً علماء میں سیاسی شعور و بیداری پیدا کی ۔ اور ان کے جذبۂ جہاد کو متحرک کیا ۔ آپ کی تربیت نے افراد ایک کثیر تعداد کو جن میں علماء کی اکثریت تھی ، عملی طور پر جہاد حریت میں حصہ لینے کے لیے خندہ پیشانی کے ساتھ آمادہ کیا ۔ سید احمد شہید کی تحریک جہاد بھی آپ کی انتھک ، مسلسل اور مخلصانہ کوششوں کا ثمرہ تھی ۔ مجاہدین کی تحریک سے متعلق مندرجہ ذیل امور قابل تقلید و تکمیل ہیں :

(الف) مجاہدین کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ ہم جہاد حریت اس لیے لڑ رہے ہیں کہ پھر اپنے اماکن میں واپس نہیں آ سکیں گے ۔ تا ہم انھوں نے یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنا قیمتی اثاثہ ، جائداد منقولہ و غیر منقولہ، اہل و عیال اور رفقاء و احباب کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہا ۔

(ب) مجاہدین جانتے تھے کہ دیگر وسائل کی کمی کے ساتھ ساتھ ان کے لیے اشیاء خورد و نوش کی فراہمی کا بھی کوئی معقول اور خاطر خواہ انتظام نہ تھا ۔ اور بسا اوقات ان کو رسد کی کمی یا نایابی کی بنا پر فقر و فاقہ کی نوبت بھی آئی ۔ لیکن پھر بھی یہ لوگ برابر مصروف جہاد رہے ۔

(ج) مجاہدین کی ریاضت اور مشقت کا یہ عالم تھا کہ یہ لوگ اوقات راحت و استراحت میں یعنی راتوں کے زیادہ تر حصوں میں عبادت و ریاضت میں مصروف رہتے تھے اور پھر نماز فجر سے فارغ ہوکر عازم جہاد ہو جاتے تھے ۔

(د) مجاہدین تمام اندرونی و بیرونی حادثات اور خطرات سے نڈر ہو کر ایک ایسی منظم ، مضبوط ، تربیت یافتہ اور مسلح افواج کے مقابل صف آراء ہوئے جو فوجی اعتبار سے ان سے کئی گنا بڑی اور ذرائع و وسائل سے آراستہ و پیراستہ تھی ۔

(ہ) سید احمد شہید اور ان کے رفقاء کو جب یہ اندازہ ہوگیا کہ ہم جہاد میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے تو وہ اپنی جانوں پر کھیل کر مردانگی ، بہادری اور بے جگری کے ساتھ دشمنوں سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوگئے ۔

سید احمد شہید اور مولوی شاہ محمد اسماعیل کی شہادت کے بعد بھی یہ تحریک جہاد ختم نہ ہوئی ، بلکہ اس تحریک نے اپنا جنگی مرکز تبدیل کر کے مختلف ادوار میں سلسلہ جہاد جاری رکھا ۔ اور جد و جہد کا جو جذبہ اس تحریک نے پیدا کیا تھا وہ برصغیر کو آزادی حاصل ہونے تک کسی نہ کسی شکل میں جاری رہا ۔

انسان کا یہ فطری تقاضہ ہے کہ ہر معمار کو اپنی عمارت سے انس و لگاؤ ہوتا ہے ۔ برصغیر میں مسلمانوں نے اپنی حکومت کو نو سو سال سے تعمیر کیا تھا ۔ لہٰذا انھیں بھی اس سرزمین سے محبت اور دلچسپی کا ہونا ناگزیر تھا ۔ مگر جنگ پلاسی، بکسر، روہیلکھنڈ، میسور ، مدراس ، دکن اور بمبئی وغیرہ میں فرنگیوں کو پے درپے کامیابی حاصل ہونے کے بعد مسلمانان ہند خصوصاً اور اہل ہند عموماً مایوس اور پریشان تھے ۔ چونکہ موجودہ

حالات کے پیش نظر اب دیسی حکومت کے قائم رہنے کی اُمید منقطع ہوگئی تھی[1] ۔ دوسری طرف فرنگیوں کے ظلم و جور نے اہل ہند کو ۱۸۵۷ء میں استخلاص وطن کی جنگ آزادی لڑنے پر مجبور کیا ۔ اس جنگ آزادی میں امام عبدالعزیز کی جماعت کے مقتدر رہنما ، علماء و قائدین ملت نے جو کار ہائے نمایاں انجام دیے وہ تاریخ ہند کے اہم ابواب ہیں ۔ ان حضرات میں مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ، مولانا فضل حق خیر آبادی ، مولانا سرفراز علی ، مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی ، مفتی صدر الدین خان آزردہ ، مولانا محمد قاسم نانوتوی ، اور مولانا رشید احمد گنگوہی جیسی مقتدر ہستیاں تاریخ میں روز روز پیدا نہیں ہوتیں ۔ ان میں سے بعض ہستیاں ایسی بھی تھیں جنھوں نے جنگ آزادی میں برطانیہ کی تربیت یافتہ اور مسلح افواج کو کئی مقامات پر شکست دی ۔ لیکن اس جنگ آزادی نے نہ تو برطانوی اقتدار کو ختم کیا اور نہ ہی کسی قسم کا سیاسی اور مادی فائدہ حاصل ہو سکا ۔ بلکہ اس کے برعکس عوام اور علماء سب ہی ہمہ قسم کے مصائب و آلام کا شکار ہوئے ۔

تاریخ کے طالب علم سے یہ بات مخفی نہیں کہ اسلامی عہد حکومت میں ، جب کہ علماء کے زیر اثر ملکی اور سیاسی مسائل طے ہوتے تھے تو ان میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی امتیاز نہ ہوتا تھا ۔ اور قانون کی نظر میں سب برابر تھے اور سب کے ساتھ حتیٰ کہ حکمران کے ساتھ بھی یکساں سلوک کیا جاتا تھا[2] ۔ مگر برطانوی عمل داری میں دو رخی اور جانب داری کی پالیسی اختیار کی گئی ۔ جس کے تحت ہندوؤں کو ابھارا ، اور عدل و انصاف میں بھی امتیاز اور جانب داری سے کام لیا ۔ حتیٰ کہ سرکاری ملازمتوں میں بھی مسلمانوں کو خاطر خواہ حصہ نہ دیا ۔ مزید برآں پادریوں کی سرکاری سرپرستی کی بناء پر ارتداد کا خطرہ جو پہلے ہی سے تھا اب مزید بڑھنے لگا ۔ اس خطرہ کو روکنے کے لیے علماء کے مخصوص (مسلک ولی اللہ سے وابستہ) گروہ نے مدرسہ دیو بند قائم کیا ۔ اس دارالعلوم کے فیض یافتہ علماء نے خصوصاً و دیگر علماء نے عموماً نصرانیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکا ۔ بلکہ بعض حضرات نے (نیز دیگر ممالک کے حضرات نے بھی) مناظروں اور مباحثوں میں پادریوں کو جا بجا شکست دے کر ان کی ہمت شکنی کی ۔ جس کے نتیجہ میں مسلمانان برصغیر فتنہ ارتداد کے عظیم خطرہ سے آئندہ کے لیے محفوظ ہوگئے ۔

---

۱ - مولانا سید حسین احمد مدنی ، "نقش حیات" ، حصہ اول ، دیو بند ۱۹۵۳ء ، ج ۲ ، ص ۳
مولانا محمد میاں ، "جمعیۃ علماء کیا ہے" ؟ ، دہلی س ن ، ص ۳

۲ - مولوی طفیل احمد منگلوری ، "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، دہلی ، ۱۹۴۵ء ، ص ۲۳ ؛ "نقش حیات" ، ج ۲ ، ص ۹

۱۸۵۷ء کے بعد علماء ظاہری طور پر تو فی الوقت سیاست سے دستبردار تھے۔ لیکن ان کے لیے طبعاً یہ ناممکن تھا کہ وہ ملی مسائل سے یکسر چشم پوشی کر لیں۔ للهذا وہ کسی نہ کسی شکل میں اپنا سیاسی کردار ادا کرتے رہے۔ مثلاً ۱۸۷۷-۷۸ء کی ترکی و روس کی جنگ میں مولانا محمد قاسم نانوتوی نے چندہ جمع کر کے اپنے دینی بھائیوں کی مدد کے لیے ترکی روانہ کیا۔ نیز ۱۸۷۹-۸۰ء میں مولانا محمود حسن نے ثمرۃ التربیت قائم کی جس کی سرگرمیاں بظاہر تو سیاسی نہ تھیں مگر سیاسی نوعیت کی خفیہ اور راز دارانہ تھیں۔

۱۸۸۵ء میں قیام کانگریس کے بعد علماء نے سیاست میں کھل کر دلچسپی اور حصہ لینا شروع کیا۔ اور مولانا رشید احمد گنگوہی، علماء لدھیانہ اور دیگر علماء نے بذریعہ فتویٰ، مسلمانان ہند کو کانگریس میں شریک ہو کر جد و جہد آزادی میں حصہ لینے کا مشورہ دیا۔ مگر کانگریس میں شریک ہونے کے مسئلے نے علماء اور عوام میں دو متضاد، سیاسی نظریے قائم کیے۔ ایک نظریہ کے تحت کانگریس میں شریک ہونا جائز نہ تھا۔ علماء کا بڑا گروہ تو کانگریس کا حامی و موید تھا۔ لیکن مسلمانوں کی بڑی جمعیت، جس میں علماء کی ایک قلیل تعداد شامل تھی، کانگریس میں شرکت کی مخالف تھی۔

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد علماء ثمرۃ التربیت، جمعیۃ الانصار۔ نظارۃ المعارف اور تحریک ریشمی رومال وغیرہ سے منسلک رہے۔ مگر جنگ عظیم اول کے آغاز سے قبل علماء نے من حیث الجماعت سیاست میں عملی حصہ نہیں لیا۔ قیام کانگریس کے بعد سیاست میں بیشتر علماء کانگریس کی پالیسیوں کی تائید و حمایت کرتے رہے۔ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم اول کے آغاز کے بعد مولانا محمود حسن نے اپنی خفیہ اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے عملاً جد و جہد شروع کی اور اسی اسکیم کو بروئے کار لانے کے لیے مولانا عبیداللہ سندھی کو کابل جانے کا حکم دیا۔ اور خود حجاز چلے گئے۔ تا کہ عالم اسلام سے، اقتصادی، سیاسی، اخلاقی اور مسلح امداد و اعانت حاصل کرکے برصغیر کو بیرونی طاقت کی غلامی سے نجات دلائیں۔ گو کہ شیخ الہند اس اسکیم میں کچھ اپنوں کی اور کچھ غیروں کی سازش کی بناء پر کامیاب نہ ہو سکے۔ علماء دیو بند اور ان کے ہم خیال علماء جن میں مفتی کفایت اللہ مولانا حسین احمد مدنی، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا محمد صادق کراچوی اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اپنے متعلقین کی سیاسی پالیسی یعنی کانگریس کے ساتھ مل کر بیرونی طاقت کا ملک سے اخراج اور ملک کو آزاد کرانے کی جد و جہد پر گامزن رہے۔

علماء دیو بند کی سیاسی پالیسی واضح اور عیاں تھی ۔ یعنی ملک کو آزاد کرانے کے لیے برطانیہ کا مقابلہ کیا جائے ۔ علماء کے اس بنیادی خیال اور متفقہ سیاسی مسلک کے پیش نظر کوئی دوسرا پروگرام یا نظام ، علماء کے لیے عملاً ناقابل تقلید تھا ۔ علماء کو اس امر کا صحیح اندازہ نہ ہو سکا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے ، پچھلی نصف صدی میں سیاسی طاقت کا توازن ہندوؤں کو منتقل ہو رہا تھا ۔ کیونکہ جمہوری طرز کی حکومتوں میں تمام فیصلے ووٹوں (رائے شماری) کی اکثریت کی بنا پر عمل میں آتے ہیں ۔ جس کے عملاً معنی یہ تھے کہ تمام فیصلے ہندوؤں کی منشاء و مرضی کے مطابق ہوں گے ۔ علاوہ ازیں علماء سے ایک سیاسی فرو گزاشت یہ بھی ہوئی کہ انھوں نے برصغیر میں ہندوؤں کی ایک عظیم اکثریت کو بھی محسوس نہیں کیا ۔ جو زبان اور نسلی اعتبار سے ہی اکثریت میں نہ تھے بلکہ معاشی ، صنعتی اور تعلیمی اعتبار سے بھی عظیم تر طاقت تھے ۔ نیز برطانوی ہند کے نظم و نسق میں بھی ان کا بڑا عمل دخل ہو چلا تھا ۔ غرض یہ کہ مندرجہ بالا مسائل میں علماء کا طرز عمل غیر حقیقی ، الجھا ہوا اور مبہم تھا ۔ علماء کے ایک بڑے گروہ نے اپنی نیک نیتی اور خوش کن توقعات کے تحت ہندوؤں کی اکثریت پر بھروسہ کیا اور کانگریس کی سیاسی پالیسی کی تائید و حمایت کی ۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور جمعیۃ کے اکابر ہمیشہ یہ بات کہتے رہے کہ ہمارا سب سے بڑا دشمن برطانیہ ہے ۔ ہمیں متحد اور متفق ہو کر اسے ملک سے نکال دینا چاہیئے ۔ اور جب ہم آزاد ہو جائیں گے تو اپنے حقوق کا تعین باہمی مشورے و رضا مندی سے کر لیں گے حالانکہ ہندوؤں کے مسلم بیزار رویے سے اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ سیاسی آزادی اور استیلا ملنے کے بعد وہ مسلمانوں کے مذہبی ، سیاسی ، تمدنی اور تہذیبی ورثہ کی حفاظت ، خلوص ، نیک نیتی اور مساوات کے جذبہ کے تحت کر سکیں گے ۔ علماء نے اس اہم حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیا کہ انگریزی راج تو ہر صورت سے دیر سویر ختم ہونے والا ہی ہے ۔ درآں حالیکہ ہندوؤں کی عددی اکثریت دائمی اور ہمیشہ قائم رہنے والی اور ناقابل تردید حقیقت ہے ۔

جمعیۃ علماء کا موقف یہ تھا کہ اہل ہند کو آزادی کامل دی جائے اور اس وطنی آزادی میں تمام صوبے "کامل خود مختار" ہوں ۔ نیز وطن میں ایک مرکزی وفاق ہو ۔ جمعیۃ علماء ہند کا یہ مطالبہ ۱۹۲۶ء سے ہی چلا آ رہا تھا ۔ اور ۱۹۳۱ء میں جمعیۃ نے ایک جامع منصوبہ پیش کیا ۔ جس کے تحت صوبوں کی "مکمل خود مختاری" کا مطالبہ بھی شامل تھا ۔ ۱۹۳۴ء میں مولانا حسین احمد مدنی نے بھی اس مطالبے کی تائید کی ۔ مولانا احمد سعید نے اس امر کی مزید وضاحت ۱۹۳۹ء میں کی اور اپنے خطبۂ صدارت میں صراحت کے ساتھ یہ کہا کہ "جمعیۃ ہندوستان کی وفاقی حکومت اور ایک مرکز کو پسند کرتی

ہے۔ کیونکہ اس کے خیال میں مجموعۂ ہندوستان خصوصاً مسلمانوں کے لیے یہ مفید ہے۔ مگر وفاقی حکومت کا قیام اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ صوبوں کے لیے خود ارادیت کو تسلیم کر لیا جائے۔"[1]

مندرجہ بالا ہر دو بیانات میں پہلا بیان یعنی صوبوں کو "کامل آزادی" کا مطالبہ تو جمعیۃ نے ۱۹۳۱ء میں کیا تھا[2] اور پھر اسی مطالبے کا اعادہ مولانا حسین احمد مدنی نے ۱۹۴۲ء میں کیا تھا۔ لیکن ۱۹۳۶ء میں مولانا احمد سعید نے صوبوں کے لیے "خود ارادیت" کا مطالبہ کیا۔ اور ساتھ کے ساتھ ایک مرکزی وفاق کو بھی اس مطالبے میں شامل کیا۔ یہاں یہ بات واضح کرنا از بس ضروری ہے کہ خود مختاری اور خود ارادیت میں نمایاں فرق ہے۔ خود مختاری کے لغوی معنی تو آزادی یا ذی اختیاری کے ہیں۔ لیکن سیاسی اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہے کہ صوبوں کو مخصوص اختیارات دے کر مرکزی وفاق کے تابع کر دیا جائے۔ اس کے برعکس خود ارادیت کے لغوی معنی ہیں اپنے ارادے یا اپنی مرضی سے کسی کام کو انجام دینا۔ سیاسی اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہے کہ صوبے اپنے اندرونی اور بیرونی معاملات میں کامل آزاد ہوں۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ صوبوں کی آزادی میں کوئی مرکز یا وفاقی حکومت مداخلت نہ کر پائے۔ اس تشریح کے بعد یہ بات سمجھنا آسان ہے کہ جمعیۃ کے قائدین خود مختاری اور خود ارادیت کے واضح فرق کو کماحقہ، سمجھ نہ سکے تھے۔ لیکن اس تضاد میں سیاسی کوتاہ نظری کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ذہن میں آتی ہے کہ ممکن ہے کہ ان قائدین نے پاکستان کے مطالبے کے بعد مسلم عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہو کہ ہمارا مقصد بھی مسلم اکثریت والے صوبوں کے لیے "حق خود ارادیت" طلب کرنا ہے۔ لہٰذا ہمارے مطالبے کی تائید و حمایت کی جائے۔ ایک دوسری شکل یہ بھی ممکن ہے کہ ان قائدین نے "خود مختاری" اور "خود ارادیت" کے سیاسی مفہوم کو ہی نہ سمجھا ہو یا اس کے سمجھنے کو درخور اعتناء نہ سمجھا ہو اور کانگریس کی سیاسی اور اکثریتی نمائندگی کی بناء پر اپنے پیش کردہ مطالبے پر ہی اکتفا کیا ہو۔

جمعیۃ نے مسلم عددی اقلیت کو ہندوؤں کی عددی اکثریت کے رحم و کرم پر چھوڑنے کی مخالفت کی اور اس بات پر زور دیا کہ مسلم عوام اپنی مذہبی، سیاسی، تہذیبی،

۱۔ مولانا سید حسین احمد مدنی، "خطبہ صدارت" لاہور، مارچ ۱۹۴۲ء، ص ص ۲۳-۲۴ ؛
مولانا احمد سعید دہلوی، "خطبہ صدارت"، میرٹھ، فروری ۱۹۳۶ء، ص ص ۶۰-۶۱

۲۔ مولانا محمد میاں، "جمعیۃ علماء کیا ہے؟" (جمعیۃ علماء ہند کے دو سیاسی فارمولے)، دہلی، س۔ن، ص ص ۸۲-۸۳ ؛
مولانا سید حسین احمد مدنی، "خطبہ صدارت، ۱۹۴۲ء"، ص ص ۲۳-۲۴

شخصی قانون (پرسنل لاء) اور ثقافتی اعمال و افعال میں آزاد ہوں گے ۔ اور مرکزی ایوان میں ممبروں کی تعداد کا حسبِ ذیل تناسب بھی طلب کیا :

ہندو	۴۵
مسلم	۴۵
دیگر اقلیتیں	۱۰
کل میزان	۱۰۰[۱]

چنانچہ اس بات کا سمجھنا آسان ہے کہ مرکزی وفاق کے تحت میں صوبوں کا ہونا اور پھر ان کی "خود ارادیت" کا قائم رہنا یہ ایک ناقص تصور تھا بلکہ یہ کہنا آسان ہے کہ وفاق کی صورت میں برصغیر کے کل صوبے ۱۲ تھے اور بارہ صوبوں میں صرف پانچ صوبے مسلم اکثریت کے تھے اور باقی سات صوبے ہندوؤں کی اکثریت کے تھے ۔ اگر جمعیۃ کے مطالبے کو اس حیثیت سے تسلیم کر لیا جاتا کہ وفاق کا قیام مشروط طور پر ہوگا۔ یعنی وفاق میں وہی قانون نافذ العمل ہوں گے جنھیں تمام صوبے متفقہ طور پر طے کر لیں تو ایسی صورت میں بھی سات صوبے تو وہی قانون پسند کرتے جس میں اکثریت کا فائدہ مدِ نظر ہوتا اور باقی پانچ صوبوں میں بھی ہندوؤں کی تعداد ۴۰ تا ۴۵ فی صد کے قریب تھی الاّ سرحد اور بلوچستان کے تو پھر جمہوری اداروں یعنی قانون ساز اسمبلیوں میں بھی ہندو اپنی تعداد کے لحاظ سے سیٹیں حاصل کرتے اور استصواب کے وقت وہ قانون کے اسی پہلو کی تائید و حمایت کرتے جو ان کے مفاد اور حقوق کا تحفظ کرتا ۔ لہٰذا ایسی صورت میں بھی صوبوں کی "خود ارادیت" کا قائم رہنا ، ناممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا ۔

مندرجہ بالا حقائق کے باوجود یہ بات بھی بڑی اہم اور ناقابلِ تردید ہے کہ علماء کے ذہنوں میں یہ بات بھی موجود تھی کہ اگر ہم نے پاکستان کی مجوزہ اسکیم کے ماتحت حمایت کی اور چند صوبوں کو الگ کرکے ایک ریاست (پاکستان) بنا لی تو برصغیر جو ایک وسیع و عریض ملک ہے اور اس کے ہر شہر ، قصبے اور دیہاتوں میں مسلمانوں کے دینی مدارس ، عبادت گاہیں ، اوقاف ، مقدس مقامات ، جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ ، زراعت ، تجارت ، صنعت و حرفت موجود ہیں انھیں یکسر اور کلیتاً خیرباد کہنا پڑے گا ۔

---

۱ ۔ مولانا احمد سعید دہلوی ، "خطبۂ صدارت" ، ۱۹۳۶ء ، ص ص ۵۹-۶۱ ؛ مولانا محمد میاں ، "علماء حق" ، مراد آباد ، ۱۹۳۹ء/۱۹۳۴ء ، حصہ دوم ، ص ص ۱۶۵-۲۵۲

اور اس طرح آن واحد میں مسلمانوں کے صدیوں سے قائم شدہ ، معاشی ،معاشرتی، تمدنی، تاریخی اور یاد گاری روایات و آثارات کو نہ صرف ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیرباد کہنا پڑے گا، بلکہ یہ بات بھی قابل اعتناء تھی کہ برصغیر سے مسلمانوں کے ہجرت کرنے کے بعد ان تمام آثار کی بقا بھی معرض خطر میں ہوگی ۔

مولانا آزاد نے قیام پاکستان کی مخالفت کے متعلق کچھ مزید دلائل اور حقائق بیان کرتے ہوئے ۱۹۵۷ء میں کہا تھا کہ :

"پاکستان کی شمال مغربی اور مشرقی سرحدوں کا جغرافیائی اتصال نہ ہونے کی بناء پر ان دونوں حصوں کا متحد اور متفق رہنا بعید از قیاس ہے ۔"

(حوالے کے لیے باب ہفتم ، فصل چہارم دیکھیے) مولانا نے مزید کہا کہ:

"اسلامی ریاستوں کا محض اسلام (دین) کی بنیاد پر متفق رہنا" تاریخ کے ساتھ جنگ کرنے کے مترادف ہے ۔ چونکہ اسلام کے ابتدائی دور کے علاوہ تمام اسلامی ریاستیں حتیٰ کہ عرب ریاستیں بھی محض دین کی بنیاد پر آج تک متفق نہ ہو سکیں ۔

علماء کے کانگریس نواز گروہ کے علاوہ ایک دوسرا گروہ جس میں بعض علماء دیوبند بھی شریک تھے ، مسلم لیگ نواز بھی تھا ۔ اس گروہ کے مقتدر علماء میں مولانا اشرف علی تھانوی ، مولانا شبیر احمد عثمانی کے علاوہ دیگر علماء اور مشائخ بھی شریک تھے ۔ یہ گروہ مسلم لیگ کے مجوزہ پاکستان اور اس کی پالیسیوں کی تائید و حمایت کرتا تھا ۔ اس گروہ کا موقف یہ تھا کہ مسلم تہذیب و تمدن ، ثقافت و معاشرت ، معیشت و تجارت ، صنعت و حرفت اور سیاسی اقتدار و غلبہ کے لیے مسلمانوں کی ایک علیحدہ ریاست کا ہونا ضروری ہے ۔ ان کے خیال میں اسلام کے نظام اور قرآنی ضابطۂ حیات کے عمل و نفوذ کے لیے پاکستان کا قائم ہونا ناگزیر تھا ۔ چنانچہ علماء کے اس گروہ نے نہ صرف پاکستان کی لفظی تائید و حمایت کی بلکہ مرکزی اور صوبائی انتخابات کے دوران انھوں نے صوبوں کے دورے کرکے مسلم عوام کو ان کے ووٹوں کی اہمیت بیان کی ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی نمایاں کامیابی میں ان علماء کی خدمات کا بھی اہم حصہ تھا ۔

مزید برآں ۳ جون ۱۹۴۷ء کو برصغیر کی تقسیم کے اعلان کے وقت دو مسلم اکثریت کے صوبے ، آسام اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں کانگریسی حکومت تھی ۔ ارباب اقتدار نے ان صوبوں کی پاکستان میں شمولیت کی مشروط طور پر اجازت دی ۔ یہ

یہ کہ وہاں کے عوام سے استصواب رائے کے ذریعہ ان کا فیصلہ معلوم کیا جائے۔ اگر عوام اپنی مرضی و منشاء کے تحت پاکستان میں شریک ہونا چاہیں تو انہیں بھی پاکستان میں شریک کر دیا جائے۔ بصورت دیگر وہ صوبے ہندوستان میں ہی شامل رہیں۔ چنانچہ علماء کے اس گروہ نے اس سلسلے میں بڑی نمایاں خدمات انجام دیں۔ اور مسلم عوام میں مذہبی احساسات اور ملی جذبات کو ابھارا۔ ہندوستان میں ان کی شرکت کے عواقب و نتائج سے انہیں آگاہ کیا۔ مسلم عوام نے ہندوؤں کے افعال و اعمال کے ماضی اور حال کا جائزہ لیتے ہوئے استصواب کے ذریعہ پاکستان میں شمولیت کا اعلان کیا۔ اس ضمن میں علماء کا کارنامہ قابل ستائش اور لائق اعتناء تھا۔

علماء کے کانگریس نواز گروہ نے ان بدلتے ہوئے حالات و واقعات کا عمیق نظر سے اور حقیقت پسندانہ جائزہ نہیں لیا جو کہ موجودہ دور کے سائنسی، صنعتی، حرفتی اور سیاسی انقلاب کی بناء پر رونما ہوئے۔ ان حالات نے دنیا کے مستقبل کو اور سیاسی معاملات کو حل کرنے کا انداز فکر ہی تبدیل کر دیا ہے۔ ان مذہبی رہنماؤں کو یہ یقین تھا کہ مسلم عوام اسلام کے نام پر ہمہ قسم کی قربانی دینے کےلیے آمادہ و تیار رہتے ہیں اور دینی پیشوائی کے تحت علماء کا اقتدار بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ان علماء نے یہ خیال کیا کہ ہم نے جو کچھ سیاسی فیصلہ کیا ہے اسے مسلم عوام کی اکثریت کی تائید اس لیے حاصل ہونا لازم ہے کہ مسلم عوام کی نظر میں علماء اسلام کے نگہبان اور وارث خیال کیے جاتے ہیں۔ علماء کا یہ خیال تھا کہ ہمارا یہ قدم کلیتاً عقل و دانائی اور حقیقت حال کے عین مطابق ہے۔ گو کہ علماء نے اس تصور میں تسامح سے بھی کام لیا۔ موجودہ دور کی مدنی زندگی اور سیاسی جد و جہد اتنی پیچیدہ اور الجھی ہوئی ہے کہ سیاستدانوں کو وقت کے اہم تقاضوں کو سمجھنے کے لیے عالمی سیاست اور عالمی معاشیات میں بالغ نظری کی ضرورت ہے۔ سیاستدانوں کے لیے یہ بھی اشد ضروری ہے کہ وہ ملک کے معاشی، معاشرتی، ثقافتی، تعلیمی، سائنسی، فنی اور دیگر پیش آمدہ مسائل سے کماحقہٗ واقف ہوں۔ اور ساتھ کے ساتھ انہیں حل کرنے کےلیے نظم و نسق کی ہر سطح سے اور ہر پہلو سے عملاً واقف ہوں اور اس میں مہارت بھی رکھتے ہوں۔ موجودہ دور میں بین الاقوامی سیاست و معاملات سے باخبر اور سیاسی بصیرت و دور اندیشی سے کام لینے والے علماء اور رہنما ہی مسلمانوں کی صحیح راہنمائی اور قیادت کے فرائض انجام دے سکتے ہیں۔ یہ بات افسوس کے ساتھ تسلیم کرنا پڑے گی کہ ایک مخصوص شعبۂ علم میں مہارت کے باوجود، بیشتر علماء کو پارلیمانی سیاست، ملکی معیشت، بین الاقوامی روابط اور دیگر پیچیدہ ملکی اور عالمی امور میں کماحقہٗ وہ بالغ نظری حاصل نہ تھی جو بیسویں صدی میں کامیاب قیادت کا جزو لازم ہے۔

مقصورات :

س ن = سن ندارد

م ن = مقام ندارد

کتابیات

کتب و جرائد حواله و استفاده

۱ - ابن تیمیه ، شیخ الاسلام امام ، "سیاست شرعیه" (مترجم مولانا ابوالعلا محمد اسمٰعیل گودہری) کراچی ، س ن -

۲ - ابوالاثر عبدالسلام ، مولانا ، "تذکرہ مشائخ بنارس" ، بنارس ، ۱۳۷۱ھ -

۳ - ابوالاعلی مودودی ، مولانا سید ، "اسلام اور جدید معاشی نظریات" ، کراچی ، ۱۹۶۱ء ، طبع دوم -

۴ - ـــــ ، "اسلام عصر حاضر میں" ، کراچی ، ۱۹۶۸ء -

۵ - ـــــ ، "اسلام کا سرچشمہ قوت" ، (مرتب شہیر نیازی) ، لاہور ، ۱۹۷۱ء ، طبع دوم -

۶ - ـــــ ، "اسلام کا نظام حیات" ، لاہور ، ۱۹۶۸ء -

۷ - ـــــ ، "انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا حل" ، لاہور ، ۱۹۶۲ء ، بار نہم -

۸ - ـــــ ، "تحریک آزادی ہند اور مسلمان" ، لاہور ، ۱۹۶۴ء -

۹ - ـــــ ، "تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں" ، لاہور ، ۱۹۵۴ء -

۱۰ - ـــــ ، مولانا سید ، "حقیقت جہاد" ، لاہور ، ۱۹۳۶ء -

۱۱ - ابوالاعلیٰ مودودی ، مولانا سید ، "موجودہ سیاسی کشمکش" ، حصہ اول و دوم ، لاہور ، ۱۹۶۳ء -

۱۲ - ابوالحسن علی ندوی ، مولانا سید ، "تاریخ دعوت و عزیمت" ، حصہ اول و دوم ، اعظم گڑھ ، ۱۹۵۵ء ، ۱۹۵۷ء -

۱۳ - ——— ، "تاریخ دعوت و عزیمت" ، حصہ سوم ، لکھنؤ ، ۱۹۶۳ء -

۱۴ - ——— ، "تذکرہ مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی" ، لکھنؤ ، ۱۳۷۷ھ -

۱۵ - ——— ، "سیرت سید احمد شہید" ، لکھنؤ ، ۱۳۶۸ھ -

۱۶ - ابو احمد عبداللہ لدھیانوی ، "انقلاب انگیز مکتوب" ، حصہ دوم ، گجرانوالہ ، س ن -

۱۷ - ابوالکلام آزاد ، مولانا ، "الہلال (مکمل فائل)" ، کلکتہ ، س ن -

۱۸ - ——— ، "تذکرہ" ، حصہ اول تا چہارم ، لاہور ، س ن -

۱۹ - ——— ، "ہماری آزادی" ، (مترجم محمد مجیب) ، بمبئی ، ۱۹۶۱ء -

۲۰ - ابو سلمان شاہجہان پوری (مرتب) ، "مکاتیب مولانا ابوالکلام آزاد" ، کراچی ، اردو اکیڈمی سندھ ، ۱۹۶۸ء -

۲۱ - ابو رحمت عبدالرحمٰن ، "معرکہ سیاست و خلافت" ، امرتسر ، س ن -

۲۲ - ابو ظفر ندوی ، مولانا سید ، "سلسلہ تاریخ ہند" ، حصہ اول و دوم ، اعظم گڑھ ، ۱۹۳۷ء -

۲۳ - ——— ، "گجرات کے تمدن کی تاریخ مسلمانوں کے عہد میں" ، اعظم گڑھ ، ۱۹۶۲ء -

۲۴ - ——— ، "مختصر تاریخ ہند" ، اعظم گڑھ ، ۱۹۴۸ء ، بار سوم -

۲۵ - ابو یحییٰ امام خان نوشہروی ، "تراجم اہل حدیث" ، دہلی ، ۱۹۳۸ء -

۲۶ - احتشام الحسن کاندھلوی ، مولانا ، "حالات مشائخ کاندھلہ" ، نئی دہلی ، ۱۹۵۷ء -

۲۷ - احمد حسین ، "سوانح عمری حضرت شاہ بلاقی مراد آبادی" ، رام پور ، ۱۳۱۲ھ -

۲۸ - احمد خان ، سر سید ، "اسباب بغاوت ہند" ، (مقدمہ ، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی) ، کراچی ، ۱۹۵۷ء -

۲۹ - ——— ، "ہنٹر پرہنٹر" ، لاہور ، ۱۹۴۹ء -

۳۰ - احمد الدین ، حافظ صوفی ، "فلاح دارین" ، کراچی ، س ن -

۳۱ - احمد سعید ، مولانا ، "پاک زندگی" ، دہلی ، س ن ، (تیسرا ایڈیشن) -

۳۲ - ——— ، "تقریر سیرت" ، دہلی ، س ن ، (تیسرا ایڈیشن) -

۳۳ - ——— ، "خطبۂ صدارت میرٹھ ، ۱۹۴۶ء" ، دہلی ، س ن -

۳۴ - احمد علی شوق ، حافظ ، "تذکرہ کاملانِ رام پور" ، دہلی ، ۱۹۲۹ء -

۳۵ - احمد میاں ، "مسلمانوں کا ماضی ، حال اور مستقبل" ، لاہور ، ۱۹۴۴ء -

۳۶ - احمد ندیم قاسمی (مدیر) ، "نقوش" جشنِ آزادی نمبر ، لاہور ، ۱۹۴۸ء -

۳۷ - اختر رضوی (مترجم) ، "فتح نامہ سندھ عرف چچ نامہ" ، حیدر آباد سندھ ، ۱۹۶۳ء ، مصحح ، محشی اور شارح ڈاکٹر نبی بخش بلوچ -

۳۸ - ادارہ ترجمان الحق - روز نامہ "الجمعیۃ" ، مجاہد ملت نمبر ، بیادگار مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی ، دہلی ، ۱۹۶۲ء -

۳۹ - ادارہ حنیفیہ ، "مختصر تاریخ مدرسہ امینیہ اسلامیہ" ، دہلی ، س ن -

۴۰ - اراکین مجلس قاسم المعارف ، "تعلیمی ہند" ، دیو بند ، س ن -

۴۱ - اسمٰعیل پانی پتی ، شیخ ، "تاریخ پانی پت (مشمولہ حیات نو)" ، م ن ، ۱۹۳۶ء -

۴۲ - اشتیاق حسین قریشی ، "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ، (مترجم ہلال احمد زبیری) ، کراچی ، ۱۹۶۷ء -

۴۳ - اشرف علی تھانوی ، مولانا "خلاصۂ سائنس اوز اسلام" ، دیو بند ، ۱۳۳۸ھ -

۴۴ - اشرف علی تھانوی ، مولانا ، "دعوات عبدیت"، حصہ ششم ، دہلی ، ۱۳۵۴ھ -

۴۵ - اصغر حسین دیو بندی ، میاں ، "حیات شیخ الہند ، سوانح عمری مولانا محمود حسن" ، دیو بند ، س ن -

۴۶ - ـــــ ، "کلیات شیخ الہند" ، دیو بند ، ۱۳۴۰ھ -

۴۷ - آفتاب احمد خاں ، صاحبزادہ ، "کلید سیاست ہند" ، علی گڑھ ، ۱۹۱۶ء -

۴۸ - اقبال ، ڈاکٹر محمد (علامہ) "خطبات اقبال" ، (مرتب رضیہ فرحت بانو) ، دہلی ، ۱۹۴۶ء -

۴۹ - ـــــ "خطبۂ صدارت" ، ۱۹۳۰ء ، دہلی ، س ن -

۵۰ - الطاف حسین حالی ، خواجہ ، "حیات جاوید" ، آگرہ ، ۱۹۰۱ء ، کان پور ، ۱۹۰۲ء ، طبع اول و ثانی -

۵۱ - ـــــ ، "یادگار غالب"، لاہور ، ۱۹۳۲ء -

۵۲ - الطاف الرحمٰن ، مولوی شیخ ، "احوال علماء فرنگی محل" ، لکھنؤ ، س ن -

۵۳ - الطاف علی بریلوی ، "حیات حافظ رحمت خاں" ، لکھنؤ ، ۱۹۳۳ء -

۵۴ - اللہ بخش یوسفی ، "سرحد اور جد و جہد آزادی" ، لاہور ، ۱۹۶۸ء -

۵۵ - امداد صابری ، مولانا ، "سیرت حاجی امداد اللہ اور ان کے خلفاء" ، دہلی : ۱۹۵۱ء -

۵۶ - ـــــ ، "فرنگیوں کا جال" ، دہلی ، ۱۹۴۹ء -

۵۷ - امین احسن اصلاحی ، مولانا ، "اسلامی ریاست" ، لاہور ، ۱۹۶۲ء -

۵۸ - انتظام اللہ شہابی ، مفتی ، "ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء" ، دہلی ، س ن -

۵۹ - ـــــ ، "علماء حق اور ان کی مظلومیت کی داستانیں" ، دہلی ، س ن -

۶۰ - ـــــ ، مفتی ، "غدر کے چند علماء" ، دہلی ، س ن -

۶۱ - ـــــ ، مفتی ، "مشاہیر جنگ آزادی" ، دہلی ، س ن -

۶۲ - ایم محی الدین لکھنوی ، "اسلام بیسویں صدی میں" ، سرگودھا ، ۱۹۶۱ء -

۶۳ - ایمری - ایل - ایس ، "ہندوستان اور آزادی" ، (مترجم شاہ خان یوسفی) ، دہلی ،
۱۹۴۴ء -

۶۴ - برہان احمد فاروقی ، "حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کا نظریۂ توحید" ، لاہور ،
۱۹۶۷ء -

۶۵ - پی - پٹا بھائی سیتا رامیہ ، "تواریخ کانگریس" ، لاہور ، ۱۹۳۰ء -

۶۶ - جان میلکم ، میجر جنرل سر ، "سیاسی تاریخ ہند" (مترجم مولوی ابن حسن) ،
حیدر آباد دکن ، ۱۹۳۲ء -

۶۷ - جمال احمد نقوی ، "تاریخ سادات امروہہ" ، حیدر آباد دکن ، ۱۹۳۴ء -

۶۸ - حبیب احمد چودھری ، "تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء"، لاہور، ۱۹۶۶ء -

۶۹ - حبیب الرحمٰن خاں شروانی ، مولانا ، "استاد العلماء ، حالات مفتی لطف اللہ
علی گڑھی" ، علی گڑھ ، ۱۹۲۷ء -

۷۰ - ــــــ ، "مقالات شروانی" ، علی گڑھ ، س ن -

۷۱ - حبیب الرحمٰن خاں ، حکیم، "ڈھاکہ پچاس برس پہلے"، لاہور ، ۱۹۴۹ء -

۷۲ - حسن ابراہیم حسن ، ڈاکٹر ، "مسلمانوں کا نظام مملکت" ، (مترجم مولوی
علیم اللہ صدیقی)، دہلی ، ۱۹۴۷ء -

۷۳ - حسین احمد مدنی، مولانا سید، "پاکستان کیا ہے؟ (تحریک پاکستان کا پس منظر)"،
دہلی ، حصہ اول ، س ن : حصہ دوم ، ۱۹۴۶ء -

۷۴ - ــــــ ، "تحریک ریشمی رومال" ، (مرتب مولانا عبدالرحمٰن) ، لاہور ،
۱۹۶۶ء -

۷۵ - ــــــ ، "خطبۂ صدارت ، لاہور ، ۱۹۴۲ء" ، دہلی ، ۱۹۴۲ء -

۷۶ - ــــــ ، "سفر نامہ شیخ الہند ، اسیر مالٹا" ، دہلی ، ۱۹۴۷ء -

۷۷ - ــــــ ، "متحدہ قومیت اور اسلام" ، دہلی ، س ن -

۷۸ - حسین احمد مدنی ، مولانا سید ، "مسلم لیگ کی آٹھ مسلم کش غلطیاں" ، دہلی ، ۱۹۴۵ء -

۷۹ - ـــــ ، "مکتوب گرامی" ، دہلی ، ۱۹۴۹ء -

۸۰ - ـــــ ، "نقش حیات"، دیو بند ، جلد اول ، ۱۹۵۳ء ، جلد دوم ۱۹۵۴ء -

۸۱ - حفظ الرحمٰن سیو ہاروی ، مولانا ، "اسلام کا اقتصادی نظام" ، دہلی ، ۱۹۵۱ء ، (طبع چہارم) -

۸۲ - ـــــ ، "تحریک پاکستان پر ایک نظر" ، دہلی ، س ن -

۸۳ - حفیظ الرحمٰن واصف ، "جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ" ، دہلی ، ۱۹۶۹ء -

۸۴ - ـــــ (مرتبہ) ، "مفتی اعظم کی یاد نمبر" ، دہلی ، ۱۳۸۶ھ -

۸۵ - حفیظ بہاولپوری (مترجم) ، "چچ نامہ" ، بہاول پور ، ۱۹۳۹ء -

۸۶ - حیدر زمان صدیقی ، حکیم ، "اسلامی نظریہ سیاست" ، بانکی پور پٹنہ ، ۱۹۴۷ء -

۸۷ - خافی خان نظام الملک (ہاشم علی خان) ، "منتخب اللباب" (مترجم محمود احمد فاروقی) ، کراچی ، حصہ اول تا چہارم ، ۱۹۶۳ء -

۸۸ - خلیق احمد نظامی ، "تاریخ مشائخ چشت" ، دہلی ، ۱۹۵۳ء ، طبع اول -

۸۹ - ـــــ ، "تاریخی مقالات" ، دہلی ، ۱۹۶۶ء -

۹۰ - خلیق احمد نظامی ، "سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات" ، دہلی ، ۱۹۵۸ء ، طبع اول -

۹۱ - ـــــ ، "شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات" ، علی گڑھ ، ۱۹۵۰ء -

۹۲ - خلیق الزمان ، چودہری ، "شاہراہ پاکستان" ، کراچی ، ۱۹۶۷ء -

۹۳ - خورشید احمد ، "تحریک اسلامی" ، کراچی ، ۱۹۶۳ء -

۹۴ - خورشید علی مہر ، مولانا ، "سیرت محمد علی" ، دہلی ، ۱۹۳۱ء -

۹۵ - ذکاء اللہ دہلوی ، خان بہادر ، شمس العلماء ، "تاریخ ہندوستان" ، جلد نہم ، علی گڑھ ، ۱۹۱۹ء -

۹۶ - رام بابو سکسینہ ، "تاریخ اردو ادب" ، لکھنؤ ، ۱۹۱۹ء -

۹۷ - رحمان علی ، مولوی ، "تذکرہ علماء ہند" ، لکھنؤ ۱۹۶۱ء -

۹۸ - رشید احمد ، "مسلمانوں کے سیاسی افکار" ، لاہور ، ۱۹۶۱ء -

۹۹ - رضا علی ، سر سید ، "خطبہ صدارت" ، کراچی ، ۱۹۴۴ء -

۱۰۰ - رضی الدین بدایونی ، "تذکرۃ الواصلین" ، بدایون ، ۱۹۴۵ء -

۱۰۱ - رئیس احمد جعفری ، "دید و شنید" ، لاہور ، ۱۹۴۸ء -

۱۰۲ - ـــــ ، "افادات محمد علی" ، حیدر آباد دکن ، س ن -

۱۰۳ - ـــــ (ترتیب و تہذیب) ، "اوراق گم گشتہ" ، لاہور ، ۱۹۶۸ء -

۱۰۴ - ـــــ (مرتب) ، "علی برادران" ، لاہور ، ۱۹۶۳ء -

۱۰۵ - سعید احمد ، "مسلمانوں کا عروج و زوال" ، دہلی ، ۱۹۴۷ء -

۱۰۶ - سلیمان ندوی ، مولانا سید ، "حیات شبلی" ، اعظم گڑھ ، ۱۹۴۳ء -

۱۰۷ - ـــــ ، "خطبات مدراس" ، اعظم گڑھ ، ۱۹۶۴ء -

۱۰۸ - ـــــ ، "نقوش سلیمانی" ، کراچی ، ۱۹۵۱ء -

۱۰۹ - ـــــ ، "یاد رفتگان" ، کراچی ، ۱۹۵۵ء -

۱۱۰ - سی - ایف - اینڈریوز ، "خیالات مہاتما گاندھی" ، حصہ دوم ، بمبئی ، س ن -

۱۱۱ - شاہ ولی اللہ ، (مترجم رشید احمد انصاری) ، دہلی ، ۱۹۵۵ء -

۱۱۲ - شبلی نعمانی ، مولانا ، "سفر نامہ روم و مصر و شام" ، دہلی ، ۱۳۱۹ھ -

۱۱۳ - ـــــ ، "سیرۃ النعمان" ، حصہ اول و دوم ، دہلی ، س ن -

۱۱۳ - شبیر احمد عثمانی ، مولانا "موجودہ سیاسی کشمکش میں مسلمان کیا کریں کیا نہ کریں" ؟ م ن ، س ن -

۱۱۵ - ـــ ، مولانا ، "ہمارا پاکستان" ، حیدر آباد دکن ، س ن -

۱۱۶ - شریف الدین پیر زادہ ، سید ، "پاکستان منزل بہ منزل" ، کراچی ، ۱۹۶۵ء -

۱۱۷ - شمس سراج عفیف ، "تاریخ فیروز شاہی" (مترجم مولوی فدا علی طالب) ، کراچی ، ۱۹۶۲ء - طبع ثانی -

۱۱۸ - شورش کاشمیری (مرتب) ، "خطبات احرار" ، جلد اول ، لاہور ، ۱۹۴۴ء ، بار اول -

۱۱۹ - شوکت حسین الہ آبادی ، "ذکر المعارف بہ حضرت شیخ محب اللہ بہاری" ، الہ آباد ، ۱۳۴۲ھ -

۱۲۰ - صالح الدین خان نشتر بلرامی، "سوانح عمری مولانا محمد علی جوہر" ، علی گڑھ ، ۱۹۳۱ء -

۱۲۱ - ضیاء الدین احمد برنی ، "تاریخ فیروز شاہی" (مترجم ڈاکٹر سید معین الحق) ، لاہور ، ۱۹۶۹ء -

۱۲۲ - ـــ ، "عظمت رفتہ" ، کراچی ، ۱۹۶۱ء -

۱۲۳ - طالوت ، "نظریہ قومیت اور مولانا حسین احمد مدنی و علامہ اقبال" ، لدھیانہ ، س ن -

۱۲۴ - طفیل احمد منگلوری ، مولوی سید ، "روح روشن مستقبل" ، بدایوں ، ۱۹۴۶ء -

۱۲۵ - ـــ ، مولوی سید ، "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ، دہلی ، ۱۹۴۵ء -

۱۲۶ - ظفر احمد انصاری ، مولانا و دیگر علماء ، "علماء کرام کا اعلان ، سرمایہ داری ، نیشنلزم ، سوشلزم اور کیمونزم" ، کراچی ، س ن -

۱۲۷ - ظفرالدین بہاری ، ملک ، "حیات اعلی حضرت ، سوانح عمری مولوی رضاء احمد خان بریلوی"، جلد اول ، کراچی ، ۱۹۵۵ء -

۱۲۸ - ظہیر الدین لاری ، جسٹس ، ''یوپی کے مسلمانوں کی جد و جہد ، ۵۰-۱۹۳۰ء'' ، کراچی ، ۱۹۷۰ء -

۱۲۹ - عاشق الٰہی میرٹھی، مولوی ، ''تذکرة الرشید حصص'' ، میرٹھ ، ۱۹۰۵ء -

۱۳۰ - عاشق حسین بٹالوی ، ''ہماری قومی جد و جہد'' ، لاہور ، ۱۹۶۶ء -

۱۳۱ - عاصم نعمانی (مرتب)، ''تصوف اور تعمیر سیرت (مولانا مودودی کی تحریروں کی روشنی میں)'' ، لاہور ، ۱۹۷۲ء -

۱۳۲ - عباس جامی مدراسی ، سید ، ''اذکار آزاد'' ، لاہور ، س ن -

۱۳۳ - عبدالباری فرنگی محلی ، مولانا ، ''آثار الاول علماء فرنگی محل'' ، لکھنؤ ، س ن -

۱۳۴ - عبدالباری ندوی ، مولانا ، ''نظام صلاح و اصلاح ، تفسیر سورة العصر'' ، کراچی ، ۱۹۶۲ء -

۱۳۵ - عبدالباقی سہسوانی ، ''حیات العلماء'' ، لکھنؤ ، س ن -

۱۳۶ - عبدالحامد بدایونی، مولانا ، ''خود نوشت سوانح عمری ، مولانا عبدالماجد بدایونی'' ، (مرتب حافظ بابر خان) ، کراچی ، ۱۹۷۰ء - (غیر مطبوعہ)

۱۳۷ - عبدالحلیم ، مولانا ، ''مختصر روداد اجلاس جمعیة علماء ہند مرکزی خلافت کمیٹی'' دہلی ، ۱۹۲۴ء -

۱۳۸ - عبدالحئی ، خواجہ ، ''جہاد ملت'' ، لاہور ، س ن -

۱۳۹ - عبد الحئی ، حکیم مولوی ، ''دہلی اور اس کے اطراف ایک سفر نامہ'' ، دہلی ، ۱۹۲۵ء -

۱۴۰ - عبدالرحمان خان ، مولوی ، ''قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات'' ، جلد اول و دوم ، دہلی ، ۱۹۵۰ء -

۱۴۱ - عبدالرحمان ، سید ، ''اقبال کے خطوط جناح کے نام''، حیدر آباد دکن، س ن -

۱۴۲ - عبدالرشید ، ارشد (مرتب) ، ''بیس بڑے مسلمان'' ، لاہور ، س ن -

۱۴۳ - عبدالستار ، مولوی ، ''تاریخ مدرسہ عالیہ'' ، ڈھاکہ ، ۱۹۵۹ء -

۱۴۴ - عبدالسلام نعمانی ، ''تذکرہ مشائخ بنا اس'' ، بنارس ، ۱۹۶۱ء -

۱۴۵ - عبدالصمد غلام محمد ، ''تواریخ سیال کوٹ'' ، مطبوعہ ۱۳۰۴ھ -

۱۴۶ - عبدالغفار مراد آبادی ، قاضی ، ''حیات اجمل'' ، علی گڑھ ، ۱۹۵۰ء -

۱۴۷ - عبدالقادر بدایونی ، ملا مکتوب شاہ ، ''منتخب التواریخ '' ، (مترجم محمود احمد فاروقی) ، لاہور ، ۱۹۶۲ء -

۱۴۸ - عبدالقدوس ہاشمی ، ''پاکستان اور ہندوستان'' ، حیدر آباد دکن ، ۱۹۴۱ء -

۱۴۹ - ـــــ ، ''تشریحات پاکستان'' ، حیدر آباد دکن ، ۱۹۴۶ء -

۱۵۰ - ـــــ ، ''تقویم تاریخی (قاموس تاریخی)'' ، کراچی ، ۱۹۶۵ء -

۱۵۱ - عبدالماجد بدایونی ، مولانا ، ''تاریخ خلافت'' ، حصہ دوم ، بدایوان ، ۱۳۴۰ھ -

۱۵۲ - عبدالواحد سندھی ، ''اسلام کے مشہور سپہ سالار'' ، کراچی ، ۱۹۵۶ء -

۱۵۳ - عبدالواحد صدیقی ، مولانا ، ''مسٹر جناح کے متعلق ، کھلی علماء کا فتوی'' ، دہلی ، س ن -

۱۵۴ - عبدالوحید خان ، ''تقسیم ہند'' ، لاہور ، ۱۹۵۹ء -

۱۵۵ - عبداللہ یوسف علی ، علامہ ، ''انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ'' ، الہ آباد ، ۱۹۳۶ء -

۱۵۶ - عبیداللہ سندھی ، مولانا ، ''ذاتی ڈائری'' ، لاہور ، س ن -

۱۵۷ - ـــــ ، ''شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک'' ، (مترجم محمد سرور) ، لاہور ، ۱۹۷۰ء ، بار چہارم -

۱۵۸ - ـــــ ، ''کابل میں سات سال'' ، لاہور ، ۱۹۵۵ء -

۱۵۹ - عزیزالحسن واقفر عبد الحق ، ''اشرف السوانح'' ، حصہ دوم ، لکھنؤ ، ۱۳۵۴ھ -

۱۶۰ - عزیز الرحمان ، ''تذکرہ مشائخ دیوبند'' ، کراچی ، ۱۹۶۴ء -

۱۶۱ - عزیز الرحمان جامعی (مرتبہ) ، ''مسلمانوں کی ڈیڑھ سو سالہ قربانیوں کا جائزہ'' ، دہلی ، س ن -

۱۶۲ - عزیز الرحمان ، مولانا مفتی ، "تذکرہ شیخ الہند" ، بجنور ، ۱۹۶۵ء -

۱۶۳ - عقیل احمد جعفری ، "مکالمات آزاد" ، لاہور ، س ن -

۱۶۴ - علی احسن مارہروی ، سید ، "المشاہیر" ، میرٹھ ، ۱۹۰۰ء -

۱۶۵ - عنایت اللہ خان مشرق ، علامہ ، "تذکرہ" ، امرتسر ، ۱۹۲۴ء -

۱۶۶ - غلام احمد شوق فریدی ، حکیم ، "احسن التواریخ سنبھل" ، مراد آباد ، س ن -

۱۶۷ - غلام جیلانی برق ، ڈاکٹر ، "دو قرآن" لاہور ، ۱۹۵۸ء ، نواں ایڈیشن -

۱۶۸ - غلام رسول مہر ، "تبرکات آزاد" ، لاہور ، س ن -

۱۶۹ - ——— ، "سرگزشت مجاہدین" ، لاہور ، ۱۹۶۵ء -

۱۷۰ - غلام محمد ، "تذکرہ سلیمانی" ، کراچی ، ۱۹۶۰ء -

۱۷۱ - فرید وجدی ، علامہ ، "اسلام کے عالمگیر اصول" ، (مترجم سید احمد حسن نقوی)، لاہور ، ۱۹۳۸ء -

۱۷۲ - فضل حسین ، سید ، "سیاست ہند ما بعد غدر" ، لکھنؤ ، س ن -

۱۷۳ - فضل حق ، مولوی ، "مظالم کانگریس" ، دہلی ، س ن -

۱۷۴ - فضل الدین احمد مرزا ، (مرتب) ، "تذکرہ" ، مولانا ابوالکلام آزاد ، حصہ اول تا چہارم ، لاہور ، س ن -

۱۷۵ - فیض احمد مارہروی ، "المشاہیر" ، میرٹھ ، ۱۹۰۰ء -

۱۷۶ - لیاقت علی خان ، نواب زادہ ، پیش لفظ ، "جناح گاندھی گفت و شنید" ، ستمبر ، ۱۹۴۴ء ، دہلی ، س ن -

۱۷۷ - مالک رام ، "تلامذہ غالب" ، نکودر ، ۱۹۵۵ء -

۱۷۸ - محسن الملک ، نواب ، "ہندو مسلمانوں کے تعلقات" - علیگڑھ ، ۱۹۰۲ء -

۱۷۹ - محمد ابرار صدیقی سیوہاروی . "پاکستان کی حقیقت" ، دہلی ، س ن -

۱۸۰ - محمد احتشام الحسن کاندھلوی ، مولانا ، "انتخابی کشمکش اور تہذیب مسلم" ، مراد آباد ، ۱۹۳۵ء -

۱۸۱ - محمد الحسنی ، سید ، "سیرت مولانا محمد علی مونگیری" ، لکھنؤ ، ۱۹۶۴ء ، بار اول -

۱۸۲ - محمد احمد ، "اقبال کا سیاسی کارنامہ" ، کراچی ، ۱۹۵۲ء -

۱۸۳ - محمد الفاروق ، "سوانح حیات ، شاہ محمد حسین الہ آبادی" ، الہ آباد ، ۱۳۵۴ھ -

۱۸۴ - محمد اکرام ، شیخ ، "آبِ کوثر" ، لاہور ، ۱۹۶۶ء ، طبع ششم -

۱۸۵ - —— ، "رود کوثر" ، لاہور ، ۱۹۶۶ء -

۱۸۶ - —— ، "موجِ کوثر" ، کراچی ، ۱۹۶۶ء ، ساتویں بار -

۱۸۷ - محمد انوارالحسن ، "تجلیاتِ عثمانی" ، ملتان ، ۱۹۵۷ء -

۱۸۸ - —— ، "حیات امداد اللہ" ، کراچی ، ۱۹۶۵ء -

۱۸۹ - محمد انور شاہ کشمیری ، مولانا ، "اکفار الملحدین" ، دہلی ، ۱۳۵۰ھ -

۱۹۰ - محمد تقی حیدر شاہ ، "اذکار الاسرار" ، لکھنؤ ، ۱۳۵۷ھ -

۱۹۱ - محمد حبیب الرحمان ، مولانا ، "اشاعت اسلام" ، سہارنپور ، س ن -

۱۹۲ - محمد جعفر تھانیسری ، "حیات سید احمد شہید" ، کراچی ، ۱۹۶۸ء -

۱۹۳ - —— ، "سوانح احمدی" ، منڈی بہاء الدین ، س ن -

۱۹۴ - —— ، "کالا پانی یا تواریخ عجیب" ، لاہور ، س ن -

۱۹۵ - محمد حفیظ اللہ ، "سلاطین ہند کی علم پروری" ، پٹنہ ، ۱۹۵۶ء -

۱۹۶ - محمد محی الدین ، "اسلام بیسویں صدی میں" ، لاہور ، ۱۹۶۱ء -

۱۹۷ - محمد خلیل اللہ ، "تحریک پاکستان" ، کراچی ، ۱۹۶۷ء -

۱۹۸ - محمد دین فوق ، "تاریخ کا روشن پہلو" ، لاہور ، س ن -

۱۹۹ - مجد الدین فوق ، "تذکرہ علماء و مشائخ" ، لاہور ، ۱۹۲۰ء -

۲۰۰ - محمد رحمت اللہ ، حکیم ، "شریعت بل اور مسلم لیگ" ، کلکتہ ، ۱۹۳۶ء -

۲۰۱ - محمد ذکی، "مکالمۃ الصدرین" ، سہارن پور ، س ن -

۲۰۲ - محمد سجاد ، مولانا سید ، "پاکستان کی چیستان" ، دہلی ، ۱۹۴۰ء ، تیسری بار -

۲۰۳ - محمد سرور ، "مولانا عبید اللہ سندھی ، حالات زندگی ، تعلیمات اور سیاسی افکار" ، لاہور ، ۱۹۴۵ء -

۲۰۴ - محمد شفیع دہلوی ، خواجہ ، "دلی کا سنبھالا" ، دہلی ، ۱۹۳۸ء -

۲۰۵ - محمد شفیع ، مفتی ، "کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ" ، دیوبند ، ۱۳۶۵ھ -

۲۰۶ - محمد صبیح الدین شاہجہان پوری ، "تاریخ شاہجہان پور" ، لکھنؤ ، ۱۹۳۲ء -

۲۰۷ - محمد طیب ، مولانا ، "دارالعلوم دیو بند" ، دیو بند ، ۱۹۶۵ء -

۲۰۸ - محمد طفیل ، میاں ، "مسلم فیملی لاء آرڈیننس پر پاکستانی علماء کا تبصرہ" ، لاہور ، س ن -

۲۰۹ - محمد طفیل مدیر ، "نقوش" ، خطوط نمبر ، لاہور ، ۱۹۶۸ء -

۲۱۰ - محمد ظہیرالدین خاں ، ظہیر ، نواب یار جنگ ، "خطبۂ صدارت آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس" ، علی گڑھ ، ۱۹۴۳ء -

۲۱۱ - محمد عبدالحق ، "نفع المہتدی" ، دہلی ، ۱۳۶۵ھ -

۲۱۲ - محمد عبدالرحمان خاں ، مولوی ، "تاریخ اسلام پر ایک نظر" ، دہلی ، ۱۹۵۲ء -

۲۱۳ - محمد عبدالشاہد خاں شروانی ، مولانا ، "باغی ہندوستان" ، بجنور ، ۱۹۴۷ء -

۲۱۴ - محمد عبدالغفار ، قاضی ، "آثار جمال الدین افغانی" ، دہلی ، ۱۹۵۰ء -

۲۱۵ - محمد عثمان فارقلیط ، "شیخ الاسلام نمبر" ، دہلی ، ۱۹۵۸ء -

۲۱۶ - ـــــ ، "مجاہد ملت نمبر" ، دہلی ، ۱۹۶۳ء -

۲۱۷ - محمد علی ، "ہندوستان کی سیاسی الجھنیں" ، حیدر آباد دکن ، ۱۹۴۷ء -

۲۱۸ - محمد عنایت اللہ ، مولوی ، "تذکرہ علماء فرنگی محل" ، لکھنؤ ، ۱۹۳۰ء -

۲۱۹ - مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ، "رپورٹ آل پارٹیز کانفرنس ، ۱۹۲۸ء" ، دہلی ،
۱۹۲۸ء -

۲۲۰ - محمد قاسم فرشتہ ، "تاریخ فرشتہ" ، جلد اول ، (مترجم خواجہ عبدالحئی) ، کراچی ،
۱۹۶۲ء -

۲۲۱ - محمد قریش شمسی ، مولانا سید ، "نظام نامہ کل ہند جمعیۃ علماء اسلام" ،
کلکتہ ، س ن -

۲۲۲ - محمد منظور نعمانی ، مولانا ، "الیکشن جہاد" ، دہلی ، س ن -

۲۲۳ - محمد مہدی ، "تذکرہ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی مرحوم" ، بمبئی ، ۱۹۲۵ء -

۲۲۴ - محمد میاں ، مولانا ، "جمعیۃ علماء کیا ہے ؟" ، حصہ اول ، دہلی ، س ن -

۲۲۵ - ـــــ ، "جمعیۃ علماء کی شرعی حیثیت" دہلی ، س ن -

۲۲۶ - ـــــ ، "خطرناک نعرے" ، ۱۹۴۶ء ، دہلی ، س ن -

۲۲۷ - ـــــ ، "علماء حق" ، دو جلدیں ، دہلی ، ۱۹۴۷ء -

۲۲۸ - ـــــ ، "علماء ہند کا شاندار ماضی" ، چار جلدیں ، دہلی ، ۱۹۴۲ء ، ۱۹۴۷ء ،
۱۹۵۷ء -

۲۲۹ - محمد میاں ، مولانا ، "ہمارا ہندوستان اور اس کے فضائل" ، دہلی ، ۱۹۴۵ء -

۲۳۰ - محمد میاں ، مولانا ، "ہندوستان کی تین بڑی جماعتیں ، جمعیۃ علماء ، کانگریس اور
مسلم لیگ کی تجاویز اور ان کی تشریح" ، دہلی ، س ن -

۲۳۱ - محمد یعقوب نانوتوی ، مولانا ، "سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی" ،
دیوبند ، س ن -

۲۳۲ - معین الحق ، سید ، "تاریخ ہند و پاکستان آخری دور" ، کراچی ، ۱۹۵۰ء -

۲۳۳ - ـــــ ، "معاشری و علمی تاریخ (اسلامی ہند و پاکستان ، ۷۱۰ء-۱۷۰۷ء)" ،
کراچی ، ۱۹۶۵ء -

۲۳۴ - مسعود عالم ندوی ، مولانا ، "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" ، کراچی ، ۱۳۷۱ھ -

۲۳۵ - مشتاق احمد ، منشی ، "سلسلہ مضامین آزاد نمبر ۲۱ ، مضامین ۱۹۲۱ء" ، دہلی ، س ن ، دوسری مرتبہ -

۲۳۶ - ملا واحدی دہلوی ، "میرے زمانے کی دلی" ، کراچی ، ۱۹۶۵ء -

۲۳۷ - مناظر احسن گیلانی ، مولانا ، "سوانح قاسمی" ، سہ جلد ، دیوبند ، ۱۳۷۳ھ -

۲۳۸ - ـــــ ، "مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" ، جلد اول ، دوم ، دہلی ، ۱۹۴۴ء -

۲۳۹ - ـــــ "مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ" ، دہلی ، ۱۹۶۰ء -

۲۴۰ - منیر گوالیاری ، "تلخیص ، تاریخ ادب اردو" ، کراچی ، ۱۹۵۵ء -

۲۴۱ - محمود احمد عباسی ، مولوی ، "تاریخ امروہہ" ، دہلی ، ۱۹۳۰ء -

۲۴۲ - محمود حسن ، شیخ الہند ، مولانا ، "خطبہ صدارت ، جمعیۃ علماء ہند" ، دہلی ، ۱۹۲۰ء -

۲۴۳ - میکڈانلڈ ، مسٹر ، "بیداری ہند" ، م ن ، ۱۹۱۱ء -

۲۴۴ - نذیر احمد دیوبندی ، "تذکرۃ العابدین" ، دہلی ، ۱۹۳۳ء -

۲۴۵ - نکہت شاہجہان پوری ، "اسلام کا تمدنی اور سیاسی نظام" ، لاہور ، ۱۹۳۹ء -

۲۴۶ - نیاز احمد ، شیخ مرتب ، "کلیات حسرت" ، لاہور ، ۱۹۵۵ء -

۲۴۷ - ہاشمی فرید آبادی ، "تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت" ، کراچی ، ۱۹۵۳ء -

۲۴۸ - ہنٹر ، ڈبلیو - ڈبلیو - ، "ہمارے ہندوستانی مسلمان" ، (مترجم ڈاکٹر صادق حسین) لاہور ، ۱۹۴۴ء -

۲۴۹ - یوسف حسین خان ، "تاریخ دستور ہند" ، دہلی ، ۱۹۴۴ء -

۲۵۰ - ـــــ ، "ہندوستان کا سیاسی مستقبل" ، حیدرآباد دکن ، س ن -

۲۵۱ - یوسف حسین خان ، "یادوں کی دنیا" ، اعظم گڑھ ، ۱۹۶۷ء -

۲۵۲ - یوسف سلیم چشتی ، "خلاصہ جوئے کوثر و لہر کوثر" ، لاہور ، س ن -

۲۵۳ - مصنف نامعلوم ، "ایک مقدس بزرگ" ، م ن ، س ن -

۲۵۴ - مصنف نامعلوم ، "روئیداد مقدمہ کراچی اسیران خلافت کمیٹی"، م ن ، س ن -

اخبارات ، جرائد ، ذاتی خطوط اور رودادیں وغیرہ :

۱ - "انجام" (روز نامہ) ، کراچی -

۲ - "آئین" ، (ہفت روزہ) ، لاہور -

۳ - "البشیر"، (ہفتہ وار) ، اٹاوہ -

۴ - "البلاغ" ، (ماہنامہ)، کراچی -

۵ - "الجمعیۃ" ، (سہ روزہ) ۱۹۲۵ - ۳۹ء ، دہلی -

۶ - "الجمعیۃ" ، (روز نامہ) ، ۱۹۴۷ء تا امروز ، دہلی -

۷ - "اردوئے معلّٰی" ، (ماہنامہ) ، علیگڑھ و کان پور -

۸ - "الزبیر" ، (سہ ماہی) ، بہاولپور -

۹ - "القاسم" ، (ماہنامہ) ، دیوبند -

۱۰ - "الناظر" ، لکھنؤ -

۱۱ - "بینات" ، (ماہنامہ) ، کراچی -

۱۲ - "برہان" ، (ماہنامہ) ، دہلی -

۱۳ - "پنج بہادر" ، (ہفت روزہ) ، بمبئی -

۱۴ - "پیام حق" ، (ماہنامہ) ، کراچی -

۱۵ - "پیام مشرق" ، لاہور -

۱۶ - "پیسہ اخبار" ، (روز نامہ) ، لاہور -

۱۷ - "ترجمان القرآن"، (ماہنامہ) ، لاہور -

۱۸ - "تہذیب الاخلاق" (تین ادوار میں) ، علیگڑھ -

۱۹ - "جزائر الذیمان ، لکوبار میں مسلمانوں کی علمی خدمات" (سہ ماہی) ، کراچی -

۲۰ - "جنگ" ، (روز نامہ) ، کراچی -

۲۱ - "چراغ راہ" (نمبر) ، (ماہنامہ) ، کراچی -

۲۲ - ذاتی خطوط مولانا محمد علی ، ۶ ستمبر ۱۹۰۵ء تا ۱۹۳۱ء ، جامعہ ملیہ ، دہلی (اردو و انگریزی) -

۲۳ - "روداد تشکیل و تاسیس، جماعت اسلامی" ، حصہ اول ، لاہور -

۲۴ - "روداد تشکیل و تاسیس ، جماعت اسلامی"، حصہ سوم، حلقہ خواتین ، لاہور -

۲۵ - "زمانہ" ، (ماہنامہ) ، کانپور -

۲۶ - "ستارۂ صبح" ، (ہفت روزہ) ، لاہور -

۲۷ - "شعلۂ طور" (ہفت روزہ) ، کانپور -

۲۸ - "طلوع اسلام" (ماہنامہ) ، دہلی ، مئی ۱۹۳۹ء -

۲۹ - "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" (ہفت روزہ) ، علیگڑھ ، ۱۸۶۶ء - ۱۹۴۴ء -
(نوٹ : ۱۹۲۰ء سے یہ اخبار مسلم یونیورسٹی علیگڑھ گزٹ کے نام سے شائع ہوتا رہا ہے -)

۳۰ - "علی گڑھ گزٹ" ، (سہ روزہ) ، علیگڑھ -

۳۱ - "فکر و نظر"، (ماہنامہ) ، کراچی ، جولائی ۱۹۶۴ء -

۳۲ - "مدینہ" بجنور -

۳۳ - "مسلم" (ہفت روزہ) ، دہلی (جمعیۃ علماء ہند کا پہلا اخبار) -

۳۴ - "نئی روشنی" (روز نامہ) ، کراچی -

۳۵ - "وکیل" (ہفت روزہ) ، امرتسر -

۳۶ - "ہمایوں" (ماہنامہ) لکھنؤ -

BIBLIOGRAPHY

A. Aziz, *Discovery of Pakistan*, 1st and 2nd. ed., Lahore, 1957, 64.

A. B. Keith, *Speeches and Documents on British Dominions*, vol. 11, London, Reprinted 1961.

A. B. Rajput, *Muslim League : Yesterday and Today*, Lahore, 1948.

Abdul Hamid, *Muslim Separatism in India : A Brief Survey (1858-1947)*, Reprinted with corrections, 1971.

Abdul Latif, S., *The Muslim Problem in India*, Bombay, 1939.

Abdul Waheed Khan, *India Wins Freedom : The Other Side*, Karachi, 1961.

Abul Kalam Azad, *India Wins Freedom : Autobiographical Narrative*, Bombay, 1959.

Agha Khan, *India in Transition : A Study in Political Evolution*, Bombay, 1918.

Agha Mahdi Husain, *Rise and Fall of Muhammad bin Tughluq*, London, 1938.

A. H. Alberuni, *Makers of Pakistan*, Lahore, 1950.

A. M. A. Shushtry, *Outline of the Islamic Culture*, Banglore, 1938.

A. Yusuf Ali, *The Making of India : A Brief History of the Different Elements, Geographical, Ethnical, Material, Moral and Political that went to the building up of the Indian people with an account of the Foundation, Consolidation, and Progress of British Rule in India*, London, 1925.

Aziz Ahmad, *Islamic Modernism in India and Pakistan*, London, 1967.

Aziz Ahmad, *Studies in Islamic Culture in the Indian Environment*, London, 1964.

Aziz Beg, *The Quiet Revolution*, Karachi, 1959.

Ata Mohy-ud-Din, *The Arabian Prophet : His Message and Achievement*, Karachi, 1955.

B. D. Basu, Major, *Rise of the Christian Power in India*, Vols. 1 & 2, Calcutta, 1923.

B. R. Ambedkar, *Pakistan or the Partition of India*, Bombay, 1946.

Chakravarty and Bhattacharya, *Congress in Evolution*, Parts 1 & 2, Calcutta, 1935.

Edited by C. H. Philips, *The Evolution of India and Pakistan*, 1858-1947, London, 1962.

Edited by Donald Eugene Smith, *South Asian Politics & Religion*, Princeton, New Jersey, 1966.

Edited by James Hastings, *Encyclopaedia of Religion & Ethics*, Vol. X, 2nd impression, New York, 1930.

Edited by Latif Ahmad Sherwani, *Pakistan Resolution to Pakistan (1940-1947)*, Karachi, 1969.

Edited by Nicholas Mansergh, *Documents and Speeches on British Commonwealth Affairs*, Vol. 1, (1931-1952), London, 1953.

Edited by S. Moinul Haq, *Memoirs of Hakeem Ahsanullah Khan*, Karachi, 1969.

Al Hamza, *Pakistan : A Nation*, Lahore, 1944.

E. Lipson, *Europe in the 19th and 20the Centuries (1815-1939)*, 8th Edition, London, 1960.

E. Lipson, *Europe in the 19th Century : An Outline History*, 3rd ed., London, 1921.

Ervin Brinbaum, *Islamic State of Pakistan*, Karachi, 1955.

Fayyaz Mahmud, Sayyid, *The Story of Indo-Pakistan*, Karachi, 1963.

F. K. Khan Durrani, *Meaning of Pakistan*, Lahore, 1944.

Fredrick Herts, *Nationality and Politics*, n. p., 1944.

G. Allana, *Pakistan Movement : Historic Documents*, Karachi, n. d.

George Dunbar, Bt., Sir, *A History of India from the Earliest Times to the Present Day*, 2nd. ed., London, 1939.

Husain Ahmad Madani, Maulana, *An Open Letter To Muslim League*, Lahore, 1946.

Ishtiaq Husain Qureshi, *The Administration of the Sultanate of Delhi*, 4th ed., Karachi, 1958.

Ishtiaq Husain Qureshi, *The Administration of the Mughul Empire*, Karachi, 1966.

Ishtiaq Husain Qureshi, *The Struggle for Pakistan*, Karachi, 1965.

Ishtiaq Husain Qureshi, *Pakistan an Islamic State*, Lahore, n. d.

Ishtiaq Husain Qureshi, *The Muslim Community of Indo-Pakistan Sub-continent*, The Hague, 1962.

Ishtiaq Husain Qureshi, *Ulema in Potitics*, Karachi, 1972.

Jamiluddin Ahmad, *Muslim Political Movement : Early Phase*, Karachi, 1963.

Jamiluddin Ahmad, *Final Phase of Struggle for Pakistan*, Karachi, 1964.

Jawaharlal Nehru, *Discovery of India*, Calcutta etc., 1946, 1961.

John Gallagher and Anil Seal, *The Emergence of Indian Nationalism*, Cambridge University Press, 1968.

J. Talboys Wheeler, *History of India From The Earliest Ages : Mussulman Rule*, Vol. v, Pt. I, New York, Revised Ed., London, 1875.

Khalid Bin Sayeed, *Pakistan : The Formative Phase*, Ist & 2nd ed., Karachi, 1960, 1968.

Khaliq Ahmad Nizami, *Some Aspects of Religion and Politics in India During the 13th Century*, New Delhi, 1961.

Khaliquzzaman Choudhry, *Pathway to Pakistan*, Lahore, 1961.

K. K. Aziz, *The Making of Pakistan : A Study in Nationalism*, London, 1967.

Lal Bahadur, *The Muslim League*, Agra, 1954.

Leonard Binder, *Religion and Politics in Pakistan*, California, 1963.

L. S. Amery, *India and Freedom*, London, 1942.

M. Kabir, *A Short History of Pakistan : Muslim Rule Under the Sultanate*, Karachi, 1969.

M. Noman, *Our Struggle (1857-1947)*, Karachi, n. d.

Muhammad Abdul Qadir Bilgarami, *Hindu Muslim Ittihad Par Khula Khat Mahatma Gandhi Ke Nam*, Aligarh, 1926.

Mohammed Ali, Green Book No. 1, *Proceeding of a Public Meeting of the Mohammadans Assembled from Different Parts of India at Dacca, on the 30th December 1906 to Discuss the Formation of the All India Muslim League, Under the Chairmanship of Nawab Viqarul Mulk Bahadur*, Indian Telegraph Press, Lucknow, Reprinted for National Archives of Pakistan, Karachi,1969.

Mohammad Ali, *Select Writings and Speeches of Maulana Mohammad Ali*, Compiled and Edited by Afzal Iqbal, 2nd ed., Lahore, 1963.

Mohammad Aziz Ahmad, *Political History and Institutions of the Early Turkish Empire of Delhi (1206-1290 A.D.)*, Lahore, 1949.

Mohammad Bashir Ahmad, *The Administration of Justice in Medieval India*, Allahabad, 1941.

Muhammad Habib and Dr. Mrs. Afsar Umar Salim Khan, *The Political Theory of the Delhi Sultanate*, Allahabad, n. d.

Muhammad Iqbal, Sir, *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, Lahore, 1960.

Muhammad Ishaq, *India's Contribution To The Study of Hadith Literature*, Dacca, 1955.

Muhammad Noman, *Muslim India*, Allahabad, 1942.

Moinul Haq, Syed, *The Great Revolution of 1857*, Karachi, 1968.

Muinuddin Ahmad Khan, *History of the Far'idi Movement in Bengal (1818-1906)*, Karachi, 1965.

M. S. Jain, *The Aligarh Movement : Its Origin & Development*, Agra, 1965.

Muslim League, *Resolutions of The All India Muslim League from May 1924 to December 1938*, n. p., n. d.

M. Mujeeb, *The Indian Muslims*, London, 1967.

N. N. Law, *Promotion of Learning in India During the Muhammadan Rule (By Muhammadans)*, London, 1916.

Paran Nath Chopra, *Some Aspects of Society and Culture During the Mughal Age (1526-1707)*, Agra, 1951.

Prepared by the *A History of the Freedom Movement*, Board of Editors, Vols., 1, 2, and 3, Karachi, 1957, 19601, 963.

Qazi Abdul Mannan, *The Emergence and Development of Dobhasi Literature in Bengal upto 1855*, Dacca, 1966.

Rahmat Ali, Choudhry, *Pakistan*, London, 1947.

Rajendra Prasad, *India Divided*, Bombay, 1946.

Reginald Coupland, *Report on the Constitutional Problem in India*, 3 parts, London, 1942, 1943, 1944.

R. C. Agarwal, *Constitutional History of India and National Movement*, 2nd. ed., Delhi, 1969.

R. C. Majumdar, H. C. Raychaudhuri, Kalikinkar Datta, *An Advanced History of India*, 2nd ed., New York, 1961.

Ram Gopal, *Indian Muslims : A Political History (1858-1947)*, Bombay, 1959.

Razi Wasti, Syed, *Lord Minto and the Indian Nationalist Movement (1905-1910)*, Lahore, etc., 1964.

Richard Symonds, *The Making of Pakistan*, 2nd ed., London, 1950.

Safdar Mahmood and Javid Zafar, *Founders of Pakistan*, Lahore, 1968.

Selected by Sir Maurice Gwyer and A. Appondorai, *Speeches and Documents on the Indian Constitution, (1921-1947)*, Vols. 1 and 2, New York, 1957.

Shaikh Abdul Qadir, Khan Bahadur, *Presidential Address of the All India Muslim League Held at Delhi in 1925*, Lahore, n. d.

Shamsul Hasan, *Presidential Addresses of Mr. M. A. Jinnah*, Delhi, 1945.

Shan Mohammad, *Syed Ahmad Khan : A Political Biography*, Meerut, 1969.

Shan Mohammad, *Simla Deputation*, Aligarh, 1969.

Shariruddin Pirzada, Syed, *Evolution of Pakistan : All India Muslim League Documents (1906-1924 and 1924-1947)*, Vols. 1 and 2, Karachi, 1969.

S. L. Sikri, *Studies in Constitutional History of India*, Jullundur (City, 1954.

Smith, W. C., *Pakistan an Islamic State : Preliminary Draft*, Lahore, 1951.

S. M. Ikram, *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan (1858-1951)*, 2nd revised ed., Lahore, 1970.

Sri Ram Sharma, *The Religious Policy of The Mughal Emperors*, London, 1940.

Surendra Nath Sen, *Eighteen Fifty-Seven*, Calcutta, 1958.

Tara Chand, *History of the Freedom Movement in India*, Ministry of Information and Broadcasting, India, 1961.

The Imperial Gazetteer of India, Vol. I, Calcutta, 1908.

The Imperial Gazetteer of India, Vol. XXV, New Ed., Oxford, 1909.

Thompson and Garrat, *Rise and Fulfilment of British Rule in India*, Allahabad, 1958.

T. W. Arnold, *The Preaching of Islam*, Lahore, 1955.

W. C. Bonnerjee, *Indian Politics*, London, 1898.

William Pitt, Lord, *Report on Indian Educational Institutions*, Delhi, 1824.

W. W. Hunter, *Our Indian Musalmans*, London, 1871.

Ziaul Hasan Farooqi, *The Deoband School and the Demand for Pakistan*, Bombay, 1963.

Periodicals and Newspapers :

The Comrade, Calcutta and Delhi.

Dawn, Karachi.

Journal of the American Oriental Society, New York.

Journal of the Islamic Review and Arab Affairs, England.

Medieval India Quarterly, Aligarh.

The Indian Journal of Politics, January, December, 1969, Aligarh.

The Tribune, February 1881 to December 1881, Lahore.

اشاریہ

(آ)

(ا)

(ب)

(پ)

(ت)

(ٹ)

(ث)

(ج)

(چ)

(ح)

(خ)

(د)

(ڈ)

(ذ)

(ر)

(ز)

(س)

(ش)

(ص)

(ض)

(ط)

(ظ)

(ع)

(غ)

(ف)

(ق)

(ک)

(گ)

(م)

(ن)

(و)

(ہ)

(لا)

(ی)